ٹیلیفون نمبر
۳۵۲۵
۴۴۸۹۸

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شمارہ ۱۱۴

جولائی ۱۹۷۰ء

مدیر

محمد طفیل

ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ انارکلی لاہور

قیمت فی پرچہ

ترتیب

محمد طفیل پرنٹر ، پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اُردو ، لاہور سے شائع کیا

طلوع

اب کے جی چاہتا ہے کہ یہ صفحہ کوئی اور لکھ ڈالے۔

وجہ ؟

وجہ یہ ہے کہ جس قوم میں پیدا ہوا ہوں، وہ غریب سے زیادہ عجیب ہے، ــــ سب کچھ سمجھتی ہے مگر اپنا بُرا بھلا نہیں سمجھتی۔

اُدھر جوہری اپنی اپنی دکان چمکائے ڈکار رہے ہیں۔ انہوں نے تاڑ لیا ہے کہ یہ قوم پتھر اور ہیرے کے فرق کو نہیں جانتی۔ اس لیے اسے جس بھاؤ چاہو، خرید لو۔ باہر کی منڈیوں میں بھی اس کے منہ مانگے دام لگ رہے ہیں۔ تجوریاں کھلی ہیں۔ سودے ہو رہے ہیں۔

اِدھر کوئی "کتاب" کے نام پر خرید ا جا رہا ہے۔ کوئی ردی کے عوض بک رہا ہے ستم یہ کہ جس جوہری کو دیکھو (بزعم خود) صرف وہی ہے جو قوم کا غمخوار ہے باقی سب گردن زدنی !

لُوٹ لو۔ مار دو! یہ بھی جوہری فرماتے ہیں۔ یہ عمل بھی جوہریوں ہی کا ہے کان رہے نہ رہے، اپنا اُلّو ضرور سیدھا ہو۔

اور

یہ سوچ "اپنوں" کی بھی ہے اور دشمنوں کی بھی ــــ موقع ہے، موقع ہے۔

[محمد طفیل]

اِس شمارے میں

پہلے پچھلے شمارے کی بات کرلیں۔

گذشتہ سال اردو کی ادبی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ پیش آیا کہ اُردو کے عظیم اور لازوال شاعر مرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک پوری بیاض اُن کے قلم سے لکھی ہوئی دریافت ہوگئی اور اس خبر نے ساری اُردو دنیا میں عجیب تہلکہ مچا دیا۔ اور کیسا عجیب اتفاق ہے کہ یہ نسخہ بھارت کے شہر بھوپال میں ڈیڑھ سو برس تک محفوظ رہا، وہاں سے امروہہ کو منتقل ہوا، مگر اُسے پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کرنے کی سعادت ہمارے حصے میں آئی۔

ہم نے اب تک اردو زبان و ادب کی بُری بھلی جو کچھ خدمت کی ہے اس پر احباب کی خوشنودی، بزرگوں کی دعاؤں اہلِ نظر کی حوصلہ افزائیوں اور قدردانیوں کے باوجود کبھی 'فخر و مباہات' کا احساس نہیں کیا۔ دل نے ہمیشہ یہی کہا کہ منزل یہ نہیں ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ہمارا مقصد رہا ہے اور خدائے بزرگ و برتر کی اعانت و عنایت سے 'نقوش' کو وہ اعتبار و اعزاز حاصل ہوتا رہا ہے جس کا شکر و سپاس ہمارے احساس سے فروتر ہوگا۔ مگر غالبؔ کی یہ نادر اور بے بہا 'بیاض' اپنے محدود وسائل اور بعض مجبوریوں کے باوجود کم سے کم وقت میں ممکن حد تک بہتر اور خوبصورت انداز میں چھاپ کر ہم نے واقعی فخر کا احساس کیا ہے۔ اس لئے کہ آج تک اساتذۂ متقدمین میں سے کسی کے قلم سے لکھی ہوئی ایسی بیاض دریافت نہیں ہوئی ہے مرزا غالب اُردو کے "سب سے بڑے" یا احتیاط سے کہا جائے تو "بہت بڑے" شاعر ہیں ان کے دیوان کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل رہی ہے اس کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اس دیوان سے زیادہ مقبول و معروف اور اہم کتاب کی دریافت آئندہ بھی متوقع نہیں ہے۔ غالبؔ کا ایک دیوان تو متداول ہے جسے محمد حسین آزاد کے لفظوں میں ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں، دوسرا نسخۂ بھوپال تھا جو "دیوان غالب نسخہ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ کچھ اور اہم نسخے گلِ رعنا (انتخاب)، نسخۂ شیرانی، نسخۂ لاہور، نسخہ لیاقت میوزیم، نسخہ طاہر وغیرہ ہیں۔ لیکن 'نقوش' نے جو نسخہ دریافت کیا ہے وہ اِن سب سے قدیم اور سب کی اساس ہے گویا اب ہم مرزا غالب کی شاعری کے منابع اور اس کے اولیں نقوش کی بازیافت کے قابل ہوگئے ہیں۔ دوسرے تمام قلمی نسخے کاتبوں کے قلم سے لکھے گئے ہیں اگرچہ بعض کی تصحیح یا حاشیوں پر اضافے مرزا کے قلم سے ہوئے ہیں — لیکن نسخۂ امروہہ تمام تر غالب ہی کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ ایسے بڑے شاعر کی ایک عظیم تصنیف کا اتنا اہم مخطوطہ ایک ایسے اہم سال میں اتنے ڈرامائی انداز سے دریافت ہو جانا اور چھپ جانا کیا کوئی معمولی ادبی سانحہ ہے؟ پھر ہم اس پر فخر کرنے میں کیا حق بجانب نہیں ہیں؟

نسخہ امروہہ کے متعلق نثار احمد فاروقی نے اپنے مضمون میں اس کا سنہ کتابت ۱۲۳۱/ ۱۸۱۶ء قرار دیا ہے۔ اس سے بعض غالب شناسوں کو اختلاف ہے، مولانا غلام رسول مہرؔ کا مضمون اسی اشاعت میں شریک ہے جو مولانا ئے محترم نے 'بیاضِ غالب نمبر'

ے افتتاحی جلسے میں پڑھا تھا۔ اس سے اُن کے اختلاف کی دلیلیں واضح ہوتی ہیں۔ بعض دوسرے اہلِ قلم نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے اور امید ہے کہ جب تک غالب اور دیوانِ غالب کا نام زندہ ہے غالب شناس بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور یہ بحث و اختلاف اُردو کی ادبی تاریخ میں اچھے علمی اضافوں کا سبب بنے گا۔

'بیاضِ غالب' کے حصول میں ہم نے جو ہفت خواں سر کئے ہیں ان دشواریوں کا بس ہمیں اندازہ ہے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ حصول کے بعد اس بیاض کو کم سے کم وقت میں اہلِ ذوق اور قدر دانوں کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے اس عجلت میں دیوان کے متن میں بعض کتابت کی غلطیاں رہ گئیں۔ چونکہ دیوانِ غالب کے اس اہم نسخے کو ہم ہر لحاظ سے مکمل، مستند اور حرف بحرف درست دیکھنے کے بھی خواہش مند ہیں اس لئے اگر طبع ثانی کی نوبت آئی تو ایسی معمولی فروگذاشتیں بھی دور کر دی جائیں گی۔ کام کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اغلاط سے متعلق چند ایک صراحتیں اس شمارے میں بھی پیش کی جا رہی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر اور سید وزیر الحسن عابدی نے بھی اس ضمن میں مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔

نثار احمد فاروقی نے اپنے مضمون کی تصحیح و استدراک اور توضیحات کو مضمون کی شکل میں قلم بند کر دیا ہے تاکہ اس مضمون کی روشنی میں اُس مضمون کا مطالعہ کیا جا سکے۔ انہوں نے اپنے مضمون کو دوبارہ اطمینان، توجہ اور دیدہ ریزی کے ساتھ لکھا ہے جس میں تقریباً کل ضروری امور سے بحث ہوگئی ہے۔ یہ ترمیم و اضافہ شدہ مضمون بیاضِ غالب نمبر کی اشاعتِ ثانی میں شامل کیا جائیگا

ادارۂ نقوش نے غالب کی یہ بیاض کس طرح حاصل کی۔ یہ بھی ایک معمّا ہے اور بہت سے حضرات چاہتے ہیں کہ اس معمّے کو حل کر دیا جائے۔ کیونکہ اس سے بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئی ہیں اور کچھ ہمارے کرم فرماؤں نے ایک محدود حلقے میں مغالطے پیدا کرنے کی مہم شروع کر دی ہے ہم نے ابھی تک بہت سے 'رازہائے درونِ پردہ' کی چہرہ کشائی نہیں کی ہے۔ وقت آئے گا، اور یہ ناگزیر ہوگا تو اس دلچسپ کہانی کا یہ اسرار باب بھی کھول دیا جائے گا۔

یہ نسخہ اپریل ۱۹۶۹ء کے شروع میں دریافت ہوا تھا اس پر سب سے پہلے مختصر نوٹ ہمارے مضمون نگار نثار احمد فاروقی نے 'ہماری زبان' علی گڑھ کی ۲۲ اپریل ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا اور جون ۱۹۶۹ء کے ماہ نامہ 'آج کل' دہلی میں اس بیاض پر پہلا تفصیلی مضمون تین صفحات کے عکس کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ادارہ نقوش نے اکتوبر ۶۹ء کی اشاعت میں یہ بیاض حسنِ طباعت کے مثالی معیار کے ساتھ چھاپی جس کی افتتاحی تقریبات اعلیٰ پیمانے پر راولپنڈی اور لاہور میں منائی گئیں۔ اردو اور انگریزی کے تمام اخباروں نے ان تقریبات کو نمایاں طور پر شائع کیا اہلِ قلم نے تبصرے اور کالم لکھے، ریڈیو سے روداد اور تعارفی مضامین نشر ہوئے غرض کہ برِ صغیر میں آج تک اردو کی کسی کتاب کا اتنے وسیع اور شاندار پیمانے پر خیر مقدم نہیں کیا گیا جس کا مظاہرہ 'بیاضِ غالب' کی اشاعت کے موقع پر دیکھنے میں آیا۔

بھارت میں دیوانِ غالب کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ اس کی خبروں سے بھی ادبی حلقوں میں اتنی دلچسپی لی جا رہی ہے کہ قومی آواز لکھنؤ، الجمعیتہ دہلی، دعوت دہلی، الحمرا بھوپال، ندیم بھوپال، انقلاب بمبئی وغیرہ اخبارات میں کئی کالم کی سرخیوں کے ساتھ اس کی خبروں کو شائع کیا گیا ہے اور سب کی نگاہیں عدالت کے فیصلے پر لگی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دیوانِ غالب کے اس بیش بہا نسخے کا عکس بھارت میں بھی چھاپا گیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے

بھارتی ایڈیشن صرف طبع ہوا ہے لیکن کچھ قانونی اور تکنیکی دشواریوں کی وجہ سے "شائع" نہیں ہوا - اور اب تک بازار میں دستیاب نہیں ہے۔ ادارہ نقوش نے اُسے حاصل کرنے کے لئے اپنے وسائل استعمال کئے لیکن وہ نہیں مل سکا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے چھاپ کر کسی گوشے میں محفوظ کر دیا گیا ہے - اور ان سطور کی تحریر کے وقت تک (جون ۱۹۷۰) بھارتی ایڈیشن بازار میں نہیں آیا ہے - اس لحاظ سے 'نقوش' ہی کو یہ امتیاز اور فخر حاصل ہے کہ اس نے برصغیر میں سب سے پہلے اس نادر نسخے کو چھاپ کر شائع کیا ہے۔

اس شمارے میں نقوش کے غالب نمبر حصہ دوم کی افتتاحی تقریبات کے فوٹو، خبروں کے تراشے اور تبصرے وغیرہ شریک ہیں۔ وہ مضامین بھی ہیں جو راولپنڈی اور لاہور کی ان تقریبات میں ممتاز اہل قلم نے پڑھے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ روداد غالب نمبر حصہ سوم کے ساتھ شامل کی جائے لیکن بعض احباب کا مشورہ تھا کہ اسی اشاعت میں شریک ہو۔ عین وقت پر جو کچھ ممکن تھا وہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی متعدد مضامین، تبصرے اور خبریں اور تنقیدیں باقی ہیں اور ان کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔

غرض بیاضِ غالب کے بارے میں سبھی کی رائے یہ ٹھہری کہ وہ اس صدی کی سب سے بڑی ادبی دریافت ہے۔ اس کے منظرِ عام پر آجانے سے آئندہ غالب پر جو کچھ بھی لکھا جائے گا، وہ سب اس کی روشنی میں لکھا جائے گا۔ اسے نظر انداز کرنے والا ناقد کچھ پائے گا نہیں، کچھ کھوئے گا ضرور!

اب تو اس بیاض کے نت نئے پہلوؤں پر بحث ہوتی ہی رہے گی۔ جسے سمیٹنے کے لیے نقوش کے صفحات فراخدلی کا ثبوت دیں گے۔ کچھ نہ کچھ اس شمارے میں بھی ہے اور بہت کچھ غالب نمبر حصہ سوم میں پیش کیا جائے گا۔

بات مجھے اِس شمارے کی کرنی چاہیئے تھی مگر طول اُس شمارے کی باتوں نے کھینچا۔ بہرحال اس شمارے میں بھی جو کچھ ہے، وہ سب ٹھکانے کا ہے۔

ایک اہم مضمون شیخ منظور الٰہی کا ہے۔ جنھوں نے اپنے والد مرحوم پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اگر ہم بزرگوں کی زندگی سے کچھ حاصل کرنے کے موڈ میں ہوں تو یہ مضمون بھی ہمیں بہت کچھ دے گا۔ اسی نوعیت کا ایک پیارا سا مضمون نقوش ہی کے صفحات پر قرۃ العین حیدر کا چھپا تھا۔ دوسرا یہ ہے۔

سید امتیاز علی تاج کو دو بے درد انسانوں نے قتل کر دیا۔ یہ المیہ تادیر رُلاتا رہے گا۔ جی چاہتا تھا کہ سید صاحب کے علم و فضل اور ان کی شخصیت پر چند ایک اور مضامین کا بھی اضافہ کرتے۔ پھر سوچا اس کام کو کسی اور وقت اطمینان کے ساتھ انجام دیں گے۔ یہ جو مضامین پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ اُس تقریب میں پڑھے گئے تھے جو سید صاحب کے اَن مٹ کام 'کلاسیکی ڈراموں کی تدوین' کی افتتاحی تقریب میں پڑھے گئے تھے۔

جمیلہ ہاشمی ایک عرصے سے لکھ رہی ہیں۔ کئی ایک ادبی انعام بھی حاصل کر چکی ہیں مگر نقوش میں ان کا افسانہ پہلی مرتبہ چھپ رہا ہے۔ ان کے اب تک نہ چھپنے کا کوئی غم نہ تھا مگر اس بار چھپنے کی خوشی ضرور ہے۔ کیونکہ کہانی نے کہہ دیا —— مجھے چھاپ لو۔

اس بار پرچہ بڑی تاخیر سے آپ تک پہنچا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اُدھر بیاضِ غالب کی دھوم مچی۔ اِدھر اپنی گرہ کٹ گئی۔ وجہ یہ کہ ادب کی دُنیا میں چُپڑی اور دو دو کا رواج نہیں!

خطبۂ صدارت

جنرل شیر علی خاں وزیر اطلاعات

محمد طفیل صاحب ایڈیٹر نقوش نے میرے بارے میں جو تعریفی کلمات ارشاد فرمائے۔ یہ ان کی عزت افزائی ہے۔ میں بھی اُن کا ممنون ہوں۔ موصوف نے حضرت غالب سے میری قرابت داری کا جو ذکر فرمایا اس کی حقیقت اس قدر ہے کہ نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والیٔ لوہارو میرے نانا کے پردادا تھے۔ اُن کے بھائی مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم حضرت غالب سے منسوب تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت غالب سے میری قرابت داری گویا ــ "ہمیں نسبت ہے دُور کی":

لیکن قرابت داری کے علاوہ میرے بزرگوں کو حضرت غالب سے ہمیشہ گہری عقیدت رہی اور خود حضرت غالب کو بھی اس خاندان سے خصوصی تعلق رہا۔ اس ربط ضبط اور مشفقانہ تعلقات کا تذکرہ ان کے کلام اور خطوط میں جا بجا پایا جاتا ہے۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ میرے پرنانا نواب علاؤ الدین خاں والیٔ لوہارو متخلص بہ علائی کو حضرت غالب نے اپنا خلیفہ اوّل بھی بنایا تھا۔ آپ نے حضرت غالب کا وہ خط بھی پڑھا ہوگا جس میں انھوں نے میرے نانا مرحوم نواب امیر الدین خاں لوہارو کو لکھا تھا کہ میں تمہارا دادا نہیں بلکہ دلدادہ ہوں۔ اس اعتبار سے مجھے بچپن ہی سے یہ سعادت حاصل رہی کہ میں نے حضرت غالب کو دیکھنے والی آنکھوں کو دیکھا، اور ان سے گفتگو کرنے والوں کی زبان سے اُن کے بارے میں بہت سی کارآمد اور پُر لطف باتیں سُنیں۔ اگلے زمانے کے بزرگوں کا یہی دستور تھا کہ وہ چھوٹوں کو بڑوں کی اچھی باتیں سنایا کرتے تھے تاکہ اُن کے دل میں بڑوں کا ادب اور احترام بچپن ہی سے قائم ہو جائے۔ اب نہ ویسے بزرگ رہے نہ ویسے چھوٹے اور نہ وہ باتیں ہی رہیں۔ اب اگلوں کا پچھلوں سے تعلق قائم رہے تو کیسے؟ خیر ان ناخوشگوار باتوں کا اس تقریب میں نہ کوئی محل ہے نہ موقع۔

حضرت غالب سے مجھے جو قریبی اور دلی نسبت حاصل ہے اور جسے میں واقعی اپنے لیے ذریعۂ عزت سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں بھی آپ حضرات کی طرح حضرت غالب کا ایک حقیر دلدادہ ہوں۔ میرے لیے یہی باعثِ فخر ہے کہ غالب کے کروڑوں عقیدت مندوں میں مجھے بھی شمار کیا جائے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اس مناسبت سے حضرت غالب کے ایک کم معروف شاگرد میاں داد خاں سیاح کا ایک شعر غالب کے شیدائیوں کی اس انجمن کی نذر کرتا ہوں۔ یہ شعر میں نے ان کے ایک نادر قلمی نسخے سے نقل کیا تھا جو میرے بزرگوں کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ وہ شعر یہ تھا ؎

ظلّ کرم ہے حضرتِ غالب کا بس، مجھے
سر پر نہیں ہے، سایۂ بالِ ہما، نہ ہو

حضرت غالب کو گزرے سو سال سے زیادہ ہو گئے مگر ان کا کلام بدستور تازہ ہے، اُن کے شیدائیوں کی تعداد بھی ساری د

میں روز بروز بڑھتی جاری ہے۔ خود ان کی پیشگوئی کے مطابق اُن کے کلام کی قدر ان کے بعد ہی ہوئی۔ اُن کی صد سالہ برسی کئی ملکوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ منائی گئی اور اُن کے کلام اور ان کی دلپذیر شخصیت کے بے شمار پہلو اجاگر کیے گئے۔

یہ امر اطمینان بخش ہے کہ پاکستان کے اُردو رسائل نے اس موقع پر جو شاندار خدمات انجام دیں وہ کسی دوسرے ملک سے کسی طرح کم نہیں ان میں رسالہ نقوش کا غالب نمبر خاص امتیاز رکھتا ہے اور برصغیر کے تمام اردو دانوں سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ لیکن نقوش کے ایڈیٹر، محمد طفیل صاحب کی حضرت غالب سے عقیدت اور نیاز گزاری کی وجہ سے اُن کے پاکیزہ ذوق کی اس سے تسکین نہیں ہوئی۔

اب انھوں نے کمال محنت اور کثیر صرف سے نقوش کا یہ دوسرا غالب نمبر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حضرت غالب کی خود اپنے قلم سے لکھی ہوئی، اوّلین بیاض کے عکسی بلاک شامل ہیں یہ نادر و نایاب قلمی بیاض، محمد طفیل صاحب نے جس تلاش اور جستجو کے ساتھ حاصل کی پھر اُسے تمام و کمال اس آراستگی اور پاکیزگی کے ساتھ شائع کیا یہ ان کے اعلیٰ ادبی اور جذبہ خدمت کا ثبوت ہے۔

حضرت غالب کا پورا اُردو دیوان، خود ان کے خط میں لکھا ہوا، برصغیر میں پہلی مرتبہ اس سلیقے کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ ایک قابل فخر کارنامہ ہے جس پر ملک کی صحافت اور طباعت دونوں بجا طور پر ناز کر سکتی ہیں۔ میں محمد طفیل صاحب کو اس پر خلوص دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں،

مجھے یقین ہے کہ غالب کے شیدائی اس عظیم یادگار کی خاطر خواہ قدر کریں گے اور نقوش کا یہ غالب نمبر تاریخ ادب میں خاص مقام حاصل کرے گا۔

بیاضِ غالب کی دریافت

مولانا غلام رسول مہر

قدسی گہرم ہر کہ بسازد بہ من از مہر
باید کہ بنازد شرفِ ملتِ ضم را
(غالب)

میرزا غالب کی صد سالہ برسی اس وسیع پیمانے پر منائی گئی کہ سرگزشت شعر و ادب میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ روئے زمین کا کوئی ملک، کوئی خطہ، کوئی قابلِ ذکر شہر اور قصبہ، کوئی علمی و ادبی ادارہ ایسا نہیں رہا جس نے اس عالی منزلت اور بدیع الفکر شاعر و ادیب کی یاد میں کوئی مجلس منعقد نہ کی ہو۔ کلامِ میرزا کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے، اس کے اندازِ شعر گوئی کی پیروی شروع ہوگئی۔ فارسی اور اردو کے علاوہ، جو میرزا کی زبانیں تھیں، دوسری زبانوں میں بھی بے شمار کتابیں چھپیں۔ ان سب کی تعداد کا صحیح اندازہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ رسالوں اور اخباروں نے صرف پاک و ہند میں جتنے خاص نمبر مرتب کئے، ان کا شمار ممکن نہیں۔ دورِ حاضر کے ترقی یافتہ وسائل نشر و اشاعت کے ذریعے سے جو کچھ ہوا اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ غرض اس سال کے لیل و نہار کا بیشتر حصہ میرزا ہی کے ذکر میں صرف ہوا۔ ان کے کمالِ فن سے دنیا بھر کے لئے شناسائی کا موقع بہم پہنچا۔ اردو اور فارسی کے وقار و ہر دلعزیزی کو تقویت پہنچی۔ کرۂ ارض کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جس کے ادبی ایوان میرزا کے ذکر کی گونج سے ناآشنا رہے ہوں۔ روسیوں نے ایک خاص وضع کا نیا اور نہایت خوبصورت پھول پیدا کر کے اس کا نام "میرزا غالب" رکھ دیا۔ وہ پھول اسی نام سے خیابانوں اور چمن زاروں میں نگاہوں کے لیے طراوت اور دل و دماغ کے لئے فرحت و شمیم انگیزی کا سروسامان مہیا کرتا رہے گا۔

ہمارے ہمسایہ ملک کے متعلق کہا گیا کہ اس نے اردو سے اچھا سلوک نہ کیا، حالانکہ یہ زبان اسی کے دامن میں پیدا ہوئی، پھولی پھلی اور معراجِ کمال پر پہنچی تھی اور یہ مختلف اللسان طبقات کی یکجائی کا ایک زندہ جاوید نشان تھی، جنھیں احوالِ روزگار نے ایک رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔ یہ درست ہے، لیکن آپ نے میرزا غالب کی عظمت و شوکت اور شان و شکوہ کی ندرت کاریاں دیکھیں؟ اس ملک میں میرزا کی برسی اس والہیت سے منائی گئی کہ شاید ہی کوئی ملک اس پر تفوق و برتری کا دعویٰ کر سکے!

سب سے آخر میں یہ کہ یہ سال میرزا سے متعلق بعض نوادر کی دریافت اور تہذیب و طباعت کے اعتبار سے بھی بڑا ہی بابرکت اور ثمروت مند ثابت ہوا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ برسات میں زمین سیراب و شاداب ہوتی ہے تو اپنے اندر کی پوری استعداد کو اچھال کر سطح پر پھینک دیتی

ہے اور دامن خاک سراسر "روکش سطح چرخ مینائی" بن جاتا ہے۔ میرزا غالب تو برسات ہی کو ہندوستان کی بہار کہا کرتے تھے:

بہارِ ہند بود برشکال، ہاں غالبؔ
دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابے ہست

فصل بہار کا درود درختوں اور پودوں کے لئے شگفتہ تازہ کا پیغام ہوتا ہے۔ ان کی رگوں میں زندگی کا افسردہ اور پژمردہ مادہ یکایک جاگ اٹھتا ہے بلکہ شوقِ شہود میں کھوتے لئے اور جوش مارنے لگتا ہے:

در شاخ بود موجِ گل از جوشِ بہاراں
چوں بادہ بہ مینا کہ نہاں است و نہاں نیست

معلوم ہوتا ہے کہ صد سالہ برسی کے سال کی ایسی ہی کوئی پُر اسرار کشش اور ایسا ہی کوئی ناشناسا جاذبہ بیانا ادبی خزانے منظر عام پر لے آیا۔ ان میں سب سے زیادہ بیش قیمت اور بے بہا گنجینہ، جسے گنج شایگاں کہنا چاہیئے، وہ ہے جس کی تقریبِ افتتاح آج ہم سب کو یہاں لائی ہے۔

یادِ بُرد آں گنج بادآورد و غالبؔ ما ہنوز
دیدۂ الماس پاش و چشم گوہر بار ہست

اس سال کا قافلۂ شوق گیارھویں منزلیں طے کر کے بارھویں میں قدم رکھ چکا ہے۔ جو اس کی آخری منزل ہے، اب ایسی کسی اور دریافت کے لئے دامن امید پھیلانے کی کون سی گنجائش باقی رہ گئی ہے؟

میرزا نے زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں، جب گمنامی کی تاریکی ان کے گرد و پیش مسلط تھی کہا تھا:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

بظاہر یہ شاعرانہ ادعا تھا اور کون سا شاعر ہے، جس کی زبان پر ایسے ادعا جاری نہ رہے؟ پھر میرزا نے حیات مستعار کے آخری دور میں فرمایا تھا:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یہ بھی محض ایک تعلی اور اپنے دل کے لئے طفل تسلی ہی سمجھی جاتی رہی۔

تاہم ایک سو سال کے اندر اندر دنیا پر آشکارا ہو گیا کہ یہ خالی اور خیالی دعوے نہ تھے۔ محض فکری تعلیاں نہ تھیں۔ یہ پیشگوئیاں تھیں۔ جن کا مشاہدہ عملی شکل میں آج ہر جگہ کیا جا سکتا ہے اور ان کی تصدیق کے دستخط صحیفۂ روزگار کے اوراق ایسے زریں حروف میں ثبت ہو چکے ہیں، جن کی درخشانی، ان شاء اللہ رہتی دنیا تک روز افزوں رہے گی:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما حافظؔ

عالمی شاعروں کا ذکر جہاں بھی چھڑے گا۔ ان کی فہرست کتنی ہی محدود رہے، تاہم میرزا کا نام ان میں ضرور شامل ہوگا۔ جو نسلاً ترکستانی، مولداً اکبرآبادی، موطناً دہلوی اور بہ اعتبارِ کمالِ فن عالمی تھے۔ دیکھیے قدرت اربابِ کمال کو مختلف انتسابات سے بالاتر ہوئی کس طرح اس مقام بلند پر پہنچا دیتی ہے، جہاں محدود انتسابات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ جہاں یہ نہیں پوچھا جاتا کہ کوئی کہاں کا ہے؟ کس نسل اور کس خاندان سے ہے؟ اس نے کہاں تربیت حاصل کی؟ کہاں زندگی گزاری؟ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے فطری جوہروں اور کمالِ ہنرمندی کا درجہ، مرتبہ اور کیفیت کیا ہے؟

گر تنزل نبود ابر بہاری غالبؔ
کہ دُر افشانی وز افشاند شمارے نہ دہی

جس نسخۂ نادرہ کا افتتاح ہمیں یہاں لایا ہے اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں، لیکن انتہائی تعجب کا مقام ہے کہ یہ نسخہ بھی بھوپال پہنچا۔ جہاں اس سے پہلے یا بعد وہ نسخہ پہنچ چکا تھا، جو اب "نسخۂ حمیدیہ" کہلاتا ہے۔ "نسخۂ حمیدیہ" ۱۹۲۱ء میں چھپ کر شائع ہو گیا لیکن یہ نسخہ، جس نے "نسخۂ امروہہ" کے نام سے شہرت پائی، بدستور گوشۂ خمول میں پڑا رہا۔

اس سے بھی بڑھ کر تعجب اس امر پہ ہے کہ جس شخص کے پاس یہ نسخہ موجود تھا، وہ اس کی حقیقی حیثیت اور قدر و قیمت سے کاملاً نا آشنا رہا۔ حالانکہ جانتا تھا، یہ میرزا غالبؔ کا لکھا ہوا ہے۔ اس نے صرف پچیس روپے قیمت بتائی اور گیارہ روپے میں اسے فروخت کر دیا۔ جس نے اسے خریدا، وہ زیادہ ہوشمند تھا۔ اس نے چند ہی گھنٹے بعد دہلی پہنچ کر اس کی دریافت کا اعلان کیا تو قیمت کم از کم چھ ہزار روپے مقرر کی۔ گویا جو نسخہ پہلے مالک کے نزدیک محض پتھر کا ایک ٹکڑا تھا، وہ دوسرے مالک کے ہاتھوں میں پہنچتے ہی "کوہِ نور" بن گیا۔ کیونکہ وہ جوہری تھا یا جوہری ثابت ہوا۔

پھر تعجب کا آخری مرحلہ پیش آیا جس کے سامنے پہلے دونوں مرحلے بے حقیقت رہ گئے۔ جب اس نسخے کی دریافت کا اعلان ہوا تھا، اس کی اشاعت کے لئے ہمارے نگاہیں ہندوستان پر جمی ہوئی تھیں۔ انتظار میں تھے کہ دیکھیں یہ کب چھپے؟ کہاں چھپے؟ کون چھاپے؟ پھر اس کی زیارت سے کیوں کر شرف اندوز ہوں؟ کیونکہ پاک و ہند کے تعلقات میں جو گرہیں پڑی ہوئی ہیں، ان کے پیشِ نظر ایک ملک میں کسی کتاب کا چھپ جانا ہی کافی نہیں۔ دوسرے ملک میں رہنے والوں کے لئے اس کا حصول بھی ہفت خوانِ رستم سے کم نہیں۔ حالانکہ اس مدت میں ہمارے عزیز دوست محمد طفیل صاحب مدیر "نقوش" نہایت اطمینان و دلجمعی سے بیٹھے ہوئے انتہائی اہتمام کے ساتھ اسے چھاپ رہے تھے۔

میرزا غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے:

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

ہمارے دوست محمد طفیل صاحب جو کبھی کبھی ایڈیٹری کی سرمستی میں اپنے آپ کو "محمد نقوش" بھی لکھتے رہتے ہیں، ان

ساف سے مزین ہیں، جو میرزا کے نزدیک حسینوں سے مختص تھے یعنی سادگی اور پرکاری۔ پھر ان وصفوں میں انہوں نے بظاہر
شق کے بغیر ایسا کمال بہم پہنچا لیا ہے، جو حسینوں کو فطری بخششوں اور عطیوں کے بعد عمر بھر کی ریاضت سے بھی شاید ہی حاصل
ا ہو۔

اتنی بڑی دولت ان کے قبضے میں تھی، مگر صاحب! ان کے ضبط و ہضم کی داد کے لئے الفاظ مساعدت نہیں کرتے
لت تک سنائی نہ دی۔ لبوں پہ مہرِ سکوت، دل و دماغ اور کام و زبان پہ پورا قابو۔ اس کاروبار پر دبیز پردۂ خفا میں بھی اپنے
ے کو ان کے نیازمندوں یا بہ اعتبار عمر دعا گوؤں میں سمجھتا تھا اور اہل علم میں سے نہ سہی مگر مولانا شبلی مرحوم کے قول کے مطابق یہ

دوستاں تہمتِ ایں شیوہ بہ ما نیز کنند

میں تو کلام نہ تھا۔ ایک روز یکایک اخبار میں پڑھا کہ راولپنڈی میں اس نسخے کی طباعت پر ایک تقریب منائی گئی یقین رکھیے
یقین نہ آیا کہ یہ وہی نسخۂ نادرہ ہوگا، جس کے انتظار میں نگاہِ شوق ہمسایہ ملک پر جمی ہوئی تھک کر لڑکھڑانے لگی تھی۔ تاہم آج
ب کچھ اسی طرح ہمارے سامنے حقیقتِ ثابتہ کی صورت میں پیش ہے، جس طرح اپنے متعلق میرزا غالب کے پیشگویانہ تصورات و
ورات حقیقتِ ثابتہ بن چکے ہیں۔

میرا احساس یہ ہے کہ یہ میرزا غالب کے متعلق آخری بڑی دریافت ہے۔ کیونکہ بظاہر یہ میرزا کے متداول اردو کلام کا پہلا مجموعہ
ے، جس کے بعد وہ فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے اور اردو میں گنتی کی نئی غزلوں کے سوا کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ کہے ہوئے کلام میں جزوی
ہیں ضرور کرتے رہے یا ممکن ہے انہوں نے کہیں کہیں چند شعروں کا اضافہ کر دیا ہو۔ یہی نسخہ "نسخۂ حمیدیہ" کی اصل و اساس بنا۔
ی میں تھوڑا سا اضافہ ہوا تو وہ نسخۂ شیرانی کہلایا۔ پھر خاصی لمبی مدت تک وہ اپنے آپ کو اردو کے بجائے فارسی ہی کا شاعر سمجھتے رہے۔
ان تک کہ بادشاہ کے دربار سے وابستگی کے بعد اردو اشعار کہے۔

اس نسخے کی تاریخِ کتابت کا معاملہ میرے نزدیک مزید غور و فکر کا محتاج ہے۔ میرزا نے اختتامی تحریر میں صرف تاریخ، مہینا
ر دن بتایا، یعنی رجب کی چودھویں تاریخ اور سہ شنبہ، سال نہ لکھا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ تاریخ، مہینے اور دن کی بنا پر ۱۲۳۱ھ
ا سال کیوں کر متعین کر لیا گیا؟ اس حقیقت کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ رجب کے مہینے میں چودھویں تاریخ کو منگل اسی صورت
ں آسکے گا کہ اس مہینے کا آغاز چہارشنبہ یعنی بدھ سے ہو۔ ۱۲۳۱ھ میں رجب کا آغاز سہ شنبہ یعنی منگل سے ہوتا ہے اور ۱۴ رجب کو
ہارشنبہ یعنی بدھ نکلتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر رجب سے پیشتر کے مہینے یعنی جمادی الآخری کو تیس دن کے بجائے انتیس دن کا مان لیا جائے
ذ ۱۴ رجب کو سہ شنبہ یعنی منگل ہوگا۔

عجیب امر یہ ہے کہ مروجہ تقویم میں جمادی الآخری کو انتیس ہی کا مان کر رجب کا آغاز سہ شنبہ سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ دلیل تو
ار آمد معلوم نہیں ہوتی۔ نیز پیشِ نظر حساب میں ایک دن گھٹا لینے سے پورے حساب میں اس دن کا وجود ختم نہیں ہو جائے گا۔
مادی الآخری میں ایک دن گھٹایا جائے گا تو وہ جمادی الاولیٰ میں بڑھ جائے گا اور معاملہ بہرحال وہیں رہے گا جہاں تھا۔ ہاں یہ ممکن
ے کہ مروجہ تقویم کو پیشِ نظر مقصد کے لئے ساقط الاعتبار قرار دے لیا جائے۔

میں نے خود چھان بین میں کچھ وقت صرف کیا تو معلوم ہوا کہ ۱۲۴۳ھ (جولائی ۱۸۲۷ء) سے پیشتر رجب کے صرف دو مہینے ایسے ہیں، جن کا آغاز چہار شنبہ سے ہوا:

۱۔ رجب ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) جب میرزا غالب کی عمر سولہ سال کی تھی۔

۲۔ رجب ۱۲۳۶ھ (یہ سال ۹۔ اکتوبر ۱۸۲۰ء سے شروع ہوا) جب میرزا زندگی کے چوبیس مرحلے طے کر چکے تھے۔

سولہ برس کی عمر تک میرزا کے پاس ایسے اُردو اشعار کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع نہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ ان کے جو شعر محفوظ رہے اور مستند مانے جاتے ہیں، ان کی ابتدا پندرہ برس کی عمر سے ہوئی۔ لہٰذا تسلیم کر لینا چاہیے کہ زیرِ غور نسخۂ نادرہ کی تکمیل تحریر ۱۴ رجب ۱۲۳۶ھ کو بروز شنبہ ہوئی۔ یعنی ۱۷۔ اپریل ۱۸۲۱ء کو۔ جب تک کوئی دوسرا مستند ثبوت بروئے کار نہ آئے۔ میرے نزدیک یہی تاریخ صحیح ہے اصل نسخے کے حاشیے پر ایک جگہ میرزا غالب نے لعل خاں نام کسی شخص کو ملازم رکھنے کی یادداشت لکھی ہے اور وہ تحریر صفر ۱۲۳۵ھ کی ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لعل خاں کو ملازم رکھنے کے وقت تک یہ نسخہ زیرِ تحریر تھا اور بالآخر ۱۴ رجب ۱۲۳۶ھ کو مکمل ہوا۔

نزاعی مسائل چھیڑنے کا یہ محل نہیں لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اب بھی سنجیدہ مذاق کے علم دوست اصحاب میرزا غالب اور میر تقی مرحوم والے قصے کو حقیقت سمجھتے ہیں!

میر تقی مرحوم کا انتقال ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ (۲۰۔ ستمبر ۱۸۱۰ء) کو ہوا۔ اس وقت میرزا غالب کی عمر تیرہ سال، ایک مہینے اور بارہ دن کی تھی۔ میر تقی مرحوم آخری دور میں بہت بیمار رہے۔ عام روایت کو درست فرض کیا جائے تو میرزا کا جو کلام میر کے سامنے پیش کیا گیا ہوگا، وہ بارہ ساڑھے بارہ برس ہی کی عمر میں کہا گیا ہوگا۔

میرزا غالب بڑے بلند پایہ شاعر تھے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بارہ سال کی عمر میں ایسے شعر کہتے تھے جیسے پیشِ نظر مجموعے میں ہیں۔ انھوں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں ضرور پڑھ لی ہوں گی، لیکن میرزا بیدل کا کلام تو وہ سمجھنے کے قابل بھی نہ ہوئے ہوں گے چہ جائیکہ اس کی پیروی میں اردو شعر کہتے۔ اس زمانے میں ایسے شعر کہتے ہوں گے:

ایک دن مثل پتنگ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادی

وغیرہ ایسا کلام نہ میر تقی مرحوم کے سامنے پیش ہو سکتا تھا، نہ وہ ویسی رائے ظاہر کر سکتے تھے، جیسی ان سے منسوب ہے پھر اصل رائے حد درجہ تعجب انگیز ہے، جس کے کسی بھی حصے کو میر تقی کی مسلّمہ عظمت سے کوئی مناسبت نہیں۔ فرماتے ہیں:

> اگر اس لڑکے کو کوئی استاد کامل مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگا۔

اب غور فرمائیے:

۱۔ یہ رائے شاعری میں استادی شاگردی کے عام سلسلے کو مسلّم مان کر پیش کی گئی ہے۔ حالانکہ وہ غیر مسلّم ہے۔ مثلاً مرزا

غالب شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اقبال کی اصل شاعری میں ان کا کوئی استفادہ نہ تھا۔ میرزا داغ کی شاگردی کے زمانے کی غزلیات میں سے شاید کوئی بھی اقبال کے مستند کلام میں شامل نہیں۔

۲۔ غالب کو کوئی کامل یا غیر کامل استاد نہ ملا، جو اسے سیدھے راستے پر ڈال دیتا۔ فطرت نے خود اس کی رہنمائی

۳ معلوم ہے کہ غالب لاجواب شاعر بن گیا اور مہمل نہ بکتا رہا حالانکہ میرزا کو سیدھے راستے پر ڈال دینے والے کسی استاد کا سراغ آج تک نہیں مل سکا۔ اس سے میر تقی مرحوم کی شعری بصیرت اور حقیقت شناسی کے کون سے پہلو کو تقویت پہنچتی ہے؟ ہاں، کوئی شخص روایات کو مسلّم مان کر توجیہات میں پڑا رہنا گوارا سمجھے، اگرچہ وہ توجیہات بادہ ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس نادر نسخے کے ساتھ طفیل صاحب نے بعض اور نوادر بھی شامل کر دیئے ہیں۔ مثلاً مولانا عباس بھوپالی کے نام میرزا کے دو غیر مطبوعہ فارسی خط، بعض اور مکاتیب کے عکس، غالب کے سات فارسی خط بنام تفضل حسین خان مع تصریحات و ترجمہ و عکس، یہ فاضل مکرم سید وزیر الحسن صاحب عابدی کے مرتبہ ہیں۔ جن کے ابر فیض سے جتنی زیادہ سعی کرم کی آرزو رہتی ہے، وہ پوری نہیں ہوتی۔ یعنی ہماری تشنگی اور تفتہ لبی پر انھیں ترس نہیں آتا۔ "گل رعنا" کے بعض اوراق کے عکس۔

البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس نسخے میں انتہائی اہتمام کے باوجود غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جن کا ذکر یہاں نہیں کروں گا یہاں تک کہ "ابوالمعانی" بیدل کو ابوالمعالی بنا دیا گیا ہے۔

اس نسخے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۲۱ء تک میرزا غالب پر بیدل کا اثر بہت زیادہ تھا، شاید ایک دو سال اور رہا ہو لیکن جب انھوں نے فارسی اختیار کر لی تو یہ اثر جلد زائل ہو گیا۔

اس تبدیلی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم نے بھی "شعر العجم" میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایرانی شاعری میں قاآنی نے انقلاب پیدا کیا، ساتھ ہی ہندوستان کی فارسی شاعری میں بھی انقلاب آیا۔

> شاعری کا جو مذاق ناصر علی وغیرہ کی بدولت سیکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا، درست ہو چلا میرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔ لیکن عرفی، طالب آملی، نظیری اور کلیم کی پیروی نے انھیں سنبھالا..... میرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدت سے اجتہاد اور جدت کا مادہ تھا۔ اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں۔ تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں چھوڑتے۔

پھر چند مثالیں دی ہیں۔

آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میرزا غالب کے اس کلام میں بھی جو زیادہ سے زیادہ چوبیس برس کی عمر تک کا ہے۔ اردو کے بہت سے شعر موجود ہیں جن کی مثالیں ہماری غزلیہ شاعری میں بہت کم ملیں گی۔ مثلاً:

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسۂ گدائی کا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سر تا سرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اپنے کلام پر آپ اصلاح دینے کی مثالیں بھی کم نہیں۔ مثلاً:

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے حسابِ بے گنہی اے خدا نہ مانگ

آخری مصرع بدل کر یوں کر دیا گیا۔

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے:

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس سودن عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

آخر میں یہ شعر یوں ہو گیا:

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

اچھے شعروں میں سے چند یہ بھی ہیں :

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے اسد
شوقِ عنان گسیختہ، دریا کہیں جسے

اسد کی جگہ بعد میں "نہاں" بنا دیا گیا۔

بیاضِ غالب کے بارے میں

نثار احمد فاروقی

دیوان غالب نسخۂ امروہہ کا متن نقوش کے غالب نمبر حصہ دوم میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرا مضمون بعنوان 'بیاضِ غالب' بھی شامل ہے۔ یہ مضمون میں نے اپنی کتاب 'تلاشِ غالب' کے لئے لکھا تھا۔ جس کی طباعت اپریل ۱۹۶۹ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس وقت تک نسخۂ امروہہ کے بارے میں بہت سے جزوی مباحث سامنے نہیں آئے تھے اور پہلی بار یہی مضمون اتنی تفصیلات پیش کر رہا تھا۔ مضمون کی تسوید بہت مختصر مدت میں ہوئی اور بوجوہ اس پر نظرثانی نہ ہو سکی۔ اس لئے بعض غلطیاں رہ گئیں۔ جن کی تصحیح یا وضاحت ضروری ہے[1]۔ اب میں نے اس مضمون کو نئی ترتیب اور اضافوں کے ساتھ دوبارہ لکھا ہے جو تمام متعلقہ مباحث کو محیط ہے۔ یہاں صرف چند ضروری امور کی طرف وضاحتی اشارے کیے جاتے ہیں :

(الف) سنہ کتابت کا مسئلہ

مضمون زیرِ بحث میں نسخہ امروہہ کی کتابت کا سنہ ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء متعین کیا گیا ہے۔ بعض حضرات کو اسے قبول کرنے میں تامل ہوا ہے۔ ابتداً میں میرا خیال تھا کہ یہ نسخہ صفر ۱۲۳۵ھ سے پہلے کتابت ہوا ہے مگر ۱۲۳۱ھ سے قبل نہیں، لیکن یہ سارا حساب "تقویم ہجری و عیسوی" مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی (شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان) کی رو سے تھا اور یہ تقویم وسٹنفلڈ کی جنتری پر مبنی ہے۔ مگر اس کے حساب پر مکمل بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ مطبع نولکشور لکھنؤ سے یک صد و دو سالہ تقویم ہجری و عیسوی ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئی تھی اس میں ایک سو دو سال کی ہجری و عیسوی تاریخوں کا یومیہ تطابق دکھایا گیا ہے اور سنہ ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء اس حساب کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اس جنتری کی رو سے ۱۴ رجب کو منگل کا دن ۱۲۳۱ھ میں آتا ہے جو جون ۱۸۱۶ء کے مطابق ہے۔ اس کا اظہار مولانا عرشی نے بھی اپنے بیان میں کیا تھا اس کے بعد میں نے بھی قطعیت کے ساتھ ۱۲۳۱ھ ہی کو نسخہ امروہہ کا سنہ کتابت تسلیم کر لیا۔

دوسری داخلی شہادت یہ ہے کہ غالب نے نسخۂ امروہہ کی کتابت اس وقت مکمل کی ہے جب وہ صرف اسد تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ اس میں بسم اللہ سے تمت تک ہر جگہ اسد تخلص استعمال ہوا ہے۔ ترقیمے کی عبارت بھی یہ ظاہر کر رہی ہے کہ انہوں نے غالب تخلص ابھی اختیار نہیں کیا ہے۔ جن اشعار میں غالب تخلص آیا ہے وہ بعد میں اضافہ ہوئے ہیں یا مقطع سا

---

[1] ان وضاحتوں کی روشنی میں 'تلاشِ غالب' کے مشمولہ مضمون کو بھی دیکھا جائے۔

بات ترمیم کر کے اسد کی جگہ غالب لکھا گیا ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ مرزا کی سب سے قدیم مہر ۱۲۳۱ھ کی ملتی ہے جس پر اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ کندہ ہے۔ اس مہر کی رو سے مرزا غالب نے اپنا تخلص ۱۲۳۱ھ تک غالب اختیار نہیں کیا تھا۔ لیکن دوسری مہر اسی سال پھر تیار کرائی ہے جس پر اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ کھدا ہوا ہے۔ ایک ہی سال میں دو مہریں انہوں نے اس سے پہلے یا بعد میں کبھی تیار نہیں کرائیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مہر کے ہوتے ہوئے دوسری بنوانا کسی ضرورت کے تحت تھا اور وہ ضرورت یہ تھی کہ انہوں نے ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں اپنا تخلص بدل کر غالب رکھ لیا تھا۔ چنانچہ جن قدیم مقطعوں میں وہ لفظ غالب کھپا سکتے تھے ان میں ترمیم بھی کر دی تھی۔ اس سے دو باتیں صاف طور پر ثابت ہو جاتی ہیں ایک تو یہ کہ غالب تخلص ۱۲۳۱ھ میں رکھا گیا۔ دوسرے یہ کہ نسخہ امروہہ میں جہاں اسد کی جگہ غالب بنایا گیا ہے یہ سب ۱۲۳۱ھ کے بعد کا عمل ہے یعنی اصل قلمی نسخے کی کتابت اس وقت مکمل ہو چکی تھی۔ تیسرے یہ کہ اگر نسخہ امروہہ ۱۲۳۱ھ کے بعد لکھا گیا ہوتا تو بعض غزلوں میں انہوں نے غالب تخلص بھی نظم کیا ہوتا۔

اسی ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جب مرزا کلکتہ گئے تو وہاں اُن کے کسی بدخواہ نے ایک درخواست دے دی کہ یہ شخص اپنا نام بدلتا رہتا ہے۔ مرزا نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ جس پر ۱۲۳۱ھ کی مہر بھی ثبت تھی اپنے دفاع میں پیش کیا یہ نسخہ امروہہ کا مبینہ رہا ہوگا۔ اس سے متعلق معلومات اُن فارسی خطوط میں ملتی ہیں جو سید علی اکبر ترمذی کے انگریزی مقدمے کے ساتھ غالب اکیڈمی نئی دہلی نے "نامہ ہائے فارسی غالب" کے نام سے شائع کئے ہیں۔ خطوط کا اصل قلمی مجموعہ نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں محفوظ ہے۔

بدیں وجہ مجھے بعض حضرات کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ نسخہ امروہہ کی کتابت رجب ۱۲۳۶ھ میں ہوئی ہے۔ اگر نسخہ ۱۲۳۶ھ میں لکھا گیا ہے تو اس کی کسی غزل میں غالب تخلص نظم کیوں نہیں ہوا؟ جب کہ یہ تخلص ۱۲۳۱ھ میں اختیار کیا جا چکا تھا؟

(ب) غیر مطبوعہ کلام کی مقدار

مضمون میں لکھا گیا ہے کہ نسخہ امروہہ کے ذریعے ۱۹ غیر مطبوعہ غزلیں اور ۱۳ رباعیاں پہلی بار سامنے آئی ہیں۔ یہ تعداد درست نہیں ہے افسوس ہے کہ میری عجلت کے باعث یہ غلطی رہ گئی۔ لیکن ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا، کیونکہ اس طرح بعض درماندہ محققوں کو بھی اپنے سر تحقیق کا سہرا باندھنے کا موقع مل گیا۔ نسخہ امروہہ میں ۲۵ غزلیں اور ۱۴ رباعیاں غیر مطبوعہ ہیں ان کے علاوہ ۲۲ مفرد اشعار ہیں یہ سب کلام نقوش کے "بیاض غالب نمبر" میں شامل ہے ان میں سے صرف چھ غزلوں کی اور ایک رباعی کی نشاندہی نہ ہو سکی تھی۔ یہ چھ غزلیں، ۲۲ مفرد اشعار اور ایک رباعی یہاں دوبارہ پیش کی جا رہی ہے تاکہ جن حضرات کے پاس بیاض غالب نمبر محفوظ ہے وہ اس وضاحت کی روشنی میں میرے سابقہ بیان کی صحت کر لیں۔ ابتدائی ہندسہ نقوش "بیاضِ غالب نمبر" میں غزل کا نمبر اور دوسرا شعر کا نمبر ظاہر کرتا ہے :-

(۱۰/۷) (اسد!) افسردگی آوارۂ کفر و دیں ہے
یاد روزے کہ نفس در گرو یارب تھا

(۲۹/۲) خاکِ عاشق بسکہ ہے فرسودۂ پروانۂ شوق
جادۂ ہر دشت تارِ دامنِ قاتل ہوا

(۳۹/۲) ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا
موجِ خمیازہ ہے ہر زخمِ نمایاں میرا

(۵۸/۶) رنگ ریزِ جسم و جاں نے از خمستانِ عدم
خرقۂ ہستی نکالا ہے بہ رنگِ احتیاج

(۶۷/۶) ناتوانی نے نہ چھوڑا بسکہ بیش از عکسِ جسم
مفت واگستردنی ہے فرشِ خوابِ آئینہ پر

(۶۸/۶)

دنداں کا خیال چشمِ تر کر — ہر اشک کو دانۂ گہر کر
آتی نہیں نیند ائے شبِ تار — افسانۂ زلفِ یار سر کر
اے دل بخیالِ عارضِ یار — یہ شامِ غم آپ پر سحر کر
ہر چند امید دور تر ہو — اے حوصلہ سعی بیشتر کر
میں آپ سے جا چکا ہوں اب بھی — اے بے خبری اُسے خبر کر
افسانۂ اسد بایں درازی
اے غم زدہ قصہ مختصر کر

(۱۰۰/۶)

حسرت کدۂ عشق کی ہے آب و ہوا گرم — یاں اشک جدا گرم ہے اور آہ جدا گرم

اس شعلے نے گلگوں کو جو گلشن میں کیا گرم　　پھولوں کو ہوئی بادِ بہاری وہ ہوا گرم
وا کر سکے یاں کون بجز کاوشِ شوخی　　جوں برق ہے پیچیدگیِ بندِ قبا گرم
گر ہے سرِ دریوزگیِ جلوۂ دیدار　　جوں پنجۂ خورشید ہوائے دستِ دعا گرم
یہ آتشِ ہمسایہ کہیں گھر نہ جلا دے　　کی ہے دلِ سوزاں نے مرے پہلو میں جا گرم
غیروں سے اُسے گرم سخن دیکھ کے غالب
میں رشک سے جوں آتشِ خاموش رہا گرم

(۱۰۵/۲) سرابِ یقیں ہیں پریشاں نگاہاں　　اسد کو گرانہ چشم کم دیکھتے ہیں
کہ ہم بیضۂ طوطیِ ہند غافل　　تہِ بالِ شمعِ حرم دیکھتے ہیں

(۱۱۱/۷) برنگِ سایہ سر و کارِ انتظار نہ پوچھ
سراغ خلوتِ شب ہائے تار رکھتے ہیں

(۱۱۲/۳) ادب نے سونپی ہمیں سرمہ سائیِ حیرت
زبانِ بستہ و چشمِ کشادہ رکھتے ہیں

(۱۲۹/۵)
منقار سے رکھتا ہوں ہم چاکِ قفس کو　　تا گل ز جگر زخم میں ہے راہ نفس کو
بیباک ہوں از بسکہ بیازارِ محبت　　سمجھا ہوں زرہ جوہرِ شمشیرِ عسس کو
رہنے دو گرفتار بزندانِ خموشی　　چھیڑو نہ مجھ افسردہ و دزدیدہ نفس کو
پیدا ہوئے ہیں ہم الہ آباد و جہاں میں　　فرسودنِ پائے طلب و دستِ ہوس کو
نالاں ہوا اسد تو بھی سرِ راہگذر پہ
کہتے ہیں کہ تاثیر ہے فریادِ جرس کو

(۱۳۶/۷)
اشکِ چکیدہ، رنگِ پریدہ　　ہر طرح ہوں میں از خود رمیدہ

گو یاد مجھ کو کرتے ہیں خوباں — لیکن بسانِ دردکشیدہ
ہے رشتۂ جاں فرطِ کشش سے — مانندِ نبضِ دستِ بُریدہ
ٹوٹا ہے، افسوس موئے غمِ زلف — ہے شانہ یکسر دستِ گزیدہ
خالِ سیاہ رنگیں رخاں سے — ہے داغِ لالہ درخوں طپیدہ
جوشِ جنوں سے جوں کسوتِ گل — سرتا بپا ہوں جیبِ دریدہ
یارو اسدؔ کا نام و نشاں کیا
بیدل بفیضِ آفت رسیدہ

(۱۴۷/۶)

خوشا طوطی و کنجِ آشیانہ — نہاں در زیرِ بال آئینہ خانہ
سرشکِ بہ زمیں افتادہ آسا — اٹھایا ہے نہ میرا آب و دانہ
حریفِ عرضِ سوزِ دل نہیں ہے — زباں ہر چند ہو جاوے زبانہ
دلِ نالاں سے ہے بے پردہ پیدا — نوائے بربط و چنگ و چغانہ
کرے کیا دعوئ آزادئ عشق — گرفتارِ الہائے زمانہ
اسدؔ اندیشۂ ششدر شدن ہے
نہ پھیرے مہرہ ساں خانہ بخانہ

(۱۴۰/۴) اے دریغا کہ نہیں طبع نزاکت ساماں
ورنہ کانٹے میں تُلے ہے سخنِ سنجیدہ

(۱۵۰/۳) بزلفِ مہ وشاں رہتی ہے شب بیدار، ظاہر ہے
زبانِ شانہ سے تعبیرِ صد خوابِ پریشاں کی

(۱۵۳/۵) تھکا جب قطرۂ بیدست و پا بالا دویدن سے
ز بہرِ یادگاریہا گرہ دیتا ہے گوہر کی

(۱۵۴/۵)

آنکھوں میں انتظار سے جاں پر شتاب ہے — آتا ہے آ، وگرنہ یہ پا در رکاب ہے
حیراں ہوں دامن مژہ کیوں جھاڑتا نہیں — خط صفحۂ عذار پہ گردِ کتاب ہے
جوں نخلِ ماتم ابر سے مطلب نہیں مجھے — رنگِ سیاہِ نیل غبارِ سحاب ہے
ممکن نہیں کہ ہو دلِ خوباں میں کارگر — تاثیرِ جستن اشک سے، نقش برآب ہے
دیکھ اے اسد بدیدۂ باطن کہ ظاہرا
ہر ایک ذرہ غیرتِ صد آفتاب ہے

(۱۶۰/۴) بہار شوخ و چمن تنگ و رنگِ گل دلچسپ
نسیم باغ سے پا در حنا نکلتی ہے

(۱۷۰/۲) نقش صد سطر تبسم ہے برآب زیر کاہ
حسن کا خط پہ نہاں خندیدنی انداز ہے

(۱۷۲/۶) از دلِ ہر دردمند سے جوشِ بیتابی زدن
اے ہمہ بے مدعائی، یک دعا ہو جائیے

(۱۸۹/۳) تجھ کو اے غفلت نسب پروائے مشتاقاں کہاں
یاں نگاہ آلودہ ہے دستار بادامی تری

(۲۰۱/۸)

(۲۰۱/۸) جوہرِ زلف کی تقریر پہ پیچ تاب خاموشی
ہند میں اسد نالاں، نالہ در صفاہاں ہے

(۲۰۷/۱) کرتا ہے گل، جنونِ تماشا کہیں جسے
گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

(۲۱۷/۲) نمک بر داغ مشک آلودۂ وحشت تماشا ہے
سوادِ دیدۂ آہو شبِ مہتاب ہو جاوے

(۲۴۰/۷) نہ پوچھ کچھ سر و سامان و کار و بار اسدؔ
جنوں معاملہ، بیدل، فقیر، مسکیں ہے

(۲۴۹/۳) ہوئے یہ رہروان دل خستہ شرمِ نارسائی سے
کہ دستِ آرزو سے یک قلم پائے طلب کاٹے

(۲۵۱/۵) اے اسدؔ مایوس مت ہو از درِ شاہِ نجف
صاحبِ دنیا، وکیل حضرتِ اللہ ہے

رباعی

بے گریہ کمال تر جبینی ہے مجھے — در بزم وفا خجل نشینی ہے مجھے
محرومِ صدا رہا بغیر از یکبار — ابریشم ساز موئے چینی ہے مجھے

بیاضِ غالب کی تصحیح

(۱)

"بیاضِ غالب" کی ترتیب و طباعت کے تمام مرحلے بہت مختصر مدت میں طے ہوئے تھے۔ اتنی عجلت میں بعض فروگذاشتوں کا قدرتی بات تھی۔ اگرچہ اس نسخے میں دلچسپی رکھنے والے تمام تر اہلِ علم اور فاضل حضرات ہیں جن سے امید ہے کہ وہ ہمارے سہو یا کتابت و طباعت کی غلطی کو بطورِ خود درست کر سکتے ہیں، لیکن اسے نقطہ بہ نقطہ، حرف بحرف بلکہ نقطہ بہ نقطہ پڑھنے والوں نے جتنی محنت کی ہے وہ عام حالات میں ہر شخص سے نہیں ہوتی۔ یہاں بیاضِ غالب کے متن کی بعض اغلاط کی نشاندہی کی جا رہی ہے تاکہ اپنے اپنے نسخوں میں ان اغلاط کی صحت کر لیں۔ اگر طبعِ ثانی کا موقع آیا تو متن کو زیادہ صحت اور اہتمام کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ ان اغلاط کی نشان دہی کے لئے ہم جناب مبارک اکمل گیلانی، (ایبٹ آباد) کے شکر گذار ہیں۔

اگر اس بیاض کی کسی اور غلطی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی گئی تو اسے شکریے کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔

(ادارہ)

تفصیل اغلاط، نقوش۔ بیاضِ غالب

نوٹ: صفحہ سے مراد، کتابت شدہ صفحہ ہے

صفحہ	غزل	شعر	مصرعہ	تفصیل
۶۳	۱۱	۶	۲	"بہ تکلّف" کی جگہ "بے تکلف" ہونا چاہیئے، جیسا کہ بیاض میں ہے
۶۷	۱۶	۵	۲	"مضراب پر پروانہ" کی جگہ "مضراب پر پروانہ" ہونا چاہیئے
۶۹	۱۷	۶	۱	'حنا آلود' لکھا گیا ہے مگر بیاض میں 'حنا آلودہ' لکھا ہُوا ہے
۷۳	۲۲	۲	۱	"دی" اصل سے زائد لکھا گیا ہے مگر کوئی تصریح نہیں دی گئی کہ سہواً رہ گیا د
۷۳	۲۳	۵	۱	اصل "بیمار ہوتا ہوں" مگر بیمار رہتا ہوں لکھا گیا ہے
۷۷	۲۷	۱	۲	تصریح ۳ کی جگہ ص۱۹۷ کی تصریح ۳ لکھ دی گئی ہے
۷۹	۲۸	-	-	غزل کا نمبر غلطی سے ۲۷ لکھا گیا ہے
۸۳	۳۴	۱	۱	اشارہ ۹ دیا گیا ہے مگر تصریح موجود نہیں
۸۷	۳۷	۲	۲	"پہر" کو "پُہر" لکھا گیا ہے جو غلط ہے
۸۹	-	-	-	کی تصریح میں قلم زد شعر کے مصرعہ اوّل میں "یاد" کی بجائے "یاس" لکھا گیا

صفحہ	غزل	شعر	مصرعہ	تفصیل
۹۱	۳۹	۱	۱	جلوہ بساط میں اضافت (ہمزہ) زائد لکھی گئی ہے ۔
۹۱	۳۹	مقطع	۲	"پیرہنستان" میں 'ر' پر اضافت غلط لکھی گئی ہے ۔
۹۳	۴۲	مقطع	۲	"سکندر" کا 'ر' کتابت سے رہ گیا ہے ۔
۹۹	۴۸	۲	۲	'آئینہ آسا' میں اضافت (ہمزہ) زائد ہے ۔
۹۹	۴۹	۲	۱	'خوں چکانی سے' ۔
۱۰۷	۵۷	مقطع	۱	بیاض میں اوفتادہ ہے اور یہی وزن میں ہے نہ کہ 'افتادہ' جس سے مصرعہ وزن سے گر جاتا ہے ۔
۱۰۹	۵۹	۶	۱	بیاض میں "بزم نظر" ہے مگر غلطی سے 'بزم طرب' لکھا گیا ہے ۔
۱۱۰	۶۰	مقطع	۲	بیاض میں ہے "افسانۂ ما باشد" نہ کہ "افسانۂ ما دارد" ۔
۱۱۳	۶۳	۲	۱	بیاض میں "ویرانئی" یوں لکھا گیا ہے ۔ کتابت یہی ہونی چاہیے تھی کہ وز
۱۱۳	-	-	-	اس صفحہ کا آخری مصرعہ (بیاض) "ہے کلیم سیہ بخت پریشاں کا کل" کتا گیا ہے ۔
۱۱۵	۶۵	۲	۲	بیاض میں "زدست" ہے نہ کہ "زدشت" ۔
۱۱۷	۶۷	مطلع	۱	"مائل" کی کتابت (مایل) غلط ہوئی ہے ۔
۱۱۹	۶۹	۲	۱	بیاض میں "از رحم در گداز ہے" مگر کتابت میں زخم لکھا گیا ہے ۔ اس دیا گیا ہے ۔
-	-	-	-	تصریحات میں ۲ موجود نہیں اسے ۲ کر دیا گیا ہے اور تصریح دی گئی اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔ کتابت درست کر دی جائے تو کافی ہے
۱۲۹	۷۸	مطلع	۱	"بعدم" پر اضافت (زیر) غلط لکھی گئی ہے ۔
۱۳۷	۸۷	مطلع	۱	غلط مصرعہ زائد لکھا گیا ہے ۔
۱۴۳	۹۲	مقطع	۱	کی تصریح میں بیاض میں لکھے ہوئے لفظ "سبکباری" کی وضاحت میں "سـ لکھا ہے ۔ بیاض میں غالب کا لکھا ہوا یوں ہے "سکباری" ۔
۱۵۱	-	-	-	اشارہ ۲ کی تصریح موجود نہیں ۔
۱۵۳	۱۰۳	۴	۱	بیاض میں "اوفتادگی" ہے اور یہی وزن میں ہے نہ کہ "افتادگی" جو لکھا گیا ہے ۔

صفحہ	غزل	شعر	مصرعہ	تفصیل
بیاض ۱۵۴	۱۰۴	مقطع	۱	پہلا لفظ قلم زد کر کے لکھا گیا ہے مگر برخلاف باقی تصریحات کے اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔
۱۶۳	۱۱۱	۴	۱	بیاض میں "شہر بافِ سنگ" ہے نہ کہ "شہرِ بافِ سنگ" جیسا کہ لکھا گیا ہے۔
۱۶۵	۱۱۲	مطلع	۲	"اوفتادہ" وزن میں ہے نہ کہ "افتادہ"
۱۷۵	۱۲۰	۵	۱	"سوزناکیہائے دل" نہ کہ "سوزِ ناکی ہائے دل" اضافت غلط ہے۔
۱۷۹	۱۲۸	مطلع	۱	بیاض میں "صاف ہے" لکھا ہے نہ کہ "صاف سے" کتابت غلط ہوئی ہے۔
۱۸۱	۱۳۰	مقطع	۲	"اوفتادہ" وزن میں ہے نہ کہ "افتادہ"
۱۸۵	۱۳۸	۴	۲	"آئین" کی کتابت "آیین" غلط ہوئی ہے۔
۱۸۹	۱۳۹	مقطع	۲	بیاض میں "ماندہ ازاں سو" لکھا ہے، نہ کہ "ہرزہ ازاں سو" کتابت غلط ہوئی ہے۔
۱۹۵	۱۴۴	مطلع	۲	"مجمر افسردہ بزماں" بیاض میں قلم زد ہے مگر صورتِ دیگر موجود نہیں۔ اس کی کتابت اسی طرح ہونی چاہیے تھی، ترمیم شدہ مصرعہ کا ماخذ تصریحات میں دینا ضروری تھا
۱۹۷	-	-	-	حاشیے میں دی گئی غزل پر یہ نوٹ نہیں دیا گیا کہ "کسی اور کاتب کے قلم سے"
۱۹۹	۱۵۰	مطلع	۱	بیاض میں "آتش عذاراں" ہے مگر غلطی سے "آتش عذاردں" لکھا گیا ہے
۲۰۳	۱۵۵	مطلع	۱	بیاض میں "بیخود زبسکہ" ہے نہ کہ "بیخود بسکہ" جیسا کہ لکھا گیا ہے
۲۰۵				تصریح ۲ میں "سجدہ پر رخ" کی جگہ "سجدہ چو رخ" لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔
۲۰۵	۱۵۹	۳	۲	"آئین" کی کتابت غلط ہوئی ہے "آیین"۔
۲۱۱	-	-	-	حاشیے پر دیے گئے اشارہ ۲ کی تصریح موجود نہیں۔
۲۱۳	۱۶۸	۵	۱	بیاض میں "غفلت افسردگی" ہے مگر غلطی سے "عظمت افسردگی" لکھا گیا ہے۔
۲۱۷	۱۷۲	۳	۱	بیاض میں لفظ "تنگ" نہیں بلکہ تنک پڑھا جاتا ہے۔ اگر تنک صحیح ہو تو مصرعہ کی صورت بدل جاتی ہے۔ اس صورت میں مصرعہ یوں ہو سکتا ہے۔ ع بیضہ آسا تنک بال و پر (پر) ہے کنج قفس
۲۲۱-۲۲	۱۸۹	-	-	پوری غزل قلم زد کر دی گئی ہے مگر باقی تصریحات کے برعکس اس کی تصریح موجود نہیں۔
۲۲۳	۱۸۹	۳	۲	بیاض میں "نگاہ آلودہ" ہے نہ کہ نگاہ آلود
۲۲۳	۱۹۰	۲	۱	بیاض میں ہے "دہن گردوں میں رو جاتا ہے" مگر غلطی سے "رہ جاتا ہے" لکھا گیا ہے۔

صفحہ	غزل	شعر	مصرعہ	تفصیل
۲۳۳	۱۹۱	مطلع	۱	بیاض میں ترکیب "آہ روبانیدن" ہے یا "آہ رویانیدن"
۲۳۵	۱۹۱	۳	۲	بیاض میں ترکیب "حسرت پیز" ہے مگر غلطی سے 'حسرت بیز' لکھا گیا ہے
۲۳۵	۱۹۱	۵	۲	بیاض میں "یک شکست" ہے نہ کہ "شکستہ"
۲۴۱	-	-	-	صفحہ کے پہلے شعر کے مصرعہ ثانی میں 'آئینہ' پہ ہمزۂ اضافت غلط ہے
۲۴۳	۱۹۹	-	-	اشارہ ۱ حاشیے میں دیئے گئے شعر کا مصرعِ ثانی "شہر خموشاں مجھ سے" نہیں بلکہ "شہر چراغاں مجھ سے"
۲۴۵	-	-	-	اشارہ ۲ موجود نہیں جو حاشیے کی غزل پر ہونا چاہیے جبکہ تصریح ۲ موجود ہے
۲۵۳	۲۱۲	۶	۱	'پردہ زنبور رنگ' کی جگہ کوئی لفظ قلم زد ہے
۲۵۳	۲۱۲	-	-	اشارہ ۱ غلط جگہ دیا گیا ہے یہ تصریح غزل ۲۱۳ شعر ۲ مصرع ۱ کی ہے جہاں پہلا اشارہ ۱ دیا گیا ہے وہاں تصریح یہ ہونی چاہیئے تھی کہ "خامہ" مکرر لکھنا سہواً رہ گیا ہے۔
صفحات ۲۵۷ تا ۲۶۵				صفحات کی ترتیب غلط ہوگئی ہے۔ اس میں یوں تبدیلی کی جائے: ۲۵۷ کی جگہ ۲۵۹، ۲۵۹ کی جگہ ۲۶۳، ۲۶۱ کی جگہ ۲۵۷، ۲۶۳ کی جگہ ۲۶۵ اور ۲۶۵ کی جگہ ۲۶۱
بیاض صفحات ۲۵۸ تا ۲۶۴				ترتیب میں یوں تبدیلی کی جائے۔ ۲۵۸، ۲۶۰ اور ۲۶۲، ۲۶۴ باہم تبدیل کردیئے جائیں
۲۵۷	۲۱۹	۶	-	تصریح ۳ میں لکھا ہے کہ یہ شعر حاشیے میں درج ہے مگر بیاض کے حاشیے میں موجود نہیں
۲۶۴ (بیاض)	۲۲۴	۳	۲	"نفس تیری گلی میں خزاں ہوں" لکھا ہے نہ کہ "خوں ہوں"
۲۶۹	۲۳۱	۲	۱	'رنگیں' کے دو نقطے کتابت سے رہ گئے ہیں
۲۷۱	۲۳۴	مطلع	۱	بیاض میں "بہ بزم" ہے مگر غلطی سے "یہ بزم" لکھا گیا ہے
۲۷۷	-	-	-	صفحہ کے پہلے مصرعہ میں "کاروبار" کی کتابت غلط ہوئی ہے
۲۸۳	۲۴۸	۴	۲	قافیہ بیاض میں "نظارت" ہے نہ کہ "نظامت"
۲۸۵	۲۵۰	-	-	اشارہ ۲ کی تصریح ہے کہ غزل قلم زد کر دی گئی ہے مگر مسودے میں قلم زد نظر نہیں آتی۔
۲۹۷	رباعی ۲۱	۲	۱	"یک بار" یا "یک تار" بیاض میں اول الذکر پڑھا جاتا ہے

(۲)[۱]

صفحہ	غزل	شعر	مصرع	تفصیل
۵۱	سطر ۳	۔	۔	ابو المعانی
۵۳	سطر ۳	۔	۔	غزل ۲ کے اشعار کی تعداد کا ہندسہ ۶ ہونا چاہیے ۔
۶۳	۱۲	۵	۲	'گرفتاروں' کی بجائے 'گراں باروں'۔
۸۱	۲۹	۶	۱	'تو ہی' کی بجائے 'تو بھی'۔
۹۱	۴۰	۵	۲	'اثردحام' کی بجائے 'ازدحام'۔
۹۵	۴۶	۱	۲	'کی مانند' کی بجائے 'کے مانند'۔
۹۷	۴۶	۳	۱	'سرِ انگشت' پر اضافت زائد ہے۔
۱۰۱	۵۰	۴	۲	'نبضِ دل بیمار ہویدا'۔
۱۰۱	۵۱	۱	۱	'میخانۂ ویراں' میں ہمزہ زائد ہے
۱۱۷	۶۶	۲	۲	'لبِ گور' کی بجائے 'لبِ گور'
۱۳۱	۸۰	۴	۱	'تیز ہوتا ہے' کی بجائے 'تیز تر ہوتا ہے'
۱۳۵	۸۶	۲	۱	'مرگِ خاموشی' میں اضافت زائد ہے
۱۵۷	۱۰۵	۲	۲	'کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں'۔
۱۸۱	۱۲۹	۱	۲	'راہِ نفس' میں اضافت زائد ہے۔
۲۱۹	۱۷۴	۱	۲	'ماں' کے بجائے 'یہاں'
۲۵۷	۲۱۸	۴	۱	'خاکستر و بلبل'۔
۲۸۱	۲۴۶	۴	۲	'مانندِ نے' میں اضافت زائد ہے

[۱] مندرجہ ذیل اغلاط کی تصحیح کے لئے ہم لطیف عارف صاحب کے شکر گزار ہیں ۔

الم،

ر نامہ

سبن

بھی کبھی کوئی مہم پسند اخباری رپورٹر آسمان میں تھگلی لگاتا ہے یا پاتال میں جاتا ہے اور ایسی خبر نکال کر لاتا ہے کہ اس کی اشاعت
نے سیاست میں زلزلہ آجاتا ہے اسے اخباری اصطلاح میں سکوپ کہتے ہیں۔ مگر ان دنوں ایک سکوپ دنیائے ادب میں ہوا
سمان میں تھگلی لگانے والے ہیں محمد طفیل۔
تفصیل اس ادبی سکوپ کی یہ ہے کہ جب مرزا غالب کی سو سالہ یادگار منانے کا وقت قریب آیا تو بھارت میں ایک شگوفہ پھوٹا۔
ں کہ دیوان غالب کا ایک ایسا نسخہ دریافت ہو گیا ہے کہ جسے آج تک نہ کسی محقق نے آنکھوں دیکھا نہ کانوں سنا یعنی غالب
بیاض ہے اپنے قلم سے اس نے اپنا کلام لکھ رکھا ہے۔ وقتاً فوقتاً جو اصلاحیں کیں وہ بھی اس میں درج ہیں۔
اس خبر سے ادبی حلقوں میں بھارت سے لے کر پاکستان تک کھلبلی پڑ گئی اس کا مطلب یہ تھا کہ غالب کے سلسلہ میں جتنے جتنے
ں تحقیقی موشگافیاں ہیں ان سب کی کلید موجود ہے آل انڈیا ریڈیو نے بڑے فخر سے اس خبر کو نشر کیا اور پاکستان میں غالب پرستوں اور
ب کے محققوں پر اوس پڑ گئی وہ جو غالب کی سو سالہ یادگار کے سلسلہ میں دو ملکوں کے درمیان ایک علمی دوڑ جاری تھی اس میں پہلے ہی
یہ پاکستان پیچھے رہ گیا اور بھارت آگے نکل گیا پاکستان گویا تحقیق کے کھلاڑی ہاتھ ملتے تھے اور کہتے تھے کہ پاکستان اولمپک میں ہاکی
جیتا یا نہ جیتا مگر غالب اولمپک میں یوں اپنے اوپر گول نہ کراتا۔
اس سے آگے راوی یوں بیان کرتا ہے کہ محمد نقوش صاحب نے قصہ گل بکاؤلی پڑھا اور شہزادہ تاج الملوک بننے کی ٹھانی۔
دھر نگہبان بھی غافل نہیں تھے۔ بھوپال کے ایک شخص نے اس بیاض کو سینے سے لگا رکھا تھا اور دم بھر کے لئے جدا نہیں کرتا تھا
نے سماجت کر کے امروہہ کے ایک بزرگ نے اس مخطوطہ کو حاصل کیا۔ بعد میں کرتب یہ دکھایا کہ اس بات سے ہی مکر گیا کہ اس
یہ نقل بھوپالی بزرگ سے حاصل کی ہے۔ خود کو اس کا دریافت کنندہ اور مالک ٹھہرایا اور چھپے سے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔
پہ بھوپالی بزرگ کو تاؤ آیا۔ انہوں نے مردانہ مردانہ پہ دعویٰ ٹھونک دیا۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا۔ اشاعت رک گئی اور مخطوطہ
ارت کے ریزرو بینک میں محفوظ ہو گیا۔ سو اب وہ سات تالوں میں بند ہو گیا۔ پرندہ اس بینک میں پر نہیں مار سکتا۔ ہمارے طفیل صاحب
وہاں تک رسائی کیسے ہو سکتی تھی۔ مگر طفیل صاحب ایک آفت کے پرکالہ ہیں، نقوش، کے اتنے موٹے موٹے نمبر ایسے ہی تو نہیں
ال دیتے۔ انہوں نے کسی نہ کسی طور سرنگ لگائی اور اس مخطوطہ تک جا پہنچے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس ہنگامہ بازی سے بہت پہلے
ہوپالی بزرگ سے بات کر لی تھی اور مخطوطہ کی فوٹو سٹیٹ کاپی حاصل کر لی تھی۔
اب پاکستان کے اندر کی سنو۔ مجلس ترقی ادب، پنجاب یونیورسٹی کا ادارہ یادگار غالب اور کراچی کی مجلس یادگار غالب سب ادارے

وضاحت: موجودہ صفحات میں بیاضِ غالب کے بارے میں جتنی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں یا جتنی خبریں چھپی ہیں، ان کی ذمہ داری ہم پر نہیں۔

(ادارہ)

غالب کی سو سالہ یادگار کے سلسلہ میں اپنے اپنے کام سے لگے ہوئے تھے اور غالب کے محقق بال کی کھال نکال رہے تھے طفیل صاحب نے بھی "نقوش" کے غالب نمبر کا اعلان کر دیا اور ہم نے سوچا کہ طفیل صاحب اس کے سوا کیا کریں گے کہ ہر قماش کے نقاد سے ایک مضمون غالب پر لکھوائیں گے اور غالب کے بہانے پھر ایک ضخیم نمبر شائع کر دیں گے مگر اس مرتبہ ہماری قسمت میں صدمۂ حیرت لکھا تھا۔ طفیل صاحب اندر ہی اندر کچھ چھاپے چلے جا رہے تھے اور کسی کو نہیں بتاتے تھے کہ کیا چھاپ رہے ہیں۔ پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے کتنی مرتبہ کتنی حسرت کے ساتھ کہا کہ کاش میرے پر لگ جاتے کہیں اڑ کر بھارت جاتا اور غالب کی بیاض دیکھ کر آتا مگر سنگدل محمد نقوش نے بزرگ محقق پر ذرا ترس نہ کھایا اور مطلق نہیں بتایا کہ غالب کی بیاض تو اڑ کر خود پاکستان آگئی ہے۔

جب کراچی کے ادارۂ یادگارِ غالب کی سب کتابیں چھپ چکیں اور مجلس ترقی ادب نے بھی نسخۂ شیرانی کو عکسی صورت میں شائع کر دیا اور مجلسِ یادگارِ غالب نے بھی اپنے پروگرام کے مطابق غالب کی ساری نگارشات کیا نظم کیا نثر، مختلف جلدوں میں چھاپ ڈالیں تب محمد نقوش نے چپکے سے نقوش کا تھیلا نکالا اور بتایا کہ اس میں غالب کی بیاض بند ہے۔

تو اب صورت یہ ہے کہ غالب کی بیاض بھارت میں تو مقدمہ بازی کی نذر ہوگئی۔ پاکستان میں وہ چھپ گئی ہے، مگر محمد نقوش بھی اپنے نام کے ایک اڈیٹر ہیں۔ وہ پروفیسر وزیر الحسن عابدی کو آسانی سے اس نسخہ کی زیارت نہیں کرنے دیں گے، اب تو انہوں نے پنڈی جا کر صرف ایک تقریب کی اور ایک تقریب تو نقوش کے خاص نمبروں کے سلسلہ میں بالعموم ہوتی ہے۔ مگر یہ تو غالب کی بیاض ہے، اور اس کی اشاعت کے بعد یہ واقعہ ظہور پذیر ہونے والا ہے کہ غالب کے دیوان اب تک جتنی صورتوں میں مرتب ہوئے ہیں ان سب پہ نظرِ ثانی کی ضرورت پیش آئے گی۔ مختلف شعروں کے بارے میں جو جھگڑا چلا آتا ہے کہ غالب نے کیا لفظ استعمال کیا تھا اور کون سے نسخہ میں لکھا ہوا شعر نقل مطابق اصل ہے۔ اس سلسلہ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ ایسے نسخہ کو صرف ایک تقریب پہ ٹرخا دیا جائے۔ محمد نقوش اتنے سادہ تو نہیں ہیں، وہ تو غالب کی بیاض کو سات گھر جھنگائیں گے اور پنڈی، لاہور، کراچی سب جگہ تقریبیں کر چکیں گے، اور پیٹ بھر کر داد حاصل کریں گے تب اسے مارکیٹ میں لائیں گے۔

ایک نشریہ

دیوانِ غالب کا نسخۂ لاہور

اعجاز حسین بٹالوی

گزشتہ سال غالب کی صد سالہ یادگار کے حوالے سے میرزا غالب کے متعلق تقریبات کا سال تھا۔ اِس دوران میں برِصغیر کے طول و عرض میں غالب شناسی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا جو غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر رسالوں نے غالب نمبر نکالے۔ نقادوں نے نئے نئے پہلوؤں سے غالب کی زندگی اور غالب کے کلام کا جائزہ لیا، یادگارِ غالب کے اداروں اور انجمنوں نے نئے سرے سے غالب کی تصنیفات کو از سرِ نو مرتب کیا اور ناشروں نے متعدد بار انہیں حُسنِ طباعت سے آراستہ کر کے قارئین تک پہنچایا۔ یہ سلسلہ سال بھر جاری رہنے کے بعد فروری میں ختم ہوا چاہتا ہے لیکن اِس سال کے خاتمے سے پہلے آج سے کوئی مہینہ بھر پہلے لاہور سے محمد طفیل کی ادارت میں نقوش کا دوسرا غالب نمبر شائع ہوا جو غالب کے سلسلے کی اشاعتوں میں ایک تاریخ ساز واقعے کی حیثیت رکھتا اور غالبیات کے سلسلے میں ایک نئے باب کا آغاز کرتا ہے۔

چند مہینے پیشتر اخباروں میں یہ خبر دیکھنے میں آئی تھی کہ ہندوستان میں پرانی دستاویزوں اور قلمی کتابوں کا کاروبار کرنے والے ایک بزرگ کو کسی کباڑی کے ہاں سے دیوانِ غالب کا ایک نادر نسخہ ہاتھ لگا ہے جس کی کتابت غالب نے خود اپنے قلم سے کر رکھی ہے۔ روایت کرنے والے کے مطابق جب خریدنے والے بزرگ پرانی کتابوں کی تلاش میں اِن کے ہاں پہنچے تو انہوں نے بعض اور کتابوں کے ساتھ ایک قلمی کتاب اِن کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا: "میاں کیا یاد کرو گے تمہیں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان دے رہا ہوں مگر اس کی قیمت پچیس روپے سے کم نہیں لوں گا۔" خریدنے والے نے مول تول شروع کیا، ردّ و کد کے بعد یہ نسخہ گیارہ روپے میں خرید لیا۔ آج یہی نسخہ غالب کے بارے میں اس صدی کی عظیم ترین دریافت سمجھا جانا چاہیئے۔ شروع شروع میں اس پر شک و شبہ کا اظہار ہوتا رہا۔ لیکن جب ہندوستان کے اعلیٰ درجے کے غالب شناسوں نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تو اس نسخے کو غالب صدی کی سب سے گراں قدر دریافت قرار دیا گیا خیال ہے کہ یہ "نسخہ امروہہ" کے نام سے یاد کیا جائے گا۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ "نسخہ امروہہ" ابھی ہندوستان میں نہیں چھپ سکا۔ وہاں اس کی اشاعت کے ایک سے زیادہ حقدار پیدا ہو گئے۔ باہمی لڑائی قانونی مقدمے بازی تک پہنچی اور عدالتی کاروائی میں اس کی اشاعت روک دی گئی۔ ادارہ نقوش کے محمد طفیل صاحب نے اپنے ذاتی ذرائع استعمال کئے اور کسی طور اِسی نسخے کی فوٹوسٹیٹ کاپی ہندوستان سے حاصل کر کے غالب کے اِس نو دریافت نسخے کو "بیاضِ غالب بخطِ غالب" کے عنوان سے لاہور سے شائع کر دیا۔ کسے معلوم کہ آگے چل کر غالب کا دیوان "نسخہ لاہور" ہی کے نام سے یاد کیا جائے کہ اس کی اولین اشاعت کا سہرا اور اسے عوام تک پہنچانے کی سعادت اِسی شہر

کو نصیب ہوئی ہے۔ اسے ادارہ فروغِ اُردو لاہور نے شائع کیا ہے اور قیمت اُس کی تیس روپے رکھی ہے۔ بیاضِ غالب کو بڑے اہتمام اور سلیقے سے شائع کیا گیا ہے۔ دائیں طرف نسخے کا فوٹو عکس اور اُس کے بالمقابل بائیں صفحہ پر وہی اشعار خوبصورت کتابت میں شائع کیے گئے ہیں۔

شروع میں بیاضِ غالب کے بارے میں نثار احمد فاروقی کا ایک جامع مقدمہ درج ہے جس میں اِس تاریخی دریافت کی تفصیلات بھی درج ہیں اور جس سے اِس نسخے کے بارے میں ضروری معلومات بھی میسر آتی ہیں۔ دیوانِ غالب کا یہ نادر مخطوطہ ۶۳ اوراق پہ مشتمل ہے اور اُس کے اختتام پر واضح الفاظ میں رقم کیا گیا ہے کہ مرزا غالب اِس دیوان کی کتابت سے ۱۴ رجب کو منگل کے دن شام کے وقت فارغ ہوئے۔ لیکن اسے مرزا کی ابہام پسندی کہیے یا قدرت کی ستم ظریفی کہ غالب نے ۱۴ رجب کے آگے سنہ ہجری کے اعداد نہیں لکھے۔

یہ بات افسوس کی بھی ہے اور خوشی کی بھی۔ افسوس اِس بات کا کہ جو بات میرزا کے قلم سے طے پا سکتی تھی وہ قدرت نے غیر یقینی عالم میں چھوڑ دی۔ خوشی اِس امر کی کہ اس سے محققوں اور نقادوں کے لئے قیاس کے گھوڑے دوڑانے اور دُور کی کوڑی لانے کے نئے مواقع پیدا ہو گئے۔ اب برسوں اس پر سن اختلاف قائم رہے گا۔ ہر چند کہ لاہور کے ایک بزرگ غالب شناس نے تقویم کے حساب سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غالب کی زندگی میں صرف دو مرتبہ رجب کی چودہ تاریخ منگل کے روز آتی ہے پہلے واقعے پر غالب کی عمر اتنی کم بنتی ہے کہ وہ صاحبِ دیوان نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا یہ مرقومہ دوسری تاریخ کا ہے۔ نثار احمد فاروقی نے اپنی تحقیق سے اِس نسخے کو غالب کے تمام نسخوں پہ فوقیت دی ہے اور نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی دونوں سے پہلے کا رقم شدہ قرار دیا ہے۔ اس "نو دریافت بیاضِ غالب" کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے مطبوعہ نسخے میں متن کی جو غلطیاں ہیں۔ اِن کی اصلاح اِس نسخے کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کا قلمی نسخہ گم ہو چکا ہے اور موجودہ نسخہ امروہہ دستیاب نہ ہوتا تو اِن غلطیوں کی اِصلاح کبھی یقین کے ساتھ نہ کی جا سکتی تھی۔ غالب نے اپنے اشعار پر خود کس طرح اِصلاح کی اور کیسے بعض ترکیبوں اور ٹکڑوں کو قلم زد کر کے ان کی جگہ نئی تراکیب استعمال کیں یہ بذاتِ خود ایک کائنات ہے جو اِس نسخے میں جا بجا جلوہ دکھاتی ہے۔ غالب جب اپنے اشعار میں خود ہی "جرمِ نظارہ" "تہمتِ نگاہ" سے تبدیل کرتے ہیں اور "مجلس آرائی" کو قلم زد کر کے اس کی جگہ "مجلس افروزی" کر دیتے ہیں تو اِن تبدیلیوں سے غالب کے ذوقِ خاص کی خبر بھی ملتی ہے اور اِس بات کی شہادت بھی میسر آتی ہے کہ وہ کیسے اپنے اشعار پہ مسلسل نظرِ ثانی کرتے رہتے تھے۔ غزلوں میں بہت سے مصرعے ایسے ہیں جن کو مصرعۂ اوّل یا مصرعۂ ثانی نصیب نہیں ہوا اور وہ اِس انتظار میں رہے کہ "قران السعدین" کی کوئی گھڑی آئے گی جب اِن مصرعوں کا نصف بہتر ان سے آملے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور یہ مصرعے اسی صورت میں غزلوں میں اپنی جگہ موجود ہیں۔ بیاض کے آخر میں ایک ضمیمہ تصریحات کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے جس سے اِن تمام تبدیلیوں کے علاوہ بہت سی اور ضروری معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ نقوش کے اس نمبر "بیاضِ غالب" میں غالب کے بارے میں چند اہم مضامین اور غالب کے چند خطوط اور دیگر گراں مایہ دستاویزوں کے عکس بھی چھاپے گئے ہیں لیکن ایک چیز جس کی شمولیت کا جواز محلِ نظر معلوم ہوتا ہے وہ پاکستان کے ممتاز مصور صادقین کی تصاویر ہیں جو

نہوں نے شعرِ غالب سے متاثر ہوکر بنائی ہیں۔ صادقین پاکستان کے نوجوان مصوروں میں صفِ اول کے مصور ہیں اور یورپ ں میں شہرت پا چکے ہیں۔ پچھلے سال اُنھوں نے غالب کے کلام سے متاثر ہوکر کچھ تصویریں بنائی تھیں جو ایک مشہور بینک کی ڈائری میں بہت خوبی اور نفاست کے ساتھ چھاپی گئیں۔ اس نسخے میں ان کی کچھ دیگر تصاویر چھاپی گئی ہیں جو اس کی "تاریخی اہمیت کے اعتبار سے اور اس بیاض کے مزاج سے کسی طور لگا نہیں کھاتیں اور غالب کے اشعار کے ساتھ جب ان تصویروں پر نظر پڑتی ہے تو وہ شعر کے حُسن کو دوبالا نہیں کرتیں۔ وجہ اس کی شاید یہ ہو کہ غالب از اوّل "تا آخر شعر کے عجمی اور مشرقی حسن کی عظیم ترین روایت سے وابستہ ہیں۔ صادقین اپنی خط کشیدگی، تصویر سازی اور شبیہ گری میں یورپی مصوری سے بے حد متاثر ہیں اس بیاض میں ان کی اکثر تصویروں کی (CHIRST FIGURE) یا مسیح مصلوب کی (FIGURE) س کا کرب اور المیہ یورپ کے گرجوں اور کلیساؤں کی مصوری کی یاد دلاتا ہے۔ کسی (FIGURE) کو دیکھ کر سسٹین چیپل کی مصور چھت کا خیال آجاتا ہے۔ شاید ان روایتوں کا یہ اختلاف ہے جو ان تصویروں کو غالب کے اس دیوان کا نظری جزو بننے میں حائل ہوا ہے۔ بہرحال بیاضِ غالب بخطِ غالب کی اشاعت لاہور۔ ایک تاریخ ساز واقعہ ہے اور اس کا چھپنا غالبیات میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ریڈیو پاکستان لاہور

مورخہ ۱۳ / جنوری ۷۰ء

اخباری کالم

لاہور نامہ

مشرق ، ۹ دسمبر ۱۹۶۹ء

غالب کی بیاض رمضان المبارک کے عین بیچ شائع ہوئی ہے۔ اس واقعہ نے پروفیسر وزیر الحسن عابدی کو سخت مشکل میں ڈال دیا ہے کہ وہ اہلِ تقویٰ میں سے بھی ہیں اور غالب کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ بیاض کو وہ دن میں نہیں پڑھ سکتے، اس لیے کہ وہ روزے سے ہوتے ہیں افطار اور سحری کے درمیان جتنا پڑھ سکتے ہیں، پڑھ لیتے ہیں۔ مگر جمعۃ الوداع کو ان کی مشکل دوچند ہوگئی۔ اس دن پاکستان کونسل میں بیاضِ غالب کی تقریب سے ایک تقریب کا اہتمام تھا اور اس میں انہیں مضمون پڑھنا تھا مضمون کے آغاز کے ساتھ ہی انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ چونکہ میں روزے سے ہوں اس لیے شعر نہیں پڑھوں گا۔ شعروں کا ذکر انھوں نے البتہ کیا۔ ایک غزل کا حوالہ جب ناگزیر ہوگیا تو انہوں نے ایک نوجوان کی خدمات طلب کیں اور اس سے غزل پڑھوائی مگر اس نوجوان نے غزل کچھ اس طرح پڑھنا شروع کی کہ غزل، غزل نہ رہی بیتاب ہو کر جوشِ اصلاح میں عابدی صاحب نے غالب کا مصرعہ پڑھا۔ اب پتہ نہیں کہ ان کا روزہ رہا یا مکروہ ہوگیا۔

اس تقریب کی صدارت جسٹس انوار الحق کر رہے تھے۔ جنہیں پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے آج کا مفتی انوار الحق قرار دیا۔ مفتی انوار الحق وہ بزرگ تھے جن کے زیرِ اہتمام غالب کا نسخۂ حمیدیہ شائع ہوا تھا۔ پھر وہ محمد طفیل پر آئے اور پیشنگوئی کی کہ طفیل صاحب کا نام رہتی دنیا تک رہے گا۔ عابدی صاحب نے غالب کی غزل کے ساتھ غالب کے قصائد کا بھی بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور مدح کے آداب پر کما حقہٗ عبور رکھتے ہیں۔

بیاضِ غالب کا بھارت سے پاکستان اُڑ کر آجانا بھی مہم جُوئی کی ایک مثال بنتا جا رہا ہے۔ محققوں کے حلقوں سے باہر بھی ہم نے یاروں کو اس پر متحیر اور مسرور پایا۔ حیات احمد خاں بہت خوش نظر آتے تھے اور کہتے تھے کہ موہنجوڈرو کی رقاصہ کے چلے جانے کا بدل مل گیا۔

موہنجوڈرو کی رقاصہ کے بارے میں کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ اس کی اب نقل ہی نقل پاکستان میں ہے۔ اصل بھارت جا چکی ہے۔ پاکستان کے شروع ہی کے دنوں میں کسی نمائش کے لیے اس ملک نے پاکستان سے یہ مجسمہ عاریتاً مانگا تھا اور دینے والوں نے اس مجسمہ کو اس بے تکلفی سے دے دیا جیسے وہ پتھر کا روڑا ہو کہ لاہور کے عجائب گھر میں پڑا رہا تو کیا اور دلی چلا گیا تو کیا۔

بیاضِ غالب کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا مخطوطہ تو ریزرو بینک آف انڈیا میں محفوظ ہے۔ محمد طفیل کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کی فوٹوسٹیٹ کاپی حاصل کی اور اسے شائع کر کے اس ضمن میں اوّلیت کا شرف حاصل کر لیا۔

بیاضِ غالب کے بارے میں نثار احمد فاروقی سے روایت یہ ہے کہ بھوپال کے جس کباڑی کے پاس یہ مخطوطہ تھا اس نے امروہی بزرگ کو نوٹس دے دیا تھا کہ میں تم سے اس مخطوطہ کی قیمت پچیس روپے سے کم نہیں لوں گا۔ اس کائیاں نے خاموشی سے پچیس روپے ادا

مخطوطہ پر قبضہ کر لیا اور دوسرے ہی دن اشتہار دے دیا کہ غالب کی بیاض صرف سات ہزار روپے میں۔ اشتہار دیکھ کر تو کسی م کو یقین ہی نہ آیا کہ غالب کی لکھی ہوئی کوئی ایسی تحریر موجود ہے۔ مگر رفتہ رفتہ جب یہ بات ثابت ہوئی تو مخطوطہ کی قیمت بڑھتی چلی گئی اور ے لیے چھینا جھپٹی شروع ہوئی۔ نوبت مقدمہ بازی تک پہنچی۔ یوں اس کی اشاعت وہاں کھٹائی میں پڑ گئی مگر ادھر طفیل صاحب نوش کے تھیلے میں بلی بند کر رکھی تھی۔ وقت موقع دیکھ کر انہوں نے تھیلے سے بلی نکالی اور محققوں کو حیران کیا۔

مگر تحقیق کے دروازے کبھی بند نہیں ہوا کرتے بلکہ تحقیق تو وہ شے ہے جو خود بخود ضرب کھاتی چلی جاتی ہے۔ جب ایک تحقیق ہاتی ہے تو اس ایک تحقیق سے تحقیق کے سو نئے دروازے کھلتے ہیں۔ ایک تحقیقی مسئلہ تو اس نسخہ کے سامنے آتے ہی پیدا ہو گیا وہ یہ الب نے اسے کس سن میں تمام کیا تھا۔ غالب کی ستم ظریفی دیکھو کہ اس نے بیاض پر یوں تاریخ رقم کر رکھی ہے۔ دن لکھا۔ تاریخ لکھی ، لکھا مگر سن نہیں لکھا۔ یہ کام اس نے محققوں کے لیے چھوڑ دیا۔ اس بارے میں نثار احمد فاروقی نے اچھی خاصی دادِ تحقیق دی تھی ۔ اور وحید قریشی نے پاکستان کونسل کی محفل میں آ کر اس تحقیق کی توثیق بھی کر دی۔ مگر مولانا غلام رسول مہر نے نثار احمد فاروقی کے تعین کیے ہوئے کو چیلنج کیا اور نئے سرے سے سن کے تعین کا بندوبست کیا۔

ایک تحقیق پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے بھی کی۔ پس منظر اس تحقیق کا یہ ہے کہ غالب نے ایک وقت میں ایک ایسے اسلوب شاعری کر رکھی ہے جو شاعری کے قارئین کے لیے ایک گورکھ دھندا ہے۔ مثلاً ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

اب غالب کے مداحوں کے سوچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جو اچھا کیا وہ غالب نے کیا، جو برا کیا وہ کسی اور نے کیا۔ متذکرہ بالا ب کو غالب کے عیوب میں شمار کیا جاتا ہے۔ پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے بیاضِ غالب کی اشاعت کے وقت کو مناسب پا کر یہ ب غالب کے فرضی یا حقیقی استاد میر عبدالصمد کے کھاتے میں ڈال دیا۔ فرمایا کہ غالب نے تو محاورے اور روزمرہ کی فضا میں ہوش الا تھا، وہ ایسی عجیب الخلقت زبان کیسے لکھ سکتا تھا۔ اصل میں میر عبدالصمد نے اسے لاسے پر لگایا اور کہا کہ اگر تم ایسی زبان میں و جس میں ’ہے‘ اور ’تھا‘ کے سوا اردو کا کوئی لفظ ہی نہ ہو تو تمہارا نام ایران تک پہنچ جائے گا۔

اور ہم سوچ رہے تھے کہ غالب آخر فارسی بھی تو جانتا تھا اور شعر بھی فارسی میں کہہ سکتا تھا اور کہتا تھا ایران میں اگر شہرت کا مسئلہ یں تھا تو ’ہے‘، اور ’تھا‘ کا تسمہ بھی کیوں باقی رکھا۔ سیدھی فارسی میں شعر کہتا مگر بہرحال تحقیق کی اپنی منطق ہوتی ہے۔

ہاں بیاضِ غالب کے بارے میں ایک بات اور سن لیجئے۔ اس کی اشاعت میں ایک اہتمام یہ بھی کیا گیا ہے کہ صادقین نے کی شاعری کو جو تصویروں میں بیان کیا ہے وہ بیان بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔

شہر سرائے

امروز ، ۷ دسمبر ۶۹ء

غالب کا ذکر آتے ہی نطق زبان کے بوسے لینے پہ مجبور ہے۔ کیونکہ اردو کے نطق شعر کو زبان غالب نے دی۔ اس سے

بڑھ کر بھی جو کیسے روا ہے بلکہ کم ہے جتنا کیسے۔ غالب کو اپنی زندگی میں اوراپنوں کے نہ ہونے کا بڑا قلق تھا۔ اب ہوتے تو دیکھتے کہ ان کے حلقہ بگوش ان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ جس گلشن کی عندلیب تھے وہ ابھی ناآفریدہ تھا۔ اور ایسوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے، ان کا وقت تو گیا اور رات سوتے جس طرح ان کی کٹی سو کٹی۔ مگر وہ جانتے تھے کہ جب تک اردو زندہ ہے غالب زندہ ہے، اپنے بارے میں انہیں کبھی شک بھی نہیں گزرا۔ وہ ہمیشہ طلب گار وسعتِ بیان رہے ان کے بعد ان کے بیان کی وسعت کھلتی چلی جارہی ہے۔ جس توجہ اور طلب سے ان کا مطالعہ جاری ہے۔ اُردو کے کسی شاعر کی قسمت میں ابھی تک نہیں آیا اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کے سمجھنے کی ابتدا ہوئی ہے۔ ان کے مطالب کے بہت سے زاویے سامنے آچکے ہیں اور بہت سے ابھی باقی ہیں کیونکہ غالب کا کلام جدید سے جدید تر ہے اور زندگی کا ساتھ دیتا ہے۔

مدیر نقوش محمد طفیل صاحب ڈوب کر موتی لائے ہیں۔ جو غالب کے شعر و زندگی پر مزید روشنی ڈالے گا۔ اب تک دیوان غالب کا متن نسخہ حمیدیہ اور نسخہ شیرانی سے مرتب تھا۔ اب طفیل صاحب کا شائع کردہ نسخہ امروہیہ جس میں متعدد غزلیات اور قطعات ایسے ہیں، جو پہلے کسی نسخے میں شامل نہیں تھے۔ سامنے آیا ہے۔ اس سے مطالعۂ غالب میں ایک نئی سمت پیدا ہوگئی ہے۔ نسخۂ امروہہ کا قصہ اخبارات میں چھپ چکا ہے۔ ایک صاحب؛ اسے پچیس روپے میں بیچتے تھے۔ خریدنے والا گیارہ روپے اس کی قیمت لگاتا تھا۔ انہوں نے یہ نسخہ حاصل کر لیا اور دہلی جاکر اس کی قیمت پچیس ہزار روپے لگائی۔ اس پر دونوں میں جھگڑا ہوا اور نسخہ ریزرو بینک آف انڈیا میں جمع ہوگیا۔ طفیل صاحب کو غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں کسی طرح اس کی خبر ہوگئی اور انہوں نے اس کی پلیٹیں حاصل کرلیں۔ پھر اندر ہی اندر اسے ترتیب دیتے اور چھاپتے رہے اور اب دھماکہ کیا۔ اس نسخے کی اشاعت لاہور کی ادبی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ اور لاہور کے علمی و ادبی حلقے اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ الفلاح میں اس کے تعارفی جلسے میں عشاق نے ہجوم کیا۔ حالانکہ حاضری بذریعہ دعوت نامہ تھی۔ جسٹس انوارالحق صاحب نے صدارت فرمائی۔ جناب مولانا غلام رسول مہر جو تحقیق کے میدان میں مرد اور غالب شناسی میں فرد ہیں۔ جناب پروفیسر وزیرالحسن عابدی جن کے پاس غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا فارسی دیوان ہے اور ڈاکٹر عبدالوحید قریشی نسخہ امروہہ کا تعارف کرانے کے لیے تشریف لائے اور ہال کھچا کھچ بھر گیا۔

ڈاکٹر عبدالوحید صاحب نے نسخہ امروہہ کی روشنی میں بتایا کہ یہ غالب کا مرتب کردہ اوّلین دیوان ہے۔ نسخہ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی اس کے بعد وجود میں آئے اور اس کا سن ترتیب ۱۲۲۱ ہجری سے ۱۲۲۵ ہجری کے درمیان ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب انیس کے سن میں صاحب دیوان تھے۔ بعد کے نسخوں میں غالب نے بعض اشعار میں اصلاح کی ہے۔ اس دیوان کے مطالعے سے غالب کے بعض اشعار کی ابتدائی شکلوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے حاشیوں پر جو عبارات ہیں وہ ۱۲۲۵ ہجری سے ۱۲۳۷ ہجری کے دوران لکھی گئیں۔ بعض داخلی شہادتوں کی مدد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نسخہ حمیدیہ کی ترتیب اس کے ساتھ چلتی رہی جو ۱۲۴۴ کے لگ بھگ تکمیل کو پہنچا۔ مگر مولانا غلام رسول مہر نے ان کی تحقیق کے نتائج سے اختلاف کیا۔ ان کا فرمان ہے کہ نسخہ امروہہ ۱۲۳۶ ہجری میں ضبط تحریر میں آیا۔ اہلِ تحقیق اب اس پر مزید غور کریں گے۔ کیونکہ نسخہ حمیدیہ اور اس کی داخلی شہادتیں چھپ کر منظر عام پر عام آچکی ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر اب گوشۂ تحقیق میں ایسے جا بیٹھے ہیں کہ ان کی زیارت کو آنکھیں ترس جاتی ہیں۔ ایسے بزرگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کا دم غنیمت ہے اور مقام شکر ہے کہ کبھی کبھار کسی اہم علمی تقریب میں آجاتے ہیں۔ غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں جس جوش و خروش اور خوش ذوقی کا مظاہرہ جس پیمانے پر کیا گیا ہے' اس پر انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا یہ تقریبات دنیا کے بہت سے ملکوں میں منائی گئی ہیں۔ روسیوں نے ایک نیا پھول تخلیق کر کے اس کا نام میرزا غالب رکھا ہے یہ اس امر کی شہادت ہے کہ غالب کو عالمی سطح میں شہرت عام حاصل ہے۔ انہوں نے چھپے ہوئے نسخے کی بعض اغلاط کی طرف اشارہ کیا جو خطِ غالب میں پڑھنے میں سرزد ہوئیں مگر محمد طفیل صاحب نے بعد میں کہہ دیا کہ ان کی ذمہ داری نسخے کے مرتب نثار احمد فاروقی پر نہیں بلکہ ان پر ہے کیونکہ بیاض انہوں نے خود پڑھی تھی۔

پروفیسر وزیر الحسن عابدی صاحب نے جلسے میں ذرا سی گرمی پیدا کی اور مطالعۂ غالب کے سلسلے میں بعض ذاتی نظریے پیش کیے فرمایا کہ نسخۂ حمیدیہ ان کے نزدیک عجیب الخلقت چیز تھی۔ کیونکہ جس غالب نے ایسی صاف اردو لکھی وہ ابتدا میں کیسا اردو نا آشنا تھا۔ غالب کے بارے میں اردو نا آشنا اور نسخۂ حمیدیہ کے باب میں عجیب الخلقت سن کر لوگ سنبھلے کہ دیکھئے ابھی اور کیا کیا سننا ہماری قسمت میں لکھا ہے مگر عابدی صاحب نے اس کی وضاحت بھی کر دی۔ کہا ابتدا میں ان کا جو مفرس کلام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکبرآباد میں ایک ایرانی ملا عبدالصمد غالب کے ہاں مہمان تھے اور وہ اردو اتنی جانتے تھے کہ مست کو ہے اور بود کو تھا کہتے ہیں۔ دیباچے میں غالب نے لکھا کہ میں فارسی کو اصفہان سے دہلی لایا اور اردو کو اصفہان بھیجا۔ اس شہادت پر عابدی صاحب نے حکم لگایا اور فیصلہ دیا کہ ملا عبدالصمد نے غالب سے کہا ہو گا کہ میں تمہارا کلام اصفہان لے جاؤں گا اور وہاں تمہارا طوطی بولے گا۔ چنانچہ چچا غالب اس لالچ میں آ گئے اور مفرس غزلیں لکھنی شروع کر دیں۔ اس مفروضے کے ساتھ انہوں نے جوڑا کہ اس زمانے میں ہندوستانی روسا یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ایران سے فوجیں آئیں گی تو ہمیں انگریزوں سے بچائیں گی۔ ان کے پیش نظر ہمایوں کی ایران سے آتی ہوئی مدد تھی۔ مگر وہ یہ بھول گئے کہ ہمایوں کے بعد ایران اور ہندوستان کی مغل حکومت میں ہمیشہ رقابت رہی۔ شاہجہان سے ایران کی مخاصمت تاریخ میں محفوظ ہے اور اورنگ زیب کے زمانے میں تو ایرانی فوجیں حملے کے لیے چل بھی پڑی تھیں۔ ایرانیوں کی طرف سے ہندوستان کی طرف نادر شاہ اور پھر احمد شاہ کے غول بیابانی آئے۔ مرہٹوں نے دہلی کو تاراج کیا۔ پھر انگریزوں نے پیر پھیلائے۔ ایرانیوں نے دہلی کو خوانِ یغما سمجھا ہو تو سمجھا ہو۔ ان کی امداد کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر غالب کیسی امید لگا کے بیٹھے تھے' اور وہ بھی ملا عبدالصمد کے ذریعے جن کی ایران میں کوئی بڑی حیثیت نہ تھی۔ سیدھی بات ہے کہ غالب کے زمانے میں فارسی علمی اور سرکاری زبان تھی' اور لکھنے والے اسی میں لکھتے پڑھتے تھے۔ پھر غالب پر بیدل کا اثر تھا۔ اردو کی کوئی بڑی حیثیت ابھی نہ تھی۔ ایک میر تھے سو دل کے کوچہ بند۔ دوسرے نظیر اکبرآبادی جو ہنسی مذاق میں شعر کہتے تھے اور جاگیر دار تھے۔ اردو کو جو مقدرت ملی وہ اسے خود غالب سے ملی مگر پروفیسر عابدی بزرگ ہیں اور بزرگوں کو حق ہے کہ وہ جو چاہیں کہیں بعد میں انہوں نے کہہ بھی دیا کہ بات میں مین میکھ نہ نکالی جائے تو پھر مقالہ کیا ہو۔ اس لیے ہم نے مین میکھ نکالی ہے۔ اب پروفیسر صاحب ہماری گزارشات کو بھی مین میکھ کے خانے میں ڈال دیں تو ہم کیا عرض کر سکتے ہیں۔

سرگرمیاں

اخبارِ خواتین ۔ ۲۷ دسمبر ۶۹ء

بستر میں پڑے پڑے ہم "ارادے باندھتے تھے توڑ دیتے تھے" کیونکہ سردی "سخت" فرمائشی قسم کی پڑ رہی تھی اور "جان" بہرحال عزیز تھی۔ گرم گرم بستر کو چھوڑ کر انٹر کانٹی نینٹل تک جانا ایک قیامت نظر آ رہا تھا۔ لیکن "بزمِ علم و فن" کا دعوت نامہ تقریبِ افتتاح "نقوش غالب نمبر" اتنا جاذبِ نظر اور دلکش تھا کہ بالآخر جاتے ہی بنی۔ "غالب نمبر" کی زیارت کا لالچ مستزاد تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ احساس کہ طفیل صاحب تو ہم پنڈی والوں کے لیے یہ نادر و نایاب تحفہ لے کر لاہور سے آئے ہیں اور ادھر ہم ہیں، بستر میں گھسے بیٹھے ہیں کہ صاحب ٹھیک ہے، غالب اچھا شاعر تھا۔ اچھے شعر کہتا تھا۔ طفیل صاحب بھی بہت اچھے ہیں کہ غالب کے غیر مطبوعہ کلام کا نسخہ کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر لائے ہیں اور اب چھاپ کر "یارانِ نکتہ داں" کو "صلائے عام" دے رہے ہیں کہ آؤ اور آ کر دیکھو کہ اس طرح کہتے ہیں سخنور سہرا۔ لیکن یہ سردی ایسی بدذوق ہے کسی غالب والب کو نہیں جانتی۔ اس نے تو ہمارا ذوقِ سلیم تک منجمد کر کے رکھ دیا ہے۔ شہر میں اہلِ نظر صاحبِ ذوق اور بھی بہت سے ہیں، جا کر "غالب نمبر" کی زیارت کر آئیں گے۔ انہی کی زبانی کچھ حال احوال ہم بھی سن لیں گے۔ رہا بچشمِ خود دیکھنے کا سوال۔ تو گرمیاں ایسی کونسی دُور ہیں۔ گرمیوں میں دیکھا جائے گا۔

یہی سوچتے انٹر کانٹی نینٹل جا پہنچے۔ جہاں غالب کے طرفدار نقوش کے "غالب نمبر" کی رسمِ افتتاح میں شرکت کے لیے یکجا تھے اور "نیم گرم" ماحول میں بیٹھے تقریریں سن رہے تھے، اور روزہ بہلا رہے تھے۔ سٹیج پر نواب زادہ شیر علی وزیر اطلاعات و نشریات تشریف فرما تھے۔ گویا میرِ محفل تھے، اور سب سے آخری صف میں تن تنہا جمیل الدین عالی صاحب بیٹھے تھے اور کچھ اس انداز سے بیٹھے تھے جیسے ابھی کوئی "ون، ٹو، تھری" کہے گا اور وہ دوڑ لگا دیں گے۔

اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ایک بار پھر سٹیج پر نظر ڈالی۔ وقار عظیم صاحب تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ غالب شناسی کا یہ دَور دورہ صرف برِصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں۔ بلکہ دوسرے ممالک میں بھی غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ روس میں تو ایک پھول کا نام "غالب" رکھا گیا ہے۔ نقوش کے بیاضِ غالب نمبر کے بارے میں وقار عظیم صاحب نے کہا: "طفیل صاحب کی کوششوں سے نسخہ امروہہ نسخۂ غالب بن گیا۔ غالب کی اس غیر مطبوعہ بیاض کا نسخہ ہندوستان میں دستیاب ہوا اور پاکستان میں چھپ گیا۔ طفیل صاحب نے بتایا ہے کہ ایک ہزار اشعار کا مصالحہ ابھی تک سے غالب نمبر کے لیے باقی ہے۔

وقار عظیم صاحب کے بعد پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے تقریر کی اور ان کے بعد محمد طفیل جنہیں بابائے اُردو محمد نقوش کہا کرتے تھے۔ مائیک کے سامنے آئے اور کہا کہ "پہلے غالب نمبر میں کہیں بے ساختہ میرے قلم سے نکل گیا کہ دوسرے غالب نمبر میں غالب کی غیر مطبوعہ چیزیں پیش کروں گا۔ لوگ کہنے لگے میاں ہوش میں آؤ۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ غالب کی تو ایک ایک سطر چھپ چکی ہے۔ میری بات کو سچ ثابت کرنے کا انتظام قدرت نے کر دیا اور غالب کی غیر مطبوعہ بیاض ہندوستان میں مل گئی۔ میں بھی ٹوہ میں

لگ گیا اور آج بحمد اللہ میں فخر کے ساتھ غالب کے غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل بیاضِ غالب نمبر پیش کرتا ہوں۔ اس میں غالب کے قلمی نسخہ کے بلاک بھی شامل ہیں۔"

انہوں نے "نقوش" کے بیاضِ غالب نمبر کی ایک جلد صاحب صدر نواب زادہ شیر علی صاحب کی خدمت میں پیش کی اور حاضرین کو یہ نوید مسرت سنائی کہ شائقین غالب نمبر کی زیارت باہر دوسرے ہال میں کر سکتے ہیں۔ نواب زادہ شیر علی نے اپنی تقریر میں غالب سے اپنی قرابت داری کا سلسلہ یوں ملایا کہ " نواب احمد بخش بہادر میرے نانا کے پردادا تھے۔ گویا غالب سے قرابت داری نسبت ہے دور کی۔ میرے نانا کو غالب نے ——— خط میں لکھا تھا کہ میں تمہارا دادا نہیں دلدادہ ہوں" بہر حال میں اس قرابت داری کے سلسلے کو زیادہ نہیں بڑھاؤں گا، کیونکہ غالب کے ایک اور قرابت دار جمیل الدین بھی یہاں بیٹھے ہیں۔ غالب سے نسبت کو میں اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہوں، کیونکہ میں بھی آپ سبھی کی طرح غالب کا دلدادہ ہوں"

ان کی تقریر کے ساتھ تقریب کا خاتمہ ہوا۔

شہر خیال

نوائے وقت ۸ دسمبر ۱۹۶۹ء

شاعروں میں پیش بینی کی صلاحیت بہت زیادہ پائی جاتی ہے، قرۃ العین طاہرہ نے اپنی ایک مشہور غزل میں کہا تھا ؎

گفتنی بود مگر اے صنم کہ ز مرِ عشق تو مبدم
اسجرتنی وقلتنی و اخذتنی بجنا حتے

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس شعر لکھنے کے سالوں بعد جب ناصر الدین قاچار کی حکومت نے اسے گرفتار کیا تو اس کی موت بالکل اس کی پیش گوئی کے مطابق ہوئی، اس کی زلفوں کو خچر کی دُم سے باندھ کر خچر کو میلوں دوڑایا گیا اور جب وہ دم توڑ گئی تو اس کی لاش کو بستان ایلخانی کے اندھے کنوے میں پھینکوا کر اوپر سے پتھراؤ کیا گیا۔

اسی طرح مرزا غالب کے دور میں ذوق کا طوطی بولتا تھا اور بیچارے میرزا کے کلام میں لوگ آئے دن اسقام تلاش کرتے رہتے تھے اور ان کی شاعری کو بے معنی قرار دیتے تھے۔ اس دور میں بھی میرزا کو اپنے کلام کی بلندی اور اپنے علوِ تخیل پر پورا اعتماد تھا اس لیے کبھی وہ کہتے ؎

غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

کبھی فرماتے ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل

اور کبھی صاف اعلان کر دیتے۔

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

مولانا محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" تک غالب کے ان اعلانات کو شاعرانہ تعلّی سے بڑھ کر کوئی حیثیت نہ دی جاتی لیکن بعد کے زمانے میں غالب فہموں، غالب پرستوں اور غالبیات کے ماہرین میں اتنا غیر متوقع اضافہ ہوا اور غالب کے کلام پر اتنی تعریفیں لکھی گئیں کہ وہ اردو کی تاریخِ غزل کی نمایاں ترین شخصیت قرار پا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں ان کے کلام کی بو باس پھیل گئی، پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف کلامِ غالب کے نسخۂ حمیدیہ گم ہو جانے سے غالب پرست دل گرفتہ ہو گئے تھے تو اچانک دوسری طرف نسخۂ امروہہ کی دریافت نے غالب کے طرفداروں کو شاداں کر دیا ہے۔

نسخۂ امروہہ کو بخطِ غالب شائع کرنے کا سہرا نقوش والے محمد طفیل کے سر ہے۔ انہوں نے اس نسخے کی اشاعت پر کافی محنت کی اور اس کی تعارفی تقریب قومی یک جہتی کی کونسل کے ساتھ مل کر شایانِ شان سے منائی۔

قیوم نظر نے اپنی شگفتہ تقریر میں کہا کہ مولانا ظفر علیخان ہمارے ادب و سیاست کی بہت قدآور شخصیت تھے لیکن ان کا اخبار زمیندار اپنی ملت دوستی اور انگریز دشمنی کی وجہ سے اتنا مشہور ہوا کہ مولانا کی ذات اس کے سامنے دب کر رہ گئی اور پھر یوں بھی ہوا کہ اگر مولانا کہیں نظر آ جاتے تو لوگ کہتے وہ دیکھئے مولانا زمیندار خاں تشریف لا رہے ہیں، محمد طفیل نقوش کے عہد آفریں شمارے شائع کر کے کچھ ایسی ہی مشکل میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کیونکہ نقوش کی مقبولیت نے انہیں محمد طفیل کی بجائے محمد نقوش بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہمارے خیال میں اب ان کا نام کچھ اور تبدیل کیا جانا چاہیے اور نقوش کے غالب نمبر کی اشاعت کے بعد انہیں محمد غالب نقوش کے نام سے یاد کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے کلامِ غالب کے نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کا تذکرہ کرتے ہوئے نسخۂ امروہہ کی اہمیت و افادیت پر خاص زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ زیرِ نظر نسخہ پہلے دونوں نسخوں سے بھی پہلے کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب جوانی ہی میں صاحبِ دیوان ہو چکے تھے۔ اس نسخے کا باقی دو نسخوں سے تقابل کر کے ہم غالب کی شاعری کے متعلق بہت سے نئے گوشے دریافت کر سکتے ہیں تینوں نسخوں کے متن اور حاشیے ایک دوسرے سے مختلف ہیں جو اشعار پہلے نسخے کے حاشیے میں تھے، اور دوسرے نسخے کے متن میں آ گئے ہیں اور اسی طرح دوسرے نسخے کے بعض متن کے اشعار تیسرے نسخے کے حاشیے پر آ گئے۔ ان تمام باتوں کے گہرے مطالعے سے ہم غالبیات میں گرانقدر اضافے کر سکتے ہیں اور اس نسخے کی دریافت سے کلامِ غالب سے تعلق رکھنے والے کئی الجھے ہوئے مسئلوں کا حل تلاش ہو سکتا ہے۔

مرزا غالب آگرے میں پیدا ہوئے اور وہیں کے زبان و محاورہ کی آغوش میں پرورش پائی۔ آگرہ، دلّی اور لکھنؤ کی طرح ثقہ زبان کا گہوارہ تھا۔ پھر یہاں سے میر تقی میرؔ اور نظیر اکبر آبادی جیسے شاعر بھی پیدا ہوئے جو سادہ اور رواں دواں زبان میں شعر کہتے تھے اب غالب اگر اس سرزمین پر رہ کر گنجلک، مشکل اور فارسی ترکیبوں سے اٹی ہوئی زبان میں شعر کہتے تھے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔ اس سلسلے میں پروفیسر وزیر الحسن عابدی کا قیاس تھا کہ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ غالب اردو کو اصفہان تک پھیلانا چاہتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ فارسی کو دہلی کی فضا میں رچا بسا دینا چاہتے تھے اور ان کی مشکل اردو غزلیں کچھ اس بنت کی ہیں کہ اردو میں معمولی شدبد رکھنے والا فارسی دان انہیں بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اُن کی مشکل گوئی کا خارجی سبب بیان کرتے ہوئے پروفیسر مذکور نے فرمایا کہ غالب کی مشکل گوئی ملا عبدالصمد کے مشورے کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے ملّا نے غالب سے کہا ہو کہ فارسی آمیز اردو شاعری [illegible] ایران تک جائیں گا اور یوں تمہاری قدر شیراز اور اصفہان میں بھی بڑھ جائے گی۔

پروفیسر مذکور نے غالب کی مشکل پسندی اور فارسی آمیز اُردو کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سراسر قیاس پر مبنی ہے اوّل تو ملا عبدالصمد کا وجود محض محققوں کی نظر میں متنازعہ ہے۔ دوسرے غالب جب اپنی بلند اور اعلیٰ مرتبہ فارسی شاعری سے اہل شیراز و اصفہان کو مسحور کر سکتے تھے تو پھر انہیں اردو شعروں کو اتنا زیادہ مفرس بنانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ غالب اپنے فن کے بارے میں بہت باشعور تھے۔ اس لیے اُن کا کسی ایک آدمی کی باتوں میں آکر اپنی فنی ڈگر چھوڑ دینا کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ بہرحال یہ پروفیسر صاحب کا اپنا قیاس ہے جو دیگر شواہد میسّر آنے پر کبھی درست بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہرؔ نے زیادہ تر باتیں غالب کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں کیں۔ انہوں نے کہا کہ غالب کی صد سالہ برسی دنیا کے کم و بیش تمام ملکوں میں تزک و احتشام سے منائی گئی ہے۔ روسیوں نے اپنے ہاں کے ایک مشہور اور خوبصورت پھول کا نام مرزا غالب رکھا ہے۔ اس موقعہ پر کلامِ غالب کے نسخۂ امروہہ کی دریافت ایک گنج شائگاں کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے یہ لطیفہ بھی سنایا۔ اس نسخے کے اصلی مالک شعر و سخن سے کاملاً ناواقف تھے۔ اس لیے انہوں نے اس نسخہ کی قیمت ۲۵ روپے طلب کی اور مول تول کے بعد اُسے ایک مشتری کے ہاتھ مبلغ گیارہ روپے میں فروخت کر دیا۔ نیا مالک اس نسخے کو دلّی لے آیا اور اس کی قیمت چھ ہزار روپے مقرّر کر دی۔ ہم مولانا کی اس داستان سے بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن بعد میں محمد طفیل نے ہمیں بتایا کہ نسخۂ امروہہ کی خرید و فروخت کی بات بالکل ایک مختلف ہے۔

مولانا مہرؔ نے شبلی نعمانی کے حوالے سے بتایا کہ جس طرح قاآنی نے فارسی شاعری میں انقلاب پیدا کیا اسی طرح مرزا غالب نے بھی اُردو غزل کو ہیئت و معنی کا نیا پیکر بخشا۔ پروفیسر وزیرالحسن عابدی نے اپنی باتوں کے دوران نسخۂ امروہہ کی غلطیوں کا ذمہ دار نثار احمد فاروقی کو قرار دیا تھا۔ لیکن اپنی تقریر کے آخر میں محمد طفیل نے ان اغلاط کی ذمّہ داری خود اُٹھا کر عالی ظرفی کا ثبوت دیا۔

محفل میں غلام علی نے مرزا کا کلام جب اپنی مخصوص آواز میں سنایا تو اہلِ محفل پر کیفیت طاری ہو گئی۔ غزل تھی —

پھر اِس انداز سے بہار آئی
بن گئے مہر و ماہ تماشائی

تبصرے

امروز — جنگ — مشرق — پاکستان ٹائمز

مُدیر: محمد طفیل۔ صفحات: ۳۸۴۔ قیمت تیس ۳۰ روپے۔ ناشر: ادارۂ فروغِ اُردو، لاہور

اُردو ادب کی جدید اشاعتی تاریخ لکھی جائے گی تو ناشر اور مُدیر نقوش محمد طفیل کا نام اس دور کے معیاری ناشروں میں سرِفہرست ہوگا۔ وہ گذشتہ ۲۰ سال سے اردو کے اس بہترین ادبی رسالہ کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں، اور ان کے بارے میں تمام ادب شناسوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ انہوں نے ادب میں کبھی دوسرے اور تیسرے درجہ کی چیز کی اشاعت کو اپنا مطمحِ نظر نہیں بنایا۔ ہمیشہ اوّل درجہ کے ادب کی پیش کش ہی ان کا مقصود رہا ہے۔ اور نقوش کے فائل گواہ ہیں کہ وہ اس مقصد کے حصول میں بدرجۂ اتم کامیاب رہے ہیں۔ عام ناشروں کی طرح اگر وہ بھی خدانخواستہ ادب میں اعلیٰ اور ادنیٰ، اچھے اور بُرے کی تمیز سے کورے ہوتے اور صرف کاروبار ہی ان کے پیشِ نظر ہوتا تو آج اُنہیں کوئی قابلِ ذکر حیثیت حاصل نہ ہوتی۔ لیکن وہ خود ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں اور اعلیٰ ادبی مذاق کے حامل ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ نقوش کے لیے انہیں ہر حلقہ اور تقریباً ہر مکتبِ خیال کے بہترین ادیبوں کا اشتراک و تعاون ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ اس وقت بھی جب وہ اس کے مدیر نہیں صرف ناشر تھے، اور اب بھی جب نشر و اشاعت سے آگے بڑھ کر اس کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی انہوں نے خود سنبھال رکھی ہیں۔

نقوش، اور محمد طفیل صاحب کی جو باہم مل کر اب واقعی معنوی طور پر "محمد نقوش" بن چکے ہیں، اردو ادب کے لیے ایک عمومی خدمت تو یہ ہے کہ انہوں نے اردو قارئین میں ادب کا ایک بہتر اور اعلیٰ تر شعور اور مذاق پیدا کیا ہے۔ لیکن اُن کی ایک خصوصی خدمت جس میں کوئی اور اُن کا شریک نہیں ہے یہ ہے کہ نقوش نمبروں کے ذریعے انہوں نے مختلف اعتبارات سے اردو ادب کا ایک بہترین ریکارڈ جمع کر دیا ہے۔ اور یہ ریکارڈ ایسا ہے جس سے صرف موجودہ نسل ہی فائدہ نہیں اٹھا رہی بلکہ اردو زبان جب تک زندہ ہے۔ اس وقت تک ان سے استفادہ کیا جاتا رہے گا۔ نقوش کے افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، لاہور نمبر، شخصیات نمبر، ادبِ عالیہ نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، جنگ نمبر، پطرس نمبر، شوکت نمبر، منٹو نمبر — یہ سب انفرادی طور پر اردو تخلیقات کی عظیم یادگاریں ہیں اور مجموعی طور پر تو یہ اتنا وسیع اور وقیع ادبی سرمایہ ہے کہ اسے جمع کرنے کے بعد محمد نقوش نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا ہوتا۔ تب بھی ان کا اردو زبان کے محسنوں میں شمار کیا جانا ایک یقینی امر تھا۔

لیکن پہلے کیے ہوئے کو کافی سمجھ لینا "محمد نقوش" کی فطرت کے خلاف ہے۔ اور اگر اس حقیقت کے اظہار کے لیے کوئی مزید ثبوت درکار تھا تو غالب نمبر کا اجرا، اس کا تازہ ترین ثبوت ہے۔ غالب نمبر کی پہلی جلد کافی عرصہ پہلے منظرِ عام پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس کے بعد جب یہ اعلان کیا گیا کہ دوسری جلد میں غالب کی صرف کمیاب، نایاب اور غیر مطبوعہ چیزیں پیش کی جائیں گی تو

واقعی بہتوں کو حیرت ہوئی تھی کہ غالبیات میں اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے جو نقوش دوسری جلد میں پیش کرے گا۔ خیر سے اخبارات کے ذریعے یہ حیرت تو دوسری جلد کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن ختم ہونے سے پہلے یہ اپنی جگہ ایک اور بڑی حیرت کو دے گئی ہے، اور وہ یہ کہ "محمد نقوش" غالب کی اس نو دریافت بیاض کو جس کی ملکیت کے بارے میں ابھی مقدمہ ہندوستانی عدالت میں زیرِ سماعت ہے اور جو فی الوقت ہندوستان کے ایک بینک کی تحویل میں ہے، بعینہٖ شائع کر دینے میں کس طرح کامیاب ہو گئے۔ جب کہ ابھی تک اس تاریخی ادبی دریافت کی اشاعت خود ہندوستان میں ممکن نہیں ہو سکی۔ اس دریافت کا قصہ جو اخبارات میں آ چکا ہے وہ مختصراً صرف اتنا ہے کہ امروہہ کے ایک صاحب توفیق احمد قادری جو پرانی اشیاء اور قلمی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ کتابوں کی کھوج میں بھوپال پہنچے اور وہاں انہوں نے ایک ہم پیشہ سے جسے اس بیش بہا نسخہ کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا، بھاؤ تاؤ کر کے اسے گیارہ روپے میں خرید لیا، اور واپس دہلی آ کر الجمعیۃ میں اشتہار دیا کہ ان کے پاس غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوانِ غالب کا ایک نسخہ موجود ہے، جسے وہ کم از کم چھ ہزار روپے میں فروخت کریں گے۔ یہ اشتہار بھوپال کے ان صاحب نے بھی دیکھا جنہوں اس انمول خزانے کو لاعلمی میں کوڑیوں کے مول بیچ دیا تھا، اور فوراً ہی اس کی ملکیت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے مقدمہ دائر کر دیا۔ یوں یہ نسخہ بینک کی تحویل میں پہنچ گیا۔ دریں اثنا توفیق احمد قادری اس بیاض کو کئی ماہرین کو دکھا چکے تھے، اور اس امر کی تصدیق کی جا چکی تھی کہ یہ واقعی غالب ہی کی بیاض ہے۔ "محمد نقوش" کی دسترس اس بیاض تک کس طرح ہوئی اور کس طرح انہوں نے بین المملکتی فاصلوں کے باوجود پاکستان میں اس کی اشاعت کو ممکن بنا لیا۔ یہ ایک راز ہے اور طفیل صاحب ابھی اس راز پر سے پردہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

غالب کے اپنے خط میں دیوانِ غالب کا یہ ابتدائی نسخہ ۶۳ اوراق پر مشتمل ہے، اور مروّجہ دیوان اور اس دیوان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں غالب کی غزلوں کی صورت کیا تھی اور بعد میں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ نیز اس نسخہ سے غالب کے مروّجہ کلام کی بعض غلطیوں کی تصحیح میں بھی مدد ملتی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہمیت اس نو دریافت بیاض کی یہ ہے کہ اس میں غالب کی ۱۹ غزلیں اور ۱۳ رباعیاں، جن میں سے ۱۲ فارسی کی ہیں اور ایک اردو کی غیر مطبوعہ ہیں۔

اس بیاض کی دریافت کے بعد سب سے پہلا جو سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ آیا یہ بیاض واقعی غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے یا نہیں۔ نقوش کے زیرِ نظر نمبر میں اس موضوع پر نثار احمد فاروقی کا جو غالبیات کے ایک بڑے ماہر ہیں اور جنہیں توفیق احمد قادری کی مہربانی سے اس نسخہ کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، ایک تفصیلی مضمون شامل ہے۔ انہوں نے غالب کی تحریر سے واقفیت کی بنیاد پر بھی اور موازنہ کے دوسرے ممکن اصولوں کے اعتبار سے بھی تفصیلی بحث کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ بیاض کی صحت شکوک و شبہات سے بالاتر ہے۔ اس نکتہ پر تمام ممکن شبہات کے ازالہ کے بعد ہی نثار احمد فاروقی نے بیاض کی اہمیت اور افادیت پر ماہرانہ روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مضمون کے مطالعہ سے غالب شناسوں کو اس دریافت کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

"نقوش" کے ذریعے جہاں اس صدی کی سب سے بڑی ادبی دریافت منظرِ عام پر آئی ہے۔ وہاں ادبی اشاعت کا بھی ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے۔ نمبر کے پورے ۲۸۴ صفحات کے لیے دبیز سفید کاغذ استعمال کیا گیا ہے اور حصۂ بیاض

رنگین اور منقش عکسی تصاویر کے ساتھ تقریباً ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ دائیں ہاتھ پر غالب کی بیاض کا عکس جوں کا توں شائع کیا گیا ہے اور بائیں ہاتھ پر اسی تحریر کا صاف اور خوشخط نستعلیق متن شائع کیا گیا ہے تاکہ قاری آسانی سے بیاض کے ہر ہر لفظ سے آشنا ہو سکے انہیں رنگین اور منقش ۲۵۰ صفحات کے درمیان دبیز آرٹ پیپر پر غالب کے اشعار پر مشہور آرٹسٹ صادقین کی ۱۲ غیر مطبوعہ تصاویر شائع کی گئی ہیں، جو اس بیاض کو اور زیادہ حسین مرقع بنا دیتی ہیں۔ سرورق اور صفحات کی تزئین اسلم کمال کے موئے قلم کا نتیجہ ہے، اور رنگوں کے امتزاج اور لطافتِ ذوق کا ایک مثالی نمونہ پیش کرتی ہے۔ پیش کش کا یہ اعلیٰ معیار خود اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ اردو ادب کے محبانِ خاص اور بالخصوص غالب کے جاننے والوں کے لیے، یہ ایک عقیدت مندانہ یادگاری پیش کش ہے، اور اس اعتبار سے اس کی تیس روپے کی قیمت بھی واقعی چند سکوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ مدیر نقوش کو غالب کی اس یادگار دستاویز کی اشاعت کو ممکن بنانے میں جن دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑا ہو گا اور پھر اس کے ایک ایک لفظ کی شایانِ شان کتابت اور طباعت میں انہوں نے جس لگن اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے قاری پکار اٹھتا ہے — محمد نقوش — زندہ باد!

(امروز)

جناب محمد عبدالواحد خاں رشیدی نے کیا خوب اور برمحل اظہارِ تحیر کیا ہے کہ اوّل تو شگرفی روشنائی سے غالب کا خود نوشتہ ۶۲ اوراق پر مشتمل یہ نادر مخطوطہ امروہہ کے ہم وطن جناب توفیق احمد قادری کو بھوپال کے ایک چھوٹے سے تاجر کے ذخیرہ کتب سے یوں آسانی سے مل جانا کچھ کم تعجب انگیز واقعہ نہ تھا۔ لیکن جناب محمد طفیل نے نقوش لاہور کے غالب نمبر حصہ ثانی میں اسے من و عن شائع کر کے ملک بھر کے شعری و ادبی حلقوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ پاکستان کے ادبی افق پر یہ انکشاف نقوش کے غالب نمبر کی افتتاحی تقریب میں ہوا جس کے مہمانِ خصوصی وزیرِ اطلاعات نواب زادہ شیر علی خاں تھے۔ ظاہر ہے کہ نو دریافت بیاض غالب کی شمولیت نے نقوش کی اشاعتِ غالب کو وہ مقام عطا کر دیا جس تک کسی اور کی رسائی یقیناً ممکن نہیں۔

مذکورہ بیاض غالب کو ناشرینِ نقوش نے پاکستان میں کس چراغ الہ دین کے ذریعہ منگوا لیا اور اس کی اشاعت میں سبقت لے گئے یہ ایک معمہ یا ادبی راز ہے جو کھلتے کھلتے ہی کھلے گا۔ لیکن فی الوقت بحث کے دو اور رُخ پیشِ نظر ہیں، اول نسخۂ امروہہ کی سند و صحت کی توثیق، دوم اس کی وہ خصوصیت جو اسے دوسرے نسخوں پر فوقیت دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نادر مخطوطہ وہی ہے جس سے بعد میں غالب کا کلام مدوّن ہوا۔ اس میں ۱۹ غزلیات اور ۱۳ رباعیات غیر مطبوعہ بھی ہیں، جو یقیناً پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہیں۔ مزید یہ کہ نو دریافت مخطوطہ شعرِ غالب اور نگارشِ غالب دونوں کا مرقع ہے۔ اس نسخہ کی دریافت کی کہانی بے حد دلچسپ ہے۔ بہر حال جب توفیق امروہوی صاحب نے یہ نسخہ ۵ اپریل ۱۹۶۹ء کو صرف گیارہ روپے میں محض ایک عام قلمی مسودہ کے طور پر خریدا تو اس وقت خود انہیں اس بے بہا گوہر کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ تھا، لیکن جب ۱۷ اپریل ۱۹۶۹ء کو انگریزی اردو ہندی اور دوسری زبانوں کے اخبارات میں غالب کی اس قلمی بیاض کی خبر شائع ہوئی اور آل انڈیا ریڈیو نے اپنے خبرنامے میں بھی نشر کی تو پورے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ اب توفیق قادری صاحب بجا طور پر یہ آرزو مند ہیں کہ نسخۂ بھوپال کی روایت کے مطابق بیاض غالب کا نام "نسخۂ امروہہ" رکھا جائے لیکن جناب امتیاز علی صاحب عرشی کے صاحبزادے اکبر علی خاں نے اس کا نام "نسخۂ عرشی زادہ" تجویز کر دیا ہے۔ اگرچہ اس کی

دریافت کا اصل سہرا توفیق احمد قادری امروہوی کے سر ہے۔ جو امروہہ میں پرانی کتابوں اور اشیاء کا کاروبار کرتے ہیں۔ ۲۳ اپریل ۱۹۶۹ء کو اخبار الجمعیۃ دہلی میں جو خبر شائع ہوئی تھی۔ اس کی سرخی سے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ اس میں مرقوم تھا۔

غالب صدی کی سب سے زیادہ گراں قدر دریافت دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ! جناب نثار احمد فاروقی نے اس نسخہ سے تعارف میں اس خوبی کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ میں جہاں کہیں کاتب یا مرتب کے سہو اور فروگذاشت کا گمان ہوتا تھا۔ ـــ اب نسخۂ امروہہ سے اس کی تصحیح ممکن ہوگئی ہے۔ لیکن ہم یہاں عرض کریں گے کہ اس سے قبل کہ بیاضِ غالب کے اس نسخہ کی پاکستان میں اشاعتِ عام ہو۔ غالب شناس حضرات بنظرِ احتیاط یہ مزید اہتمام فرمالیں کہ غالب کے املا کو پڑھنے اور اچھا درد دار کھنے میں ادارۂ نقوش سے اشعار کی جدید نستعلیق کتابت کرانے میں کوئی نادانستہ سہو یا لغزش ہوئی ہو تو اسے درست کر لیا جائے۔ بہرحال اس نادر مخطوطہ سے غالب کے ذوقِ سخن کے مدارج اور شعری و فکری ارتقا کا پتہ چلتا ہے اور یہ نسخۂ بھوپال، نسخۂ شیرازی، گل رعنا، نسخۂ رام پور، نسخۂ بدایوں، نسخۂ کراچی، نسخۂ لاہور، نسخۂ رام پور جدید اور نسخۂ طاہر کے درمیان تسلسل کے ایک گمشدہ سلسلہ کو مکمل کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ غالب کے قدیم ترین مکتوب بنام خدا داد خاں ولی داد خاں متوطن آگرہ سے جو آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ کی تحریری مماثلت بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ اکثر غزلوں کے مقطع میں تخلص کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے مگر کاغذ عمدہ اور دبیز ہے اور خوش قسمتی سے یہ نسخہ ۱۵۰ سال تک کسی ایسی جگہ محفوظ رہا ہے کہ کرم خوردگی یا آب زدگی کا نشان تک اس پر موجود نہیں۔ نقوش کے توسط سے پاکستان میں نسخۂ امروہہ کی اس قدر جلدی اشاعت یقیناً ایک نہایت غیر معمولی اور قابلِ قدر واقعہ ہے۔

نقوش کے زیرِ نظر غالب کی دوسری قابلِ ذکر خصوصیت غالب کے اشعار پر ملک کے ممتاز مصور صادقین کی تیرہ غیر مطبوعہ تصاویر ہیں۔ ان تصویروں کے خالق کا تعارف کراتے ہوئے نقوش کے تزئین کار جناب اسلم کمال نے اس عظیم فنکار کی بوقلموں شخصیت کا لفظی پیکر تراشا ہے۔

"کھلے کینوس پر وہ روشنائی اور قلم اور موقلم سے مختلف النوع اشیاء کو نہایت مہارت سے پُر اسرار ترتیب دیتا ہے لیکن غالب کے بارے میں صادقین کی شبیہہ حد درجہ مؤثر اور غضب کی معنی آفریں ہے۔ فکرِ غالب میں صادقین کے چہرے کا رچاؤ اتنا فطری ہے کہ آج اگر غالب کی عکسی و قلمی تصاویر نایاب ہوتیں تو ہم بلا تامل تسلیم کر لیتے کہ مصور کے ذہن پر شاعر کا چہرہ مہرہ نازل ہوا ہے"

صادقین صاحب کے "نگار خانۂ غالب" سے مستعار یہ چند سحر انگیز پینٹنگز نقوش کے غالب نمبر حصہ دوم کی شان و شوکت دوبالا کر رہی ہیں۔ عمدہ کاغذ اور طباعت و تزئین کے علی الرغم اس شمارہ کی قیمت تیس ۳۰ روپے مقرر ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ دستاویزی اہمیت کے اس مجلہ کی قیمت اور کاوش کا کوئی حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ (جنگ)

ایڈیٹر: محمد طفیل۔ ناشر: ادارۂ فروغِ اردو لاہور۔ قیمت تیس ۳۰ روپے

غالب کی صد سالہ یادگار کے حوالے سے غالب نمبر تو خیر بہت سے ادبی رسالوں نے نکالے، مگر بعض رسالوں کی ایک غالب نمبر نکال کر تشفی نہ ہوئی۔ انہوں نے غالب نمبر کے بعد پھر غالب نمبر نکالنے کا اہتمام کیا۔ ان رسالوں میں نقوش بھی ہے۔ نقوش نے اپنا پہلا نمبر

فروری ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔ یہ نمبر بھی ویسا ہی نمبر تھا جیسا نقوش بالعموم نکالا کرتا ہے۔ مگر اب جو دوسرا غالب نمبر اس نے شائع کیا ہے اس نے اردو ادب میں ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

یہ دوسرا غالب ہمیں دیوانِ غالب کے ایک نو دریافت نسخہ سے روشناس کراتا ہے۔ اس دریافت کی داستان اخباروں میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ نیا نسخہ امروہہ کہلاتا ہے اور غالب صدی کی سب سے گراں قدر دریافت سمجھا جاتا ہے۔ نسخہ حمیدیہ اور نسخہ شیرانی کے مقابلہ میں اس کی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ وہ ان سے قدیم ہے، اور دوسرے یہ کہ خود غالب کے خط میں ہے۔ اس طرح اُسے بیاضِ غالب کی حیثیت حاصل ہے۔ غالب نے اپنے اشعار میں وقتاً فوقتاً جو اصلاحیں کیں وہ بھی اس میں درج ہیں، پھر اس میں مختلف غزلیں اور اشعار ایسے شامل ہیں جو کسی اور نسخہ میں شامل نہیں، وہ اس دریافت کے واسطے سے پہلی بار غالب کے قارئین کے سامنے آئے ہیں، اس نسخہ کی ایک اہمیت ایک اور اعتبار سے بھی ہے۔ وہ یہ کہ نسخہ حمیدیہ گم ہو چکا ہے۔ اس لیے مطبوعہ نسخہ میں جو متن کی غلطیاں رہ گئی تھیں ان کا متن سے موازنہ کر کے تصحیح کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ پھر اس نسخہ میں بہت سا کلام ایسا تھا جو کسی اور نسخہ میں موجود نہیں تھا۔ اس لیے کسی دوسرے نسخے کو سامنے رکھ کر بھی اس کی تصحیح نہیں کی جا سکتی تھی اور پھر یہ کہ نسخہ آخر کو تو کاتب ہی کا لکھا ہوا تھا اس لیے غلطی اصل نسخہ میں بھی موجود ہو سکتی تھی۔ اب نسخہ امروہہ کی صورت میں ہمارے پاس ایک ایسی دستاویز آگئی ہے جس کی روشنی میں نسخہ حمیدیہ کی تصحیح ہو سکتی ہے۔

نسخہ امروہہ ابھی ہندوستان میں نہیں چھپ سکا ہے، وہاں اس کی اشاعت حقداروں کی آپس کی مقدمہ بازی کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ گئی۔ محمد طفیل صاحب نے اپنے نجی ذرائع سے وہاں سے اس نسخہ کی فوٹوسٹیٹ کاپی حاصل کی اور اُسے شائع کر ڈالا۔ اس طرح گویا نسخہ امروہہ پہلی مرتبہ پاکستان میں شائع ہوا ہے۔

ادارۂ نقوش نے اس نسخہ کو چھاپنے میں بہت احتیاط اور اہتمام سے کام لیا ہے۔ اس نے نسخہ کا عکس بھی شائع کیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہر غزل کو باحتیاط پڑھ کر اور کتابت کرا کر بھی پیش کیا ہے۔ اب اگر پڑھنے میں کوئی چوک ہوتی ہے یا کتابت کی کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اس کی تصحیح اصل کو دیکھ کر ہاتھ کے ہاتھ کی جا سکتی ہے۔ موجودہ صورت میں ہم یہ اہتمام دیکھتے ہیں کہ ایک صفحہ پر بخطِ غالب عکس موجود ہے اور مقابل کے صفحہ پر آج کی دیدہ زیب کتابت میں غزل لکھی ہوئی ہے۔

اس بیاض پر ادارے کی طرف سے جو حاشیے چڑھائے گئے ہیں وہ قابلِ قدر ہیں اور اس نسخہ کی افادیت اور معنویت کو واضح کرتے ہیں، مثلاً بیاض کے ختم پر ایک ضمیمہ تصریحات کے عنوان سے شامل کیا گیا جس میں اس قسم کی وضاحتیں کی گئی ہیں کہ کونسا شعر غزل مروّجہ دیوان میں موجود نہیں ہے، اور کونسا شعر یا غزل مروّجہ دیوان میں موجود نہیں ہے۔

نثار احمد فاروقی کا ایک مقالہ اس نسخہ کے بارے میں ہمیں تمام ضروری معلومات مہیا کر دیتا ہے۔ صادقین کی تصویریں جا بجا بیاض کے ساتھ شامل کی گئی ہیں۔ صادقین نے اس برس غالب کی شاعری کو اپنی مصوری کا موضوع بنایا ہے اور اس کے مختلف اشعار کو رنگوں کی زبان میں رقم کیا ہے۔ یہ تصویریں بھی اس نمبر کو قابلِ قدر بناتی ہیں۔

بیاض کے علاوہ بھی اس نمبر میں چند قیمتی دستاویز اور مقالے شامل ہیں۔ سید معین الرحمٰن نے گل رعنا کے اس نسخہ کے بارے

یں مقالہ رقم کیا ہے جو خطِ غالب میں ہے اور لاہور میں خواجہ محمد حسن صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ اس مخطوطہ کے بھی چند اوراق کے عکس اس کی اشاعت کی زینت ہیں۔

مسلم ضیائی صاحب نے غالب کے ایک اور مخطوطہ سے ہمارا تعارف کرایا ہے۔ یہ مخطوطہ اس کلیاتِ نظم و نثر کا ہے، جو میخانہ آرزو سرانجام کا عنوان رکھتا ہے۔ اور انجمن ترقی اردو کراچی کے پاس محفوظ ہے۔ اس مخطوطہ کے بھی چند عکس شاملِ اشاعت ہیں۔ مخطوطہ کے ایک مخطوطہ پر سید وزیر الحسن عابدی نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ یہ سات خط جو فارسی میں ہیں عکسی صورت میں یہاں موجود ہیں۔

اس طرح نقوش کا یہ نمبر نسخۂ امروہہ کے علاوہ بھی غالب کی بعض نادر تحریروں اور ان پر تحقیقی کام پر محیط ہے۔ یہ نمبر مجلّد ہے، ۷۱۳ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے، اور نفیس کتابت و طباعت سے آراستہ ہے۔ (مشرق)

GHALIB'S NEW FOUND DIVAN

"NUQOOSH" (Ghalib Number 2), edited by Mohammad Tufail.
Pages 384, Price 30.00

So much appeared about Ghalib and his works last year that quantity effectively superseded quality. It was like an earthquake, whos after-tremors are still being felt (special numbers of magazines on Ghalib keep appearing even now and a few may be in the offing). No doubt something of worth can be salvaged from the thousands of pages published last year. But it all involved conscious effort. The most astonishing thing is that the one indubitable contribution to Ghalibian Scholarship occurred by mere chance.

The detials of the chance discovery are fairly interesting last year while Ghalib's centenary was being celebrated throughout the sub-Continent with great enthusiasm, a very early version of Ghalib's divan, in his own handwriting, was unearthed by rare books dealer at Bhopal. The find created a stir in literary circles. It so happened that due to some legal snag it could not be published in India, but Mr Tufail, who has earned himself quite a reputation of being an enterprising and quick-on-the-draw editor, somehow or the other, managed to get hold of the original and by becoming the first to print the rarity has scored a signal success.

It seems that Ghalib compiled this divan in 1816 when he was nineteen. These verses perhaps have been selected from some still earlier collection which the scholars are hopeful will also turn up sooner or later. Before this remarkable discovery the oldest manuscript of Ghalib's verses was supposed to be the one found at Bhopal—now unfortunately lost—which is known in its printed form as the "Nuskha-i-Hamidiya."

A comparison of the new manuscript and the "Hamidiya" reveals that the latter contains a lot of misprints, which have turned Ghalib's early work, admittedly very difficult, still more abstruse. A great deal of this confusion can now be cleared up. And this, I think, is one of the most utilitarian aspect of the find. Moreover, there is some material here—19 ghazals, 13 rubait (all but one in Persian) and stray couplets—which was hitherto unknown. The Ghazals are all, as was to be expected, in Ghalib's early style, difficult, florid and dense. Nevertheless these contain here and there couplets of great beauty and originality.

Objections

Some people object to the publication of such poetry and argue that what the poet has himself discarded at some stage of his poetic career need not be printed or read. The objection does not seem to carry much weight. In the first place a poet is not always a good judge of his own work. Secondly, the early or immature work of a genius is very often more rewarding than the whole output of a second-rater and cannot be glossed over. It is only in the early period that the influences of other poets most clearly reveal themselves and some of his phychological make-up is more exposed, naked. All this is of great help to the critics, scholars and intelligent readers. Besides it is quite likely that the absence of certain ghazals etc., from a final version does not necessarily mean that they were discarded. The poet may have lost or misplaced them.

So far as this special number is concerned the "Divan" naturally steals the show. But there are other items of scholarly interest also. Thirteen new paintings of Sadequain are also included. Sadequain has become very repetitive and seem to have run out of style, if not ideas

Production is fair and as the new found divan has been reproduced photographically page by page the price is less prohibitive than it may otherwise seem. On the whole, Mr. Tufail deserves for his effort a word of cheer !

The Pakistan Times April 12, 1970.

خبریں

Rare 'Nuskha' of Ghalib launched

BY A STAFF REPORTER

Rawalpindi made literary history yesterday (Saturday) when a rare manuscript of Ghalib's verses was launched. Believed to be the only one in the poet's own hand, in the sub-continent, it was recently procured from Amroha, India.

At the launching ceremony at Hotel Inter-Continental, the chief guest was Gen. Sher Ali, Minister for Information and National Affairs, who is a descendent of Nawab Allauddin, an ardent admirer of Mirza Ghalib. The function organised by Bazm-i-Ilm-o-Fun, was attended by poets, writers, litte rateurs and educationists.

Besides the chief guest, Prof. Abdul Hameed Khan, Prof. Waqar Azeem, Col. Mohammad Ahmad spoke briefly on the celebrated poet and eulogised the efforts of the Editor of "Naqoosh", Mr. Mohammad Tufail, in procuring and publishing the unique manuscript thus bringing a rare honour to Pakistan.

Recently, Indian Papers had reported that Ghalib's own 'Beaz' (collection in poet's own handwriting) was available in Amroha, U.P., India. Mr. Mohammad Tufail said he was fortunate in procuring it and presenting it to the literary world.

DAWN OF NEW ERA

Literary circles have described the publication as a start of a new era on Ghalib's thought and poetry. The reproduction also shows the corrections made by Ghalib himself in various verses, revealing how the poet reshaped his verses and reformed his thoughts in the process of evolution to fuller heights as a poet and thinker.

The 'Diwan' contains 19 unpublished 'Ghazals' and 12 'Rubaiyat'. Several unpublished letters of Ghalib are also reproduced.

پاکستان ٹائمز، راولپنڈی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۶۹ء

غالب کی تخلیقات آج بھی نئی ہیں

نواب زادہ شیر علی

راولپنڈی ۲۹ نومبر (اپ پ ا) وزیر اطلاعات و قومی امور نوابزادہ شیر علی خان نے آج یہاں بزم علم و فن کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں نقوش کے غالب نمبر کا افتتاح کیا۔ اس موقع پہ تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اردو کے ممتاز شاعر مرزا غالب کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کی تخلیقات آج بھی ایسی ہی ہیں جیسی ایک سو سال پہلے تھیں انہوں نے کہا کہ ان کی تخلیقات کا دنیا بھر میں ذوق و شوق سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کی صد سالہ برسی متعدد ممالک میں منائی گئی۔ نقوش کے غالب نمبر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس میں غیر مطبوعہ ۱۹ غزلوں اور ۱۲ رباعیوں کی شمولیت سے اس کی خصوصیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سے قبل نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل نے کہا کہ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ غالب کی یہ نظمیں اور غزلیں پاکستان میں پہلی بار شائع کی گئی ہیں۔ جبکہ بھارت

Objections

Some people object to the publication of such poetry and argue that what the poet has himself discarded at some stage of his poetic career need not be printed or read. The objection does not seem to carry much weight. In the first place a poet is not always a good judge of his own work. Secondly, the early or immature work of a genius is very often more rewarding than the whole output of a second-rater and cannot be glossed over. It is only in the early period that the influences of other poets most clearly reveal themselves and some of his phychological make-up is more exposed, naked. All this is of great help to the critics, scholars and intelligent readers. Besides it is quite likely that the absence of certain ghazals etc., from a final version does not necessarily mean that they were discarded. The poet may have lost or misplaced them.

So far as this special number is concerned the "Divan" naturally steals the show. But there are other items of scholarly interest also. Thirteen new paintings of Sadequain are also included. Sadequain has become very repetitive and seem to have run out of style, if not ideas

Production is fair and as the new found divan has been reproduced photographically page by page the price is less prohibitive than it may otherwise seem. On the whole, Mr. Tufail deserves for his effort a word of cheer !

The Pakistan Times April 12, 1970.

خبریں

Rare 'Nuskha' of Ghalib launched

BY A STAFF REPORTER

Rawalpindi made literary history yesterday (Saturday) when a rare manuscript of Ghalib's verses was launched. Believed to be the only one in the poet's own hand, in the sub-continent, it was recently procured from Amroha, India.

At the launching ceremony at Hotel Inter-Continental, the chief guest was Gen. Sher Ali, Minister for Information and National Affairs, who is a descendent of Nawab Allauddin. an ardent admirer of Mirza Ghalib. The function organised by Bazm-i-Ilm-o-Fun, was attended by poets, writers, litte rateurs and educationists.

Besides the chief guest, Prof. Abdul Hameed Khan, Prof. Waqar Azeem, Col. Mohammad Ahmad spoke briefly on the celebrated poet and eulogised the efforts of the Editor of "Naqoosh". Mr. Mohammad Tufail, in procuring and publishing the unique manuscript thus bringing a rare honour to Pakistan.

Recently, Indian Papers had reported that Ghalib's own 'Beaz' (collection in poet's own handwriting) was available in Amroha, U.P., India. Mr. Mohammad Tufail said he was fortunate in procuring it and presenting it to the literary world.

DAWN OF NEW ERA

Literary circles have described the publication as a start of a new era on Ghalib's thought and poetry. The reproduction also shows the corrections made by Ghalib himself in various verses, revealing how the poet reshaped his verses and reformed his thoughts in the process of evolution to fuller heights as a poet and thinker.

The 'Diwan' contains 19 unpublished 'Ghazals' and 12 'Rubaiyat'. Several unpublished letters of Ghalib are also reproduced.

پاکستان ٹائمز، راولپنڈی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۶۹ء

غالب کی تخلیقات آج بھی نئی ہیں

نوابزادہ شیر علی

راولپنڈی ۲۹ نومبر (اپ پ ا) وزیر اطلاعات و قومی امور نوابزادہ شیر علی خان نے آج یہاں بزم علم و فن کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں نقوش کے غالب نمبر کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اردو کے ممتاز شاعر مرزا غالب کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کی تخلیقات آج بھی ایسی ہی ہیں جیسی ایک سو سال پہلے تھیں انہوں نے کہا کہ ان کی تخلیقات کا دنیا بھر میں ذوق و شوق سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کی صد سالہ برسی متعدد ممالک میں منائی گئی۔ نقوش کے غالب نمبر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس میں غیر مطبوعہ ۱۹ غزلوں اور ۱۲ رباعیوں کی شمولیت سے اس کی خصوصیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سے قبل نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل نے کہا کہ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ غالب کی یہ نظمیں اور غزلیں پاکستان میں پہلی بار شائع کی گئی ہیں۔ جبکہ بھارت

میں ان کی اشاعت اب تک نہیں ہوئی۔ آرمی ایجوکیشن کور کے سابق ڈائرکٹر کرنل محمد خاں، ممتاز نقاد سید وقار عظیم اور پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان نے غالب کی شاعری اور نقوش پر مقالے پڑھے مسٹر طفیل محمد نے نقوش غالب نمبر کی ایک جلد بھی وزیر اطلاعات کو پیش کی غالب نمبر کی اشاعت سے مطالعہ غالب میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا ہے۔ کیونکہ یہ غالب کا پہلا اور قدیم ترین دیوان ہے جو انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اس نمبر میں ایک صفحے پر غالب کی اپنی تحریر کا عکس اور دوسرے صفحے پر کتابت شدہ مواد ہے۔ اور اس میں غالب کے کئی غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں۔

جنگ، راولپنڈی ـ ۳۰ر نومبر ۱۹۶۹ء

وزیر اطلاعات نے نقوش کے "غالب نمبر" کا افتتاح کیا

راولپنڈی، ۲۹ر نومبر (اپ پ ا) مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات نوابزادہ شیر علی خاں نے آج یہاں اردو کے مشہور ادبی مجلہ نقوش کے دوسرے "غالب نمبر" کا افتتاح کیا۔ انہوں نے مرزا غالب کو شاندار خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ سو سال گزر جانے کے بعد آج بھی ان کا کلام اتنا ہی تازہ اور اثر انگیز ہے۔ افتتاحی تقریب میں پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر وقار عظیم، کرنل محمد خاں اور دوسرے ممتاز افراد نے تقریریں کیں۔

نوابزادہ شیر علی خاں نے کہا کہ مرزا غالب عالمی شہرت کے مالک شاعر مانے گئے ہیں۔ ان کی صد سالہ برسی کی تقریبات دنیا کے مختلف ممالک میں منائی گئی ہیں ان کا کلام سو سال کے بعد بھی اتنی ہی دلچسپی سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ انہوں نے نقوش کے غالب نمبر کی ترتیب و تدوین کو سراہا اور توقع ظاہر کی کہ یہ کاوش اردو ادب اور غالبیات میں بیش بہا اضافہ ثابت ہوگی۔ اس سے قبل نقوش کے مدیر مسٹر محمد طفیل نے فخر کا اظہار کیا کہ پاکستان میں مرزا غالب کے کلام کو چھاپنے کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ جب کہ بھارت میں ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ نقوش کا غالب نمبر مرزا غالب کے پہلے اور قدیم ترین دیوان پر مشتمل ہے جو مرزا غالب نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے غالب نمبر میں ایک صفحہ پر مرزا کی اصل تحریر کا عکس اور سامنے کے صفحہ پر تحریر خط نستعلیق میں درج ہے۔ دیوان میں غالب کی ۱۹ غزلیں اور ۱۲ رباعیاں ایسی ہیں جو دیوان غالب کے کسی دوسرے نسخہ میں شامل نہیں۔ ان میں غالب کی اپنی اصلاح بھی شامل ہے۔ اس سے غالب کے بہت سے ایسے الفاظ کی تصحیح ہو جائے گی۔ جو موجودہ نسخوں میں غلط لکھے گئے ہیں۔ نقوش کے اس غالب نمبر میں متعدد غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں۔

مشرق، لاہور ـ ۳۰ نومبر ۶۹ ۱۹ء

The Diwan in Ghalib's own hand

PUBLICATION BEING LAUNCHED TODAY

By a Staff Reporter

A special function to launch the publication of a rare manuscript of Diwan-i-Ghalib in the poet's own handwriting, discovered in India early this year, will be held at the Pakistan Council at 3-30 p.m. on Friday (today).

The function, which has been jointly sponsored by the Pakistan Council and the Idara-i-Naqoosh, the publishers of the manuscript, will be presided over by Mr Justice Anwar-ul-Haq of the West Pakistan High Court. Maulana Ghulam Rasul Meher, Syed Wazirul Hassan Abedi and Dr. Waheed Qureshi will address on the importance of the manuscript.

The discovery of the manuscript created a sensation in the literary circles of the Sub-Continent and it is at present in safe custody of the Reserve Bank of India in Delhi. Its publication in India has been restrained by a law court following a dispute between its original owner and subsequent buyer.

EDITOR'S CLAIM

The Editor of "Naqoosh" Mr. Mohammad Tufail, has claimed that he had secured a facsimile of this precious manuscript before it was entrusted to the Reserve Bank of India. How and when this was secured is a secret closely guarded by Mr. Tufail. He has published the facsimile along with its transcript in a special number of the "Naqoosh" which is being launched in Lahore on Friday.

According to the publisher the manuscript contains 19 ghazals and 12 rubayats which have not appeared anywhere so far. The manuscript also contains several unpublished letters of Mirza Ghalib.

The reproduction of the manuscript also shows all the changes made by the poet himself in the original manuscript.

The story of the sensational find is narrated in an article in the publication by Mr. Nisar Ahmad Farooqi. According to him, on April 5 last, Taufiq Ahmad of Amroha, U.P. (India), who deals in old manuscripts, met one of his professional colleagues in Bhopal. The latter showed him the manuscript which he was prepared to sell for Rs. 25. The bargain was struck at Rs. 11. On arrival in Delhi Mr. Taufiq advertised his treasure in the "Al-Jamiat" of April 7 and put the price at Rs. 6,000. A few days later, an expert of the U.P. Archieves confirmed that the manuscript was in Ghalib's own handwriting. The news of the rare find was carried by the Indian Press and broadcast by All-India Radio.

Mr. Taufiq announced his decision to publish the manuscript but he was restrained from doing so when a suit was filed in a court of law by its original owner from Bhopal. The manuscript was passed on to the Reserve Bank for safe custoday.

5, December 1969. — Pakistan Times. Lahore

پاکستان میں اولین بیاض غالب کی اشاعت کا خیر مقدم

قلمی نسخہ عظیم شاعر کی بدحواسیوں کا غماز بھی ہے

لاہور ۶ دسمبر ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس انوار الحق نے پاکستان میں میرزا غالب کے اردو کلام کے اولین قلمی نسخے کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا ہے اور اسے ایک عظیم سعادت سے تعبیر کیا ہے۔

جسٹس انوار الحق کل جریدہ نقوش کے بیاض غالب نمبر کی افتتاحی تقریب جو ادارہ نقوش اور پاکستان کونسل کے مشترکہ اہتمام سے ہوئی صدارتی تقریر کر رہے تھے۔ آپ نے کہا کہ اس نسخے کی اشاعت سے غالب کے فن کا ارتقا سمجھنے میں مدد ملے گی۔ پروفیسر قیوم نظر۔ ڈاکٹر

وحید قریشی، پروفیسر وزیرالحسن عابدی اور مولانا غلام رسول مہر نے بھی بیاض غالب کا خیر مقدم کیا۔

نقوش کے مدیر جناب محمد طفیل نے بتایا کہ "بیاض غالب نمبر" اس قلمی نسخے کی عکسی تصویروں سے شائع کیا گیا ہے جو ان دنوں ریزرو بینک آف انڈیا میں محفوظ ہے۔ بیاض میں ۱۹ غزلیں اور بارہ رباعیات ایسی ہیں جو اب تک کہیں نظر نہیں آئیں۔ بیاض میں غالب کے بعض ایسے خطوط بھی موجود ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئے۔ جریدے میں نثار احمد فاروقی کے ایک مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ امروہہ یوپی کا ایک شخص توفیق احمد جو پرانے قلمی نسخوں کا کاروبار کرتا ہے۔ ۵ اپریل کو اسی دھندے کے ایک آدمی سے ملا تو موخر الذکر نے اُسے یہ قلمی نسخہ دکھایا اور پچیس روپے مانگے توفیق نے بیاض گیارہ روپے میں خریدی اور پھر دہلی جا کر "الجمعیۃ" میں اس کی فروخت کا اشتہار دے دیا اور چھ ہزار روپے قیمت مقرر کی۔ چند روز کے بعد یوپی۔ میں قومی مخطوطات کے مرکز کے ایک ماہر نے بیاض کا معائنہ کیا اور تصدیق کی کہ وہ غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اخبارات اور ریڈیو نے اس دریافت کا کافی چرچا کیا۔ توفیق نے بعد ازاں نسخے کی اشاعت کا اعلان کیا تو اس کے پہلے مالک نے ایک دیوانی دعویٰ دائر کر دیا اور عدالت نے بیاض کو اپنی تحویل میں لے کر ریزرو بینک میں محفوظ کر دیا۔ طفیل صاحب کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے بیاض کا مکمل عکس عدالت کے حکم سے پہلے حاصل کیا تھا۔ مگر وہ یہ بتانے کے لئے تیار نہیں کہ انہوں نے یہ کامیابی کیسے حاصل کی۔ نقوش میں بیاض کے عکس کے سامنے قارئین کی سہولت کے لئے مروجہ طرز کتابت میں اس کی نقل بھی چھاپی گئی ہے

مقررین کو اس بات پر اتفاق تھا کہ یہ اوّلین بیاض ہے جو غالب نے چوبیس سال کی عمر کے لگ بھگ اپنے ہاتھ سے لکھی بعد میں شاعر نے ساری توجہ فارسی گوئی پر مبذول کر دی اور پھر اُردو کلام کی دو بیاضیں کتابت کیں ان میں سے کئی اشعار اور متعدد غزلیں ترک کر دیں۔ زیر نظر بیاض نسخہ حمیدیہ یا نسخہ بھوپال اور نسخہ شیرانی سے پہلے کی ہے۔ پروفیسر عابدی نے بتایا کہ اس بیاض سے مرزا غالب کی بعض بدحواسیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایک غزل میں "ماہ و سال" کی جگہ "حسبِ حال" لکھ گئے ہیں حالانکہ یہ ترکیب غزل میں دوسری جگہ صحیح مقام پر موجود ہے۔ اسی طرح سہو کتابت سے ایک شعر کے دونوں مصرعوں کے مختلف حصے آگے پیچھے ہو گئے ہیں پروفیسر صاحب نے بیاض کی جدید کتابت میں بعض اغلاط کی نشاندہی بھی کی جب نقل کرنے والے نے تحمل کو تجمل پڑھا غالب نے غلطی سے ل کے نیچے نقطہ لگا دیا تھا جسے کاتب نے ج کا نقطہ سمجھا۔ پروفیسر عابدی نے بتایا کہ پاکستان میں غالب کی یادگاروں میں یہ ایک اہم اضافہ ہے غالب کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اردو دیوان کے دو نسخے گل رعنا اور نسخہ شیرانی اور فارسی دیوان پنج آہنگ پہلے سے لاہور میں موجود تھے۔

زیر نظر بیاض میں غالب نے تاریخ تکمیل کتابت ۴ رجب درج کی ہے مگر سنہ ہجری سہواً چھوٹ گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا تخمینہ تھا کہ سن ۱۲۳۱ ہونا چاہیے لیکن مولانا مہر نے اصرار کیا کہ سن ۱۲۳۶ ہی ہو سکتا ہے چونکہ غالب ۱۲۱۲ ہجری میں پیدا ہوا تھا اس لئے اس سے کم عمر میں ایسا وقیع مجموعہ کلام ممکن نہ تھا۔

امروز، لاہور، ۷ دسمبر ۱۹۶۹ء

Publication of 'Diwan-i-Ghalib' launched

The publication of a rare manuscript "Beyaz-i-Ghalib" in Mirza Ghalib's own handwriting, the recent discovery of which created a sensation in literary circles, was launched in Lahore on Friday at a largely attended function at the Pakistan Council.

The function jointly sponsored by the local centre of the Pakistan Council and Idara-i-Naqoosh, the publishers of the manuscript was presided over by Mr. Justice Anwarul Haq of the West Pakistan High Court. Maulana Ghulam Rasul Meher, Syed Wazirul Hassan Abidi and Dr. Waheed Qureshi spoke on the significance of the manuscript and on the new vistas it would open for researchers in Ghalibiat.

Mr. Justice Anwarul Haque in his brief presidential address said that the function was not only a pleasingly unique way of introducing the publication of the rare manuscript of a great poet, but it also afforded an opportunity to the audience to listen to great authorities on Ghalib and thereby know more about the poetry and philosophy of Mirza Asad Ullah Khan Ghalib. The philosophy and poetry of Ghalib, he added, spoke volumes on various aspects of life and was a treasure of wisdom and inspiration.

Maulana Ghulam Rasul Meher, after discussing the significance of the manuscript, said that the fame of Mirza Ghalib had transcended the boundaries of India and Pakistan and acquired cosmopolitan character. The Soviet Union, the Maulana said had named a variety of flowers as Mirza Ghalib.—APP.

Pakistan Times, Lahore.
7, December 1969.

مرزا غالب نہ صرف برِّ صغیر بلکہ دُنیا کے عظیم شاعروں میں سے ہیں

یہاں نقوش کے غالب نمبر کے سلسلہ میں منعقد ایک تقریب میں اسد اللہ خاں غالب کو برصغیر پاک و ہند کا ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی شاعر قرار دیا گیا اور اردو زبان و ادب پر کیے گئے احسانات کا اعادہ کرتے ہوئے انہیں زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ پاکستان کونسل کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی اس تقریب میں مولانا غلام رسول مہر، سیّد وزیر الحسن عابدی، محمد طفیل مدیر نقوش اور ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مقالے پڑھے۔

جسٹس شیخ انوار الحق نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ غالب کی زندگی اور ان کی شاعری ہماری ادبی زندگی کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ہم زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی شاعری سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر نے کہا کہ غالب کو پوری دُنیا میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے اور اس سال ہر جگہ ان کی صد سالہ برسی منائی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ غالب کی یاد ایک بین الاقوامی شاعر کی حیثیت سے منائی گئی ہے۔ شاید ہی کرۂ ارض کا کوئی حصّہ ایسا ہو، جہاں پر مرزا غالب کا کلام نہ پہنچا ہو۔ انہوں نے کہا جشنِ غالب کی صد سالہ برسی منانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہُوا کہ ان کے بہت سے نادر قلمی نسخے دریافت کیے گئے۔ مولانا نے کہا کہ غالب صرف ہند و پاک کا ہی نہیں بلکہ اُس کا شمار عالمی شعراء کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ سیّد وزیر الحسن عابدی اور ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا کہ ادبی دُنیا پر "غالب نمبر" ایک احسان کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان غالب کی خدمات کا اعتراف کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔

لاہور (ندائے ملت ۷ دسمبر ۱۹۶۹ء)

نقوش کے غالب نمبر کا افتتاح

مرکزی وزیر اطلاعات و قومی امور نواب زادہ شیر علی خاں نے آج شام "نقوش" کے غالب نمبر کا افتتاح کیا۔ یہ نمبر اس کلام کا پہلا مجموعہ ہے جو غالب نے خود مرتب کیا اور اس میں غالب کا قدیم ترین دیوان بھی شامل ہے۔ نمبر کے ایک صفحے پر اس کی نقل درج ہے اور یہ خصوصیت پورے نمبر کو حاصل ہے۔ اس میں غیر مطبوعہ ۱۹ غزلیں اور رباعیات بھی شامل کی گئی ہیں۔

(نوائے وقت، راولپنڈی ۲۰ دسمبر ۱۹۶۹ء)

نقوش کے غالب نمبر کی افتتاحی تقریب

مرکزی وزیر اطلاعات اور قومی امور نوابزادہ شیر علی خاں نے اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے کلام میں آج بھی اتنی ہی رنگینی اور تازگی پائی جاتی ہے، جتنی آج سے ایک صدی پیشتر تھی۔ آپ آج شام سہ ماہی رسالہ "نقوش" کے دوسرے غالب نمبر کی افتتاحی تقریب میں تقریر کر رہے تھے۔ اس نمبر میں غالب کا پہلا اور قدیم ترین دیوان بھی اس اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے کہ اس کے ایک صفحے پر غالب کی تحریر کا عکس ہے اور دوسرے صفحے پر وہی اشعار خطِ نستعلیق میں دیئے گئے ہیں۔

(نوائے وقت، لاہور - ۲۰ نومبر ۱۹۶۹ء)

بیاض غالب

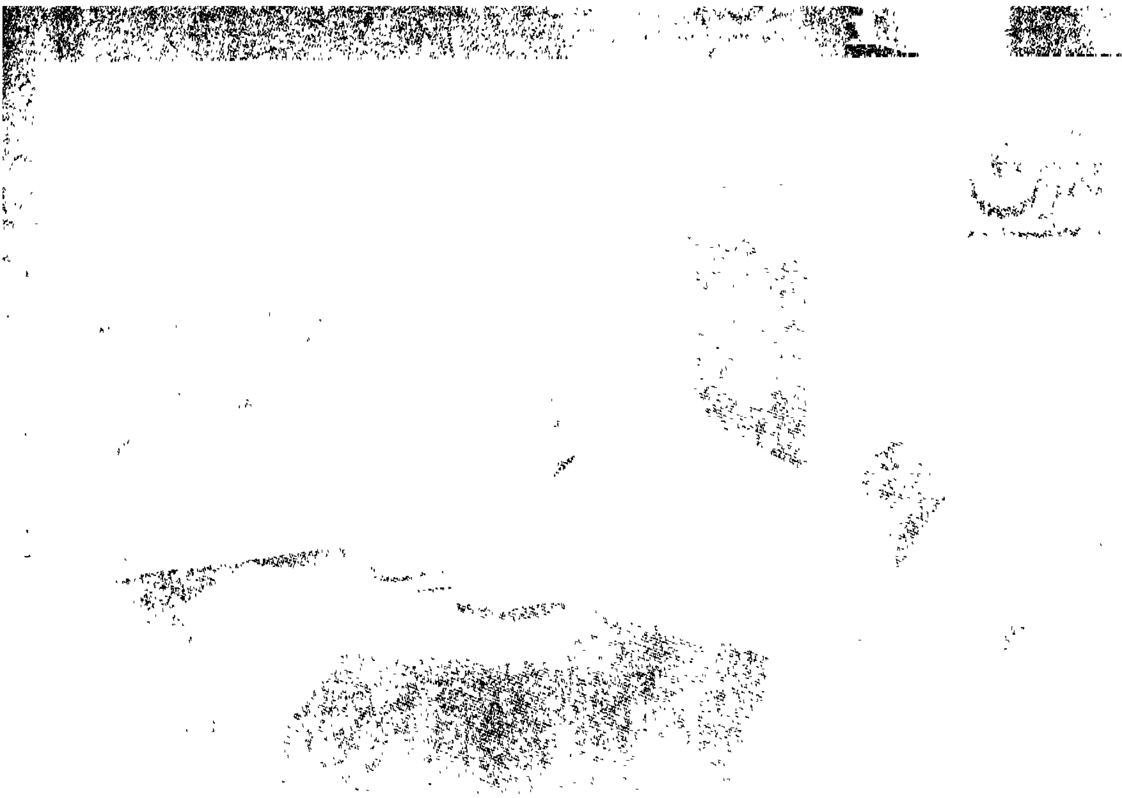
کے افتتاح (مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۶۹ء) کی چند جھلکیاں

*

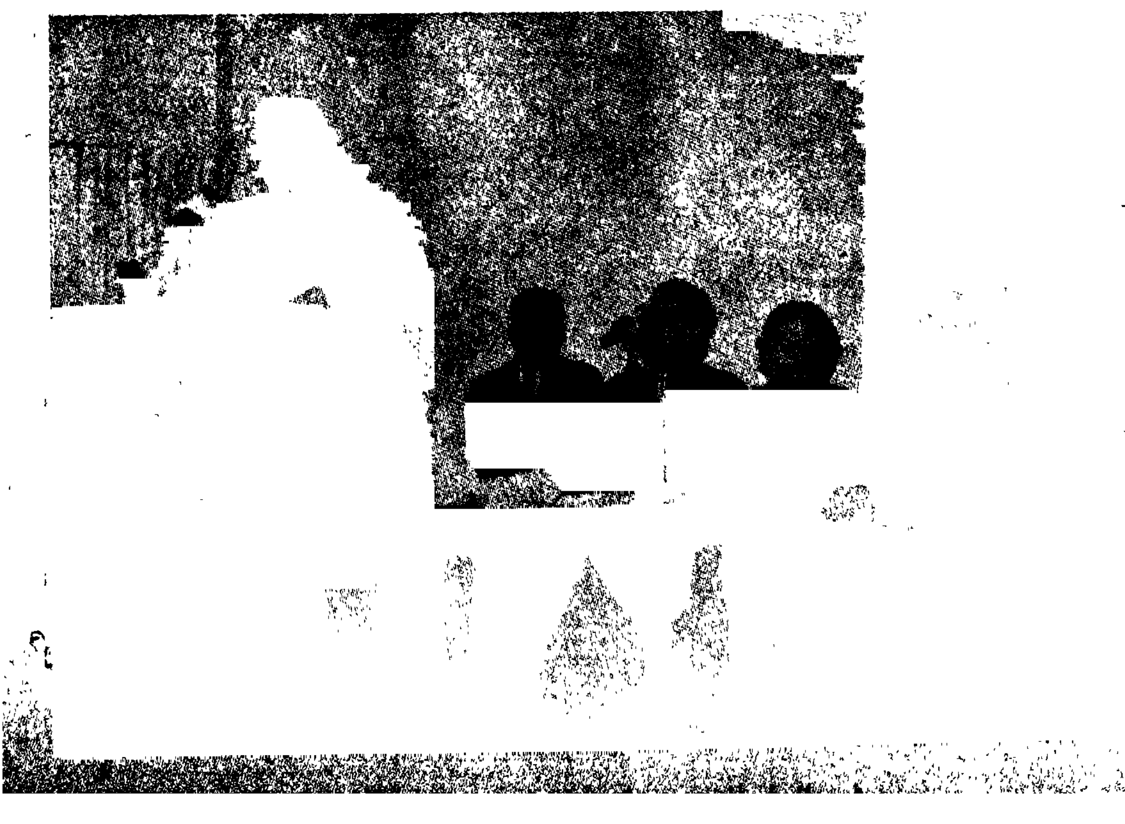
کچھ تصاویر ، کچھ مضامین ، کچھ خبریں ، کچھ کالم اور کچھ تبصرے

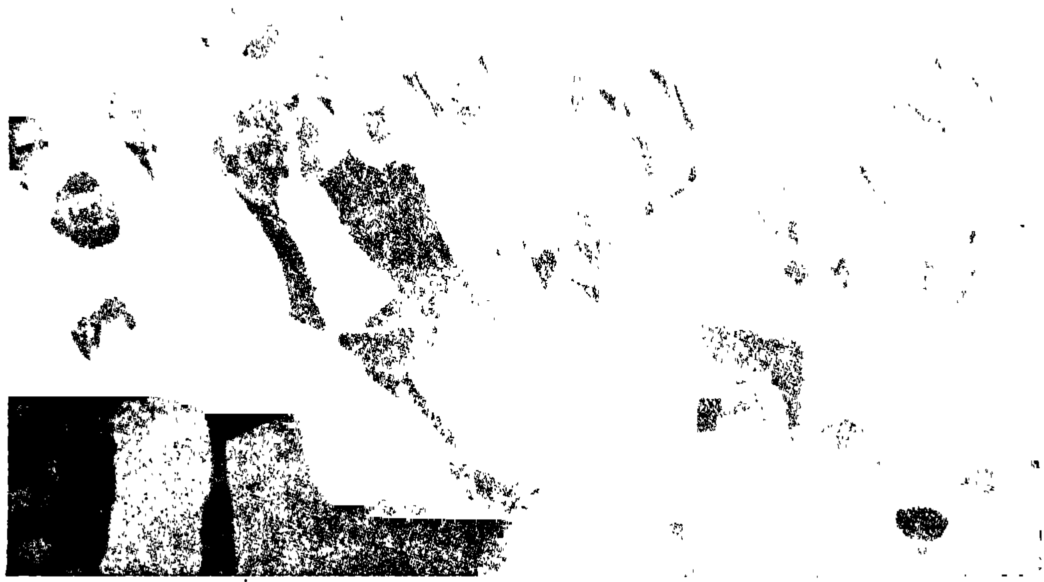


مدیر نقوش نے وزیر اطلاعات کی خدمت میں
”بیاض غالب نمبر“ کا نسخہ پیش کیا۔



جنرل شیر علی وزیر اطلاعات ، صدارتی خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں (راولپنڈی)





راولپنڈی



مضمون نگار



پروفیسر حمید احمد خان



سید وزیر الحسن عابدی

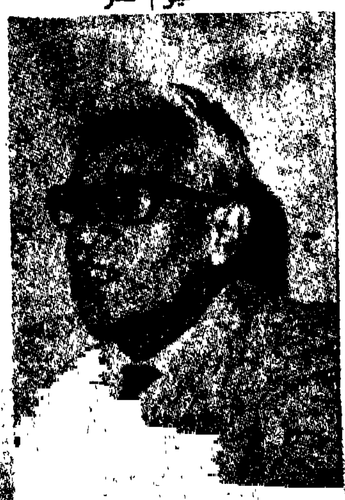


مولانا غلام رسول مہر



قیوم نظر





افسانے

(ایک طویل مختصر افسانہ، ایک ناولٹ)

(۱) زہر کا رنگ — جمیلہ ہاشمی

(۲) دھوکے باز — ڈاکٹر احسن فاروقی

زہر کا رنگ

جمیلہ ہاشمی

بولان میل تین گھنٹے لیٹ پہنچی تھی اور مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر گوتم اسٹیشن پر میرا منتظر نہیں ہوگا۔ کراچی شہر کی گہماگہمی میں ہر آدمی اتنا مصروف
ہوتا ہے کہ کوئی دور کے رشتے کے بھتیجے کے لیے تین گھنٹے بیکار نہیں بیٹھ سکتا، اور پھر گھر میں جیسا کہ مجھے معلوم ہوا تھا۔ گوتم کی خوب جمی ہوئی پریکٹس
تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وہ بہت مشہور تھے۔ کلینک کے پتے پر جانے کے بجائے میں نے وکٹوریا روڈ کے علاقے میں ان کا گھر ڈھونڈنے
کا سوچا۔ آدمی چاہے تو بھگوان کو ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ آدمی کا ڈھونڈنا کونسا مشکل ہے؟
اور اب دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ بھلا یاد کے اس پتلے سے دھاگے کے ناطے کوئی گھر ڈھونڈے جاتے ہیں؟ بابا نے کہا تھا "گوتم کا گھ
اُس کے کلینک سے بہت فاصلے پر ہے۔ گھر وکٹوریا روڈ پر ہے اور کلینک شہر کے گنجان علاقے میں۔" وہ ماں سے کہہ رہے تھے۔ میں نے ایف
ایس، سی کا امتحان پاس کیا تھا اور بابا میرے مستقبل کے متعلق بہت پُرامید تھے۔ وہ چاہتے تھے میں بھی گوتم کی طرح ڈاکٹر بنوں، خوب روپے
کماؤں، زندگی میں نام پیدا کروں، میرا نتیجہ سُننے کے بعد سے ماں کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ خوابوں میں کھوئی ابھی سے مجھے ڈاکٹر سمجھ
لگی تھی۔ بابا البتہ خوشی کے ساتھ ساتھ سوچ میں ڈوبے تھے۔ "داخلہ کس طرح ہو سکے گا، آج کل تو ہر کام سفارش سے ہوتا ہے یا رشوت کے بل بوتے
سفارش تو خیر گوتم کی وجہ سے ممکن تھی، مگر رشوت کے لیے روپیہ کہاں سے آتا اور اس لیے بابا نے بہت سوچ سمجھ کر ڈاکٹر گوتم کو لکھا تھا، نہ
شاید فون کیا تھا "اگر میرا داخلہ ممکن ہو، اور وہ ایک احسان کر سکے تو مجھے کراچی بھیجا جائے۔" وہاں سے جواب آنے پر میری تیاری شروع ہو
ماں یوں جلد جلد میرا ہر کام کر رہی تھیں، بہنیں بھاگ بھاگ کر میرا سامان درست کرنے لگیں، جیسے میں کسی بہت ہی اہم اور ضر
رازداری کے کام پر روانہ ہونے والا ہوں نئی رضائی، نئی چادریں خریدی گئیں۔ نیا بکس آیا، نئے کپڑے بنے، کھانے کے لیے کئی قسم کی مٹھائیاں
جانے کیا کیا۔ ہمسائے تک اس سپنوں کے سفر میں شریک تھے۔ عورتیں ماں کو بدھائی دیتیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے لڑکوں سے کہتیں
"منو کتنا قابل ہے، تم بھی ایسے ہی قابل بننا۔ کتنے زیادہ نمبر لیے ہیں اس نے۔" میں ہیرو بنا پھرتا تھا، کالج کے دوست کہتے تھے۔ "م
تم اب تو ہمارے سے گئے۔ خوش نصیب ہو، ڈاکٹر بن جاؤ گے، اور یہاں تو اب آگے پڑھنے کے بھی لالے ہیں۔ تم جب دوسری بار
ملو گے تو ہم کلرک بن چکے ہوں گے۔ چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے پھرتے یا نوکریوں کی تلاش میں! اور تم، تمہاری کون برابری کر سکتا ہے
باتیں سُن سُن کر میرا دماغ آکاش کی اونچائی پر تھا۔ میں بھی ماں کی طرح سپنے دیکھتا تھا۔

جب گاڑی چلی ہے تو بہنیں رو رہی تھیں۔ ماں نے بابا سے چوری ایک تھیلی مجھے دے کر ہولے سے کہا تھا:
"منو یہ تیرے لیے ہیں، میری طرف سے جب تجھے بہت ضرورت پڑے تو تب ہی ان کو استعمال کرنا، پردیس میں کون جا
آدمی کو سہارے کی تلاش ہو۔"

بابا نے کہا تھا، خط لکھنا، دوسروں پر بوجھ بننے کی کوشش نہ کرنا۔ گوتم نے نہایت مہربانی سے تمہارا داخلہ کرانے کا وعدہ کیا

نوٹ: یہ کہانی اسی زمانے کی ہے کہ سابق سندھ، کوئٹہ اور کراچی میں ہندو امن و امان سے بس رہے ہیں اور ان
روزمرہ زندگی محبتوں اور نفرتوں کے درمیان اس طرح گھومتی ہے کہ انہیں کسی فساد کا خوف نہیں۔

ے زیادہ مدد اُن سے نہ لینا، ایسے رشتوں کو آڑے وقت کے لیے رکھنا چاہیے۔

میراجی جدائی کے خیال سے اور آواز آنسوؤں سے بھاری ہو رہی تھی۔ دوستوں سے بچھڑنے کا غم۔ پردیس کی وحشت اور پھر دوڑ
یرا کام کرنے والی بہنیں جو بڑے پیار اور بڑی آس سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ماں جس کا چہرہ ایک لمحے دمکتا تھا اور دوسری گھڑی
رجاتا تھا۔ میں نے بابا کی بات کا جواب صرف سر ہلا کر دیا۔ ان کے بالوں میں سفیدی زیادہ تھی اور ٹوپی کے اندر سے جو حصہ نظر آتا تھا
رہ ملگجا تھا۔ بوجھ سے جھکے کندھے۔ آدمی کی وقت گزرنے کے ساتھ یہ دشا ہوتی ہے۔ میں نے سوچا۔ بابا کبھی جوان رہے ہونگے۔ میری طرح
، اور سپنوں سے بھرے دماغ والے اور اس گھڑی وہ اپنی خوشی میں بھی سنجیدہ تھے۔ آنے والے دن کا چہرہ پہلے سے کس نے دیکھا ہے؟
رے ہوئے مسافروں کی گہما گہمی میں کمی ہوگئی۔ سوار ہونے والے اطمینان سے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ وداع کرنے آئے ہوئے بلبر کھڑے ایسی
باتیں کررہے تھے۔ باتیں جن میں حسرتیں، آشائیں اور بچھڑنے کا دُکھ بھرا ہوتا ہے اور اس کے باوجود ان کا مطلب نہ سننے والے کو پورا
ں آتا ہے اور نہ کہنے والے کو۔ گارڈ نے جھنڈی ہلائی۔ سیٹی بجی، بھاری پہیوں میں حرکت ہوئی اور کھچ کھچ کی آواز کے ساتھ گاڑی پلیٹ فارم
سکنے لگی۔ رومال ہلے، ہاتھ ہلے۔ میری چھوٹی بہن نے رونا شروع کیا۔ اس کے رونے کی آواز مجھ سے دور ہوتی گئی اور ماں کا محبت
ے والا چہرہ اپنی مہربانی اور چمک کے ساتھ پیچھے چھوٹ گیا۔

کراچی کی ہوا جو دَم دَم چلتی ہے اور دامنوں کو تھپتھپاتی ہے مگر پسینہ خشک نہیں کرپاتی۔ چمکتے سورج تلے ایک سار بہتی جاتی ہے سڑک
ہیوں کا دریا رواں تھا اور مجھے گوتم چاچا کا گھر نہیں مل رہا تھا۔ مجھے بھی ضد ہوگئی تھی کہ کہیں نہ کہیں تو آخر میرے آس پاس وہ جگہ ہوگی
ا جس کی تلاش تھی۔ میں آخر اس سیدھی سپاٹ سڑک پر جو کئی چوک کاٹتی چوراہوں سے گزرتی، بتیوں کی روشنی سمیٹتی آگے بڑھتی ہے، وہ گھر
ں نہیں ڈھونڈ سکتا؟ میں نے جی میں کہا "اگر یہ گھر جس کا پتہ بھی ڈھنگ سے مجھے معلوم نہیں مل گیا تو میں زندگی میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ بڑا
ٹر بن سکوں گا وغیرہ وغیرہ۔" آج یاد آتا ہے تو ہنسی آتی ہے۔ آدمی جب جوان ہوتا ہے اور پُرامید تو ذرا ذرا سی باتیں اس کو مقابلے کے لیے
تی ہیں، تمام اونچی بلڈنگوں میں جاکر میں ڈاکٹر گوتم کا پتہ پوچھ چکا تھا۔ اب بڑ کے درخت کے نیچے کھڑا تھا اور ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا موڑ رد
در رہا تھا کہ اس میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ دھوپ سے سنولائے ہوئے چہرے مطمئن خوش سوچ میں ڈوبے میرے پاس سے گزر رہے تھے۔ صورتیں
خیال کی پرچھائیں کی طرح دیکھی ہوئی لگتی ہیں اور پھر بھی اجنبی ہوتی ہیں۔ گھنی شاخوں پر چمکتے پتے یوں ہل رہے تھے جیسے کسی ناچ کے توڑے سیکھ
ہے ہوں۔ آگے پیچھے پھر آگے پھر پیچھے۔ ان کی حرکت میں کوئی ترتیب نہ ہونے کے باوجود ترتیب تھی اور وہ سرسراہٹ کی لَے پر جھوم رہے تھے۔
ں یوں چپ تھا جیسے میرا سارا وجود سانس روکے کسی شے کا انتظار کر رہا ہو۔ عجیب بات تھی۔ اس چوراہے پر اجنبی شہر کے دل میں میں اپنے دل
ی دھڑکن کے رکنے کی راہ دیکھتا تھا۔ پھر مدہم سُروں میں کوئل کی کوک پتوں کے ساز کے ساتھ اونچی ہوئی مجھے ایسا لگا جیسے میں اس جنگل میں اکیلا
ہوں اور یہ کوک میرے لیے ہو۔ میرا دل ایک دم دھڑکا اور پھر ہر دل کی طرح یونہی بس جاری رہنے کے لیے سینے میں چلنے لگا۔ اس لمحے میں نے اپنے
پ کو نہایت بے بس اور کھویا ہوا سا پایا۔ ایک بالک کی طرح جو راستہ بھول گیا ہو۔

کسی بچے کے رونے کی آواز آئی تیز اور دُکھ بھری۔ میں نے درخت سے پرے جھانکا۔ ایک تختی پر گوتم لکھا تھا۔ تو میری تلاش سپھل ہوئی۔

بڑ کا درخت جس کی شاخیں فٹ پاتھ پر لٹک رہی تھیں۔ ان کے گھر کے سامنے تھا۔ پورچ پہ سایہ کیے ہوئے پھاٹک کو ڈھانپے ہوئے میں نے سوچا تھا چاچا کی بیوی ایک ادھیڑ عمر ماں کی طرح کی ہی ہوگی، چمکتا چہرہ جیسے چمپا کا رنگ ہو اور کہیں کہیں لکیروں کی وجہ سے کچھ تھکا ڈوبا ہوا۔ جس لڑکی نے دروازہ کھولا وہ تو میری بڑی بہن سے ذرا نکلتے قد اور تقریباً اسی کی ہم عمر تھی۔ بڑی بے آسرا سی لگنے والی معمولی سی لڑکی جس کو نہ آدمی سپنے دیکھنے لگتا ہے، اور نہ ہی جسے دیکھ کر گھبرا جاتا ہے نہ جس کی آنکھیں ہوش اڑاتی ہیں اور نہ ہی اس کا رعب پڑتا ہے۔ میں نے سوچا یہ چاچا کی لڑکی ہوگی، مگر اتنی اداس سی کیوں ہے؟

"ڈاکٹر گوتم جن کے رشتہ دار چمن میں رہتے ہیں، یہی ہیں۔"

اُس نے مجھے بہت غور سے دیکھا اور پھر کہنے لگی "منوہر ہو تم"

"جی میں منوہر ہوں" میں نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا، لاپرواہی سے اور ناز سے جیسے میں اس سے نکلتے قد کا ہونے پر اپنے آپ کو اس سے بڑھیا محسوس کر رہا ہوں۔ اُس نے دروازہ چھوڑ دیا اور میں پیچھے پیچھے ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔

"اصل میں گوتم تمہیں لینے صبح جا نہیں سکے تھے" اس نے تپائی پر ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ میں جو ایک تصویر کے سامنے کھڑا اُسے غور سے دیکھ رہا تھا، پلٹا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ میرا پلٹنا اور اُسے حیران ہو کر دیکھنا اس نے بھی محسوس کیا۔

پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے اس نے کہا "تم نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ اب دوپہر ڈھل رہی ہے۔ گوتم کی راہ دیکھی تو اور دیر ہو جائے گی وہ تین بجے سے پہلے کبھی نہیں لوٹتے۔ میں تمہارا کھانا نکال دیتی ہوں۔ یہ ہے غسل خانہ" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا:

کھانا کھاتے ہوئے میں سوچتا رہا یہ دھان پان سی لڑکی جس کو عورت کہنا درست نہیں یہ چاچی ہے۔ ڈاکٹر گوتم کی بیوی کمال ہے بھئی۔ پورچ کے اوپر کمرہ تھا۔ رنگ برنگ شیشوں والی کھڑکیوں میں سے دھوپ کی روشنی سے رنگوں کی چھوٹ سی فرش پر پڑتی تھی۔ بستر سفید چادر بچھی تھی، جیسے ہی میں لیٹا رنگوں کے لہریوں نے مجھے ڈھانپ لیا۔

میں سپنے دیکھنے کا عادی نہیں ہوں، میرا مطلب ہے مجھے بہت کم سپنے نظر آتے ہیں، لگتا ہے سونے کے ساتھ ہی میرا دماغ بھی اپنے خیالوں کو لپیٹ کر آرام کر رہا ہے۔ جب لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہر رات سپنے دیکھتے ہیں، تو میں یقین نہیں کرتا، میں نارمل آدمی ہوں، عام جیسے اور بہت لوگ ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگ سپنے دیکھیں اس سہ پہر کو جب میں وکٹوریا روڈ کے چوراہے پہ بنے اس گھر کے پورچ کے اوپر سو رہا تھا اور بڑ کی شاخوں میں چھپی کوئل رہ رہ کر کوکتی تھی۔ موٹروں کے شور سے ہنگامہ سا تھا۔ میں نے ایک عجیب سپنا دیکھا۔

میں نے دیکھا سات رنگ پروں والا ایک پرندہ ہے جو اپنی چونچ میں کوئی پھل پکڑے ہے، اور میرے سر کے قریب کبھی اڑتا ہے کبھی بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کے پروں میں سے بڑی میٹھی باس نکلتی ہے۔ اور یہ خوشبو میرے اندر ہی اندر سفر کرتی ہے۔ خون کے ساتھ رگوں میں ہے۔ میں بیہوش ہونے کو ہوں۔ پھر وہ پرندہ ایک شاخ پر بیٹھ جاتا ہے۔ شاخ پر نہ پتے ہیں نہ پھل۔ ننگی ہے، جیسے سردیوں میں برفباری کے درخت کا کوئی پتہ نہیں رہتا۔ ماتم کرنے کی آوازیں کہیں سے آ رہی ہیں۔ وہ پنچھی ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے جیسے ان کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہوئے اسے بھول جاتا ہے کہ اس کی چونچ میں کچھ ہے۔ وہ منہ کھولتا ہے۔ بولنے کی کوشش میں اس کی آواز گدھے کی آواز سے ملتی جلتی ہے۔ پھل نیچے گر جاتا ہے۔ میں جھک کر اُسے اٹھاتا ہوں تو وہ اندر سے کھوکھلا ہے، اور اصلی بھی نہیں ہے، رنگا ہوا مٹی کا کھلونا ہے۔ میں اور

دونوں پھول کی طرف دیکھتے ہیں، میری آنکھوں میں بھی افسوس ہے اور اس کی آنکھوں میں بھی چمک ہے جیسے ان میں آنسو ہوں، پھر گڑیا نے اس کھلونے کو الٹ پلٹ کر میں دیکھ ہی رہا ہوں کہ وہ میرے ہاتھ سے گر جاتا ہے، اور آواز کیسے بنا ٹوٹ جاتا ہے۔ بریک لگنے کی کرخت تیز آواز آئی اور میں جاگ گیا۔ شاید نیچے سڑک پر کوئی حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ دیر تک میں پاؤں نیچے لٹکائے بستر پر بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ میں کہاں ہوں ـــــ دروازہ آہستگی سے کھول کر وہ اندر آئی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اسے کھولا، رات کی روشنیاں پرے پرے جل رہی تھیں۔

گوتم تمہارے جاگنے کا انتظار کرتے کرتے دوبارہ اپنے کلینک چلے گئے ہیں۔ اب وہ رات کے دس گیارہ بجے ہی آسکیں گے۔ تم چلے جاؤگے یا کافی!

"آپ میرے لیے تکلیف نہ کریں، میں باہر جا کر پی لوں گا اور ہوٹل سے اپنا سامان بھی لے آؤں گا۔" اس کی آواز کی رسان سے مجھے لگا وہ میرے آنے کو بوجھ نہیں سمجھتی، نہیں بھئی اب پردیس میں تم چائے کیوں ہوٹلوں میں پیتے پھروگے۔ رسوئی ہے، وہ ابھی ایک منٹ میں بنا دیتی ہے" اور پھر وہ چلی گئی۔ اس کے پیچھے روشنیوں کے لرزتے سائے پتوں کی سرسراہٹ میں ملے۔ ٹریفک کے شور پر بستے شریر بچوں کی طرح کود کر اندر آتے اور پھر باہر جاتے رہے۔

ہوسٹل سے میں گوتم چاچا کے گھر آیا تھا۔ یہ غالباً پہلی اتوار تھی۔ ان آٹھ دنوں میں میں نے ایک دو لڑکوں سے سرسری سی راہ و رسم پیدا کی تھی اور بس لیکچروں کو سننے اور بڑی بڑی کتابوں کو اٹھاتے کا جادو ہی ایسا ہے کہ کچھ بھی سمجھ میں نہ آنے کے باوجود آدمی اپنے آپ کو ابھی سے ڈاکٹروں کی طرح سنجیدہ باوقار مصروف جاننے لگتا ہے۔ کمرے میں میرا ساتھی لڑکا بھی خاموش طبع سا تھا اور اس لیے ہفتے کی شام کو جب اگلے دن کا کوئی پروگرام نہ تھا، کتابوں پر کاغذ چڑھانے اور الماری ٹھیک کرنے کے بعد تھکا تھکا ہونے کے باوجود میں نے گوتم چاچا کے ہاں جانے کا سوچا اور پھر میرے دو چار کپڑے ان کے ہاں تھے۔ دھوبی شاید دے ہی آیا ہو۔

مایا بچے کو گود میں لیے کھڑی تھی آیا شاید کسی کام سے اندر گئی تھی۔ گوتم چاچا نے کہا:

"آؤ آؤ ہم لوگ ذرا کلفٹن تک گھومنے جانے والے تھے۔ میرا مطلب ہے میں تو کمپنی کے کسی افسر کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ مایا اور آیا سمندر کنارے ٹہلنے جاتی ہیں۔ اب تم بھی ان کے ساتھ ہی چلے جانا۔" پھر وہ موٹر لینے موٹر خانے تک گئے جو پچھلی طرف تھا۔ بچہ کلکاریاں مارتا اور ہمک ہمک کر ماں کی گود سے نیچے کودنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تندرست صحت مند گول مٹول سا سانولہ شیام سندر۔ میں نے ہاتھ اس کی طرف اٹھائے تو وہ یوں لپک کر میرے بازوؤں میں آیا کہ میں نے اسے مشکل ہی سے سنبھالا۔

مایا کہنے لگی "بہت شریر ہے پر تم سے اتنے دنوں میں خوب جان پہچان ہو گئی تھی نا۔ اس لیے یوں تمہاری طرف الٹ پڑا۔"

چھوٹے بہن بھائیوں سے دوری کی وجہ سے مجھے بھی شیام بہت اچھا لگا تھا اسے دیکھ کر مجھے ماں تی یاد آجاتی جو میرے آتے سمے اسٹیشن پر یوں تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ اب جانے کب میرا جانا ہو سکے کب بیتے دن کبھی لوٹ کر نہیں آتے نا میں اس کو گود میں اٹھائے کھلے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ کومل پتوں میں بسنے لگی جیسے اندھیرے کا سینہ چیر کر روشنی کی لکیر اسے اور گہرا اور ڈراؤنا بنا دے۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ رنگ برنگے آنچل پھڑپھڑا رہے تھے۔ موٹروں کی قطاریں ڈوبتے سورج کی روشنی میں کھڑی اس رونق کے باو

ایسی لگ رہی تھیں جیسے کسی ویران غیر آباد جزیرے پر اُتاری گئی ہوں، تماشا دکھانے، چیزیں بیچنے والے یہاں وہاں اِدھر اُدھر چکر لگاتے پھرتے تھے غباروں کے رنگوں میں ڈوبے ہوئے آدمی کو بہلانے کے لیے ہر آنے والے کی طرف بڑھتے تھے۔ سمندر آج بہت اندر کی طرف آیا ہوا تھا۔ پہلی تاریخیں تھیں نا۔

گوتم ہمیں چھوڑ کر چلا گیا وہ کہنے لگا:

"میں لوٹتے سمے تم لوگوں کو یہیں سے لے لوں گا۔"

سمندر کے کنارے دُور دُور تک میلا لگا تھا۔ جگہ جگہ دکانیں لگی تھیں، جو پہیّوں والی سرکس کی گاڑیوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجائی جا سکتی تھیں۔ شیام اپنی گاڑی میں سو گیا تھا جس کو آیا ہولے ہولے لیے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

برفباری کے طوفانوں میں رہنے والوں کے لیے پہلے پہل سمندر کا کنارہ چہل پہل اور رونق سے پُر دلکش اور دلرُبا ہوتا ہے۔ سامنے سیاہ سمندر حدِ نظر تک پھیلا ہے۔ جھاگ اڑاتی ہوئی لہریں ایک دوسری کے پیچھے بھاگتی آتی ہیں۔ شائیں شائیں کرتی ہوئیں۔ مانو ابھی اپنی تندی تیزی سے سب کچھ بہا لے جائیں گی اور ساحل تک آتے آتے دم توڑ کر شریر بچّوں کی طرح واپس جھاگوں اور شور سمیت سمندر کے اندر کودتی ہوئیں زیادہ دیر سمندر کی طرف دیکھو تو چکر آنے لگتے ہیں، اور پھر لگتا ہے آدمی ان چکروں میں گھوم رہا ہے، مٹ رہا ہے۔ لہروں کے ساتھ ساتھ اس مہاساگر میں کھنچتا چلا جاتا ہے اور آخر میں آدمی مٹ جاتا ہے۔ صرف چنگھاڑتی ہوئی مہیب آواز باقی رہتی ہے۔ میں نے بہت ساحل دیکھے ہیں۔ گھوما ہوں، ہر جگہ یہی احساس ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے یہ احساس مجھے ہی ہوتا ہو۔ اب تو میں سمندر سے خوف کھانے لگا ہوں۔ کون چاہتا ہے کہ وہ زندہ ہو اور پھر بھی فنا ہو جائے۔ اس کی ہستی کہیں نہ ہو۔ ریت کے ایک ناچیز ذرّے کی طرح ہواؤں، آوازوں اور شور مچاتی لہروں میں ل

گو میں نے زندگی میں پہلی بار ساحل دیکھا تھا، بس سمندر کے متعلق کتابوں میں پڑھا تھا وہ آج میرے پاؤں میں تھا۔ جہازوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دُور سمندر کے اندر بڑی بڑی بادبانی کشتیاں تنکوں کی طرح لہروں کے ساتھ اُٹھ اور گر رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا میرے منہ پر آ کر لگتی تھی۔ بڑی محنت سے سنوارے ہوئے بال بکھر رہے تھے۔ مایا نے ایک نہایت خوب صورت اسکارف اپنے بالوں پر لپیٹ رکھا تھا۔ مگر اس سے بھی اُس کی شکل کے معمولی پن میں کوئی جاذبیت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ نہ اُس کی آنکھوں میں کوئی جادو تھا اور نہ ہی اس کے جسم پر کوئی موہنی۔

آیا نے بچّہ گاڑی کو ایک طرف کھڑا کر دیا اور خود ایک ٹوٹی سی کرسی کھینچ کر اُس کے قریب بیٹھ گئی۔ میں اور مایا آگے اور آگے سمندر کے کنارے چلتے گئے۔

بات کرتے کرتے میں نے اُسے کہا "چاچی"

کہنے لگی "منوہر میں تم سے کوئی زیادہ بڑی نہیں ہوں، یہی دو چار سال کا فرق زیادہ سے زیادہ ہوگا۔ تم مجھے مایا کہا کرو۔"

میں نے کہا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں گوتم کو بھی چاچا کہتا ہوں۔"

مایا نے کہا "گوتم کی اور بات ہے وہ مجھ سے بھی پندرہ بیس سال بڑے ہیں، ان کو تم جو جی چاہے کہہ سکتے ہو، مگر مجھے "چاچی" کو

س لگتا، پھر رُک کر تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگی:

”پتہ نہیں کیوں مجھے جب بھی کوئی کسی رشتے سے پکارتا ہے۔ لگتا ہے وہ مجھ میں کسی اور کو تلاش کر رہا ہے۔ یا میں، میں نہیں کوئی اور ہوں۔“

ہم دونوں آگے ہی آگے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔

مجھے اچھا لگتا ہے کہ میرا ہر ملنے والا مجھے میرے اپنے نام سے پکارے۔ تم کو پتہ نہیں، گوتم کے سب دوست مجھے مایا جی کہتے ہیں۔ پہل تو سب کو تعجب ہوا مگر اب تو لوگ عادی ہو گئے ہیں۔ عورتیں بھی پہلے مجھے مایا کہتے ہوئے بجائے مسز گوتم کے عجیب محسوس کرتی ہیں۔ نے لگتی ہیں۔ اب میں کسی کی بھابی، کسی کی بہن، مسز گوتم کچھ نہیں بس صرف مایا ہوں۔

سورج لہروں میں کہیں نیچے ڈوب گیا تھا اور شراب کی سی سیاہ موجیں زیادہ تندی کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔ سمندر کے کنارے کا یہ بازار مجھے کہانیوں کی طرح کا لگا۔ الف لیلیٰ کی کہانیوں کا سا۔ دھواں دیتے گیس اور ٹمٹماتی ہوئی لالٹین جل رہی تھیں اور سروں پر آس پاس اندھیرا پھیلا ہو پُراسرار اور آوازوں سے پُر اور دل لبھانے والا تھا۔ ذرا پرے ہر آدمی کے پیچھے تاریکی تھی اور لہروں کی پُرشور گھٹنے اور بڑھنے والی آواز تھی۔ پہلی راتوں کا چاند سمندر کے ایک کنارے سے بڑھنے لگا۔ تاریکی میں تاروں کے نیچے روشنی پھیلنے لگی اور آدمیوں کے سائے ذرا واضح ہونے جہاں ہم تھے وہاں تک پانی آ گیا۔ آیا نے شیام کو ہلکے کمبل سے ڈھانپ دیا۔

لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ ٹخنوں تک گیلی ریت میں دھنس رہے تھے۔ عورتیں اپنے دامن بچانے کے لیے ساڑھیوں اوپر اڑسے ہوئے تھیں، پوڈر اور سرخی سے لپے پتے چہرے کاجل سے سیاہ آنکھوں کی وجہ سے زیادہ غیر انسانی لگ رہے تھے۔ بچے ہنستے ہوئے ان گاتے ہوئے یا قہقہے لگاتے ہوئے لڑکیوں کی تاک میں آئے ہوئے لڑکے اور جانے کیسے کیسے لوگ۔

مایا چپ چاپ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ میں بات کرتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ میں اُسے مایا کہنا نہیں چاہتا تھا، کہہ نہیں پا رہا تھا۔ سی رونق میں بات کرنا کوئی ضروری بھی تو نہیں ہوتا۔

پھر گوتم کی موٹر کا ہارن بجا، وہ کہنے لگی ”گوتم آ گئے ہیں۔“

میں نے کہا ”کیسے پتہ چلا؟“

”وہ آتے ہوئے لائٹ کو جلاتے بجھاتے آتے ہیں، یہ اشارہ ہے۔“

گوتم نے موٹر کھڑی کی، آیا نے سوئے ہوئے شیام کو گود میں اٹھایا۔ مایا نے بچے کی گاڑی کو تہہ کر کے پیچھے رکھا اور ہم سب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

گوتم کہنے لگے۔ ”مجھے ذرا دیر ہو گئی تھی۔ وہاں کچھ لوگ آ گئے تھے۔ ان سے باتوں میں خیال ہی نہیں رہا کہ تم لوگ راہ دیکھ رہے ہو گے۔ منوہر تم سناؤ بمبئی کالج کیسا لگا؟“

میں نے انہیں سب باتیں بتائیں۔

گوتم چاچا موٹر تیز تیز چلاتے ہیں۔ مگر انہیں اس پر انتہائی قابو بھی ہے۔ وہ بہت اچھے ڈرائیور ہیں، گھر آ گیا انہوں نے مایا سے کہا۔

میں اور تم منوہر کو کہیں باہر کھانا بھی کھلاتے ہیں اور پھر اسے اس کے ہوسٹل بھی پہنچا آئیں گے۔

آج سے پندرہ بیس سال پہلے کراچی اتنا آباد اور راتنا پُر رونق نہیں تھا، دو ایک مشہور چینی ریستوران تھے اور دو چار اچھا دیسی کھانا تیار کرنے والے ہندو ریستوران!

مایا کہنے لگی "چلتے ہو تو کہیں چینی کھانا کھلاؤ۔ گھر کی ترکاریاں اور ایک سی چیزیں کھاتے کھاتے تو دل بھر گیا ہے۔

گوتم کہنے لگے "منوہر سے پوچھ لو یہ چینی کھانا کھا سکے گا۔

"کیوں بھئی چینی کھانا کھاؤ گے" مایا نے اگلی سیٹ پر سے مُنہ پیچھے کر کے مجھے پوچھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی سوائے اپنے کھانے کے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میرے بابا کٹر قسم کے مذہبی آدمی ہیں، رشیوں مُنیوں کی طرح وہی کھاتے ہیں جو کتابوں میں لکھا ہے، وہی بھوگ کرتے ہیں جو دیوتاؤں نے آدمیوں کے لیے تجویز کیا ہے سنسکاروں کے مطابق رہتے ہیں۔

میں نے کہا "بابا کے پاس رہتے ہوئے ماں کے ہاتھ کا پکا کھاتے رہے ہیں۔ اب آپ جو کھلوا دیں۔

تو تم نے ابھی اُسے مایا کہنا شروع نہیں کیا" گوتم نے ہنس کر موڑ ایک کوٹھی کے اندر موڑی "یہ رہا تمہارا کھانے کا گھر" وہ موٹر کو بند کر کے نیچے اُتر آیا۔

ہوا چل رہی تھی اور پہلی بار اُس مُلگجے اندھیرے میں مَیں نے محسوس کیا کہ مایا اگر کسی کی طرف ذرا غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو اس کے پسینے چھوٹ سکتے ہیں، اس کی نبضیں تیز ہو سکتی ہیں، اس کا دل دھڑک سکتا ہے۔ مایا میں ایک ایسی طاقت ہے جو اس کے کمزور جسم سے بہت زیادہ قوی ہے۔ جانے اس کا منبع کہاں ہے؟ مگر یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ میں ذرا سا گھبرایا ہوا نیچے اُترا۔ مایا نے اپنی ساڑھی کی سلوٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ گوتم چاچا کے سفید بالوں نے مدھم جلنے والی چینی طرز کی لالٹین کی روشنی پکڑ لی، اور وہ الہ دین کے چراغ والا جادوگر لگنے لگا۔ برآمدے میں نہایت نفیس لکڑی کے کام کے بنے ہوئے پردے کے پیچھے سے نکل کر ایک لڑکی نے ہمارا سواگت کیا۔ اُس کی لمبی قمیص کا چینی سلک اژدھوں کی سبز تصویروں والا تھا اور اپنی دبی دبی چمک کے ساتھ بہت بڑھیا معلوم ہوتا تھا۔ ہال ایک دل لُبھانے والے ساز کی آواز سے بھرا تھا۔ ساز بجانے والے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ صدائیں جو دل میں پرانی یادیں جگاتی اور نیند کی طرح خوش آئند ہیں، ہلکی ہلکی نشہ لانے والی دھیمے سُروں میں کانوں سے نہیں آتما کے اندر اُتر جانے والی ساری نشستیں اس انداز سے لگائی گئی ہیں کہ بڑے بڑے منقش پردوں کے پیچھے چھپا جا سکے۔ مدہوش کُن سی فضا جس میں تیسرا آدمی اجنبی لگتا ہے اور باتیں کرنا بیکار معلوم ہوتا ہے۔

مایا اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ گوتم اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"پچھلی بار سے اب تک انہوں نے بہت سی تبدیلیاں کی ہیں۔

"کیا کچھ" مایا نے ہولے سے کہا۔

"یہ دیکھو پچھلی بار جب ہم آئے تھے تو ان لیمپوں کے شیشے سُرخ تھے۔ اب سبز ہیں۔ اور تم نے دیکھا۔ باہر برآمدے میں خوش آمدید کہنے والی لڑکی کا لباس کتنا بڑھیا ہے۔ میرا خیال ہے، وہ نئی آئی ہے کیونکہ پچھلی لڑکی سے اس کا انداز زیادہ دلنشیں اور آواز زیادہ سُریلی ہے۔ اس کی آنکھیں رسیلی اور ہونٹ بھرے بھرے ہیں۔ وہ اتنی صحت مند نہیں تھی، شاید یہاں کی آب و ہوا نے اس کو مجبور بنا دیا تھا۔

ست اچھی بات ہے کہ اُن کا اصل اسٹور چین میں ہے باسی سڑی ہوئی پُرانی چیزوں کو ٹھیک بنانے کے لیے یہ واپس وہیں بھیج دیتے ہیں
یہاں کے شوکیسوں میں سجانے کیلئے نئی ڈکیاں لے آتے ہیں، نئی چیزیں۔"

مایا اور میں اس کی باتیں سُن رہے تھے۔ میں نے کہا آپ کی نظر بہت گہری اور بڑی مفصل ہوتی ہے۔ ایک ہی نظر میں آپ نے اس
ں کی اتنی تفصیلات کو جان لیا۔

گوتم نے کہا: "منوہر میں ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر کو ماہرِ نفسیات۔ شعبدہ باز۔ گرو سب کچھ ہونا چاہیے۔

مایا نے کہا" ہر شے کا ہر وقت تجزیہ کرنے سے زندگی کا مزہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔ پہ بات یہ ہے کہ تمہاری نظریں عورت کی کھال کے
رباہر زیادہ دیکھتی ہیں۔"

گوتم نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں اگر شکایت پیدا نہ ہوتی تو میں سمجھتا تمہیں مجھ سے ذرا سا لگاؤ بھی نہیں ہے۔"

مایا نے پردے کے پیچھے کھڑے ویٹر کو اشارہ کیا۔

گوتم کو قریب سے دیکھنے اور اس کے مزاج کی حس سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُس سے ایک تفصیلی ملاقات ہی کافی نہیں ہوتی
، ایک بہت اچھا ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے مثال ماہرِ نفسیات بھی ہے اس کی نظر بہت سی چیزوں کا ایک ہی وقت میں جائزہ بھی
ے سکتی ہے، اور وہ ان سے حظ بھی اُٹھا سکتا ہے۔ اس کی شخصیت میں جادو کا سا اثر ہے اور کبھی کبھار اُس کی اس خود اعتمادی کی وجہ سے
اس سے بے پناہ نفرت بھی محسوس کر سکتے ہو۔ اس کی کہی ہوئی بات کم ہی جھوٹی ہوتی ہے۔ وہ دوسرے پر اپنا آپ مُسلط کرنا نہیں چاہتا اس کے
وجود کوئی اس کے جادو سے آزاد نہیں رہ سکتا۔

ہم خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ گوتم نے کہا: "بھتیجے چینی کھانے کو تم ایک ہی بار کھانے سے پسند نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے
نہیں اپنے مزے کو باقاعدہ ٹریننگ دینی ہو گی — کیونکہ یہ کھانے ایک خاص طرزِ زندگی ایک خاص طرزِ احساس اور ایک اجنبی اندازِ فکر کی
نشان دہی کرتے ہیں، یہ تہذیب بہت دور سے آئی ہے گر پھر بھی اتنی دُور سے نہیں کہ تم اس کو اپنا نہ کہہ سکو۔

مایا نے کہا: "آج یہ اپنی رشی اوتار کی جُون میں ہیں۔ آج اپنی ساری علمیت کے بل بوتے پر جواری کی طرح اپنی ساری پونجی داؤ پر لگا کر
اُس کا اثر تمہارے چہرے پہ دیکھنا چاہیں گے۔

گوتم نے ہاتھ ہلا کر کہا: "میرے ساتھ زیادتی ہے بالکل زیادتی مایا تم کو معلوم ہے مجھے اتنا وقت ہی کہاں ملتا ہے کہ کسی سے اپنے
جی کی بات کہہ سکوں، یہاں تک کہ میری تو تم سے بھی کم ملاقات ہوتی ہے۔ رات کو گیارہ بجے کلینک سے لوٹتا ہوں تو گدھے کی طرح اتنا تھکا
ہوا کہ ڈھنگ سے ڈھینچو ڈھینچو بھی نہیں کر سکتا۔"

میں زور سے ہنسنے لگا۔ وہ کیسی مضحکہ خیز بات کہہ رہا تھا۔

گوتم نے کہا۔ "ڈاکٹر کی زندگی اور گدھے کی زندگی میں کوئی فرق نہیں، اتنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ان بیس برسوں کے عرصے
میں میرا کتنا جی چاہا ہے کہ میں کبھی طویل رخصت پہ جاؤں۔ کراچی سے بس غائب ہو جاؤں، پھر برف پوش وادیوں میں پھولوں سے بھری ہوئی
زمینوں پہ طویل سیریں کروں، میلوں پیدل چلوں، صبح سے شام تک پیدل چلتا رہوں۔ اُونچی آواز میں گیت گاؤں، اس قدر زور سے چلاؤں

کہ اپنی آواز کی بازگشت سُن سکوں، آدمی کے جی میں کیسی کیسی تمنائیں ہوتی ہیں۔

مایا کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ کبھی تم بھی اس بساندے ہوئے نمی مارے شہر سے دُور کہیں جاؤ۔"

مایا نے کہا۔ میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے، تمہاری بساط پر میں تو ناکارہ مہرہ ہوں، میرے لیے کلفٹن کی ہوا بہت ہے میرے سینے میں کوئی دل ہے جو چاہے گا یا دماغ میں کچھ ہے کہ میں سوچوں گی چینی ریستوران اور بس!

میں نے کہا: "اب کے چھٹیاں ہوں تو آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔"

گوتم نے چمچ رکھ کر آگے جھکتے ہوئے کہا:

"مایا یہ مزے کی بات ہے منوہر کے ساتھ اکیلے تم چلی جانا

"تمہارے بنا کیا جاؤں گی" مایا نے نہایت بددلی سے کہا۔

ارے بھئی میں بھی تم سے آن ملوں گا۔" میں دو تین ماہ تک متواتر کلینک نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہاری طرح میرے پاس فالتو وقت کہاں ہے۔

اور پھر اس چینی ریستوران میں سبز شیڈ والے چینی لیمپوں کی روشنی میں نائلون کے نفیس پردے کے پیچھے ہم تینوں نے ہوتے ہوئے سارا پروگرام بنایا۔ گوتم اتنے جوش و خروش سے باتیں کر رہا تھا۔ جیسے مایا کی خوشیاں ہی اس کی زندگی ہوں اور اس کی خوشیوں کا حصول ہی اس کا سرمایہ۔ مایا اس سارے عرصے خاموش رہی وہ اداس نہیں تھی۔ صرف نہایت لاپرواہی سے بیٹھی تھی جیسے اس ساری گفتگو میں نہ اُسے یقین ہو اور نہ ہی وہ اس کی کچھ پروا کرتی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ گوتم اور مایا کا جوڑا ایسا تھا کہ ایک دوسرے سے بے نیاز تھا۔ مایا اکیلے پن میں گُن تھی اور گوتم اپنے کلینک میں۔

میں نے کہا "آپ کو ہمارے ہاں جا کر خوشی ہوگی۔"

مایا نے کہا "تم مجھے مایا نہیں کہہ سکتے مجھے اس آپ جناب سے سخت نفرت ہے۔

گوتم نے کہا بھتیجے یہ روایتی عورت نہیں کہ تم اسے رشتے سے جوڑ سکو۔ مایا صرف اور محض عورت ہے۔ میری بیوی کم اور عورت زیادہ ہے۔ یہ صرف مایا ہے سمجھے۔

پھر مایا کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"یہ جس ماحول سے آیا ہے وہاں تو محلے کی عورتیں بھی کچھ نہ کچھ لگتی ہیں کسی نہ کسی رشتے کی ڈور میں بندھی ہیں، تمہارے اس نظریے کو سمجھنے کے لیے منوہر کو وقت چاہیے۔"

دوسرے لوگ اور پردوں کے پیچھے سازوں کی دھن میں صداؤں کی اس لَے پر مدھم روشنی کی اس لَو پر جانے کیا کیا سوچتے ہوں گے ہوں گے۔ ہر آدمی دوسرے سے الگ طرح سوچتا ہے۔ دیکھتا ہے۔

رات گئے جب وہ مجھے ہوسٹل چھوڑنے کے لیے مڑے ہیں تو الوداع کہنے والی چینی لڑکی کی مسکراہٹ اس کے بھیگے بھیگے ہونٹوں پہ بڑی مؤدب اور دلفریب تھی اور اُس کے جسم کے زاویے بڑے خطرناک تھے جو چینی ریشم کے چست لباس میں واضح بھی نہیں تھے اور چھُپتے بھی نہیں تھے۔

مایا نے کہا، آدھی رات ہو چکی ہے۔ اب منوہر جاکر اپنے ساتھ والے لڑکے کو تنگ ہی کرے گا۔ کیوں نہ سب سو جائیں۔

گوتم نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں شریمتی۔ آپ کا گھر ہے اور آپ جسے چاہیں اپنے ہاں مہمان رکھ سکتی ہیں۔ اس نے موٹر گھر کی طرف موڑ لی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کراچی کا شہر اونگھنے لگا تھا۔ سڑکوں پر بتیاں سوئی سوئی تھیں اور چاندنی روشنی میں گھل گئی تھیں۔ سینماؤں کا شور کہیں دور ہو رہا تھا۔ لوگ آخری شو ختم ہونے پر گھروں کو جا رہے تھے۔

پورچ کے اوپر والے کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور سمندر کی نمی سے بھری ہوا چاندنی کے ساتھ اندر آ رہی تھی۔ فرش پر بچھے قالین کے پھول چاندنی میں دمکتے اور مہکتے خوشبو دیتے لگ رہے تھے۔ مایا نے مجھے گوتم کا رات کے پہننے کا پاجامہ دیا تھا۔ جو میرے ٹخنوں سے اونچا تھا۔ اکا دکا موٹریں گزر رہی تھیں اور ان کی روشنیاں کبھی کبھار پتوں سے چھن کر کھڑکی کی چوکھٹ کے باہر ہی ٹھہری رہتیں۔ ہوا میں پتے سرسرا رہے تھے اور چپ رہے تھے۔ مجھے لگتا تھا میں کسی جادو کے دیس میں آ گیا ہوں اور جانے اب کیا ہونے والا ہے، میرا روآں روآں منتظر تھا۔ جانے کاہے کو۔ پھر دور ہی کوئل کی کوک سنائی دی اتنے قریب سے جیسے وہ خود اس کمرے میں ہو۔ اس کھڑکی کی چوکھٹ کے باہر جو میں سحر زدہ سا اٹھا اور بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔ اس کے برابر کی بالکنی گوتم کے کمرے کی تھی۔

شیام کے رونے کی آواز آئی پھر آیا نے شاید اسے سلا دیا ہوگا، اور رونے کی صدا نہ تھی۔ کوئل بھی کوک کر سو گئی تھی۔ مجھے اپنی ماں یاد آ رہی تھی اور میں اکیلا تھا۔ میری منزل دور تھی۔

پھر گوتم کی آواز آئی "مایا میں باتیں نہیں کر سکتا۔ مجھے اس رات کا نوجوان دیا بڑا سستے پڑا! خطرہ بھی اب نہیں جتا سکتا۔ اگر تم کو نیند نہیں آ رہی اور تم باتیں کرنا چاہتی ہو تو جاؤ منوہر سے باتیں کرو۔ جاؤ اچھے بچوں کی طرح باہر کھیلو۔"

پھر بالکنی میں مجھے مایا کا سراپا نظر آیا، وہ درخت کے سائے میں بہت دیر کھڑی رہی اور پھر آہ بھر کر اندر چلی گئی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ کیسے وہ دو سرا تھ کے لیے پریشان ہے اور گوتم اس سے ایسا سلوک کرتا ہے جیسے وہ دس پندرہ سال کی بچی ہو جس کو جھڑکا جا سکتا ہے۔ پیار کیا جا سکتا ہے جو اس کے بچے کی ماں تو ہو سکتی ہے مگر اس کی بیوی نہیں وہ اس کی شریک حیات نہیں۔ صرف گھر کی مالکن تھی۔

میں نے سوچا میری بہنیں بھی ہیں۔ جانے انہیں کیسے لوگ بیاہ کر لے جائیں گے۔ اجنبی اور سخت گیر جو انہیں نوکرانیوں سے زیادہ نہیں سمجھیں گے جو گھر میں صفائی اور سکون کی خاطر عورت چاہیں گے۔ دل کے رازوں کی حصہ دار بنانے کے لیے نہیں۔

مجھے ماں یاد آئی گھر اور گھر کی سادگی اور برف پوش پہاڑوں کی تنہائی وادیوں میں گونجتی صدائیں خوبصورت شامیں پاگل کر دینے والی چاندنی اور درختوں کے لمبے سایوں کے نیچے بہنے والے خاموش جھرنے۔ اونچی نیچی راہوں پر ہرنیوں کی طرح چلتی ہوئی عورتیں اور لڑکیاں۔ صحت مندی اور حسن کی تصویریں۔ غربت سے بے بس مگر پھر بھی خوش لوگ۔

اتوار کے دن زندگی کی رفتار بہت سست ہوتی ہے نہ تو بھاگتے ہوئے لوگ ہوتے ہیں اور نہ ہی تیز تیز موٹریں بھگاتے ہوئے دفتروں میں جاتے ہوئے افسر۔ شہر دیر سے جاگتا ہے اور سستاتا ہے۔ جیسے کوئی اطمینان سے دھوپ تاپے یا سمندر کے کنارے ریت پر

لیٹ کر سورج کی شعاعوں میں اپنی جلد کی مرمت کرے۔ گوتم کو تو روز کی طرح کلینک جانا تھا۔ اس لیے میرے اُٹھنے سے پہلے وہ جا چکا تھا۔ چائے میرے برابر میز پر پانی کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میرا اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر پھر ہوسٹل جانے کے خیال سے اُٹھ کر میں نے غسل کیا۔ پانی ٹھنڈا لگا اور نیند کا ماتا جسم جاگ گیا۔ نہا کر باہر نکلا ہوں تو باورچی نے کہا "ناشتے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ میں من ہی من میں مسکرا تا جیسے کہانیوں کا راجکمار ہو۔ کھانے کے کمرے کی طرف چلا۔ مایا کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ مگر یہ تو میں نے بعد میں دیکھا ہے وہ تو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا ہوں تو بھی اس نے نظر اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کے بال کھلے تھے جو سیاہ تھے اور اس کی کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے ناتواں جسم کے گرد یہ بال جیسے جال ہو۔ اس نے خاموشی سے چائے بنا کر پیالی میری طرف بڑھا دی۔ ارے اس کے ہاتھ کتنے خوب صورت تھے اور انگلیاں کتنی مکمل گوتم کی طرح میں نے ابھی سے چیزوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

مایا تم نہیں پیو گی چائے۔

اُس نے میری طرف دیکھا۔ آنکھیں کتنی سُرخ تھیں۔

میں نے کہا "رات بہت دیر تک جاگی ہیں۔"

"نہیں زیادہ دیر تک تو نہیں۔ یہ تو میرا معمول ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پہلے تو کبھی آپ کی آنکھیں ایسی نہیں ہوئیں۔"

"منوہر سب دن ایک سے نہیں ہوتے۔ کبھی کبھار ایسی باتیں تنی تکلیف دیتی ہیں۔ جس کیلئے ہم سوچتے ہیں، ہم عادی ہو چکے ہیں۔" اس نے ہونٹ ہوئے سے کہا۔

"رات تو ہم لوگ خوش و خرم ہنستے ہوئے گھر آئے ہیں کیا ہوا تھا" میں نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔ گوتم کے لیے کبھی نہ کوئی بات اہم ہوتی ہے اور نہ بڑی۔ میں اس کے نزدیک بچی ہوں۔ اس سے بیس سال چھوٹی۔ تمہیں پتہ ہے اس نے مجھے گودیوں کھلایا ہے۔ جب میں پیدا ہوتی ہوں تو یہ لوگ ہمارے برابر میں رہتے تھے" وہ شکایت نہیں کر رہی تھی۔

"ایک بچی کی طرح اس نے مجھے اتنا پیار دیا ہے کہ اب اس کے لیے میری حیثیت محض اس کے بازوؤں میں کھیلنے والی مایا کی سی ہے۔ میں اس کے لیے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اور کچھ نہیں۔"

آنسوؤں کے ریلے سے اس کی آواز ٹوٹتی ہوئی تھی۔

چائے کی پیالی سامنے رکھے میں سوچتا رہا کہ گوتم اور مایا کا معاملہ قابلِ رحم ہے۔

وہ چُپکے چُپکے روتی رہی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ آنسو جو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے اس کے ہونٹوں کے کناروں پہ رُک رہے تھے۔ اس کی ساڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔

"رات میں نے چاہا اس سے باتیں کروں، مگر ہر رات وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا ہے، اور اتنا نیند کا ماتا کہ کھانا کھاتے ہی ایک بات کیے بنا سو جاتا ہے۔ مجھے صرف پیسے کی، زندگی کے آرام کی، بجلی کی چیزوں کی ہی ضرورت نہیں، اس کی توجہ کی ضرورت بھی ہے۔ شیام

پیدا ہوا تو میں نے سوچا تھا۔ اب میرا من اس میں لگے گا مجھے گوتم کی توجہ کی کمی محسوس نہیں ہوگی مگر پرانا زخم پھر ہرا ہو گیا ہے۔ وہ تنہائی میں مجھ سے کبھی اتنی باتیں نہیں کرتا، جتنی دوسروں کے سامنے۔ دوسروں کے سامنے وہ مجھ پر اپنی توجہ صرف کرتا ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا سمایہ کہتا ہے مجھ پر جان چھڑکتا ہوا لگتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ ہم سے خوش قسمت جوڑے بہت کم ہیں۔ تم نے دیکھا۔ رات وہ تمہاری موجودگی میں کس طرح مجھ پر سے نچھاور ہو رہا تھا۔ میرے لیے پروگرام بنا رہا تھا۔"

میں نے کہا "مایا تم آج ضرورت سے زیادہ دکھی کیوں لگ رہی ہو۔"

کہنے لگی "آج تم دیکھ رہے ہو۔ میری باتیں سن رہے ہو۔ روز میں اپنے دکھ کے ساتھ اکیلی ہوتی ہوں۔"

میں نے کہا "اگر تم اپنے آپ کو مصروف رکھو تو اکیلے پن کا یہ دکھ تمہیں تکلیف نہ دے"

کیا کروں آخر، میں کیا کروں، تم بھی سمجھنے کی بجائے مجھے نصیحت کرنے لگے ہو۔ اس نے سر اپنے بازوؤں کے حلقے میں رکھ لیا اور سسکنے لگی۔

"دیکھو نوکر ہیں آیا ہے یہ لوگ کیا سوچیں گے؟"

"سوچیں گے انہیں سوچنے دو" اس نے بازوؤں میں سر دیئے دیئے اسی طرح سے کہا"

اس کا جسم سسکیوں سے ہل رہا تھا۔

"مایا۔ مایا۔ مت روؤ مایا" میں نے بہت منت سے اسے کہا۔

نہیں میرے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تم سے میں نے اس لیے بات نہیں کی تھی کہ تم گوتم کے بھتیجے ہو۔ گوتم اور اس کا کوئی بھی میری تنہائی کے دکھ کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کا علاج کوئی نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا "تم جذباتی ہو رہی ہو"

منوہر اس زندگی کی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ نئے زمانے کا دکھ ہے۔ ہر آدمی اکیلا ہے اور مصروف ہے اور مصروف تر ہوتا جاتا ہے۔ گوتم مجھے بیوی نہیں، باندی سمجھتا ہے، اور باندی کے لیے کون وقت نکال سکتا ہے؟

وہ میری شکایت کو میرا بچپنا سمجھتا ہے مگر اصل یہ ہے کہ وہ اپنے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ نئے زمانے کا شکار وہ بھی ہے، اور میں بھی اور ہماری زندگی بھی۔

"تمہارا رونا محض وقت گنوانا ہے، جب تم سمجھتی ہو کہ تمہاری طرح کی اور بہت سی زندگیاں یونہی شکار ہو رہی ہیں تو پھر تم کیوں اتنی شدت سے اسے محسوس کرتی ہو"

مایا نے کہا تھا "اور لوگ ہیں وہ تھوڑے وقت میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، گوتم کو یہ پروا نہیں ہے۔ اس کے لیے میرا وجود محض فضول شے ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں۔ کیا پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے؟

"میں نے تو ابھی پیسہ کمانا شروع نہیں کیا۔ میں کیا جانوں" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ارے ناشتہ تو تم نے کیا ہی نہیں۔ مجھ پر کبھی کبھار ایسے دورے پڑتے ہیں، روتی ہوں اور پھر خود ہی چپ ہو جاتی ہوں۔ تم یہ

کھجوریاں تو کھاؤ۔ میں نے تمہارے لیے بنوائی تھیں۔"

آیا۔ شیام کو لے آئی، اور میں اُسے اٹھا کر لوریج کے اُوپر والے کمرے میں آگیا۔ اس کے ساتھ کھیلتا رہا۔ پھر مایا بھی وہیں آگئی۔ وہ بچے کے ساتھ بھی اتنی خوش تھی۔ آیا نے کہا اگر ہو سکے تو وہ اپنے بچوں سے ملنے چلی جائے۔ شام تک آجائے گی۔

مایا نے کہا منوہر اگر تم ٹھہرو تو میں آیا کو چھٹی دے دوں۔ تین چار بجے گوتم آجائیں گے۔ آج اُن کا کلینک نہیں ہوگا، ہم مل کر پکچر دیکھیں گے۔

اس کے سوال میں اتنا اپنا پن تھا۔ اور وہ جذباتی ہو کر میرے سامنے رو چکی تھی، اس لیے باوجود چاہنے کے میں جانے کا نام نہ لے سکا۔ شیام سو گیا تھا۔ دوپہر ہوگئی۔ میں اور مایا تاش کھیلتے رہے۔ پھر اس نے گوتم کے کھانے کا بندوبست کیا۔ ہم لوگ ذرا کی ذرا لیٹے پھر اُٹھ کر پکچر دیکھنے چلے گئے۔ رات کا کھانا میں نے نہیں کھایا اور پیدل ہی ہوسٹل کی طرف چلا۔ مایا نے کہا بھی کہ ہم تمہیں پہنچا آتے ہیں مگر میں نے پیدل چلنے کو زیادہ مناسب سمجھا۔

ایک ٹرم ختم ہوگئی۔ ماں کا خط آیا "جی لگا کر پڑھو۔ کرایہ کافی ہے، آنے جانے میں بہت خرچ اُٹھ جائے گا۔ اس لیے اگر اپنا آنا دوسری لمبی چھٹیوں پر اُٹھا رکھو تو بہتر ہے۔ مجھے اس آنے والے وقت کا خیال آتا ہے، جب تم پڑھ لکھ کر بڑے کامیاب ڈاکٹر بن جاؤ گے اور میں فخر سے اپنا سر اُونچا کر سکوں گی۔ مالتی تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ روتی بھی ہے، تمہارے پاس آنے کی ضد بھی کرتی ہے۔ مگر لڑکیوں کی ضد کیا ہے؟"
ایسی ہی چھوٹی بڑی باتوں سے خط بھرا تھا۔ پھر چھوٹا سا پرزہ تھا۔ بڑی بہن کا وہ سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا مجھے یاد کرتا تھا۔ بھلا ذرا سا بچہ مجھے کیا یاد کرتا۔ بس میرا جی خوش کرنے اور مجھے اپنی یاد کا یقین دلانے کے لیے اُس نے لکھا تھا۔ چھوٹے بھائی کا خط تھا۔ اس نے اپنے اسکول کی گپ شپ لکھی تھی۔ ٹیم کا کپتان ہو گیا تھا۔ استاد اس سے خوش تھے۔ شکار کی ایک ٹولی بنائی تھی اور کُتے پال رہا تھا۔ کتوں کی قسمیں اور ان کی اچھی بُری نسلیں چار مضمون کا ایک دفتر تھا۔ اُسے مجھ سے محبت تھی مجھ پر دشواش تھا، اور اسی لیے اس نے خط میں اپنے منصوبوں کے متعلق سب کچھ اُگل دیا تھا۔

خط پڑھ کر میرا جی ایک دم اُداس ہو گیا۔ پر ہوتے تو میں اُڑ کر چلا جاتا مگر چھٹیاں صرف دس پندرہ دن کی ہی تھیں، اور ہم اتنے امیر نہ تھے بابا ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑتے تھے۔ تب کہیں جا کر مہینہ گزرتا تھا۔ ضروریاتِ زندگی یہاں نسبتاً سستی تھیں ورنہ بڑے شہروں میں تو گزارہ مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

گوتم نے کہا "ہوسٹل میں کیا پڑے رہو گے۔ اب گھر نہیں جا رہے تو یہاں آجاؤ۔"

مجھے یاد آگیا بابا نے کہا تھا۔ رشتہ داروں کی ہمدردی اور محبت کو آزمانے سے پہلے بُرے وقت کے لیے سنبھال کر رکھنا چاہیے میں نے اس سے کہا "میں پڑھنا چاہتا ہوں" تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ پھر مایا سے کہنے لگا "سوگندرے لو جو میں نے امتحان کے لیے ایک ماہ سے زیادہ کبھی پڑھا ہو۔ تم کہاں کے اتنے پڑھنے والے آگئے پاگل نہ ہو۔ بھلا امتحان سے چھ ماہ پہلے بھی کوئی پڑھتا ہے۔ میری مانو یہاں آجاؤ۔ شیام تم سے کافی مل گیا ہے خوش ہوگا۔"

مایا اس ساری گفتگو میں بالکل حصّہ نہیں لے رہی تھی، وہ اطمینان سے بیٹھی تھی، جیسے میرے یہاں آنے یا نہ آنے سے اُسے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

دوسرے دن گوتم میرے ہوسٹل پہنچا اور زبردستی مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر لے آیا۔

بڑ کے سائے میں کوئل کی کوک سے بھرے اور سات رنگوں والے کمرے میں میرا تقریباً پندرہ دن ٹھہرنا ہونے کے یہ سامان تھے گوتم جب کلینک جا رہا ہوتا تو میں بالکنی میں کھڑا ہوتا، اسے الوداع کہتا، کبھی کبھار مایا بھی وہیں آجاتی اور میرے ساتھ ہی پتوں کی اوٹ میں کھڑی ہاتھ ہلاتی۔ تین چار دن کے اندر ہی مجھے لگنے لگا جیسے گوتم تو وقتی طور پر یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ گھر مایا کا اور میرا ہے۔ کتنا عجیب خیال تھا۔ بگاڑنے والے خیالات، خراب کرنے والا بُرا خیال، اور اس خیال کو ذہن سے دور بھگانے کے بجائے میں نے تپسیا کرنے کی حد تک اپنے آپ کو گھیر گھار کر اندر ہی روکے رکھا ہے۔

دوپہر کو کھانے پر ہماری ملاقات اس سے ہوتی تو وہ مریضوں، دواؤں اور ایسی ہی بے سر پیر کی باتوں میں ہمیں اُلجھا دیتا۔ مایا کے رشتے میں بھی شاید شیام سے بڑا ایک بچّہ تھا، وہ مجھے اور شیام دونوں کو حکم دیتی سر کے بل کھڑے ہو جاؤ۔ ہنستے ہنستے دوہرے ہوتے۔ ہم دونوں اس کی بات ماننے میں لگ جاتے۔ کہتی بیشک میں مایا ہوں مگر ہو تو تم گوتم کے بھتیجے اور شیام کی طرح کے بچے تو ہو۔"

میں کہتا جس طرح شیام تمہارے گلے میں باہیں ڈال کر تمہیں اپنے ساتھ لگاتا ہے۔ تمہارے مُنہ کو اپنی طرف پھیر کر تمہاری آنکھوں میں جھانکتا ہے۔ میں ایسے کب کر سکتا ہوں۔

بنا غصہ منائے کہتی "بڑوں کو یہ رعایت نہیں ملا کرتی من ہر"

"تم مجھے من ہر کیوں کہتی ہو، میرا نام تو منوہر ہے۔" میں اس سے پوچھتا۔

"بس ہمیں اسی طرح اچھا لگتا ہے تمہارا نام من ہر کا مطلب ہے من کو ہارنے والا۔" وہ ہنس کر کہتی۔

"اگر من ہار دوں گا تو میں کام کیسے کروں گا۔ میری زندگی ہے۔ اس کے بغیر میں بھلا پاگل آدمی بھی کچھ کر سکتا ہے۔ نہیں مایا مجھے یہ سراپ نہ دو میں تو تم سے اشیرواد لینے کے لیے اتنی دور آتا ہوں، تم شیام کی ماں ہو۔" میں نے اس سے کہا۔

ایسا ہی ملا جلا سا رشتہ تھا میرا اور اس کا۔ میرا من اُلجھتا تھا۔ کبھی لگتا وہ دیوی ماں کی طرح مہربان ہے۔ ہنستے ہنستے وہ رک جاتی، اور بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگتی جن میں سوال ہوتے اور میں گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگتا۔

کیا بات ہے من ہر تھک گئے ہو کیا؟ وہ بڑی بہن کے سے پیار اور توجہ سے پوچھتی۔

میں پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا تو وہ بڑے ہوشربا انداز میں بازو پیچھے کی طرف ٹیکے ان کے سہارے جھکی یوں کہ اس کا سارا جسم اوپر کی طرف تنا ہوا ہے۔ بیٹھی ہوئی ہوتی۔ پہلے پہل مجھے اس کی اس بیباکی سے بہت شرم آئی۔ پھر مجھے اُسے یوں دیکھنے کی عادت پڑ گئی۔ دیکھنے کی دعوت دینے کا یہ انداز۔ بولتی ہوئی آنکھیں، ہنستے ہوئے ہونٹ، مجسمے کی طرح اپنے کو بنانے والے کے فن کی داد طلب کرتا ہوا جسم۔ ان دنوں مجھے مصوری اور آرٹ کسی کے متعلق بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ جتنی عورتیں بھی زندگی میں آئی تھیں، انہوں نے اپنے جسم کو خزانوں کی طرح چھپایا ہی تھا۔ مایا کی بیباکی

آپ ظاہر کرنے کی خواہش مجھے اس کی طرف کھینچتی تھی۔ لگتا تھا میرے اندر کوئی شے اتنی تنی ہوئی ہے جو ذرا سی حرکت سے ٹوٹ جائے گی۔
مایا نے خاص ریاض کیا تھا وہ ایسے ہی بُت کی طرح بیٹھی رہتی اور مجھ سے باتیں کیے جاتی۔
اس کا باتیں کرنے کا انداز ہی تھا جو اس کے جسم کے خطوط میں دلآویزی، آنکھوں میں جادو بنتا تھا۔ ہم دیکھی ہوئی پکچروں کی کہانیاں پھر سے دہراتے، بحث کرتے، وہ ہیروئن کی طرف داری کرتی اور میں ہیرو کی۔ اب مطمئن جانور کی طرح جو پیٹ بھرنے کے بعد اپنے شکار کو سامنے دھرے پنجے چاٹتا ہے۔ وہ گوتم سے متعلق بہت کم بولتی اور میں حیران تھا وہ اس دن روتی ہوئی المیوں کا ذکر کرتی ہوئی عورت کیا ہوئی؟ میں اپنے کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا یہی میں یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ میری وجہ سے مطمئن تھی۔
ایک شام گوتم کہنے لگا "مایا تم منوہر کو لے کر سیر کو کیوں نہیں چلی جاتی۔ میرے ایک دوست نے ہاکس بے سے دور ہٹ بنائی ہے اسے کسی بڑے مصور سے پینٹ کروایا ہے۔ مگر اس کی بیوی انڈیا چلی گئی ہے۔ اب قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ کچھ دیر اور آ نہ سکے گی، وہ یہ ہٹ اسے تحفتہً دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بھی دعوت دی ہے بلکہ کہا ہے کہ اگر چاہوں تو دو چار دن ایک ہفتے کے لیے جا کر رہوں۔ میری اپنی تمنا ہے کہ سمندر کے کنارے گھر بناؤں اور اُسے سجاؤں۔ پھر مایا کے ارپن کر دوں۔
کہنے لگی "اگر تم ایسی باتیں نہ بھی کرو تو کیا ہے۔
گوتم میز پر سے جھک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرے بالوں کی سُفیدی میں سیاہی گھلنے لگی ہے۔ مایا کم از کم تم اس عمر میں تو مجھے جھوٹا اور فریبی نہ سمجھو۔"
مایا نے کہا "تم غلط سمجھے ہو نہ میں تمہیں جھوٹا کہتی ہوں، اور نہ فریبی، مجھے معلوم ہے سوچنے کی حد تک تم مجھے دروپدی اور اپنے کو بھیم سمجھتے ہو۔ سورگ کے سبب سے بڑھیا اور خوشبودار پھول تم میرے بالوں میں سجانا چاہتے ہو۔ مگر بھیم کی طرح تم اس پھول کو لانے کیلئے نرک اور سورگ کے فاصلے نہیں ناپنا چاہتے۔ تمہارے خیال بہت بڑھیا اور تمہارا جوش صرف سوچ تک ہی رہتا ہے۔"
"ہیر۔ ہیر" گوتم نے تالی بجا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھتے ہو منوہر میری بیوی کتنی بڑھیا تقریریں کرسکتی ہے۔ اس کی نظر کہاں تک پہنچتی ہے۔ تم بھی بھگوان سے دعا کرو کہ ایسی عمدہ دھرم پتنی تمہیں ملے۔
مایا نے چڑ کر کہا "تم کو تو میری عمدگی برتنے کی فرصت نہیں ہوتی وقت نہیں ملتا کہ مجھ سے بات کرسکو تمہارا کام ہی تمہاری زندگی ہے۔ کیوں نہیں مجھے منوہر کو دان کر دیتے۔"
"بات تو بہت معقول ہے اچھا سوچیں گے۔ اگر منوہر اچھے نمبروں میں پاس ہوگیا تو انعام کے طور پر ہم اُسے مایا دے دینگے" گوتم نے خوش دلی سے کہا۔
میں دم سادھے چپ تھا اور چائے کی پیالی میں دیکھ رہا تھا۔
گوتم نے کہا "منوہر بھتیجے گھبرا گئے ہو۔ مایا کا انعام تمہیں قبول نہیں ہے کیا؟ تمہارا رنگ اُترا ہوا کیوں ہے؟
میں نے اوپر دیکھا مایا میری طرف دیکھ رہی تھی دلچسپی سے اور آنکھوں میں ہنسی لیے۔
گوتم نے اُٹھتے ہوئے کہا "بھئی دو چار دن کے لیے نہیں تو ایک آدھ دن کے لیے چلتے ہیں۔ میں بھی چلوں گا اس نے اپنے

ٹ کی تعریف میں اتنی باتیں کی ہیں کہ میرا بھی جی چاہتا ہے دیکھوں۔"

مایا کھل اٹھی، بولی" اس سے اچھی بات کیا ہے۔ ارے اگر تم چلو تو میں ہر جگہ جا سکتی ہوں بھلا کوئی تفریح تمہارے بنا بھی ہو سکتی ہے۔"

گوتم اس کے قریب کھڑا تھا مایا اپنی کرسی پر اڑی بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا۔ پوجنے کی حد تک اُسے چاہتی ہے۔ رف اسے۔ اس کے متعلق میں نے جو اندازے اتنے دنوں میں لگائے تھے۔ سب ایک دم غلط اور میرے اپنے ذہن کی پیداوار لگے عورت یک پہیلی ہے کسی سے نہ بوجھی جانے والی۔ میں میز چھوڑ کر بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔ اُس گھڑی مجھے اپنا آپ اتنا اکیلا اور قابلِ رحم لگا۔ قابلِ رحم مٹی کا کھلونا جو سات رنگ والے پرندے نے اپنی چونچ میں پکڑا ہوا تھا اور جسے اس نے گرایا تو وہ بنا آواز کئے ٹوٹ گیا تھا۔ پتہ نہیں، اور لوگ اتنے بڑھیا سپنے کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ اُس گھڑی مجھے ماں اور گھر بہت یاد آیا۔ پیسوں کی خاطر اپنی چھٹیاں یہاں گزار رہا تھا۔ فضول بیکار ٹیپ ریکارڈ چلا تھا اور گوتم ناچ رہا تھا۔ اس کا ترشا ہوا جسم کسی دیوتا کی طرح مضبوط اور مکمل تھا۔ اس کے نیچے تلے قدم بڑے اعتماد سے موزیک کے اس فرش پر پڑ رہے تھے۔ مایا نہانے کے لباس پر ایک سنہری لبادہ پہنے آلتی پالتی مارے ننگے فرش پر بیٹھی اپنے پاؤں کے ناخنوں پر رنگ لگا رہی تھی۔ اس کے بال لبادے پر پیچھے تک پھیلے تھے۔ ہم صبح یہاں آئے تھے۔ سمندر گہرا نیلا صحرا کی طرح خاموش اور اپنے اندر طوفانوں کو دبائے پھیلا تھا۔ یہ رنگ جو سپنے لاتا ہے۔ یہ نیلاہٹ جس کو دیکھ کر لگتا ہے۔ آکاش نیچے اُتر آیا ہے۔ ہوائیں ابھی وہ زور نہیں آیا تھا جو ہر شے کو اپنے ساتھ اُڑا تا ہے۔ چھٹیاں منانے والے اور لوگ دور دور کی ہٹوں میں آئے ہوئے تھے۔ ہاکس بے پر جو رونق آج کل ہوتی ہے۔ اُن دنوں وہ تو نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھار تو لگتا ہم دھرتی کے آخری سرے پر آن پہنچے ہیں۔

گوتم نے کہا" بھتیجے تمہارا میرے ناچ کے متعلق کیا خیال ہے۔"

میں نے کہا" مجھے ناچ کی کیا خبر ہمارے ہاں تو صرف لڑکیاں ناچ سیکھتی ہیں، اور وہ بھی ضرورت سے شادی نہیں ہو سکتی نا!"

گوتم کہنے لگا" تمہیں معلوم ہے مایا سے بھی میں نے اسی لیے بیاہ کیا ہے کہ سارے سندھ میں اس سے بہتر ناچنے والی اور کوئی لڑکی نہ تھی۔"

مایا بولی اگر سوائے اس کے تم نے میری اور کوئی خوبی بھی دیکھی ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

گوتم نے کہا" ناچنا دیوتاؤں کا اپنا پسندیدہ مشغلہ ہے اور دیوتا کو خوش کرنے کے لیے دیو داس میں اس سے بڑھ کر خوبی اور کیا ہو سکتی ہے۔

مایا اٹھی اور خاموشی سے اس کے ساتھ رقص کے چکروں میں گھومنے لگی۔ گوتم نے نیا اور کسی طویل ناچ کا فیتہ بدل کر لگایا۔ مجھے پھر اکیلے پن کے دکھ نے ستانا شروع کیا۔

شیام کے چہرے پر ہوا آ کر لگتی تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں آیا کی ساڑھی کا پلو پھڑپھڑا رہا تھا۔ اور اس کے سر سے بار بار اُتر جاتا تھا۔ شیام ہنس رہا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے گنتی کے دانت سرخ ہونٹوں میں سے دکھائی دیتے بڑے پیارے لگتے تھے۔ گول مٹول سا چہرہ۔ وہ ہاتھ مار رہا تھا اور یونہی ہنس رہا تھا۔ اس کی ٹوپی کا ربن اس کی ٹھوڑی کے نیچے تھوک سے بھیگ کر چپکا ہوا تھا۔ میں پتھروں پر پاؤں دھرتا

آہستہ آہستہ نیچے اُتر آیا اور نیلے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دُور تک اندر بجتے ہوئے ساز کی گت نے میرا پیچھا کیا پھر ہوا اُسے مخالف سمت میں اڑانے لگی اور میں اکیلا رہ گیا۔

بے دھیانی میں جب میں سمندر کے اندر تک گئی چٹان کو پھلانگ کر دوسری طرف کو دا ہوں تو ایک بدیسی جوڑا لیٹا ہوا تھا میں کھنکھارا ہوں، مگر انہیں کچھ خبر نہیں ہوئی اور مجھے اپنے ننھیال میں گزاری چھٹیاں یاد آئیں جب میں اسی طرح گھومتے نکلا تھا اور دو سانپوں کو پیچ در پیچ لپٹے دیکھ کر خوف کے مارے میری رگوں میں خون جم گیا تھا۔ اپنے پاؤں میں لپیٹے اس جوڑے میں سے ایک نے میری طرف دیکھا تھا۔ مجھے پلٹتے دیکھتا رہا تھا۔ مگر یہ جوڑا انہیں تو کچھ خبر نہیں تھی، شاید یہ ہنی مُون منانے نکلے تھے۔ یہ اُن کا اپنا گھر تھا۔

ہوا میں تُندی آتی گئی۔ سمندر کا صحرا جھاگ کے ریت اُڑاتا گوتم کے بازوؤں میں چھپی طاقتوں کی طرح ہولے ہولے اٹھا اور ناچ کے چکروں میں گھومنے لگا۔ پھوار پڑنے لگی۔ میرا جی تھا میں واپس نہ جاؤں۔ اس لیے میں آگے آگے چلتا گیا۔ کہاں۔ کہاں۔ بنا منزل کے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ایک دو اور غیر مُلکی جوڑے تھے ننگے پاؤں میں مچھلی کے پاؤں کے سے پتوار باندھے تیر رہے تھے۔ ربڑ کی کشتی کو پانی میں ڈال کر کم گہرے پانی میں چلا رہے تھے اُن کے ماں باپ سمندر کے اندر تک بنی چٹانوں تک تیر رہے تھے۔ زمین پر آخری انسان۔ مجھے نمی سے بھری نیلاہٹ سے بھیگی پھواروں والی اس ہوا کے جھونکے جو ہوش اڑائے دیتے تھے بھلے لگے۔ قدموں کے نشانوں کو جھاگ اڑاتی لہریں مٹا دیتیں۔ فاصلے لمبے ہوتے گئے۔ میں آگے ہی آگے نکلتا چلا گیا۔ پھر یوں ہوا کہ مجھے اس تنہائی سے خوف آنے لگا۔ مجھے لگا میں ہوں ہی نہیں۔ ایک ناچیز ذرے کی طرح پانی کے ایک قطرے کی طرح۔ مہیب، خوفناک سفید جھاگ اور رنگ برنگ پتھروں کی چمک تھی۔ میں ایک پتھر کے کنارے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پتھر اتنا بڑا تھا کہ میں اس کے کنارے پر ایک کیڑے کی طرح چمٹا ہوا لگتا تھا۔ جو اڑ جانے کے خوف سے اس پہ لگ گیا ہو۔

ریت پر پانی کا سانپ مرا پڑا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں کھلی تھیں جیسے سمندر کی جرأت پر حیران ہوں۔ ہر جاندار اپنے آپ کو دُنیا کا محور سمجھتا ہے۔

جانے میں کب تک وہاں بیٹھا رہتا۔ اگر ہوا کے کندھوں پر اُڑتی من۔ ہر کی آواز مجھ تک نہ پہنچتی۔

گوتم نے کہا۔ بھتیجے۔ تم نے تو ہمیں چکرا دیا تھا۔ کہاں گم ہو گئے تھے؟"

مایا نے کہا "تمہارا کیا دنیا تیاگ دینے کا ارادہ تھا"

میں نے کہا " یہ جادو کرتا ہوا سمندر مجھے اڑا کر جانے کہاں لیے جاتا تھا"

گوتم نے کہا "تو تم نے بھی چیزوں کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ جاگنے لگے ہو!

مایا بولی۔ تم میں یہی خرابی ہے گوتم۔ ہر ایک سے یہ توقع کرنے لگتے ہو کہ وہ تمہاری طرح سوچے، تمہاری طرح رہے۔ تم اپنے آپ سے اتنی محبت کرتے ہو کہ اپنے سوا باقی لوگ تمہیں سوئے ہوئے لگتے ہیں"

دیکھا تم نے منوہر، گوتم نے ٹفن کی ٹوکری کھولتے ہوئے کہا " مایا ایسا کوئی لمحہ جانے نہیں دیتی۔ جب یہ مجھ پر حملہ آور ہو سکتی ہو۔ بھوک کی شیرنی کی طرح ہر وقت تاک میں رہتی ہے"

پھر اس نے ایک بڑا سینڈوچ میری طرف اچھال دیا۔ اگر میں بروقت اسے پکڑ نہ لیتا تو گر گیا ہوتا۔

یہ لو اس نے مایا کی طرف بھی ایک سینڈوچ اُچھالا۔ شیام سوچ چکا تھا اور آیا دوسرے کمرے میں تھی۔

ہوا کے زور سے غبارے کی طرح پھولتے لبادے کو سمیٹتے ننگے پاؤں خطرناک پتھروں کے کناروں پر رکھتی مایا، گوتم کے پیچھے پیچھے تیرنے کے نیچے اُتر گئی۔ تھکے تھکے قدموں سے پھر اُن کے ساتھ ساحل پر آ گیا۔

یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ دونوں کتنے مکمل ہیں۔ گوتم کی نگاہوں کے سامنے مایا پھول کی طرح کھل جاتی۔ اس کی شخصیت ہی بدل جاتی وہ ہر بات میں تکمیل کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ اس لیے اگلی صبح جب گوتم شہر جانے کے لیے تیار ہوا ہے تو میں نے سوچا مایا کتنی اداس ہوگی؟

وہ اپنے دوست کی موٹر پر چلا گیا تھا۔ ہم شام کو اُس سے ملنے والے تھے۔ یہ سارا دن ہمارے سامنے تھا۔ لمبا دن جس کے گھنٹے بوجھل پتھروں کی طرح سینے کو مسلتے ہوئے گزریں گے۔ میں گوتم کے سامنے اپنے کو کتنا ناچیز سمجھا اور کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا: میں اب جاگ رہا تھا۔

جب دھول اڑاتی موٹر فاصلے میں گم ہو گئی تو مایا نے کہا:

”آؤ ہم ساحل پر دوڑ لگائیں۔ تم مجھے پکڑو۔“

میں نے کہا ”بھربھری ریت میں پاؤں دھنس جاتے ہیں۔ بھاگنا آسان نہیں۔“

اس نے کہا ”تم بھاگو تو سہی۔ میں تمہیں پکڑتی ہوں۔“

”کل تو تم نے ایسا نہیں کیا۔ سنجیدہ باوقار گھریلو عورت کی طرح ناچتی اور تیرتی رہیں۔ یہ بچوں کا سا کھیل کھیلنے کے لیے میں رہ گیا ہوں“ میں منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

میرے کندھے سے پکڑ کر اس نے مجھے اپنی طرف پھیرتے ہوئے کہا ”کل گوتم ہمارے ساتھ اور میں اس کی ستی دساوتری بیوی تھی۔ آج تم میرے ساتھ ہو۔ ساحل اکیلا ہے اور ہوا میں نمی اور نشہ ہے۔ تمہیں بتاؤں مجھے ہر روز مکمل بیوی کا پارٹ ادا کرنا اچھا نہیں لگتا“ پھر میرے کندھے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

اچانک میں نے اُسے چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ میں اس چٹان کو پھلانگ کر کودنے ہی والا تھا۔ جب اس نے مجھے آ لیا۔ ہم ایک ساتھ کودے اور وہ میرے اوپر گری۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے اُٹھنے نہیں دیا۔ یہ وہی جگہ تھی۔ جہاں اس سے پہلے دن ایک بدیسی جوڑا ہنی مون منا رہا تھا۔ ہوا میرے کانوں میں سیٹیاں بجانے لگی۔ طوفانی لہریں مجھے ڈھانپنے کے لیے بڑھنے لگیں۔ اور مانگی راگ جیسے موت اور ابدیت کے موں میرے گرد گھومنے لگے۔ میں من۔ سر تھا اور سمندر کی نیلاہٹ مجھے پکار رہی تھی۔ کائنات کے اندر آوازیں مجھے بچانے کی ناکام کوشش میں مجھے پکار رہی تھیں۔ مجھے مایا سے کون بچا سکتا تھا؟ گوتم نے ٹھیک ہی کہا تھا وہ ایسی شیرنی تھی جو ہر وقت شکار کی گھات میں رہتی تھی۔ مجھے بھی اس نے شکار کر لیا۔ میں فنا ہو گیا تھا۔ میرا اپنا آپ کہاں تھا؟

جب ہم لوٹے ہیں تو بادل ہوا کے ساتھ ادھر اُدھر اکٹھے ہو رہے تھے۔ میرے منہ کا مزہ کڑوا تھا۔ میرے بالوں میں ریت بھری تھی اور دل کے اندر لہو کے فوارے سے چھوٹ رہے تھے۔ میرا روآں روآں رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ ٹانگوں سے جان نکل

ہوئی تھی۔ میں اپنے اس مردہ ناکارہ وجود کو گھسیٹ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اپنے آپ کو اس نیلاہٹ کے حوالے کر دوں۔ مگر اپنے اس وجود کو کیسے اس پانی کے حوالے کر دوں جو کتابوں میں لکھا تھا، دیوتاؤں کا ہے؟

میں فرش پر اوندھا لیٹا تھا اور وہ دوسرے کمرے میں اپنے بچے کے ساتھ ہنس رہی تھی۔ اس سے کھیل رہی تھی۔ میں دانت پیس رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ مجھے لگتا تھا وہ مجھ پر ہنس رہی ہے۔ میرا مذاق اڑا رہی ہے۔ ہوا باہر اتنی تیزی و تندی کے ساتھ چل رہی تھی کہ لگتا تھا اس ارمانوں سے بنی ہٹ، کو تنکوں کی جھونپڑی کی طرح بکھیر دے گی۔ پھر بارش ہونے لگی۔ بوندیں طوفان مچاتی، ناچتیں رہیں۔ سمندر پھنکار رہا تھا۔ زخمی اژدھا کی طرح وہ اپنے دشمن کو فنا کرنا چاہتا تھا۔

پھر میں نے مایا کے ننگے قدموں کی چاپ سنی اس نے میرا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ آہستہ سے پکارا "من ہر" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

من ہر میری بات سنو، میری طرف دیکھو من ہر۔ میں تم سے معافی مانگنے تمہارے قدموں پر سر رکھنے آئی ہوں۔ من ہر اٹھو تو سہی، میری طرف دیکھو من ہر۔ بھگوان کے لیے میری طرف نہ دیکھنا۔ سیدھے تو ہو جاؤ۔ دیکھو اس پلنگ پر لیٹو۔ اٹھو تو سہی۔

میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ قدموں کی چاپ دور ہوتی گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ جب اکڑے ہوئے جسم کو سیدھا کرنے کے لیے میں نے بانہوں کے حلقے سے اپنا۔ اٹھایا ہے، اور ادھر ادھر نظر کی ہے تو مایا جل پری کی طرح بال کھولے اپنے عکس کو بڑے آئینے میں گھور رہی تھی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

'اٹھو دیوتا' اس نے میری طرف مڑے بنا کہا، "لگتا ہے تم اپنی آنکھیں میری کھال سے ہٹا ہی نہیں سکتے۔ آخر ہم بانہیں اور چہرہ ننگا رکھ سکتے ہیں۔ تو باقی جسم میں کیا کیڑے پڑے ہوتے ہیں؟"

مڑ کر اس نے کہا "تم مجھ سے بدتر کسی عورت سے آج تک نہیں ملے ہو گے ہیں نا"

دور پرے گاؤں کے گنوار لڑکے ہو۔ میں نے تمہارا دماغ بگاڑ دیا ہے۔ جو سبق تم کو ساری زندگی کوئی نہ سکھاتا، وہ میں نے سکھا دیئے ہیں' اس کی آواز میں غصہ تھا۔

اُسے کسی شرم کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ لگتا تھا وہ اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھی ہے۔ میں نے کہا "تم حد ہو۔ تم سے پرے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ٹھیک کہتے ہو من ہر بھلا اس سے مکمل جسم کہیں ہو سکتا ہے۔ میرا روآں روآں دیوتاؤں نے خود اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ سنہری کھال ریشم کی طرح ہاتھوں کے نیچے سے پھسل جانے والی کہیں فالتو گوشت ہے؟ شعلے کی طرح دمکتا ہوا رگوں میں بہنے والا خون۔ دروپدی بھی مجھ سے زیادہ مکمل نہیں ہو گی پانچ بھائیوں کی بیوی تھی۔ پھر ہنس کر کہنے لگی "من ہر کیا تم گوتم کے ساتھ مجھے بانٹنا پسند نہیں کرو گے۔؟

اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھتا ہی رہا۔

گوتم ٹھیک کہتا تھا۔ مایا صرف اور محض عورت تھی۔ گوتم کی نگاہیں کہاں تک دیکھ سکتی تھیں، اور وہ کیا جانتا تھا؟

ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ میں اس کھیل سے تھک چکا تھا۔ ہر وقت پکڑے جانے کا خوف گوتم کے احسانوں کا بدلہ میں چکا رہا تھا کہ اس کی چوری کر رہا تھا۔ دل اندر ہی اندر دہکنے والے انگارے کی طرح سینے میں ہر وقت جلتا رہتا تھا۔

یہ ہر وقت میں نے غلط کہا ہے۔ کیونکہ ایسی گھڑیاں بھی ہوتیں۔ جب میں مایا کے پاس ہوتا۔ اور اس سے بڑھ کر جوش و خروش سے اس کا ساتھ دیتا۔ ہم نے اس کمرے کو نئے سرے سے سجایا تھا۔ وہ ملکہ تھی، اور میں اس کا غلام اور پھر بھی وہ میری راہ دیکھا کرتی تھی۔ ہفتے کی شام میں ہوسٹل سے آجاتا۔ ہم دونوں کبھی گوتم کے ساتھ اور کبھی شیام کو لے کر سمندر کی سیر کو نکل جاتے۔ ہم ساحل پر گھوم رہے ہیں۔ یکایک وہ کہتی۔

"من ہر، میرا جی چاہتا ہے تم اور میں کہیں چلے چلیں۔"

میں نے کہا "مجھے بتاؤ آخر یہ کس طرح ممکن ہے۔ مجھے تو ہفتے کی رات تمہارے ہاں گزارتے ہی ڈر لگتا ہے۔ کیا ہو اگر گوتم جاگ جائے اور ہمارے کمرے میں گھس آئے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہارا جی اب مجھ سے بھر گیا ہے۔ تم میرے لیے اتنا سا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے۔"

"یہ اتنا سا خطرہ ہے۔ دوسرے کی بیوی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اور پھر گوتم کی بیوی"

میں نے کانپ کر کہا۔

"گوتم سے ڈرتے ہو۔ میرے لیے اتنا سا کرنا بھی تمہیں بہت لگتا ہے، اور میں نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔" مایا نے بڑے دکھ سے کہا۔

"میں کسی قابل ہی کہاں ہوں، میں تو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے کیا کروں گا۔ میرے ساتھ جو جتنے بندے ہیں ان سب کا انجام ایسا ہی ہوا ہے۔ تم نے میرے ساتھ کوئی سپنا نہیں سجایا۔ اچھا کیا۔ میری ماں نے جانے کتنے خواب دیکھے ہیں اور میں نے ان کا کیسا منہ چڑایا ہے۔"

"تم تو مجھے الزام دیتے ہو۔ سوچتے ہو۔ میں نے تمہیں خراب کر دیا ہے۔" وہ تیز تیز چل رہی تھی۔

"کیا سمندر کے پار تک جانے کا ارادہ ہے۔ کہاں بھاگی جاتی ہو۔" میں نے یونہی کہا۔

"میرے لیے کہیں بھی ٹھکانا نہیں ہے۔ من ہر میں کہیں بھی چلی جاؤں میرا نرک میرے میرے ساتھ ہے۔"

اس لمحے میں اس کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتا تھی اس کا نرک اس کے ساتھ تھا۔

میں نے سدا سوچا تھا۔ من ہر میں ہر طرح سے مکمل عورت ہوں گی۔ ہمارے گھر میں میری دو بہنیں پہلے ہی روٹھ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میری ماں ان کے بچوں کو کوستی تھی اور اپنے نصیبوں کو روتی تھی۔ میں نے بچپن سے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اپنے جی میں کہا تھا۔ اگر میرا بیاہ ہوا تو میں کبھی روٹھ کر گھر نہیں آؤں گی چاہے کسی برے سے برے آدمی کے ساتھ نبھاہ کرنا پڑے۔ کروں گی۔ مگر ہوا یہ کہ دو چار سال میں ہی مجھے اپنے سے کیے ہوئے وعدے دیوانے کی بڑ لگنے لگے۔ بھلا جو تمہیں عورت ہی نہ سمجھے اس سے نبھاہ کا کیا سوال۔ کبھی کبھار گوتم کا سلوک مجھے ناقابل برداشت لگتا تھا۔ اسے میری رتی برابر پروا نہیں ہے۔ وہ صرف اپنے لیے زندہ ہے، اپنے غرور کے لیے زندہ ہے، اسے اپنے آپ سے محبت ہے۔

میں نے کہا "نہیں تمہارا خیال ہے۔ اگر اسے تم سے لگاؤ نہ ہو تو وہ تمہاری خوشی کی خاطر روز روز یوں اپنا ثبیت مجھے کیے ہنس کر "گھر آؤ"۔

"اوں" مایا نے سخت نفرت سے کہا "میری خوشی اس کی جوتی۔"

میں نے کہا "تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔"

مایا نے جو جواب دیا۔ اس نے میری رگوں میں خون منجمد کر دیا۔ سن سن کر خون میرے سر کی طرف چڑھنے لگا۔ مجھے لگا میں کانپ کر ابھی گر جاؤں گا

"اُسے پتہ ہے کہ میں تمہاری مسٹریس ہوں۔"

"نہیں بابا نہیں۔" میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے تم مجھے کیوں جھنجھوڑتے ہو۔ چھوڑو میرے کندھے ہلا کر رکھ دو گے۔"

مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ تم اس کے بچے کی ماں ہو۔ اس کی بیاہتا بیوی ہو" میں نے زور سے اپنے چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

تمہیں پتہ ہے، مجھے کہتا ہے" تمہیں نیند نہیں آ رہی ہوگی۔ بابا جاؤ اپنے من سر سے باتیں کرو۔ میں تھکا ہوا ہوں۔

"وہ سوچتا ہوگا شاید ہم باتیں کر رہے ہیں۔" میں نے تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

جیسے گوتم کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ جیسے وہ بچہ ہے۔ جو ایسے کھلونوں سے بہل جائے گا۔ اس کی نگاہ جو دلوں میں چھید کرتی ہے۔ برمے کی طرح سینے کے اندر اتر جاتی ہے۔ وہ نگاہ کیا کچھ نہیں جان لیتی۔ کیا کچھ نہیں دیکھ لیتی۔ گوتم سے کیا چھپا ہے؟ وہ تیز تیز بول رہی تھی۔

"سمجھ میں نہیں آتا یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" میں نے ہولے سے کہا۔

تمہیں یقین کرنے پر مجبور کون کرتا ہے اور یقین کرو تو اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ایک عجیب مذہب رکھتا ہے جس میں کسی پر کوئی رشتہ مجبوری سے نہیں لادا جا سکتا۔ مگر یہ صرف میرا خیال ہے۔ اس نے مجھ سے اتنی باتیں کب کی ہیں۔ ان آٹھ سالوں میں اس کے دل کی کوئی بات نہیں جان سکی۔"

"اور میرا خیال تھا تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہو۔ یہ شاید پسند کی شادی تھی تمہاری یا اس کی،" میں نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اگر تماشا دیکھنے والے کو کوئی ناچتی ہوئی پتلی پسند آجائے اور وہ اُسے اپنے کمرے کے ایک کونے میں سجا لے تو تم اُسے شادی کہو گے۔ ہندو لوگوں میں یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ لڑکی کو پسند کروانے کے لیے لڑکے والوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے چار سال ناچنے کی تربیت حاصل کی ہے۔ گوتم بہت بڑا رقاص ہے۔ بس یہی بنیاد تھی۔"

گوتم تمہاری بہت قدر کرتا ہے بابا۔ میں نے تسلی دینے کی خاطر اُسے کہا۔

قدر میری نہیں، میرے فن کی ہے۔ سال میں ایک آدھ بار جب اس پر ناچنے کا دورہ پڑتا ہے۔ اُسے کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ایسے شخص کی جو محض تماشائی نہ ہو۔ فن کو جاننے والا ہو۔ اور اس کے فن کی داد دے سکے تو وہ میری طرف پلٹتا ہے۔ اُسے مغربی ڈانس سے نفرت ہے وہ ہندوستان کے پرانے ناچ پسند کرتا ہے۔ اُن کا ماہر ہے اور میں بھی کچھ شُد بُد رکھتی ہوں۔

تم ڈانس اکیڈمی کھول لو۔ مصروف بھی رہو گی، اور یہ فن دوسروں تک بھی پہنچا سکو گی۔

"ڈانس اکیڈمی ڈاکٹر گوتم سہائے کی بیوی" وہ سر پیچھے ڈالے زور زور سے ہنس رہی تھی۔ جیسے پاگل ہو گئی ہو۔

کئی ہفتوں ان کے گھر نہیں گیا۔ عجیب کیفیت تھی میری۔ نشے کے عادی کو اگر مارفیا نہ ملے تو اس کا جسم ٹوٹتا ہے۔ اور وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔ میں بھی لیکچر سنتے میں گم ہو جاتا تو مجھے بابا یاد آتی۔ کوئل کی کوک کے سائے میں سکون سے کھڑا وہ گھر یاد آتا۔ لگتا بالکنی میں سے مجھے کوئی جھک

رہ میری راہ دیکھ رہی ہے۔ شیام کا ہنستا ہوا چہرہ یاد آتا۔ گوتم سے مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس کی شکل یاد آتی بھی تو میں یاد نہ کرتا۔ مایا یوں چپ تھی۔ مانو میں اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔

ایک شام میں دیر تک نوٹس بناتا کالج میں ہی بیٹھا رہا۔ مجھے آج کل اکیلے کونے اور تنہائی پسند آتی تھی۔ قلم ہاتھ میں لیے دیر تک میں یونہی سوچتا رہا۔ ہا کس ہے کا وہ دن گھوم پھر کر مجھے اپنے قبضے میں کر لیتا۔

"منوہر۔ منوہر" کسی نے مجھے پکارا۔

جیسے چوری کرتے میں پکڑا جاتے والا گھبرا جاتا ہے۔ میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا "کون ہے"

ارے بھئی تمہارے بابا آئے ہیں۔ دوپہر سے کمرے میں تمہاری راہ دیکھ رہے تھے، اور تم پہنچے ہی نہیں: میرا ساتھی تھا کیلاش۔

"بس یہاں ہی اچانک رہا تھا۔ کتنا ہی کام باقی تھا۔ بیٹھ کر کرنے لگا"

کتابیں سمیٹ کر میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

راستے میں اس نے کہا۔ تمہارے بابا پوچھ رہے تھے۔ کیسا پڑھتا ہے۔ جی کیسا ہے۔ کب سے اس نے گھر خط نہیں لکھا۔ اس کی ماں نے گھبرا کر مجھے بھیجا ہے" تب مجھے یاد آیا کہ میں نے تین چار ماہ سے گھر خط نہیں لکھا۔ بھلا سپنے دیکھنے والے بھی خط لکھ سکتے ہیں، سوئے ہوئے آدمی سے کیا اُمید کی جا سکتی ہے۔ بابا پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گا۔ گھر خط کیوں نہیں لکھا تھا میں نے؟ لکھنے کو بھی کیا تھا۔

بابا کہنے لگے۔ میں گوتم کے ہاں نہیں گیا۔ سیدھا یہاں ہی آیا ہوں۔ تم تو بڑے ذمہ دار تھے۔ یہ کیسے ہوا کہ اتنے بدل گئے ہو۔ تمہاری ماں اتنی پریشان تھی کہ میں سیدھا یہاں آیا ہوں۔

"ماں کیسی ہے؟ میں نے ہولے سے پوچھا"

کیسی ہوتی؟ جس کا بچہ تین ماہ سے اُسے بھلائے بیٹھا ہو۔ اس کی کیا کیفیت ہو گی۔

"کہتی ہے بڑا شہر ہے کہیں میرا بچہ گم نہ ہو گیا ہو" بابا ہنس کر کہنے لگے۔

اُنہیں کیا پتہ ان کا بچہ گم ہو چکا تھا۔ وہ بیٹا جس کو انہوں نے اسٹیشن پر الوداع کہا تھا۔ کہیں نہیں تھا۔

میں گوتم کے ہاں بابا کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بابا کہنے لگے" میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ بیٹے گوتم میرے چاچا کا بیٹا ہے۔ اس نے تو سگے بھائیوں سے بھی زیادہ بڑا احسان مجھ پر کیا ہے"

میں سر جھکائے سنتا رہا۔ گوتم کا مجھ پر احسان تھا تو سہی۔

بابا سے میں نے کہا" آپ گوتم کے کلینک چلے جائیں۔ وہ رات کے تقریباً گیارہ بجے تک وہاں ہی ہوتے ہیں"

بابا کہنے لگے" نہیں، میں اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ اس کے بچے کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں، اس کی بیوی کو تمہاری ماں کے بھیجے تحفے دینا چاہتا ہوں۔

اس رات گوتم کلینک سے جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کا جی اچھا نہیں تھا۔ مایا مجھے دیکھتے ہی سفید پڑ گئی۔ جیسے کسی نے اس کے چہرے کی رنگت نچوڑ لی ہو۔ بابا گوتم کے پاس بیٹھ گئے، میں شیام سے کھیلتا رہا۔

وہ دونوں اپنے پرکھوں کی اور جانے کاہے کی باتیں کر رہے تھے۔ جن میں نہ مجھے دلچسپی تھی اور نہ ہی میں جاننا چاہتا تھا۔ یہ باتیں وہ ماں سے بھی کرتے تھے۔ نسل پر ناز آدمی کا کل ورثہ تو نہیں ہو سکتا۔ رگوں کے اندر کیسا خون ہے۔ نیلا یا سرخ اس کی کون پروا کرتا ہے آج کل کا زمانہ تو طاقت کا زمانہ ہے۔ طاقت روپے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور روپے کمانے کی لاکھوں راہیں ہیں۔

گوتم کہنے لگا۔ رات یہیں پر رک جاؤ۔ ہوسٹل میں جاکر کیا کرو گے!

میرا جی اس کمرے میں عجیب گھٹن سی محسوس کرتا تھا۔ جیسے بیتے دنوں کی یادیں میرا گلا دبا رہی ہوں۔ اپنے دکھائی نہ دینے والے پاؤں کو کٹڑے لگاتی پھرتی ہوں۔

بابا سو گئے تو میں چپکے سے اٹھا اور پچھلی سیڑھیوں سے اوپر چھت پر چلا گیا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔ حبس تھا پھر میں نے باہر کی دیوار کے ساتھ کھڑی مایا کو دیکھا۔ وہ پلٹی نہیں میرے قدموں کی چاپ سن کر بھی اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔

رات کو رہنے کی جرأت میں نے پھر کبھی نہیں کی۔ کیونکہ مجھے مایا پر اعتبار نہیں تھا۔ گوتم سے کبھی آمنا سامنا ہوتا تھا تو کہتا:

"بھتیجے تم نے ہمیں بھلا دیا ہے بہت کم آتے ہو، مگر تم تو بہت مصروف ہو گئے ہو نا۔ یہ ہمیشہ سے ایسا ہے کہ آدمی کا اپنا آپ بھ دیتا ہے۔ میری تو تمنا ہے تم خوب محنت کرو۔ بڑے قابل ڈاکٹر بنو۔ عام سطح سے اونچا اٹھنا تو ضروری ہے۔ اگر تم سڑک پہ چلنے والے ہر دوسرے آدمی کی طرح ہوئے تو کیا ہوئے۔"

میں سڑک پہ چلنے والے ہر دوسرے آدمی کی طرح تو نہیں تھا۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مایا نے ایک ڈانس اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔

جس طرح میری زندگی کا راستہ مایا کی زندگی کے اندر سے ہو کر نکلتا ہے۔ اسی طرح اس کے ڈانس اسکول کا راستہ بھی میرے کالج کی راہوں کو کاٹتا گزرتا تھا۔ شام کے وقت گوتم اسے جاتے ہوئے پاس کے کسی چوراہے پر چھوڑ دیتا وہ خراماں خراماں جیسے اچانک ہی مل جاتی۔

"جب گوتم کو تمہارے اور میرے متعلق پتہ ہے پھر بھی تم اور وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہو، تمہارے درمیان کوئی دیوار نہ آئی۔" میں نے کتنی بار یہ سوال پوچھا تھا۔

پہلے پہل ہم آج یہاں اور کل وہاں اٹھائی گیروں کی طرح پھرتے رہتے پھر مایا نے ایک جاننے والی کے گھر کے اوپر کی منزل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔ ہوتے ہوتے وہ پردے اور پلنگ اور ایسی ہی دوسری چیزیں لے آئی۔

میں نے پوچھا "تم کو یہ جاننے والی کچھ کہتی نہیں، تم سے پوچھتی نہیں؟"

کہنے لگی یہ غیر مطمئن زمانہ ہے اور پرانے سوال کوئی نہیں پوچھتا۔ ہر کسی کا اپنا کوئی نہ کوئی چکر ہے۔ یہ جاننے والی یوں دیکھنے میں کسی افسر کی بیوی ہے۔ مگر اصل میں یہ کوئی اور دھندہ چلاتی ہے۔ مجھے کیا کہے گی۔"

مایا کہتی تو ٹھیک تھی۔ اگر پرانے سوالوں کے پوچھنے کا وقت ہوتا تو گوتم مجھ کو اپنے گھر آنے سے تو منع کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا جیسے آج بھی ہے کہ گوتم کو بابا اور مجھ پر وشواش تھا۔ جانے کیوں، مایا نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ کیا وہ یہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ کتنا بڑا خطرہ مول لے

میرے لیے کتنے آگ کے دریا پار کر رہی ہے۔

اَب میں بہت بڑھیا سوٹ پہننے لگا تھا۔ جو اگر میرے بابا دیکھتے تو ضرور پُوچھتے کہ کہاں سے آتے ہیں، مجھ پر دولت کی بارش کہاں سے
ی تھی؟ پہاڑی علاقوں سے آیا ہوا تہذیب کے مرکزوں سے سینکڑوں میل دُور کا باسی کراچی میں من ہر بنا تو کتنا بدل گیا تھا۔

مایا میرا دُلار بھی تو بہت کرتی تھی۔ شیام کی طرح وہ مجھے بگاڑ رہی تھی۔ ہر بار کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ لاتی۔ میں نے اُسے کتنی بار منع کیا تھا۔
تحفے لانا کیا ضروری ہے؟"

"تم مجھے منع مت کیا کرو۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اُس دن کی طرح کھڑی میری نگاہوں کو اپنے جسم پر رینگتے محسوس کرتی۔ کھلے بال
کمر کے نیچے تک پہنچ رہے ہوتے۔ سڈول ٹانگیں کتنی خوب صورت تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے نشہ سا ہونے لگتا۔

ایک شام ملی تو کہنے لگی، آج ہم ڈانس اسکول کے کسی فنکشن میں شریک ہیں۔ میں گوتم سے کہہ آئی ہوں کہ وہ پریشان نہ ہو میں اگر نہ آسکی تو
رہ پڑوں گی وہ تھکا ہوا ہوگا، آکر سو جائے۔"

"جانتے ہو کیا ہُوا۔ گوتم نے پہلی بار کہا کہ رات باہر رہنا کیا ضرور ہے۔ میں تم کو جس وقت کہو لینے آؤں گا۔ مایا کا سانس سینے میں
ہمار ہا تھا۔

تو پھر تم ڈانس اسکول چلی جاؤ۔ یوں گوتم کی سوئی ہوئی غیرت کو جگانا کیا ضرور ہے۔" میں ڈر رہا تھا۔

کہنے لگی" من ہر جہاں تک میں آگئی ہوں۔ اس کے بعد لوٹ کر جانا ممکن ہی نہیں۔ آج رات ہم ہاکس بے پر گزاریں گے۔ ہٹ کیلئے
نے ہوٹل والوں کو فون کر دیا تھا۔"

مایا یہ تم نے کیا کر دیا ہے سنبھل کر قدم رکھو۔ میں جیتے جی مر جاؤں گا۔ بابا مجھے کبھی گھر گھسنے نہ دیں گے۔ ماں میرا مُنہ نہ دیکھے گی۔ تمہیں
ہے۔ اَبکے چھٹیوں میں میں گیا ہوں تو ماں کہنے لگی" منوہر تم بہت بدلے بدلے نظر آتے ہو۔ مجھے تو بڑے شہروں کا کچھ پتہ نہیں کیا ہر
ایسا ہی ہو جایا کرتا ہے؟"

میں نے ماں سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی مایا۔ اُس جگہ ہی اپنے آپ سے اتنی نفرت کرنے لگا تھا۔ اتنی نفرت کہ بہن بھائیوں کے
نہ بات کرتے بھی مجھے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ بہنوں نے سوچا بھائی پردیس کے پانی سے بدل گیا ہے۔ مگر ماں کی نگاہیں میرے سینے کے
اُتر گئیں۔ مالتی اب ان سالوں میں ذرا سیانی ہو گئی ہے۔ مگر پھر بھی میری گود میں تو بیٹھ سکتی تھی۔ میں نے اُسے چھوا تک نہیں مجھے اپنا شریر
گندہ لگتا ہے جیسے۔ ۔ ۔

مایا نے ہنس کر کہا" یہ سب بچپن میں سُنی کہانیوں کا اثر ہے جو تمہاری ماں یا نانی نے سُنائی ہوں گی۔ بھلا جیون میں کیا گندگی ہو
سکتی ہے؟"

"تو یہ جیون ہے جو میں اور تم گزار رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

چوراہے پر کھڑے ہو کر مجھ سے سوال نہیں کرو۔ کوئی سواری پکڑو۔ پھر شام گہری ہو جائے گی۔

اُس رات سمندر کی طرح مایا نے اپنی مُہیب لہروں میں میری ہستی کو بہا لیا۔ وہ مجھے اپنی تاریکیوں میں لے جانا چاہتی تھی۔ جہاں

وہ اکیلی تھی جنم جنم سے پیاسی اس کی آتما مجھ سے پرے کسی اور شے کی کھوج میں تھی جو مکمل ہو۔ وہ میری ہستی سے اپنی تکمیل کرنا چاہتی تھی، کیسی ناقابلِ عمل بات تھی۔

جسم کے صحرا میں گھومنے والے جانتے ہیں کہ اس سفر میں اپنا آپ کھو کر بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ آدمی صدیوں اس میں پھرتا پھرے انجامِ کار اس کے دامن خالی رہتے ہیں۔ یہ کسی کے سراب کی وجہ سے نہیں یونہی تشنگی اور بربادی اس سفر کا مقدر ہوتے ہیں۔ پیالے کی تلچھٹ تک پی جانے والے آخر میں خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ نہ کوئی خوشی نہ کوئی نئی بات نہ کوئی انکشاف یوں ہوتا ہے کہ جیتا جیتا بھی بھکی تیز سانسوں اور طبیعت پر بار گزرتی ہوئی متعفن راہوں پہ چلنے کا نام رہ جاتا ہے۔ راہیں جہاں پر نہ خوشبو ہے اور نہ ہی کوئی خوشی۔ رگوں میں سرایت کر جانے والے جذبوں سے خالی جسم کی اوپری سطح کو ٹکرا کر مرنے والی وقتی راحتوں سے عبارت یہ محبتیں نہ کسی کا بھگوان بن سکتی ہیں اور نہ ہی کسی کی یاد۔ اتنے زمانوں بعد میں جو وقت کے ٹوٹے مجسمے کو پھر سے جوڑ رہا ہوں۔ سوائے افسوس کے میرے دامن میں اور ہے

مایا اور میں اس رات سمندر کی پرشور لہروں کی طرح آپ سمندر تھے اور آپ ہی لہر۔ وہ اتنی کمزور اور دھان سی تھی۔ کچی مٹی کی ہوئی۔ لگتا تھا۔ ذرا زور سے پکڑنے سے ٹوٹ جائے گی۔

کہنے لگی "کیا ہوتا ہے جو تم کوئی خوب صورت نظم لکھ سکتے۔ اصل میں مجھے ڈاکٹروں اور انجینئروں سب سے نفرت ہے نرم جذبات کو سمجھ نہیں سکتے۔ کبھی تمہارا جی نہیں چاہا کہ مجھے پا کر تم خوشی کا اظہار شعروں میں کرو۔ ہم ہوٹل کے کمرے سے باہر پتھر کی سیڑھیوں بیٹھے تھے۔ جہاں موجیں آ کر اپنا سر ہمارے پاؤں پر پٹک رہی تھیں۔

مایا "اصل میں تم رومان کی کھوج میں ابھی تک گھوم رہی ہو۔ میں سمجھتا ہوں تم اپنی کھوج کے انت تک کبھی نہیں پہنچ پاؤ میں نے اپنا سر اس کی گود سے ذرا سا اٹھا کر کہا "لیٹے رہو یونہی اسی طرح کہ زمانے ہم پہ سے بیت جائیں۔ تم اور میں یہیں پہ بت بن جا پھر صدیوں بعد جب کوئی ہمیں یہاں سے اٹھائے تو کون جانے کس دیوی اور دیوتا کی مورتی ہے" مایا نے سرگوشی سے کہا۔

سمندر کے کنارے رات گزارنا ایک الگ تجربہ ہے۔ مگر اس گھڑی تو میں صرف مایا کی بات کرنا چاہتا ہوں۔

اگلے دن مجھے چھٹی تھی۔ مایا کی خواہش تھی کہ ہم وہ دن بھی یہیں گزاریں۔ جانے وہ کیوں اتنی دلبر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اس کی سے خوف آنے لگا تھا۔ اس کا کیا بننے والا تھا اور پھر میرا آخری امتحان بھی سر پر تھا۔

صبح کے قریب جب میں اپنے ہوسٹل میں گھسا ہوں تو برابر والے کمرے کے لڑکے نے مجھے ایک تار تھما دیا۔ ماں سخت بیمار بابا نے مجھے بلایا تھا۔ میرے سر میں خیالوں کی ہائے وائے مچی تھی۔ ماں بیمار تھی اور مایا جانے گوتم مایا سے کیا کہے۔ اس رات کی عنبر جا کا جواب وہ کیا دے گی۔ گوتم اگر اس کی کھوج میں مجھ تک آ گیا تو؟

عبدل سے میں نے پوچھا کوئی رات مجھے پوچھتا ہوا بھی آیا تھا؟

ہاں تمہارے وہی چچا جو ڈاکٹر ہیں آئے تھے۔ انہوں نے تمہارے دروازے پہ تالا دیکھ کر مجھ سے کہا تھا، منوہر کہا ہے؟

پھر تم نے کیا جواب دیا" میں نے ڈر سے تقریباً کانپتے ہوئے پوچھا۔

"کیا جواب دیتا بھئی تم شروع سے ہی کسی چکر میں ہو۔ اُسی میں کہیں گئے ہو گے۔ اُس نے ہنس کر گردن کو کھجاتے ہوئے کہا "مگر تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ کیا کسی کو قتل کر کے آئے ہو؟"

"امتحان سر پہ ہے اور ماں کی بیماری کا تار آیا ہے۔" "پر تم نے یہ نہیں بتایا گوتم سے کیا کہا تھا؟"

"میں اُن کی نظروں میں تمہاری عزت خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر تم میرے ہمسائے ہو۔ میں نے کہا کسی دوست کے گھر گیا ہے۔ دونوں مل کر امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔" عبدل کی نیند سے بند ہوتی آنکھوں نے میرے گالوں پر اطمینان کی خوشی نہیں دیکھی۔

"تمہارے چاچا تھوڑی دیر کھڑے رہے، سوچتے رہے۔ موٹر کی چابی کو اُنگلی کے گرد گھماتے رہے اور پھر چلے گئے۔"

میں نے عبدل کو زور سے اپنے سے لپٹا لیا۔

ایکا ایکی میں چھوٹ گیا تھا بھگوان اور سب دیوتا میرے ساتھ تھے۔ میرے اور مایا کے ساتھ اپنے خون میں سنسناہٹیں لیے گاڑی سے میں گھر کے لیے چل پڑا۔

پندرہ دن بعد جب لوٹا ہوں تو ماں کے دُکھ کے ساتھ امتحان کا فکر میرے ہوش اڑائے دیتا تھا۔ اس گھڑی جب میں سمجھا تھا۔ بھگوان اور دیوتا میرے ساتھ ہیں، وہ میرے ساتھ نہیں تھے۔ مجھ سے مُنہ موڑے تھے۔ یہ کتنی بڑی سزا تھی کہ جب میں اُس چوراہے پر پہنچنے والا تھا، جہاں سے کامیابی اور سربلندی مجھے اپنی طرف بلا سکتی تھی۔ وہ نہ رہی تھی جو آنکھوں میں غرور لیے میرا ذکر چھپا کے سے رنگ والی دھیرج سے بات کرنے اور دل کے اندر جھانکنے والی آنکھیں رکھنے والی ماں نہ رہی تھی۔

ایک چھٹیوں میں جب مایا کا خیال میری آتما بنا ہوا تھا۔ اور میں گھر گیا تھا تو ماں نے کہا تھا:

"چوری کا پھل پہلے تو میٹھا لگتا ہے۔ پر جب اس کا رس رگوں میں اُترتا ہے۔ تو جی کو افسوس ہوتا ہے۔"

اُس دن میں اداس سا لیٹا تھا، اور آکاش کو بھرنے والی دھوپ کی سفیدی میری جان میں دکھن بن کر اُتر رہی تھی۔ ماں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا "منوہر گھومتے پھرتے نہیں ہو۔ کتابیں پڑھتے ہو یا لیٹے رہتے ہو۔ جاؤ دوستوں سے ملو۔ ندی نالوں کو پھلانگو۔ کیا سوچتے رہتے ہو۔ ہمارے گھر کے قریب پچھواڑے کی پہاڑی میں سے ایک نیا چشمہ پھوٹا ہے"

"چشمے کا پانی ٹھنڈا نہیں ہوگا ماں" میں نے کروٹ بدل لی۔

وہ یونہی کتنی دیر میرے قریب سر پہ ہاتھ رکھے بیٹھی رہی، پھر کہنے لگی۔

"بیٹے تو میری پہنچ سے باہر اور بڑا ہو گیا ہے۔"

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے ماں کہ تمہارا بیٹا بڑا ہو رہا ہے۔" میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

یکایک ماں نے پوچھا تھا "مایا اور گوتم میں سنا ہے بہت فرق ہے۔ میرا مطلب ہے مایا گوتم سے بہت چھوٹی ہے۔"

"ہے تو سہی، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے تیزی سے کہا۔

ماں نے بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "گوتم نے غلطی کی۔ بڑے آدمی اکثر غلطیاں کرتے ہیں۔"

کہتے ہیں۔ غلطی آدمی سے ہی ہوتی ہے۔ اور آدمی بھگوان نہیں ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ اپنے سے بات کر رہی تھی۔

مگر ماں وہ دونوں تو بہت خوش ہیں مایا تو اپنے پتی کو پوجا کرنے کی حد تک چاہتی ہے" میں نے مایا کی وکالت کی۔

"تم نے تو دیکھا ہوگا کبھی اس کے میکے سے کوئی آیا کرتا ہے؟" ماں نے یونہی پوچھا۔

"میں ہوسٹل رہتا ہوں، پڑھنے سے فرصت نہیں ہوتی پہلے دنوں کے سوا اب تو بس کبھی کبھار ہی جاتا ہوں، مگر جب بھی میں گیا ہوں، میں نے اس کے میکے کے کسی آدمی کو نہیں دیکھا۔ مگر تم کیوں پوچھتی ہو"

"یونہی" پھر ہنس کر بولی: "وہ میری دیورانی ہے۔ تمہاری چاچی ہے۔ آخر رشتہ داروں کی بات تو ہر کوئی پوچھتا ہے۔ تم سے کیسا سلوک کرتی ہے؟"

"بہت اچھا کرتی ہے۔" میں خوش تھا کہ ماں مایا میں اتنی دلچسپی لے رہی ہے۔

اس کا بیٹا تو تم سے خوب ہلا ہوا ہوگا۔ ماں نے بے دھیانی میں پوچھا۔ مالتی چولہے کے پاس منڈلا رہی تھی۔ بڑی بہن کو ستا رہی تھی۔ روٹی پکانے کے لیے ضد کر رہی تھی۔

"مالتی" ماں نے پکارا "دیکھو بھیا کے ساتھ باہر جاؤ۔" منوہر اسے گھما لاؤ، جب سے تم آئے ہو اس کی طرف ذرا توجہ نہیں دیتے اس سے یہ بہت چڑچڑی اور لڑاکا ہو گئی ہے۔ پہلے جو تم اس کا بہت دلار کرتے تھے۔ اس سے یہ اب بھی تمہاری توجہ چاہتی ہے۔ بچوں کو کیا پتہ ہوتا ہے، بڑے کتنا بدل جاتے ہیں۔"

ماں کے بات کہنے کا انداز ایسا تھا کہ بڑی سے بڑی بات بھی کہہ دے تو کوئی برا نہیں مناتا تھا۔ اور اب مالتی اتنے سالوں میں کافی بڑی ہو گئی تھی۔ اسکول جاتی تھی اور لگتا تھا میرے اور اس کے بیچ جو ناطہ تھا وہ نہیں رہا۔ وہ مجھ سے بہت کم بولتی تھی۔ دوسری بہنوں کی طرح بھاگ بھاگ کر میرے کام بھی نہ کرتی۔ عجیب طرح سے گم سم سی رہتی۔

ماں نے مرنے سے بہت پہلے کہا تھا "منوہر ہر جیون کا انت یہی ہوتا ہے۔ جو یہاں آتا ہے اسے جانا بھی پڑتا ہے۔ کوئی پہلے اور کوئی بعد میں۔ جو آتما پوتر ہوتی ہے اس کے کشٹ اور پاپ جنم میں رہ جاتے ہیں۔ بھگوان میرا انت سپھل کریں"

بابا جو اس کے پاس بیٹھے گیتا کا پاٹ کر رہے تھے "مادھوری بولو نہیں ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔"

سانس کی تکلیف بہت بڑھ گئی اور اس کا چمپا کا سا رنگ مدھم پڑنے لگا، آنکھوں کی پتلیاں پگھلی پگھلی لگنے لگیں۔ اسے کم نظر آتا تھا اور وہ گھبرا کر ہماری صورتوں کو جو دھندلی لگتی تھیں۔ دیکھنے کے لیے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اپنے پاس بلاتی تھی۔ اکھڑے ہوئے سانس کی وجہ سے بات کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لمحے میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کا وہ سر اپنی گود میں رکھوں، اس سے لپٹ جاؤں، مگر میں اپنے میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے سخت نفرت محسوس ہوتی تھی۔ ماں کو ہاتھ لگاتے، اسے چھونے۔ اس کے قریب ہونے کے قابل کہاں تھا۔ ماں کا انت آ پہنچا تھا۔ میں اتنے دنوں اس سے دور رہا تھا اور اب وہ مجھ سے اور دور ہو جائے گی۔ یہ صورت یہ چاہنے والا دل یہ معاف کر دینے اور سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بنی رہنے والی اب نہیں رہے گی۔

بابا نے کہا بھی منوہر ماں کو سہارا دے کر اسے ذرا اٹھا کر بٹھا دو۔ مگر میں اسی طرح کھڑا رہا۔ میری بہنوں اور چھوٹے بھائی نے بابا کے

ساتھ مل کر اُسے پونر کی ہوئی جگہ پر اُتار کر نیچے لٹا دیا۔

پھر اُس کی آتما نئے جنموں کے چکروں میں گھومنے کے لیے چاندی سا شریر چھوڑ کر آگے کے سفر پر نکل گئی۔

واپس آیا ہوں تو گوتم اور ماما دونوں میرے ہوسٹل آئے۔

گوتم نے کہا "بھتیجے تم مجھے بتائے بنا چلے گئے تھے۔ بہت دنوں پتہ ہی نہیں چلا پھر ایک دن میں تمہارے دوست عبدل سے کلفٹن پر ملا۔ اس نے بتایا تم گھر گئے ہو۔ میں خط لکھ کر بھابی کی خیر شکھ پوچھنے ہی والا تھا کہ بھائی صاحب کا خط آیا۔"

میں خاموش رہا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ صرف دل میں افسوس تھا جو ماما کو اپنے ساتھ دیکھ کر نئے سرے سے اور زیادہ زور سے مجھے دبا رہا تھا۔

ماما نے کہا "من ہر، مجھے بھابی کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ افسوس وہ ایک بار بھی یہاں نہ آئیں۔"

گوتم نے کہا "اب دکھ کو اپنے اُوپر سوار نہ کرو۔ تمہیں پتہ ہے یہ دنیا ہم تک یونہی پہنچی ہے۔

منوہر۔ تمہارا امتحان قریب ہے خوب پڑھو۔ اگر تمہارے نمبر اچھے ہوئے تو میں کوشش کر کے تمہیں باہر بھجوا دوں گا۔"

میں نے بہت غور سے اُسے دیکھا، کیا وہ سچ کہہ رہا تھا؟ مگر اس گھڑی ساری کامیابیاں جھوٹ اور بیکار لگتی تھیں اور باہر جانا یا ملک میں رہنا میرے لیے کسی خوشی کا باعث نہ تھا۔

ماما نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی۔

گوتم نے جاتے ہوئے کہا "شیام تمہیں یاد کر رہا تھا، مگر میں تمہیں امتحان سے پہلے آنے کی صلاح نہیں دوں گا۔ ہم لوگ بھی اب تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔ امتحان میں کل پندرہ دن ہی تو رہ گئے ہیں۔"

جاتے جاتے ماما ذرا سی دیر کے لیے گوتم کے پیچھے جاتے ہوئے رُکی اور دروازے میں سے اس نے بڑی گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ نگاہ جو ننگی تھی اور ایسے افسوس کے   موقع پر سارے انسانوں کی اہانت لگتی تھی۔ سارے جذبوں کی بے عزتی لگتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے اور میرے ناطے کی بھی ہنسی تھی۔

میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

پھر وہ گوتم کے ساتھ جا ملی اور میں نے کتابوں کے ڈھیروں کی طرف بڑے دکھ سے گھورا۔ امتحان سر پر آ ہی گئے تھے۔ امتحان جو میری قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ لوگ جو کہتے ہیں کہ ان دیکھی طاقتیں اور آکاش پر رہنے والے دیوتا کچھ نہیں ہے۔ مرنے کے بعد آتما فوراً ہی اگلے جنم کے چکروں میں گھومنے کے لیے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جون میں جنم لے لیتی ہے۔ غلط کہتے ہیں اور میں جو بہت کم سپنے دیکھتا ہوں سپنوں میں وشواس کرنے لگا ہوں۔

امتحان کے دنوں میں روز رات کو میری ماں مجھے دکھائی دیتی۔ آنکھیں مجھ سے ملا کر بات نہ کرتی ہوئی وہ فوراً ہر کتاب کو کھولتی اور اگلے پرچے کے لیے ان جگہوں کی طرف اشارہ کرتی، جہاں سے سوال پوچھے جانے والے ہوتے۔ پہلے دن میں نے سوچا "شام میں نے ماں کو

گوتم نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا۔ پھر کہنے لگا مایا دیکھو تو کون آیا ہے۔

مایا آکر دہلیز پہ کھڑی ہو گئی۔ اس کا رنگ ایک دم سفید ہو گیا۔ میں بھی یونہی ہاتھ بڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا کچھ نہیں۔

"اندر آؤ بھئی، وہیں سے کھڑی کیا گھور رہی ہو۔ اب اس سے پوچھو نا تم سے بنا کیوں چلا گیا تھا۔" گوتم کی آواز اپنی پرانی گمبھیرتا کے ساتھ محبت کرنے والے کی سی نرم تھی۔

مایا ہولے ہولے چلتی اندر آئی، پھر مُڑ کر گوتم سے کہنے لگی۔ "تمہارا جی کیسا ہے؟"

"دیکھا تم سے ابھی تک ناراض ہو رہی ہے" گوتم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم اس سے معافی مانگ لینا بھئی منوہر بلکہ ابھی مانگو۔"

"اور تم ناشتے میں دلیہ کھاؤ گے یا انڈا" وہ بدستور اس کی طرف مخاطب تھی۔ "مایا تمہارے اخلاق کتنے خراب ہیں۔ بھئی گھر آئے مہمان سے تو اس طرح بے نیاز نہیں ہوتے۔" گوتم نے پھر کہا۔

"بیٹھو منوہر" اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مگر یہاں بیٹھ کر کیا کرو گے اپنے اسی پرانے کمرے میں جاؤ۔ نہا دھو کر کچھ آرام کرو۔ تھکے ہو۔ آج بولان میل اپنے وقت پر آیا ہے۔ ریلوے والے بھی وقت کے کتنے پابند ہوتے ہیں۔"

میں تھکا تھکا سا سیڑھیاں چڑھتا اس بالکنی کی طرف بڑھا۔ لکڑی کی سیڑھیوں کا رنگ و روغن اُتر چکا تھا اور وہ چرچراتی تھیں۔ کتنی ہی دیر میں بالکنی میں کھڑا سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ موٹروں کا دریا سا رواں تھا۔ بڑ کے پتے اسی طرح کمرے کے اندر تک جاتے تھے اور جھکے رہتے تھے۔ ہوا ویسے ہی سرسراتی ہوئی شاخوں میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور سمندر کی نمی سے بھرے جھونکے بڑے خوشگوار لگ رہے تھے۔

ہر شے یونہی تھی میرا اور مایا کا کمرہ بھی، پردے بھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میری کنگھی تک رکھی تھی۔ بستر کے ساتھ میرے سلیپر تھے۔ مجھے لگا یہ وقت نہیں بیتا میں سپنے سے جاگا ہوں اور مایا ابھی ابھی میرے پاس سے اُٹھ کر گئی ہے۔ میری پسندیدہ خوشبو تک ارد گرد ڈول رہی تھی۔ خوشبو جو اس کے جسم کی بھی نہیں، اس کے بالوں کی بھی نہیں، اس کے سانس کی تھی۔

جب دوپہر بیت گئی، میں آرام کر چکا تو نوکر نے کہا "ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

گوتم کرسی پر بیٹھا تھا اور صبح سے زیادہ بشاش لگتا تھا۔

"مایا تو دیکھو اپنی کسی جاننے والی کے ہاں گئی ہے۔ شاید کسی برت وغیرہ میں۔ بچے یہیں ہیں، وہ ابھی تک نہیں آئی۔ تم جانتے ہو تمہاری غیر موجودگی میں ہمارے ہاں ایک اور اضافہ ہوا ہے" پھر اس نے آواز دے کر کہا "آیا کو کہو بے بی کو لائے۔"

"تم دیکھو گے کہ روپا بالکل تم پر پڑی ہے" گوتم کی آواز میں نہ طنز تھا اور نہ ہی شرارت۔ وہ نہایت ایمانداری سے کہہ رہا تھا۔ اس کی نگاہ دروازے کی طرف تھی ورنہ وہ میرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ تو دیکھ سکتا۔ میرا اڑا ہوا رنگ تو اسے ضرور نظر آتا۔

آیا وہی تھی شیام اور روپا دونوں آ گئے تھے۔ شیام تو آنے کے ساتھ ہی میری گود میں چڑھ گیا۔ بچی کو گوتم نے اٹھا کر میری طرف کیا۔ "دیکھتے ہو۔ کیسے تم پر پڑی ہے۔ وہی نقشہ ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ ماں باپ میں سے کسی سے مشابہ نہیں ہوتا۔ کسی دور پار کے رشتہ دار جیسا ہو جاتا ہے۔ روپا، دیکھو تمہارے بھائی آئے ہیں۔"

اپنے سفید ہوتے چہرے کو گوتم سے چھپانے کے لیے میں نے روپا کو اس سے لے لیا۔ اور اسے گھٹنے پر بٹھا لیا۔

"تو یوں مایا نے مجھے قید کر لیا ہے سدا کے لیے۔ ایک ویرانی کے احساس سے میرے وجود کو ڈسنے کے لیے اس نے میر پر روپا کو مارا ہے۔"

سوچیں میرے جی کو پریشان کرتی رہیں۔

سمندر کے کنارے دیر تک ٹہلتے ہوئے ایک ہی خیال بار بار ڈھیٹ بھکاری کی طرح میرے دماغ کے دروازے پر کھ کرتا رہا۔

"مایا کو اب گوتم سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ میرا اخلاقی فرض تھا کہ میں مایا اور روپا کو اپنے ساتھ لے جاؤں، جب مایا میرے ساتھ جانے کے لیے ہاں نہیں کرتی، میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔ کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں گوتم سے کہہ دوں گا۔ میں اسے مز نہیں دینا چاہتا۔"

ایسے ہی خیال جو سوال بھی خود ہی تھے اور جواب بھی خود ہی۔

جب کمرے میں گھسا ہوں تو میرا ارادہ تھا اگر گوتم جاگتا ہو، اس سے اسی وقت بات کر لوں گا۔ مگر سارا گھر چپ کے پ قید تھا۔ میں نے کپڑے بدلے اور بہت کم شور کیا۔ چاند کھڑکی کے سامنے تھا اور پتوں میں سے چھن چھن کر روشنی اندر آ رہی تھ میں بستر پر لیٹا ہوں تو لمبے سیاہ بال تکیے پر بکھرے تھے اور اندھیرے میں مایا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"من ہر، من ہر، اس دیوانے خیال کو جی سے نکال دو۔ میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔ کیا گوتم کو چھوڑنا اتنا آسان ہے روپا کو تو تم لے جاؤ گے پر شیام، بے شیام کا کیا بنے گا۔ اس سیاہ داغ کے ساتھ میں شیام کا جینا پسند نہیں کروں گی۔ اس کے ما یہ لکھا ہو کہ اس کی ماں اس کو چھوڑ گئی۔ نہیں من ہر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"روپا مجھے دے دو" میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا

"گوتم کو کیا کہوں۔ میں روپا من ہر کو کیوں دے رہی ہوں۔ ابھی تو اسے ذرہ برابر شک نہیں ہے۔"

سوال پھر پھر کر شیام کا آ جاتا ہے۔"

"تو تم گوتم کو نہیں چھوڑ سکتیں" میں نے زور سے کہا۔

میرے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا "ہولے بولو، میں دو بچوں کی ماں ہوں"

"مگر دن کے وقت مجھے کیا کہہ سکو گی جب میں گوتم سے ساری بات خود کہوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے منہ پہ سے ہ

"گوتم کا غصہ بہت سخت ہے اور وہ غصے میں جن سے زیادہ طاقت ور ہو جاتا ہے۔" مایا نے اپنا بازو میرے سر کے نیچے ہوئے کہا۔

"ہٹاؤ، چلی جاؤ یہاں سے تم قابلِ نفرت ہو۔ میں تمہارے منہ پر تھوکتا ہوں" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مایا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میرے کندھے پہ اپنا سر رکھتے ہوئے کہا "من ہر تم میرے رات کے مالک ہو۔ دن پر تمہ نہیں۔ دن کو میں گوتم کی ہوں اور میں اجازت نہیں دوں گی کہ تم اس کے سکون اور اس کی بھی بھائی زندگی میں کھنڈت ڈال سکو۔ رات

بہت یاد رہا تھا۔ اس لیے وہ مجھے نیچے میں دکھائی دی ہے۔ معمولی شستہ بیٹھک والی گھر جو حیرت کے ڈاکٹری کی کتابوں کا کیا پتہ؟ اُسے یہ پتہ تھا میں کیا پڑھتا ہوں۔ مگر اس رات وہ بہت سفید ساڑھی باندھے تھی اور ایسی تھی جیسے وہ اپنی جوانی کے دنوں میں ہو گی۔ پچھلی ہوئی دودھیا چاندنی ابھی بھی ہے تو صحن میں سے دکھائی دے۔ گھر والوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی نہیں۔ بس ایسے ہی جیسے میری جوان بہن گئی تھی۔ جیسے اس کا بیاہ ہوا ہے۔ کمرے کے اندر آ کر اس نے پاس پڑی کتابوں کو الٹا پلٹا مگر بولی کچھ نہیں پھر اس نے ورق پلٹے اور اشارہ کیا کہ میں یہاں سے پڑھوں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا۔ رات کا آخری پہر بجا تھا اور سویرا کہیں قریب ہی تھا۔

پرچے کے وقت میرا دل جو سے جو سے دھک دھک کر رہا تھا۔ میری ماں نے پہنچ کر میری مدد کی تھی۔ اس نے مجھے اسٹیئرنگ دیا تھا، پر پاس ہونا بس ضروری ہو گیا تھا۔ امتحان کوئی ڈیڑھ مہینہ چلا۔ میرے ہم جماعت بوسے کہتے: "منوہر لگتا ہے پرچے کچھ تسلی بخش نہیں ہو رہے تمہارے لیے وقت تمہاری ماں نے تمہارا ساتھ چھوڑا بغیر کوئی بات نہیں، اگر کچھ پرچوں میں کمی رہ گئی تو سپلیمنٹری میں دے دینا۔"

فارغ ہو کر میں نے فوراً گھر جانے کا سوچا۔ بہنوں کے لیے بازار سے سوغاتیں خریدیں اور گاڑی کے وقت سے ذرا پہلے گوتم کو اس نے ٹیلیفون کیا۔

گوتم بہت مصروف تھا۔ کسی نہایت سیریس مریض کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا: "تم کچھ دنوں رک کے۔ ہمارے ہاں رہتے تو اچھا تھا:"

میں نے کہا: "دل بہت اداس ہے۔"

ماتھے کی میز پر ابھی ہاتھ سے پکڑے کپڑے اس نے کہا: "ماتا سے نہیں ملے۔ اس پر پھر ہوریت کا دورہ پڑا ہے۔ جب سے میں رہتا ہوں تب سے کچھ بھی خبر لی تھی۔"

میں نے کہا: "گاڑی کا وقت ہو رہا ہے۔"

تو اس نے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا: "جب رزلٹ نکلے گا تو دیکھیں گے۔ تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ ماتا سے میں کہہ دوں گا کہ تم چلے گئے ہو۔" اور اس کے بعد رسیور رکھ کر وہ پھر اپنے مریض پر جھک گیا تھا۔ کراچی کے چند ہم جماعت اسٹیشن پر مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ رزلٹ تک دو تین ماہ سب کے پاس فالتو تھے۔ کوئی کسی جگہ ملنے جانے والا تھا، اور کوئی کام شروع کرنے والا تھا۔ زندگی کی ہماہمی پر یہ دن۔

میں بابا کے ایک دوست ڈاکٹر کے پاس کام کرنے لگا تھا اور اس مصروفیت میں ماں کی یاد مجھے آتا نہ ستاتی تھی۔ سادہ دل تھے۔ پیچیدہ مرض بھی ٹھیک ... ویسے ہی طرح ابھی اپنے شکنجے میں نہیں جکڑتے تھے۔ ڈاکٹر کہتا: "میں سوچتا ہوں کسی بڑے شہر میں جا کر پریکٹس کروں۔ یہاں تو سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ اس ڈگری کا کیا فائدہ؟ یہاں تو کوئی معمولی کمپونڈر بھی ان کے لیے کافی ہے۔"

"پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا ڈاکٹر صاحب۔" میں ان دنوں بسنت جانے والی دنیا سے کوئی بہت محرومی نہیں کرتا تھا۔

"تو پھر تم اور کس شے کی کھوج میں ہو؟ تم نے اتنے سال یونہی گنوائے ہیں۔ جب کوئی منزل نہ ہو آدمی کو کہیں جانا نہ ہو تو یہاں اور وہاں برابر ہے۔ زیادہ اونچی تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ سادہ دل سے آدمی کہیں پر بھی گزر بسر کر سکتا ہے۔ میں تو روپیہ کمانا چاہتا ہوں۔ و میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔ میرا ابھی تو یہ ہے کہ میرے کلینک کے سامنے فیس کی جو تختی لگی ہو اس پر لوگوں کے ہجوم لگا دے۔ صرف بہت اونچا

لوگ ہی مجھ تک پہنچ پائیں اور وہ ڈرتے جھجکتے ہوئے ہوں۔ ان جاہل لوگوں کی طرح وہ مجھ سے بحث تو نہ کریں:

میں نے کہا۔ "آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں کبھی کبھار ان کو سمجھانا خاصا مشکل ہو جاتا ہے"

"تم خاصا مشکل کہتے ہو، میں کہتا ہوں ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن ہے انہیں سمجھانا۔"

ڈاکٹر نے دور سے مریض کو دیکھا اور کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بابا کا خیال تھا امتحان پاس ہونے کے بعد میں بھی یہیں پر کلینک کھول لوں اور بہنوں کے پاس ہی رہوں اور کام بھی چل نکلے گا کے ارادے ایسے ہی تھے۔ وہ ہر شام جب کھانے سے فارغ ہو کر گھڑی دو گھڑی بیٹھتے تو یہی کہتے۔

"منوہر تمہارا نتیجہ نکل آئے۔ میرے پاس کچھ پیسہ ہے تمہیں کلینک کھول دوں گا۔"

اپنے چاچا ڈاکٹر کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں پر کام چلنا مشکل بلکہ نہیں چلنے والا تھا۔ ایک دو لوگ جن کو مریض دیا جاتا تھا۔ جن کے دیے ہوئے زہر سے بھی وہ ٹھیک ہو جاتے تھے مگر سب تو اس درجے تک نہیں پہنچ پاتے۔

میں دن گن رہا تھا اور سوچتا تھا رزلٹ نکلنے کے بعد ہی بابا کے سوال کا جواب دے سکوں گا۔

جب برف پڑنے لگی تھی اور نلوں میں پانی جمنے لگا تھا تو ہمارا نتیجہ نکل آیا۔ گوتم نے مجھے تار دیا مبارک باد کا۔ میری سارے میں دوسری پوزیشن تھی۔

کاش کوئی ہوتا جو غرور سے سر اونچا کر کے چل سکتا۔ اس دن میری بہنیں چھپ چھپ کر روتی رہیں اور میں رات گئے تک برف ڈھکے خیر آباد رستوں پر یونہی چلتا رہا۔ جانے میں کتنا چلا ہوں گا۔ کہ گھر آ کر تھکا ہوا سو گیا۔ میں نے اس رات جاگنے کے باوجود کوئی سپنا

تقریباً سوا سال کے بعد میں پھر کراچی کے اسٹیشن پر آ کر اترا تھا۔ رزلٹ نکلنے کے بعد میں نے ہاؤس سرجن ہونے کا تمام عرصہ کوئٹہ ہسپتال میں گزارا تھا اور گوتم سے بھی خط و کتابت ہوتی رہی تھی۔ اس نے میرے لیے بہت کوشش کی تھی جس سے ہماری پتھر اٹھانے آخر میں ایک جینک کے غیر سرکاری وظیفے پر میرا امریکہ جانے کا بندوبست ہو سکا تھا۔ اسٹڈ ویلی کی تاریخ چار دن بعد تھی۔ اس نے مجھے لکھا بھاری قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ جب میں نے اس شہر کے نیچے قدم دھرا۔ تو اُن کی کوک نے میرا سواگت کیا جلد دنوں کے خیال سے میرا جی بھر آیا۔ جب میں نے گوتم کے نام کی تختی ڈھونڈنا چاہی تو وہ مجھے نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا گھنٹی بجاؤں اس نے میں ذکر نہیں کیا۔ شاید انہوں نے مکان بدل لیا ہو۔

نوکر نے پوچھا: "آپ کس سے ملیں گے۔"

"ڈاکٹر گوتم یہیں رہتے ہیں نا؟"

جی حضور یہیں رہتے ہیں۔ آج ان کا جی اچھا نہیں ہے۔ کلینک نہیں گئے۔ آپ نام بتائیں انہیں خبر کردوں۔" وہ مسکرایا

میں نے کہا۔ "خبر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"

اس نے میرا بکس اٹھالیا۔ اور دوسرے ہاتھ میں وہ بڑی ٹوکری بھی جو بابا نے گوتم کے لیے بھیجی تھی۔

گوتم نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا، پھر کہنے لگا "ماتا دیکھو تو کون آیا ہے۔"

ماتا آئیں دہلیز پہ کھڑی ہو گئیں۔ اس کا رنگ ایک دم سفید ہو گیا۔ میں بھی یونہی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا کچھ نہیں۔

"اندر آؤ بھئی، وہیں سے کھڑی کیا گھور رہی ہو۔ اب اس سے پوچھو نا کہ یہ بنا کہے کیوں چلا گیا تھا۔" گوتم کی آواز اپنی پرانی گمبھیرتا کے ساتھ محبت کرنے والے کی سی نرم تھی۔

ماتا بڑھتے ہوئے چلتی اندر آئی، پھر مڑ کر گوتم سے کہنے لگی "تمہارا ہی پیسا ہے۔"

"دیکھا تم نے ابھی تک ناراضگی باقی ہے" گوتم نے ہنستے ہوئے کہا "تم اس سے معافی مانگ لینا بھئی منوہر بلکہ ابھی مانگو۔"

"تم ناشتے میں دلیہ کھاؤ گے یا انڈا؟" وہ بدستور اسی کی طرف مخاطب تھی۔ "ماتا تمہارے اخلاق کتنے خراب ہیں۔ بھئی گھر آئے مہمان سے تو اس طرح بے نیاز نہیں ہوتے۔" گوتم نے پھر کہا۔

"بیٹھو منوہر" اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مگر یہاں بیٹھ کر کیا کرو گے۔ اپنے اسی پرانے کمرے میں جاؤ۔ نہا دھو کر کچھ آرام کرو۔ تھکے ہو گے۔ آج بولان میل اپنے وقت پر آیا ہے۔ ریلوے والے بھی وقت کے کتنے پابند ہوتے ہیں۔"

میں تھکا تھکا سا سیڑھیاں چڑھتا اس بالکنی کی طرف بڑھا۔ لکڑی کی سیڑھیوں کا رنگ روغن اتر چکا تھا اور وہ چرچرا رہی تھیں۔ کتنی ہی دیر میں بالکنی میں کھڑا سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ موٹروں کا دریا رواں تھا۔ بڑ کے پتے اسی طرح کمرے کے اندر تک جاتے تھے اور جھک رہے تھے۔ ہوا ویسے ہی سرسراتی ہوئی شاخوں میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور سمندر کی نمی سے بھرے جھونکے بڑے خوشگوار لگ رہے تھے۔

ہر شے یونہی تھی میرا اور ستیا کا کمرہ بھی، پردے بھی، ڈریسنگ ٹیبل پر میری کنگھی تک رکھی تھی۔ بستر کے ساتھ میرے سلیپر تھے۔ مجھے لگا یہ وقت نہیں بیتا میں سپنے سے جاگا ہوں اور ستیا ابھی ابھی میرے پاس سے اٹھ کر گئی ہے۔ میری پسندیدہ خوشبو تک ارد گرد ڈول رہی تھی۔ خوشبو جو اس کے جسم کی بھی نہیں، اس کے بالوں کی بھی نہیں، اس کے سانس کی تھی۔

جب دوپہر بیت گئی، میں آرام کر چکا تو نوکر نے کہا "ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

گوتم کرسی پر بیٹھا تھا اور صبح سے زیادہ ہشاش بشاش لگتا تھا۔

"ماتا دوپہر سے اپنی کسی جاننے والی کے ہاں گئی ہے۔ شاید کسی برت وغیرہ میں۔ بچے یہیں ہیں، وہ ابھی تک نہیں آئی۔ تم جانتے ہو تمہاری غیر موجودگی میں ہمارے ہاں ایک اور اضافہ ہوا ہے" پھر اس نے آواز دے کر کہا "آیا کو کہو بے بی کو لائے۔"

"تم دیکھو گے کہ روپا بالکل تم پر پڑی ہے" گوتم کی آواز میں نہ طنز تھا اور نہ ہی شرارت۔ وہ نہایت ایمانداری سے کہہ رہا تھا۔ اس کی نگاہ دروازے کی طرف تھی ورنہ وہ میرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ تو دیکھ سکتا۔ میرا اڑا ہوا رنگ تو اسے ضرور نظر آتا۔

آیا وہی تھی۔ شیام اور روپا دونوں آگئے تھے۔ شیام تو آنے کے ساتھ ہی میری گود میں چڑھ گیا۔ بچی کو گوتم نے اٹھا کر میری طرف کیا۔ "دیکھتے ہو، کیسے تم پر پڑی ہے۔ وہی نقشہ ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ ماں باپ میں سے کسی سے مشابہ نہیں ہوتا۔ کسی دور پار کے رشتہ دار جیسا ہو جاتا ہے۔ روپا دیکھو تمہارے بھائی آئے ہیں۔"

اپنے سفید ہوتے چہرے کو گوتم سے چھپانے کے لیے میں نے روپا کو اس سے لے لیا۔ اور اسے گھٹنے پر لے بٹھایا۔

"تو یوں مایا نے مجھے قید کر لیا ہے سدا کے لیے۔ ایک ویرانی کے احساس سے میرے وجود کو ڈسنے کے لیے اس نے میرے منہ پر روپا کو مارا ہے"

سوچیں میرے جی کو پریشان کرتی رہیں۔

سمندر کے کنارے دیر تک بیٹھے ہوئے ایک ہی خیال بار بار ڈھیٹ بھکاری کی طرح میرے دماغ کے دروازے پر کھٹ کھٹ کرتا رہا۔

"مایا کو اب گوتم سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ میرا اخلاقی فرض تھا کہ میں مایا اور روپا کو اپنے ساتھ لے جاؤں، جب تک مایا میرے ساتھ جانے کے لیے ہاں نہیں کرتی میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔ کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں گوتم سے کہہ دوں گا۔ میں اسے مزید دھوکا نہیں دینا چاہتا۔"

ایسے ہی خیال جو سوال بھی خود ہی تھے اور جواب بھی خود ہی۔

جب کمرے میں گھسا ہوں تو میرا ارادہ تھا اگر گوتم جاگتا ہو، اس سے اسی وقت بات کر لوں گا۔ گھر سارا گھپ چپ کے جادو میں قید تھا۔ میں نے کپڑے بدلے اور بہت کم شور کیا۔ چاند کھڑکی کے سامنے تھا اور پتوں میں سے چھن چھن کر روشنی اندر آ رہی تھی جب میں بستر پر لیٹا ہوں تو لمبے سیاہ بال تکیے پر بکھرے تھے اور اندھیرے میں مایا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

من ہر۔ من ہر۔ اس دیوانے خیال کو جی سے نکال دو۔ میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔ کیا گوتم کو چھوڑنا اتنا آسان ہے؟ روپا کو تو تم لے جاؤ گے پر شیام۔ شیام کا کیا بنے گا۔ اس سیاہ داغ کے ساتھ میں شیام کا جینا پسند نہیں کروں گی۔ اس کے ماتھے پہ یہ لکھا ہو کہ اس کی ماں اس کو چھوڑ گئی۔ نہیں من ہر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"روپا مجھے دے دو" میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا

"گوتم کو کیا کہوں۔ میں روپا من ہر کو کیوں دے رہی ہوں۔ ابھی تو اُسے ذرہ برابر شک نہیں ہے۔"

سوال ہر بار پھر کر شیام کا آ جاتا ہے۔"

"تو تم گوتم کو نہیں چھوڑ سکتیں" میں نے ذرا زور سے کہا۔

میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا "ہولے بولو۔ میں دو بچوں کی ماں ہوں"

"مگر دن کے وقت مجھے کیا کہہ سکو گی جب میں گوتم سے ساری بات خود کہوں گا" میں نے اس کا ہاتھ اپنے منہ پہ سے پرے کیا

"گوتم کا غصہ بہت سخت ہے اور وہ غصے میں جن سے زیادہ طاقت ور ہو جاتا ہے" مایا نے اپنا بازو میرے سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"ہٹاؤ چلی جاؤ یہاں سے تم قابلِ نفرت ہو۔ میں تمہارے منہ پر تھوکتا ہوں" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

مایا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھتے ہوئے کہا "من ہر تم میرے رات کے مالک ہو۔ دن پر تمہیں اختیار نہیں۔ دن کو میں گوتم کی ہوں اور میں اجازت نہیں دوں گی کہ تم اس کے سکون اور اس کی بھی بھالی زندگی میں کھنڈت ڈال سکو۔ رات کو پھر

تمہاری دُلہن ہوں اور دن کو گوتم کی۔"

"تم یہ سب باتیں کیسے سوچ سکتی ہو۔ کتنے آرام سے کہہ سکتی ہو۔" میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"میں ہر رات اندھیارے کے دیتا ہو۔ تمہارا میرا ملاپ ہی رات ہے۔ رات اور اندھیرا جس کے اندر سے دن پیدا ہوتا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے یہ سب باتیں کہہ رہی تھی۔

"میں اس گھر میں ایک گھڑی نہیں ٹک سکتا۔" میں بدستور غصے میں تھا۔

"بیروں اس گھر کو کیا ہوا ہے۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں بھی دروپدی کی طرح تم دونوں کے درمیان اپنے آپ کو بانٹ رہی ہوں۔" ملیکا نے اس نرمی سے کہا۔

"دنیا میں آج تک ایسا نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ یہ صرف تمہاری معاملہ پسندی ہے۔ تمہارے دیوانے پینے ہیں۔" میں بہت خفا تھا۔

"چلو دیوانے سپنے ہی سہی جو تم بیوی مان لیتی ہوں۔ میں تمہاری چرنوں کی دھول بھی اسی طرح ماتھے پر چڑھاتی ہوں جیسے گوتم کی۔ تم نہیں سمجھتے کہ تمہاری کمیاں تم میں پوری ہوتی ہیں تم دونوں مل کر میرے سپنے بنے ہو۔"

"عجیب منطق تھی۔"

"مدیا کو کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ میں اس کا کون ہوں۔" میں نے دکھ سے کہا

"مجھے تو معلوم ہے کہ تم اس کے کون ہو۔ تمہارے لیے وہ اتنی ضروری کیوں ہے؟ رویا مجھ سے ہے۔ میں رویا سے نہیں ہوں۔"

"میری ذمہ داریاں میرا اخلاقی ذہن، اُن سب کا کیا بنے گا۔" میں نے پوچھا۔

"وہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اب جانے والے ہو۔ اپنا دل کیوں میلا کرتے ہو۔ نہیں ابھی اور بہت سے کام کرنے ہیں۔ پوری توجہ سے انٹرویو دو۔ میں ہر وقت بھگوان سے تمہارے لیے پرارتھنا کرتی ہوں۔ تمہاری کامیابی میری کامیابی ہے۔ تمہیں نہیں پتہ تم مجھے کتنے اچھے لگتے ہو۔

وہ اسی طرح کی باتیں کرتی رہی اور رات بہت گئی اور پھر اور کئی راتیں اسی طرح گزر گئیں۔

آدمی ذکر شکوہ سے آخر سمجھوتہ کر ہی لیتا ہے۔

انٹرویو ہوا میرے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ بابا آئے۔ اور کئی چھوٹے بڑے کام نمٹا کر جب میں جہاز کے اندر بیٹھا تو محسوس ہوا کہ میں اپنا ایک وجود پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک زمانہ یہاں رہ گیا ہے۔ میرا بچپن میری جوانی میری محبت میرے سپنے اور رویا۔

ملیکا ان دنوں مجھ سے دور ہی دور رہی تھی اور چونکہ شیام کا جی اچھا نہیں تھا وہ مجھے پہنچانے ایئرپورٹ بھی نہیں آئی۔

گوتم اور بابا باتیں کر رہے تھے۔ گوتم مجھے بیچ بیچ میں نصیحتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ بابا تاکید کر رہے تھے کہ خط لکھوں انہیں بھول نہ جاؤں۔ سیڑھی ہٹائی گئی اور میں انجانی دنیاؤں کی طرف اجنبی لوگوں کے درمیان رہنے کے لیے چلا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ہم دو کے بعد میری اور گوتم کی دروپدی جانے اور کتنے لوگوں کو بیاہے گی۔

مجھے کسی ملنے والے نے بتایا کہ ملیکا کی صحت گر گئی ہے۔ وہ یوں دیکھنے میں اچھی بھلی لگتی ہے۔ مگر اصل میں بیمار رہتی ہے۔ اسے نیند نہیں آتی۔ بولتی ہے تو بولتی چلی جاتی ہے اور چپ رہے تو دنوں بات نہیں کرتی۔ کبھی جوگن کا روپ دھار لیتی ہے۔ ننگے پاؤں مندر جانے

تی۔ گھر میں پوجا کا علیٰحدہ کمرہ بنا رکھا ہے۔ سارے دیوی، دیوتا اور بھگوان طاقوں میں سجا کر ان کے آگے ماتھا ٹیک رہی ہے۔ جی میں شمع ساڑھی پہن کر مانگ میں سیندور بھرے موڑھے کر اکیلی ہی گھومتی پھرتی ہے۔ پاس سے جا کر پہروں سمندر کو تکے جاتی ہے۔ کے پیچھے بہت بھاگا۔ ہر جگہ اس کے علاج کے لیے گیا۔ مگر مایا نے اس سے بار بار کہا "گوتم میں بالکل اچھی طرح سے ہوں۔ بالکل تتلی کی طرح کئی روپ بدلتی ہوں۔ اصل میں اسی جنم میں بار بار جنم بدل رہی ہوں۔ تم کیوں گھبراتے ہو۔" تو وہ بھی کچھ سمجھ کر اپنے کام میں وہ اس طرح سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مگن ہے تو ہر کسی سے اس کی شکایت کرتی ہے۔ کہتی ہے۔

میں مروں یا جیتی رہوں، گوتم سے کیا۔ اسے تو مجھ سے کوئی مطلب ہی نہیں:

دوست تو سمجھتے ہیں کہ یہ بیمار عورت ہے۔ مگر دوسرے لوگ کم جاننے والے ہر کوئی تو مایا کی طبیعت سے واقف نہیں ہو سکتا؟ اور جب ہوشمند عورت اس طرح سے رونا روئے گی تو شک کرنے کی بجائے لوگ اسے بہت دکھی سمجھیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ تم تندرست ہو، چہرے پر رونق ہے وہ کھوئی کھوئی ہوئی نگاہیں نہیں ہیں "تو گالیاں دینے لگتی ہے۔ ایک وقت وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ اسے جلد اور وہ بیمار بنا بھی چاہتی ہے:

میں اور گپتا کسی دوست کے ہاں آئے ہوئے تھے جو ابھی ابھی کراچی سے واپس آیا تھا۔ وہ یونہی گوتم سے ملا تھا اور گوتم اسے گھر لے گیا پر وہ کھانے کے لیے رکا تھا اور اس نے مایا سے بات کی تھی۔

پہلی نظر میں تو لگا کوئی جوگن ہے۔ سفید ساڑھی باندھے کھڑاویں پہنے۔ گوتم نے کہا " یہ میری دھرم پتنی ہیں۔ ان کا نام مایا ہے۔

میں نے جھک کر سلام کیا۔ وہ بیٹھی رہیں اپنے سامنے تکتی رہیں۔

گوتم نے کہا " مایا، میں ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں جو کسی ریستوران میں ممکن نہیں تھیں۔ کیا ہمیں بہت بڑھیا کھانا مل سکے گا"

سوچوں گی۔ مایا نے اسی طرح سامنے تکتے ہوئے کہا

گوتم نے پھر کہا" تمہاری خاص ڈش ہے نا وہ حلوہ اور پوریاں اور سندھی اچار اور چاٹ کیا کیا۔ میں نے ان چیزوں کا وعدہ کیا ہے ان بت زمانوں بعد امریکہ سے آئے ہیں منوہر کے دوست ہیں اور ایک دو دن میں واپس بھی جانے والے ہیں"

پھر تو میں مضطرب تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ میرے نام سے مایا کے چہرے پر جو تبدیلی ہوئی — اس کے متعلق گوپال کوئی بات گپتا کہے۔ مگر گوپال نے کوئی بات نہیں کہی کم از کم ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے میں گپتا کو جواب دینے اور قابلِ اعتراض ہونے کی توجہ رہتا۔

کھانے پر وہ بہت بدلی ہوئی اور یکسر دوسری عورت لگی تھی: گوپال کہانی کہنے والے کی طرح اب خود بھی اس سارے واقعے ہوتا دکھائی دیتا تھا۔

گوپال کی بیوی دیا اور گپتا دونوں حیرت سے منہ کھولے سُن رہی تھیں اور کہانی میں دلچسپی لے رہی تھیں۔

گوتم اور میں اتنے عرصے میں مایا کی بات ہی کرتے رہے۔ اس نے مجھے اس کی بیماری کے متعلق بتایا اور بہت دیر تک ہم تجربے سے اس کیس کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نے اس سے کہا تھا مجھے مایا سے بات کرنے دو۔ گوتم نے

سر مار رہی ہے۔ بیوی تو اس بات کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ مایا نہ کسی ماہر نفسیات کے پاس جاتی ہے اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے بات کرنے کو تیار ہے۔ وہ کہتی ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ سوچتی ہے وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ اب پچھلے دنوں میں وہ لوگوں سے کیا اپنا دکھ کہتی پھرے؟" اور پھر میں کوئی بیمار ہوں نیند نہیں آتی نا؟ بس کیا ہوتا ہے۔ اس سے آنکھیں بند کر کے میں پچھلے گزرے جنموں کی بیتی باتیں سوچتی ہوں۔ فلم کی طرح ہر واقعہ سامنے سے گزرتا ہے:

"ایسے مریض کا تم کیا علاج کر سکتے ہو، جو اپنا علاج خود کرنے نہ دے۔" گوتم تھکا ہوا لگتا تھا اور بوڑھا جیسے کسی اچھے بھلے درخت کو گھن چاٹ رہا ہو۔ اور وہ وقت سے پہلے گرنے والا ہو۔

"میں نے کہا تم مجھے اس سے ملنے سے بات تو کرنے دو۔"

گوتم نے کہا "میں یہ شعبدہ کئی بار کر چکا ہوں۔ ماہر ڈاکٹروں کو گھر لاتا ہوں وہ اس سے علیحدگی میں بات کرتے ہیں مگر تمہیں پتہ ہے وہ میری عدم موجودگی میں ان سے بیری ہے۔ خالی کار و بار رونے لگتی ہے۔ میرے کلینک میں آنے والی ہر عورت اور کام کرنے والی نرس پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے تعلقات بڑھا رہی ہیں۔ کئی بار وقت بے وقت میرے کلینک پہنچ جاتی ہے۔ اگر میں کسی مریض عورت کی طرف توجہ سے دھیان سے مخاطب ہوتا ہوں اس کا حال پوچھتا ہوں تو غصے سے مایا کا منہ سرخ ہو جاتا ہے۔ وہیں پر لڑنے لگتی ہے۔ اس سے میری پریکٹس پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ میں لوگوں سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میری بیوی ذہنی مریضہ ہے۔"

میں نے کہا "مجھے بھی آزما لینے دو۔ اور پھر ہنس کر میں نے کہا ہو سکتا ہے۔ تمہاری چند غلطیاں مایا کی وجہ سے مجھے بھی معلوم ہو جائیں۔"

گوتم نے کہا۔ "اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ میرے دوست میرے لیے دعا کرو۔"

کھانے پر میں نے دیکھا مایا نے سرخ ساڑھی پہنی تھی وہ بطور خاص اس دعوت کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس نے مانگ میں خوب بڑی دھاری سیندور کی لگائی تھی۔ ماتھے پر بندیا تھی۔ خون کی طرح سرخ۔ بالوں میں پھول تھے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ میں ہولے ہولے کھانا کھاتا رہا۔

مایا نے کہا "تم نے اس کی تعریف نہیں کی۔"

گوپال نے کہا "میں نے کھانے کی بہت تعریف کی۔ کھانا بہت اچھا تھا۔ مایا بات بات پر ہنس رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں وحشت بھری سی کیفیت تھی۔ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے اور وہ پلکیں بہت جھپکتی تھی۔"

گوتم کسی کام سے دوسرے کمرے میں گیا تو وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سانس روک کے کہا "مایا دیوی آپ تو بہت بدلی ہوئی اور بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ دو گھنٹوں میں آپ کتنا بدل گئی ہیں۔"

مایا کے ماتھے کی رگ پھڑکنے لگی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی اور اس نے میری طرف جھک کر کہا "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

ودیا نے کہا "تو سب ہے گوپال کیا ذرا مہربان ہے جو بات سنا بھی چکو۔"

گوپال نے کہا "یوں مایا کی طرح گھبرا کیوں رہی ہو۔ سنا تو رہا ہوں۔ اچھا تو پھر ایک لڑکی کمرے میں آئی۔ مایا نے اس کی طرف غصے

سے دیکھا اور نفرت سے پوچھنے لگی "روپا کیا ہے"؟

"میں نے روپا کو دیکھا بہت پیاری لڑکی ہے"۔ گوپال نے آہستہ آہستہ کہا اور میری آنکھوں میں دیکھا جیسے میرا راز جانتا ہو۔ میرا دل کانپ گیا۔ اب اگر اس نے روپا کی شکل کا بتایا۔ مگر نہیں وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ روپا کی اور میری شکل کے ملنے کو محض اتفاق نہیں سمجھتا تھا۔ اسے میرا راز معلوم تھا۔

دیا نے کہا "کیا وہ لڑکی جوان تھی"؟

"یہی پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ گوپال نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"اس نے ماں کے یوں سختی سے بولنے کا برا نہیں منایا"۔ گیتا نے پوچھا۔

"نہیں وہ بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ آ کر ماں کے پاس کھڑی ہوگئی اور ہنس کر کہنے لگی "ماں میں تمہیں دیکھنے آئی ہوں بابا سے کوئی ملنے آیا ہے شاید کوئی مریض ہے۔ میں نے سوچا آپ اکیلی ہوں گی"۔

مایا کے چہرے پر نرمی سی امنڈ آئی۔ اس نے روپا کو اپنے قریب کر لیا، کہنے لگی "گوپال صاحب میری بیٹی کو میرا بہت خیال رہتا ہے۔ یہ باپ کی طرح نہیں ہے اور نہ میرے بیٹے کی طرح جو ہر بات میں میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ میری بیٹی مجھے دنیا میں ہر شے سے زیادہ پیاری ہے۔

گیتا اور دیا دونوں اداس سی ہوگئیں۔

میں نے پوچھا "اس نے تم سے گوتم کی شکایت نہیں کی"

گوپال نے کہا "مجھے دو پورے حواسوں میں بھی نہیں لگی۔ مگر اتنا زیادہ فکرمند ہونے کی بات کی بھی نہیں تھی۔ کئی عورتیں بڑھاپے کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ سدا جوان رہنا چاہتی ہیں۔ میرا خیال ہے جوانی میں مایا ذرا خوش باش عورت ہوگی۔ اپنے ساتھ قصوں کو وابستہ کر کے خوش ہونے والی خیالوں میں چلنے والوں کی قطاریں دیکھ کر جی ہی جی میں مطمئن ہونے والی اور پھر جسم میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ بھی عورت کو بدل دیتی ہیں کیہ اندر اور باہر سے اس کی کیفیات اور احساسات بدل جاتے ہیں۔ وہ چڑچڑی، کم گو، سست یا تیز ہوتی ہے۔ یوں سمجھو ندی اپنا رخ بدل لیتی ہے۔

گیتا نے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ دیا چلیں، میں وہ سب چیزیں دیکھنا چاہتی ہوں جو گوپال بھائی لائے ہیں۔ گوتم اور مایا کا قصہ تو تم سمجھو یہ اب پیشہ ورانہ باتیں کر رہے ہیں"۔

پھر وہ دونوں اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں اور گوپال بنا بات کیے بیٹھے رہے جیسے کہنے کے لیے کچھ باقی نہ رہا ہو جیسے وہ مایا کی بات کرتا ہوا اور میں سنتے ہوئے۔

مایا نے ہی ایک خط میں لکھا تھا "تمہارے پاپا اب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ان کی کمر جھک گئی ہے۔ وہ دل کے ہاتھوں بہت پریشان ہیں۔ گوتم کے علاج سے بھی انہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے معلوم ہے تم میری وجہ سے واپس نہیں آتے۔ مگر یقین کرو گھر سے جو خط آتے ہیں ان میں تو آدھا بھی حال نہیں لکھا ہوتا بیماری کی شدت کا، تمہارا چھوٹا بھائی وہیں وطن میں محض اس وجہ سے رہتا ہے کہ تمہارے

کو اب اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ کچھ مہینے ہوئے وہ آیا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس سے کہ ان سب جگہوں پر گھمانے لے گئی جہاں کبھی تم اور میں جایا کرتے تھے۔ سمندر اسی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ریت پر دور دور تک وہ ہمارے قدموں کے نشان ڈھونڈتی رہی۔ رات کو ہم اپنا پرانا گیت گاتے۔ سدا بڑی ہو رہی ہے میں اسے یہ سمجھنے نہیں دیتی کہ تم اس سے بہت آگے نکل گئے ہو اور امریکہ میں ہو۔

بابا مجھے یاد آتے ہیں کہ کبھی مجھے نہیں کہا کہ انھیں میری ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ لوٹ آؤ۔ اور ایک دن بیٹھے بٹھائے ایک دن میں نے وطن واپس آنے کا سوچا۔ دراصل زمین میں ہمارے بابا کے درختوں کی جڑیں ابھی گہری نہیں جا تیں اور اس لیے امریکہ چھوڑتے ہوئے مجھے ذرا دکھ نہیں ہوا۔ بابا کو لے کر میں واپس آیا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ ہسپتال میں اسے لے گیا۔ ڈاکٹروں کا بورڈ بٹھایا۔ ان کی بیماری کی تشخیص ہوئی۔ کچھ دنوں وہ ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ پھر انھیں چھٹی مل گئی۔ جو کچھ دن رہتے۔ اس لیے ابھی ان کا کراچی چھوڑنا مشکل تھا۔ ہسپتال میں وہ دن اور وہ راتیں بہت فکرمندی، بے چینی اور اضطراب کی تھیں۔ مجھے تو اپنے گرد و پیش کی بھی خبر نہیں ہوتی تھی۔ مجھے لگتا تھا بابا نہ رہے تو میرے چاروں طرف اندھیرا ہو جائے گا۔ پھر جانے گر دھاری بھی بس تھا۔ نہیں روز خط لکھتیں۔ بڑے دکھ کے دن تھے وہ۔

گوتم بڑی باقاعدگی سے آتا تھا۔ کبھی کبھار رادھا بھی آ جاتی۔

بابا آنکھیں بند کیے رہتے۔ ہر وقت ایک آدمی ان پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوستا تھا کہ تو سات سال یا ستر سال کیا ذرا بھی ... پڑتا تھا۔ پھر میں جیسے کوئی ڈرتا ہوں۔ میں کس شے سے بھاگ رہا تھا۔

جب بابا ذرا سنبھلے، ہوش آئے تو گوتم نے آنا کم کر دیا۔ اب وہ کلینک جاتے ہوئے صبح یا شام بس ایک وقت آتا۔ مجھے کہتا: "منوہر تم تو لڑکیوں سے بھی کم ہمت ہو۔ میں مانتا ہوں انھیں تمہاری پوری توجہ کی ضرورت ہے لیکن ہر وقت آرام تو کیا کرو۔ گر دھاری کو یہاں چھوڑ کر خود ہمارے ہاں جاؤ۔ کسی دن ڈھنگ سے سو لو۔ تمہارے چہرے پر زردی تو کہو۔"

میں نے تب دیکھا کہ گوتم خود بھی بوڑھا ہو رہا تھا۔ اس کے بالوں کی سفیدی اب سیاہی سے زیادہ نمایاں تھی۔

میں نے کہا: "تم جو کام کرتے ہو اتنی چلتی ہوئی تمہاری پریکٹس ہے۔ آخر دولت کیا کرو گے۔ کیوں اتنے مصروف رہتے ہو۔ کبھی چھٹی بھی کرو۔"

کہنے لگا: "تم سمجھتے ہو میں دولت کے پیچھے دیوانہ ہوں۔ اصل یہ ہے کہ میں مصروف رہنا چاہتا ہوں۔ اتنا مصروف کہ مجھے بات کرنے کی بھی فرصت نہ ہو۔"

میں نے کہا: "میں زندگی میں نہ پیسہ کمانا چاہتا ہوں نہ مصروف رہنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے میں کامیاب ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔"

گوتم نے کہا: "حالات اور واقعات آدمی کو وہ بنا دیتے ہیں جو وہ نہیں ہونا چاہتا۔ شاید میں بھی تمہاری طرح سوچوں۔ سوچتا رہا ہوں۔ بابا نے کروٹ بدلی۔ آنکھیں کھولیں اور کہنے لگے: "میں اس ماحول سے گھبرا گیا ہوں۔ مجھے یہاں سے لے چلو منوہر۔ یہ بو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔"

آرام کی خاطر ہم دونوں نے نچلی منزل پر وہ کمرہ لیا تھا جو گوتم کے گھر کا مہمان خانہ تھا۔ وطن سے ... نے ... حال پوچھنے

میرے ملنے والے ساتھی دوست ڈاکٹروں کا آنا جانا۔ یہاں رہنے میں سو سُکھ تھے۔

مایا بھی بابا کی دیکھ بھال میں لگی رہتی، لوگوں کی خاطر داری کرتی، ڈاکٹروں سے بات کرتی۔ قسم قسم کے پرہیزی کھانے پکوا کر دیتی۔ نوکروں کو شور کرنے سے روکتی، جیسے وہ گھر کی بہو ہو۔ میں نے سوچا تھا، یونہی شاید بھگوان نے اس کی مدد کی ہو اور وہ بھول گئی ہو۔

انہی دنوں جب بابا ابھی ذرا ذرا اچھے ہو رہے تھے، تکیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے، اپنے ہاتھ سے چمچ پکڑ کر کھانا کھا لیتے تھے۔ میں نے حیرت سے دیکھا گردھاری کے کپڑے بہت صاف ہوتے ہیں، اس کے چہرے پر اکثر سپنوں کی پرچھائیں سی رہتی ہے۔ بات کرنے میں ہنسی اس کے ہونٹوں پر، اُس کی آنکھوں میں ناچتی ہے۔ وہ بڑا بے چین سا رہتا ہے۔ بیٹھا ہوتا ہے مگر اُس اطمینان سے نہیں جس سے وہ ہسپتال میں بیٹھا کرتا تھا۔ جب میں اُسے اکیلا چھوڑ کر جاتا ہوں تو وہ نصیب سے لڑ جانے والے آدمی کی طرح کرسی پر گر جاتا ہے۔ بابا کے کام وہ پہلے سی دلچسپی سے نہیں کرتا۔ اُس کی نگاہیں اِدھر اُدھر دروازوں پر بڑی اُمید سے پڑتی ہیں، جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔

میں نے سوچا یونہی میرا وہم ہے۔ گردھاری نے دن رات ایک کرکے بابا کی خدمت کی ہے۔ میرے ساتھ اس نے بھی سارے دکھ کاٹے ہیں۔ وہ جوان ہے، پُر اُمید ہے اور میں کسی کو پتہ ہو یا نہ ہو زندگی کا ایک دور ختم کر چکا ہوں۔ ندی پہاڑوں سے نکلتی ہے تو پُرشور ہوتی ہے، تیزی سے بہتی ہے۔ میں میدان میں سے گزرنے والے دریا کی طرح ہوں، اپنے سینے میں طوفان چھپائے ہوئے، اور پھر بھی آہستہ چلنے والا۔ اپنے وہموں پر میں خود ہی شرمندہ سا ہوا۔ اس کے لیے میرے جی میں جو میل سا آگیا تھا، وہ اپنے آپ ہی صاف ہو گیا۔

ہم لوگ دیس جانے والے تھے تو تم میرے لیے ایک سرکاری ہسپتال میں کوشش کر رہا تھا۔ باہر سے ڈگریاں لے کر آنے کے باوجود یہاں آکر پتہ چلتا ہے کہ جتنے سال تم [illegible] باہر گھومتے رہے، یہاں پر تم سے کوئی نہایت جونیئر آدمی اس مرتبے پر پہنچ گیا جس کے مقابلے میں تم کچھ نہیں ہو۔ یہ میرا ہی نہیں باہر سے آنے والے تقریباً ہر پیشہ کے آدمی کا مسئلہ ہے۔ سفارشوں، رشوتوں کا چکر چلتا ہے، فنکارانہ مہارت کی جو ناقدری ہوتی ہے۔ ہر کسی کو اس کا کہیں نہ کہیں تو [illegible] ورنہ۔ گوتم نے اپنے سارے ذرائع [illegible] کی طرح میرے لیے لگایا تھا۔

احسان مندی کی جو لہر کبھی کبھار میرے جی میں اٹھتی اس پر یہ خیال بھی سمندر کی سطح پر تیرنے والے جہازوں سے نکلے تیل کے داغ کی طرح اُبھرتا کہ گوتم جو میرے لیے اتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے؟

مایا نے ایک بار مجھے کہا تھا، گوتم کو پتہ ہے کہ میں تمہاری مسٹرس ہوں۔

گوتم کو اگر پتہ ہوتا تو کیا وہ یہ ساری تکلیف میرے اور بابا کے لیے برداشت کرتا۔ اس نے ضرور مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ ہو سکتا ہے [illegible] مجھ سے [illegible] شاید اس واقعے اور محض اتفاق ہو، ورنہ گوتم برداشت کرتا؟ کبھی کبھار انسان میں بے پناہ چیزیں، دکھ اور رقابت کو برداشت کرنے کی طاقت آ جاتی ہے۔

وہ رات بڑی بوجھل تھی۔ میں اور گوتم دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ جھینپ نہیں گیا تھا۔ میرے لیے کسی ذہنیت [illegible] ہم پہلے سیاست اور اس کے بعد مختلف ملکوں میں مختلف [illegible] کہانیاں کہتے رہے۔ وہ کہتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس کا تجربہ بے پناہ اور نقطہ بڑی گہری تھی۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اگر وہ سیاست دان ہوتا تو [illegible] وزیر ہوتا۔ مگر افسوس کہ وہ ایک ڈاکٹر تھا جس کو ملکی معاملات میں دخل دینے کا کوئی

حق نہیں تھا جو بہت جاننے کے باوجود کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ وہ پُر اُمید بھی تھا اور پھر بھی وثوق سے کچھ نہیں جانتا تھا۔

کہنے لگا: "میں نے ان پر جو احسان کیا ہے اگر انہیں یاد ہوگا تو میرا کام کرنا وہ اپنا فرض سمجھیں گے۔"

"لوگ احسانات کو اکثر بھول جاتے ہیں۔" میں نے گوما سے زیادہ اپنے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں منو۔ لوگ احسانات بھول جاتے ہیں، احسان کرنے والے کو بھول جاتے ہیں۔ زندگی میں کوئی خوب صورتی، کوئی پاکیزگی اور کوئی سنجیدگی باقی نہیں رہتی، اور پھر بھی ہم لوگ جی رہے ہیں، جیتے رہیں گے۔" گوما اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی بابا کے پاس کمرے میں چلا آیا۔ گردھاری لال اوپر والے کمرے میں رہتا تھا اور وہیں سوتا تھا۔

اوتی کا خط آیا تھا کہ اس کا جی اچھا نہیں تھا، وہ اکیلے میں گھبرا گئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر اس خط کا جواب فوراً نہیں آیا تو وہ ماما کے بیٹے کو ساتھ لے کر چلی آئے گی۔ اور یہ دھمکی ہی نہیں تھی۔ میں سارا دن کاموں میں اتنا گم تھا، بابا کی دیکھ بھال اور اپنی دوڑ بھاگ میں ایسا محو تھا کہ مجھے گردھاری کو خط کے متعلق بتانے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ کپڑے بدل کر لیٹا ہوں تو اوتی یاد آئی اور اس کی دھمکی بھی۔ اگر وہ آگئی تو! ایک دو دن کی بات اور تھی۔ ہم لوگ جانے ہی والے تھے۔ یہ اندیشہ تھا کہ گردھاری لوٹ جائے مجھ سے پہلے۔

پہلے میں نے سوچا میں اُسے صبح بتا دوں گا اور شام کی کسی گاڑی سے وہ چلا جائے گا۔ مگر میل تو صبح ہی جاتی تھی۔ اگر گردھاری اس سے چلا جائے تو مجھے دن پہنچ جانے کا اور اوتی کو اتنا لمبا سفر کرنے کی زحمت سے بچ جائے گی۔ یہ خیال مجھے نہیں آیا کہ اوتی کو رکنے کا تار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آدمی وہی باتیں بروقت سوچ جایا کرے تو پچھتاوے ہی زندگی کا حاصل نہ ہوں۔

باہر نکل کر میں نے پہلے سوچا کہ گردھاری کو یہیں کھڑے کھڑے پکار دوں۔ پھر میں اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا ان سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے اوپر چڑھا۔ آخری سیڑھی پر قدم دھرا تب تو دل ہوا۔

مجھے وہ دن یاد آنے لگے جب میں یہاں نیا نیا آیا تھا۔ اس سارے عرصے میں کتنی اُمیدیں، کیسے کیسے بت بن کے کبھی نہ ٹوٹنے کے لیے بیٹھ گئے۔ وہ راتیں جو گود کے اس گوشے میں اب میں چھپتے چھپتے گزارتا تھا، جو میری زندگی تھیں، جیسے میں نے اور مایا نے یہاں کھڑے ہو کر کہاں کی کوک و شنید تھا۔ سب سے بڑھ کر کا منظر یہ تھا، چاندنی شیشوں کے اندر سے چھن کر کمرے کے اندر آتی تھی۔ سات رنگوں کے شیشوں میں سے رنگوں کی پھوٹ سی بن کر ہمارے اوپر پڑا کرتی تھی اور مایا کا ترشا ہوا سراپا اس کمرے کی ایک پاگل کی طرح میرا دل ان پرانی یادوں سے کس طرح دھڑکتا! میں جانے کب تک ماتم کرنے والے کی طرح سیڑھی پر کھڑا رہا اور کھڑا رہا۔

آخری زینوں سے چاند کا کونا مجھے چھت کے کنارے سے نظر آیا۔ دور کسی بلڈنگ میں بتی جلی۔ کہیں کوئی بچہ رو دیا۔ کوئل پھر بولی۔ ستارے دور سے جڑے ہوئے نگینوں کی طرح آکاش کے نیلے پن میں بڑھے بڑھے اور روشن چمکے۔ یہ قصہ پرل جان کی رات آج تک میرے ذہن کے پردے پر اسی طرح ہے جیسے کوئی مصور تصویر کو نیم ادھورا چھوڑ دے اور خود جانے کہاں گم ہو جائے۔ گردھاری کو جب جب میں نے جگانا چاہا تو اس کے تکیے پر سیاہ بالوں کا جال سا بکھرا تھا اور کمرے میں مجھے پاگل کرنے والی خوشبو پھیلی تھی۔ مایا کے سانس کی خوشبو!

بابا سے میں نے کہہ دیا تھا کہ "مجھے میری محنت کا کوئی صلہ اس ملک میں نہیں مل رہا۔ اس لیے میں امریکہ واپس جانا چاہتا ہوں۔"

بابا نے کہا تھا، "بیٹے میں بوڑھا ہوں اور بیمار بھی، مگر میں اپنی خاطر تمہیں روکنا نہیں چاہتا۔"

گوتم نے کہا " میں کوشش کر رہا ہوں تم گھبرا گئے ہو۔"

میں پاگل ہو رہا تھا اور یہ میرا آخری فیصلہ تھا۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ بھلا میں کس شے سے بھاگ رہا تھا، وہ لڑکی جو میرے اندر ہے اُس کو میں نے بس دھکیل دیا ہے۔ دل کے ایک کونے میں قید کر دیا ہے۔ پھر جب وہ یاد آتی ہے تو آتی ہے اس کی رومان پسندی اس کا چھپ چھپ کر مجھ سے ملنا، ایک ایک یاد ہزاروں یادوں کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔

جانے کونسی جگہ تھی اب تو یاد نہیں اُس دن سمندر بہت طوفانی تھا۔ ہوا رہ رہ کر چلتی تھی جیسے اپنا زور آزما رہی ہو اپنے طوفانوں سے کھیل رہی ہو۔ جیسے سمندر نے اور ہوا نے شرط باندھی تھی کہ وہ ہم کو مجھے اور قدیر کو یہاں سے بھگا دیں۔ ان میں سے کون زیادہ طاقت ور ہے ہوا یا سمندر!

قدیر نے کہا تھا۔ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے بھلا یہاں کیا دھرا ہے اور پھر سات سال امریکہ میں رہ کر تم تقریباً اجنبی ہو گئے ہو۔ وہاں کی تیز رفتار زندگی کو جیت سمجھ لو اور یہاں کی بیل گاڑی میں جُتنا کیسے اچھا لگے گا بھلا!"

میں نے کہا تھا " قدیر مجھے یہاں کی بیل گاڑی میں جُتنا بھی اچھا لگتا مگر اب یہاں سے جی بھر گیا ہے۔ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ سب چیزیں بہت یاد آئیں گی۔ بہار میں درختوں پہ نکھار، سپنے جگانے والی کوئل کی کوک۔ نیلے آکاش تلے پھیلے سبزے کے خواب دیکھتا ہوا بیل گاڑی چلانے والا کسان۔ پہاڑوں میں شام کو تیز قدم اُٹھانے والا آدمی اور وادیوں میں گونجتی ہوئی گیتوں کی صدائیں۔ مگر یہ سب میرے نصیب میں نہیں ہے۔"

قدیر نے کہا۔ تم جذباتی ہو رہے ہو۔ بیئر پیو۔ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے، اچھے بھلے تھے ابھی شاعری کرنے لگے یار۔ تم کہیں امریکہ میں ڈاکٹری کی بجائے ادب تو نہیں پڑھتے رہے۔ پھر اس نے ایکسیلیٹر کو زور سے دبایا اور موٹر تقریباً پھنیاں کھاتی ہوئی سمندر کے لہراتے پانی کے اندر ہی سڑک پر اُڑنے لگی۔ اس نے اپنی سیٹ بنائی تھی اور وہ میری الوداعی پارٹی کرنے کی خاطر مجھے یہاں لایا تھا۔ اس کی موٹر میں بیئر کی بوتلیں بھری تھیں کھانے کی چند چیزیں تھیں اور پانی کی ایک بوتل تھی۔ شام کی دھوپ ہوا کے ساتھ اُڑتی ہوئی لگتی تھی اور سمندر پاگل بنا لہروں کے جھاگوں سے بھرے منہ پھیلائے پھنکار رہا تھا۔ جیسے غصہ ور اژدھا ہو۔ ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے پتھر تھے جو جھاگوں سے ڈھکے دُھنکی ہوئی روئی کے ڈھیروں کی طرح تھے۔

قدیر پی رہا تھا اور سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لہریں بڑھتی تھیں اور برآمدے کے سامنے تک آتی تھیں۔ سگریٹ کا دھواں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں نہایت حقیر رینگنے والے کیڑے کی طرح اوپر اُٹھنے کی کوشش کرتا تھا اور پھر ہوا کے زور سے نیچے جھک جاتا تھا۔ ہمارے بال اُڑ رہے تھے اور ہم ہنس ہنس کر پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ میں پی نہیں رہا تھا۔ بیئر کوئی پینے کی شے ہے بھلا۔ بیئر پینا مجھے پینے کی توہین لگتی ہے اور نشے کی بھی۔ نشہ تو آدمی کے اندر کی گرہیں کھولتا ہے۔ اُسے اپنے آپ کے بندھنوں سے آزاد کرتا ہے۔ جینے کا قرینہ سکھاتا ہے۔ دکھوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت دیتا ہے زندگی خود ایک بہت بڑا نشہ ہے۔ زندہ رہنا جبکہ تم مرنا چاہو۔

قدیر ہوتے ہوتے رو رہا تھا۔

میں نے کہا " کیوں رو رہے ہو؟ کون یاد آ رہا ہے۔ کس کی بے وفائی تمہیں رونے پر مجبور کر رہی ہے۔ کہنے لگا: میں سمجھتا ہوں وفا کوئی شے نہیں ہے۔ جیسے کوئی لمحہ واپس نہیں آتا اسی طرح گزری محبتیں واپس نہیں آسکتیں۔ کوئی پرندہ اس جگہ دانہ چگنے نہیں جاتا جہاں دانہ نہ ہو۔ مگر

آدمی اسی جگہ جانا پسند کرتا ہے جہاں کچھ باقی نہ ہو۔

"انسان میں اور پرندے میں بہت فرق ہے۔" میں نے باہر جا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ مجھے قدیر نے ساتھ ہی وہ رات یاد آ رہی تھی مجھے لگ رہا تھا، اگر میں یہاں بیٹھا رہا تو اپنے ہوش و حواس کھو دوں گا۔

"ٹھیک ہے۔" قدیر نے میرے برابر آ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "پرندہ انسان سے بہتر ہے۔ اور انسان عورت سے بہتر ہے۔"

"نہایت رجعت پسند ہو۔ اتنی لکیروں پر رہتے ہو۔ بیئر پی کر بہک رہے ہو۔" میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر کہا۔

"خدا کی قسم منوہر عورت نہایت کمینی اور قابلِ نفرت شے ہے۔" قدیر نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔ قدیر کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ عورتوں سے بھاگتا ہے۔ ابھی کسی شریف عورت سے میں نے بات نہیں کی۔ بہت اچھا مگر خاصا ناکام ڈاکٹر ہے کیونکہ اس کے کلینک میں عورتوں سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔

میں نے کہا "بیئر کے جھاگ سمندر کے جھاگوں کے ساتھ مل کر تمہارے دماغ پر چھا گئے ہیں۔"

"تم سوچتے ہو میری کوئی محبوبہ نہیں ہو سکتی۔" وہ ہچکیوں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم سمجھتے ہو میں کسی عورت کی توجہ کے قابل نہیں تھا۔" وہ برآمدے سے خالی بوتلیں اٹھا کر لہروں میں پھینک رہا تھا۔ "بکواس ہے۔ یہ لو۔ یہ لو۔"

سورج کو بادلوں نے ڈھانپ لیا۔ سرخ رنگ سمندر پر بکھر گیا اور خون کی موجیں سیاہی میں ڈوبتی چلی گئیں۔ نہ تاروں کا نور تھا۔ نہ چاند تھا۔ نہ سمندر میں کوئی کشتی تھی۔ ہوا میں ایسی باس تھی جس سے جی متلانے لگتا ہے۔ ہمارے گرد کوئی آواز نہ تھی۔ دنیا میں دو اکیلے انسان۔

"ایسی ہی طوفانی رات تھی اور وہ ڈر رہی تھی۔ کانپ رہی تھی۔" قدیر نے کہنا شروع کیا۔

"کون؟" میں نے برآمدے میں کرسی گھسیٹ لی۔ لہریں بڑھ رہی تھیں اور لگتا تھا بس کر بہا کر لے جائیں گی۔ میری آواز میں مذاق کو محسوس کر کے اس نے کہا۔

"تم سوچتے ہو میں یہ کہانی بنا رہا ہوں۔ کئی اور لوگوں کی طرح محض رومان پسندی کی تسکین کے لیے یہاں آکر تم کو باتیں گھڑ کر سنا رہا ہوں۔"

"ارے جی نہیں قدیر تم تو ناصح معلوم ہوتے ہو۔ کہانی سننے والے کی طرح مشتاق ہو رہا ہوں۔ اپنے جاگنے کا ثبوت دینے کے لیے تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ مگر بڑی سخت آندھی ہے کمرے میں چلیں میں لیمپ جلاؤں گا۔" میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"ارے کہانی تو سنتا جا۔ جھوٹی ہو تو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے سن تو لو۔" "لیمپ جلائیں چلو اندر چلو۔ پانی اب یہاں تک آ گیا ہے۔" میں نے پھر اٹھنا چاہا۔

"اندھیرے میں ایک چراغ جلانے سے کیا ہوگا منوہر۔ تاریکی میں ذرا سی روشنی تو بڑی ڈراؤنی لگتی ہے۔ اور میں تو بچپن سے اندھیروں کا عادی ہوں۔ میں جب چھوٹا تھا اور اپنے گاؤں میں دادی کے پاس رہتا تھا تو میری دادی شام کے بعد دیا جلانے نہیں دیتی تھی۔ غریب آدمی کے لیے زیادہ روشنی اچھی نہیں رہتی۔ تیل بچ جاتا تھا۔ پھر رات میں کہانیاں سناتے [illegible]

سکتے۔

میں میٹھی سی لہریں ہم پر سے گزرنے لگیں۔

"خدا کی قسم منوہر تم سمجھتے ہو میں جھوٹ کہہ رہا ہوں مگر وہ عورت نہیں جل پری تھی:"

قدیر بدستور اپنی کہانی میں لگا تھا۔

"میں نے کب کہا ہے یہ جھوٹ ہے: مجھے سب سے چھوٹی جل پری کی کہانی یاد آرہی تھی جس نے آدمی کی محبت حاصل کرنے کی خاطر مچھلی سے عورت بننا منظور کیا تھا اور جس کی زبان اس کے خاندان والوں نے اسے نہیں دی تھی جو رو نہیں سکتی تھی اور جس کو چلتے میں اتنی تکلیف ہوتی تھی جیسے کوئی تلواروں پر چل رہا ہو۔ اب پانی کمرے کے اندر آرہا تھا۔ لگتا تھا ہم سمندر کی تہہ میں کسی محل میں ہیں

کتنی منطقی بات ہے کہ نہیں ہم فنا ہو گئے ہیں اور نمروں کی طرح لہروں اور جھاگوں میں مل گئے ہیں

ہم جھٹ سے نکل کر دوسری طرف کھلی ریت پر بیٹھ گئے۔ سڑک نیلے فیتے کی طرح سمندر کے آگے ہوتے پانی کے ایک قطعے کے کنارے چلی گئی تھی۔ موٹر سیاہ تودے کی طرح لگتی تھی۔ قدرت پانیوں کی ناگوار لبساند سے فضا بھری تھی جو ہوا کے زور کے ساتھ رخ بدل کر کبھی کم ہوتی تھی اور کبھی زیادہ۔ ریت اڑ رہی تھی اور ہوا ہمیں بھی اڑائے دے رہی تھی۔

میں نے کہا "تمہاری محبوبہ کی طرح مجھے بھی لگ رہا ہے۔ چلو موٹر میں چل کر بیٹھیں۔ تم اس کی طرح کیسے ہو سکتے ہو۔ وہ عورت نہیں کوئی عجیب شے ہے۔ بنا کہے بنا احسان جتائے محبت کرنے والی بنا غرض دکھائے بنا ڈر کے ملنے والی۔ تمہیں پتہ ہے اس نے شہر میں ایک جگہ محض اس لیے الگ سے رکھی ہے کہ کبھی کبھی اکٹھے ہونے سے پہلے ہر دفعہ نئی جگہ نہ ڈھونڈنی پڑے۔ قدیر اور میں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔

میرا دل سینے میں زور سے دھڑکا

"آدمی کو اس کے قریب ہونے سے نشہ ہونے لگتا ہے۔ قدیر نے ہاتھ میں پکڑی بوتل کو ختم کر کے اسے پرے پھینک دیا۔ کچی سی آواز آئی۔

"مگر اب وہ ہے کہاں۔" میں نے چپ بے یقینی سے کہا اور قدیر نے بے یقینی کی اس آواز کو محسوس کر کے کہا۔

"اگر تم یقین نہیں کرتے تو میں تمہیں نہیں بتاتا۔"

"بے یقینی نہیں ہو رہی ہے تو مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ جب وہ اتنی محبت سے تم کو ملتی ہے۔ پھر بھی تم عورت کو برا کہتے ہو۔" میں نے قطعی ایمانداری سے کہا۔

جب وہ ہاتھوں میں ساعدوں پہ پہونچوں میں مجھے ملتی رہی تو میں خوش تھا اور مجھے اپنی قسمت پہ ناز تھا۔ اس کمرے کو اس نے سجایا تھا۔ دکھائی نہ دینے والی کشتیاں جس سے ہر شے جگمگاتی رہتی اور اس کے سیاہ بال کمر سے نیچے تک پہنچتے ہوئے۔ میں پلنگ پر لیٹا خوشبوؤں کے درمیان خواب بناتے نیم وا آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔ وہ ایسی شراب ہے جسے پینے پر بھی آدمی کو پتہ نہیں چلتا کہ تم پی چکے ہو۔ کھلی لدہنیات پرانی شراب ہے۔

کوئی محبوبہ ایسی ہو سکتی تھی اور کمرہ کرائے پر لینا کون مشکل بات ہے۔ اگر تم اُسے محض اس وجہ سے چاہتے ہو تو... میں کچھ نہیں

ہوتا۔" میں نے بات ختم کی

"بابا کی طرح ہر عورت نہیں ہو سکتی۔" قدیر نے پتھر پر سے اٹھ کر سمندر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ہماری پشت پر طوفان تھا جو جہٹ کے بند دروازوں سے ٹکرا رہا تھا اور ایسا ہی طوفان میرے سینے میں موجزن تھا۔

"کون بابا" میں نے قدیر کو کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف پھیرتے ہوئے کہا "کونسی بابا؟"

"دنیا کو دو باٹے کر کر سبھی بات

تمسی دا اسب کی کوئی نہ پوچھے بات"

قدیر ہوا میں ٹکڑا سا ہو کر ساحل کی طرف جا رہا تھا اور اس کی آواز بے ربط اور پھٹی پھٹی تھی۔ اسے نہ آواز پر قابو تھا اور نہ قدموں پر۔

بوکھلایا زدہ ہو کر ... سے لڑکھڑا ہوا کہا۔ میں نے درشتی سے پوچھا "بتاؤ کون سی بابا؟"

"بابا ایک ہی تو ہے اس شہر میں اس کی کون ہو سکتی ہے بھلا" قدیر نے بوتل کو منہ سے لگایا۔

میں نے زور سے ہاتھ دبا کر بوتل کو گرا دیا۔ "تمہیں بتانا پڑے گا بابا کون ہے؟"

"سنو منوہر کوئی عورت بھی اس قابل نہیں ہوتی کہ اس سے ایسے ٹوٹ کر پیار کیا جائے اور ابھی تم جانتے نہیں ہو کہ کون بابا ہے۔ بتاؤں آپ تو آل جی اس سے منسوب ہے میرے دوست"

قدیر افسوس زدہ سا بوٹ کے اوپر بیٹھ گیا۔

"بابا سے تعلق ہو نہ ہو مگر اس کا وجود ہے جس کو وہ کوئی خیال سمجھے۔" میں بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"تم تو"

اور اس سے پہلے کہ وہ بات ختم کرتا میرا ہاتھ اٹھا تو اس کی آواز آئی

"تم بابا کو جانتے ہو" قدیر نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔

مجھے بے حد ... بڑی شرم آئی۔

میں اس کے اندر بیٹھ گیا اور قدیر بھی ... بیٹھا وقت کی ... اور لہریں ہم پر سے گزرتی گئیں۔

میں آخری بار بابا سے ملنے جا رہا تھا۔ کئی دن سے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا اور سخت بے چین تھا۔ مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ بابا کے جانے کے بعد سے میں ان لڑکوں سے نہیں ملا تھا۔ میں گوتم سے بھی نہیں ملا تھا۔ اس رات کے بعد سے ایک گھٹن میرے سینے کے اندر بھی تھی جو میرا وجود جھلسا رہی تھی۔ نفرت تو محبت سے شدید تر جذبہ ہے۔

جہاز کے کمرے میں ... جا چکے تھے اور میں اگلے دن پرواز کرنے والا تھا۔ سامان بندھا رکھا تھا۔ دوست بے حد ... تھے۔ ہم لوگ گیلی ریت پر ... لگا رہے تھے اور پی رہے تھے۔ چاندنی تھی جو ہوا کے ساتھ اڑتی تھی۔ ساحل کے ساتھ اوپر کی طرف بنے شو کے مندر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ کوئی ایسے میں پوجا کرنے آیا ہوگا۔

وہ یہ ناچ رہا تھا اور تھک کر گر جاتا تھا اور پھر اٹھتا تھا کبھی کیلاش کے بازوؤں میں جھوم جاتا اور کبھی فیروز کے اوپر گر جاتا۔ مجھے گوتم [illegible] یاد آرہا تھا۔ دور پرے ہم سے بہت پرے کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ خالی بوتلیں کبھی کبھار چمک سی پڑتیں جیسے رنگین شیشے ہوں مجھے پورے [illegible] بیٹے مرے ذکھ [illegible] نے سات رنگ شیشے یاد آرہے تھے۔ جانے گردساری کے بعد کون کون اس تکیے پر سر رکھ کر سویا ہوگا۔ جانے کس کے بازوؤں پر وہ [illegible] جال بکھرا ہوگا! میں حیران تھا کہ پایا [illegible] ہوں گی۔

شام کو میں نے الفنسٹن کی سب سے مہنگی دکان کی سب سے بڑھیا ساڑھی خریدی تھی۔ پاپا کو آج تک میں نے جو تحفے خرید کر دیئے تھے ان سب سے زیادہ قیمت کی تھی۔ ان سات سالوں میں امریکہ سے بھی میں نے اسے جو کچھ بھیجا تھا۔ اس کی قیمت بھی کچھ نہ تھی۔ میں نے اپنا دل اسے دیا تھا وہ سب سے کم قیمت تھا میں نے اپنا آپ کو پرے پھینک دیا تھا۔ اس کی اداؤں سے میں نے اپنی نظریں اپنے جذبے اپنی محبتیں سب وار دی تھیں [illegible] پایا کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہ تھی۔

میں نے اسے فون کیا تھا دوسرے سرے پر اس نے کہا تھا۔

"من پر مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو۔ تم نے تو ہمیں یوں بھلا دیا ہے۔ جیسے ہم کبھی تھے ہی نہیں۔"

"معروف رہا ہوں کہ پتہ تو مجھ سے بھی زیادہ کاموں میں لگی رہتی ہو۔ مجھے یاد کرنے کی فرصت ہی کب ملتی ہے" میں نے بات کی۔

"ملنے کب آ رہے۔ تمہاری تو مصروفیت کا لیا بنا" پایا نے میری شکایت ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"کل میں جانے والا ہوں پایا۔ [illegible] کی خدمت سے جانے سے پہلے لوٹ کر آؤں تم سے ملنے کو جی چاہتا ہے لکھو کہاں مل سکو گی" وہ تھوڑی دیر چپ رہی جیسے کچھ سوچتی ہو۔

"تم [illegible] ملنا چاہتے ہو۔ [illegible] پر دیکھو [illegible]" پایا نے کہا۔

"کہ وہ ابھی تک سے ؟ [illegible]" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"ہاں [illegible] یا ہی اور [illegible] بعد بھی میرے [illegible] رہو گے۔ تمہاری یاد کو میں نے سینے سے لگا رکھا ہے۔ وہ کمرہ تو لیاشے ہے" پایا بہ [illegible] ہو رہی تھی۔

"کمرہ [illegible] تم سات سال سے [illegible] میری وجہ سے برداشت کر رہی ہو؟"

میری آواز [illegible] جذبے سے خالی اور [illegible] تھی۔

"اس میں ظاہر ہے کیا بات ہے۔ تم کو تو خوش ہونا چاہیے تھا" پایا نے پھر کہا۔

"میں خوش ہوں بہت خوش اور اسی لیے تم سے ملنا نہیں چاہوں گا" میں نے اپنے آپ کو قابو میں کر لیا تھا۔

"کب آؤ گے" پایا نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم پھاٹک بند نہ کرنا اور سیڑھیوں کا دروازہ کھلا رکھنا، میں کسی وقت بھی آ سکتا ہوں۔ آج شام ایک دعوت ہے۔ شاید دیر تک چلے۔ آ ہی جاؤں گا۔ انتظار کرنا" اور میں نے فون بند کر دیا تھا۔

اب جبکہ وہ سب خوش تھے اور ادھر ادھر ہو رہے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ پانی بھی سہنے لگا تھا۔ میں جانا چاہتا تھا۔

ن اسے دیوں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قدیر پرانے سنہری گیت گا رہا تھا اور ہچکیاں لے رہا تھا۔ کیکاشں ایک خالی جگہ بجا رہا تھا اور ہماری
پر غیر انسانی محفل کا گمان ہوتا تھا۔ بچھڑے ہوئے خوشیوں کی محبت سمیٹی جانے والے۔

میں نے قدیر کی جیب سے چابی نکالی

موڑ ہوتے ہوئے اس جانی پہچانی راہوں پر چھا گئے تھی۔ ان راہوں پر شہر کی مخصوص لوئیں فروزاں تھیں۔ ہر سڑک کی اپنی بند گلی آو
اور ایسی گلی جس کی آبادی سوئی پڑی تھی اور پھولوں کی خوشبو کے ساتھ کسی پانی کی باس بھی تھی جو جو تو بھاگنے کے دوران اندر آتا ہے تو
کی راہ نہیں پاتا۔ چپ سنتا ہے اور ہوا کے ساتھ ساتھ اپنی سرزمین چھوڑتا ہے۔ دور پرے ہاتھ آئی لیمپ کی روشنیاں تھیں۔ اس سے
وہ قدیم عبارتیں تھیں جو آسیب پھیلا رہی تھیں۔ اور اپنی کہانی آغوش میں لیے تھیں۔ پھر میوزیم تھا جس میں پرانے زمانوں کے دیوی دیوتا اپنے
ٹھکانوں سے نکل کر شیشے کے تابوتوں اور الماریوں میں قید تھے۔ اور جن کے تراشے ہوئے جسموں کو دیکھ کر لوگ بنا آنکھ جھپکائے آگے گزر جایا کر
تھے۔ لوگ نہ ماتھے ٹیکتے تھے۔ نہ پھول چڑھاتے تھے نہ آرتی اتارتے تھے۔ گویہ نئے بازار نہیں موڑوں میں زندہ تھے ... رہ جاتی تھیں اور
کی کوئی ایسی آرزوئیں نہ تھیں۔ جو دیوی دیوتاؤں کی مدد کے بنا پوری نہ ہوتی تھیں۔ اس زمین پر کسی پرانی زمین کا گمان ہوتا تھا۔ زمانہ کتنی ترقی کر
قرابے چراتے پلک سے نظر پھلانگ کر اور باغات جن میں سارا دن کے لوٹ نکلتے تھے اور شام کو رشتے بانسے اپنی محبتوں کے قصے کہنے یہاں
ہوتے تھے۔

کہ سے سانس میں ہوئی دکھ رہا۔ دور سے ہوا سے سے ... ہوں نوڑوں کی کوک سنائی دی۔ میرا دل زور سے دھڑکا جیسے پرانے
میں اس آواز کو سن کر دھڑکا کرتا تھا۔ ... اور ... بیتے دنوں کی ... میں ذرا ذرا سی باتیں ... کیسی کیسی ... ہو
ہیں۔

سارنگی نے پیٹ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے میں پھاٹک کے باہر کھڑا رہا۔ پورچ کے اوپر کھڑکی سے ... آواز آئی۔ سیڑھیوں
پر میں دبے قدموں چڑھا۔

"تم نے بہت دیر کر دی" آپا نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا تھا نا پارٹی تھی اور بہت بد صورت ... تو انہیں وہیں چھوڑ کر اٹھ آیا ہوں۔ میرے کپڑے بھی گیلے ہیں۔"

"تم ہر اتنے زمانوں کے بعد دیکھے ہو۔ مجھے تو لگتا تھا اب میں کسی نئے جنم میں ہی تم سے مل سکوں گی۔"

اس نے مجھ سے لگ کر کپڑے بدلتے ہوئے کہا۔

"اس جنم میں ہم واقعی ساتھ نہیں رہتے۔ بھلا اور پھر کس کس سے لوگی۔ اگلے جنم میں دیکھ پڑی"

"میری آواز کی ہنسی نے اسے ڈس لیا۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گئی۔"

"جانے آج کیسی باتیں کرنے لگے ہو۔"

"اپنے کیے وعدے کے مطابق مجھے خفا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

چاند ڈوب چکا تھا یا مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے کہا کھڑکیاں دروازے بند کر لو اور بتی جلاؤ

میں مجھے اس کمرے میں ملنا چاہیے تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ مگر تم اوپر کمرے میں بتی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ پھر صبح بھی قریب ہے اور اس کی نیند اب بہت ہلکی ہو گئی ہے" مایا نے حیرت سے اور کچھ ڈر سے کہا۔

"تم کب سے گوتم سے اتنا ڈرنے لگی ہو۔ تم تو اس کی آنکھوں کے سامنے محبت کا ڈرامہ کھیلنے والی عورت ہو۔" میں اپنے آپ پر قابو پانا ہر لحظہ مشکل سمجھ رہا تھا۔

"طعنے کیوں دیتے ہو۔ میں نے جو کچھ کیا ہے۔ تمہاری محبت میں کیا ہے" وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔

"میری محبت میں۔ میری محبت میں" میری آواز گھٹی گھٹی اور عجیب سی تھی۔ میرے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہوتی اور کھلتی تھیں۔

"تم آج بہت خفا معلوم ہوتے ہو۔ کیا لڑنے آئے ہو" مایا مضطرب سی پلنگ کی پائینتی بیٹھ گئی۔ پھر اس نے الماری میں سے ایک ٹیبل لیمپ نکالا اس کی الجھی ہوئی تاروں کو سلجھایا اور اسے پلنگ کے نیچے کر کے روشن کیا۔ کمرے میں بڑی ہلکی سی روشنی پھیل گئی۔ پھر اس نے دروازے بند کیے کھڑکیاں بند کر دیں۔

اس مدھم روشنی میں اس کا سراپا ویسا ہی اشتہا انگیز تھا اور وہ اسی طرح جاذب نظر تھی۔ اس نے کسی نہایت باریک اور خوبصورت کپڑے کا گھیردار ڈریسنگ گون پہن رکھا تھا جس کا بہاؤ بہت دلآویز تھا جیسے اس کے گرد آبشار گر رہا ہو۔ اس نے اپنے آپ کو یوں سجایا تھا، جیسے کوئی آخری رسومات کے لیے اپنے کو بنائے سنوارے۔ سولہ سنگھار کیے وہ رادھیکا بنی ہوئی تھی۔ تازہ دم جیسے کوئی کنواری ہو۔ اس کے بالوں میں پھول تھے اور اس نے بڑے ہی اچھے بال بنا رکھے تھے۔

میں نے کہا "تم دل کے بدلے مہنگی نہیں ہو۔ آدمی تم پہ سے جان نچھاور کر سکتا تھا" میں سچ بول رہا تھا۔ اس گھڑی اسے کوئی بھی جھٹلا نہ سکتا۔

"یہ ڈبے میں کیا ہے" اس نے شوق سے پوچھا۔ اس گھڑی وہ اتنی مکمل تھی۔ جیسے ایک عورت ہو سکتی ہے۔ آخر مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اسے جھٹلاؤں مگر دوسرے لمحے مجھے قدیر یاد آ گیا۔ گردھاری یاد آیا۔ اور میرے دل میں ایک شعلہ سا اٹھا۔

"پوجا کی گھڑی آن پہنچی ہے مایا" میں نے تکیے پر سر رکھ کر ہاتھ اپنے پیچھے باندھ لیے۔

"میں تیار ہوں میرے دیوتا۔ میرے من ہر" اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔

"سیاہ بالوں کا جال اپنے گرد پھیلاؤ۔ میں تمہارے سراپا کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں"

میں نے جذبات سے کمزور پڑتی آواز میں کہا۔

مایا نے پھولوں کو نکال کر سنگھار میز کے اوپر رکھ دیا پھر اس نے بال کھولے جانے وہ کیوں اتنی سستی سے ہر کام کر رہی تھی اتنے سالوں میں اس کے بال کچھ اور لمبے ہو گئے تھے اور اس کی ساری پشت کو ڈھانپ رہے تھے گھٹنوں تک ایک سیاہ لبادے کی طرح۔

جب وہ میری طرف گھومی ہے تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

مایا کی بانہوں نے مجھے نیچے کھینچ لیا جیسے پاتال میں گھسیٹ لیا ہو۔

میں نے اس کا انگ انگ ٹوٹا ہوا محسوس کیا۔ زمیں بعید تھا اور پاتال سے باہر آ رہا تھا۔ تمہاری باہوں میں جو شاخوں کی سی لچک تھی وہ نہیں رہی مایا۔ میں نے اس کے بازوؤں کو تھپکتے ہوئے کہا

مایا نے اپنی باہوں کا گھیرا میرے گرد اور تنگ کر لیا۔

تمہاری کھال ڈھلک گئی ہے۔ لگتا ہے تم بوڑھی ہو رہی ہو۔

مایا کا کانپتا ہوا جسم پناہ ڈھونڈنے کے لیے میرے اور قریب ہو گیا۔

تمہارے سانس کی وہ خوشبو جس کا میں دیوانہ تھا۔ اب کم ہو گئی ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

اس کی ٹھنڈی سانس میرے منہ پر شام کی ہوا کی طرح لگی۔

پہلے تم مجھے سورج کی اسپارکلنگ لگتی تھیں مگر اتنے سالوں میں وہ بات نہیں رہی، تمہارا رنگ پھیکا پھیکا سا ہے، جیسے باسی چیزوں کا ہوتا ہے زیادہ استعمال سے جیسے چیزیں بدرنگ ہو جاتی ہیں۔

چیخ روکنے کے لیے مایا نے ہاتھ اپنے منہ پر زور سے بھینچ لیا۔

پھر میں اٹھا اور میں نے وہ ڈبہ کھولا، ساڑھی کو نکال کر پھیلایا اور اس پر ڈال دیا۔ یہ اس رات کی قیمت ہے۔

'یہ تم ہو منوہر' مایا شرم سے دوہری ہو رہی تھی۔

ہاں میں ہوں۔ میں۔ میں منوہر ہوں۔ مگر تمہارا نہیں ہوں میں منوہر ہوں، قدیر نہیں ہوں، میں کوئی اور نہیں ہوں۔ میں ان سب میں سے ایک ہوں جو تمہاری راتوں کی رونق رہتے ہیں۔ سمجھیں۔!

مایا اپنا ہاتھ کاٹ رہی تھی۔ اس کا پورا جسم سسکیوں سے ہل رہا تھا۔

میں تیزی سے سیڑھیاں اتر آیا۔ کوئل میرے پیچھے کوکتی رہی۔

دوسرے دن امریکہ کو جانے والے مسافر جمع ہو رہے تھے اور اعلان کرنے والی لڑکی کی پھٹی پھٹی آواز گونجی۔ مجھے فون پر بلایا جا رہا تھا۔

دوسری طرف مایا کی آواز آئی۔ منوہر، منوہر

آپ کون ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتا۔ میں نے زور سے فون بند کر دیا۔ اور تیزی سے دوستوں کی طرف ہاتھ ہلاتا ہوا جہاز کی طرف بڑھا

ماتی کا خط آیا۔ ہمارے آنگن میں رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ ہم نے ڈھولک پر سہاگ کے گیت گائے تھے۔ گھر رشتہ داروں سے بھرا تھا۔ تمہاری بھابی کو دیکھنے کے لیے سارا گاؤں امنڈ آیا تھا۔ جیسا ہم بھابی کو اسی طرح بیاہ کر لائے ہیں جیسے تم یہاں پر ہو۔ تمہاری تصویر کے ساتھ اس کے پھیرے ہوئے تھے اور جس کمرے میں ہم نے اسے اتارا ہے ہم نے سجایا بھی ویسے ہی تھا جیسے تمہارے یہاں ہوتے سجاتے۔ پھولوں کی بو سے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اتنے پھول تھے۔ بابا اب اچھے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا تم چاچا کو آنے کا لکھا تھا۔ مگر انہوں نے جواب دیا۔ مایا چاچی بیمار ہیں اور وہ نہ آ سکیں گے۔

مایا نے بہت دنوں بعد لکھا تھا۔

ذ مہینے میں گوتم کے ہاں گیا تھا۔ ماتا نے بیماری میں میری بہت خدمت کی تھی اور یوں بھی تمہاری وجہ سے ان کے ہم پر بڑے احسان ہیں۔ ماتا جیادہ نہیں ملتی۔ بس کھوئی کھوئی سی ہے۔ بات نہیں کرتی اور بولتی ہے تو چپ نہیں ہوتی۔ یہ عجیب طرح کا دکھ ہے جو ماتا سے زیادہ دتم کو لگا ہے۔ اس کے گھر کی بنی بنائی زندگی برباد ہو رہی ہے۔ لگتا ہے درخت سوکھ رہا ہے۔ بچے سہمے سہمے سے رہیں۔ میں دو دن رہا ہوں، ۔ میں ایسی خاموشی سی اور اداسی رہتی ہے جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ تمہارے ماما کے بیٹے پر بھودیا کا بیاہ بھی تمہارے ساتھ ہی ہوا ہے۔ وہ بہو بھی یری بہو کے ساتھ ہی آئی تھی۔ تم گیتا کو بلانے کا جلد کوئی بندوبست کرو۔ ہم اُسے اداس ہونے تو نہیں دیتے۔ پھر بھی اس کی جگہ تمہارے پاس ہے۔ ہستی تو نہیں مگر شدت سے اس دن کی راہ دیکھتی ہے جب کاغذات مکمل ہو کر آئیں اور وہ امریکہ جانے کے لیے تیار ہو۔"

"ماتا بیمار ہے" میں نے بابا کے خط کو پڑھ کر سوچا۔ پھر میں جانے کب سو گیا۔

میں نے دیکھا۔

رات ہولے ہولے بھیگتی جا رہی ہے۔ میں اور ماتا اسی کمرے میں ہیں۔ اندر عجیب ملی جلی خوشبوئیں تھیں۔ پھولوں کی نئے کپڑوں کی منہ کی بیماری سی بُو میں اٹکنے والی خوشبو۔ سینٹ کی مہک۔ میں اٹھ کر کھڑکیاں کھولتا ہوں اور سرد ہوا کمرے کے بوجھل پن کے مقابلے میں بہت خوشگوار ہے۔ بدن کو بھلی لگنے والی۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ جیسے باقی کچھ نہیں رہا۔ میں تاریکی کے اندر دل کی طرح دھڑک رہا ہوں۔ اگر بازو پھیلاؤں تو گرتا ہی جاؤں گا۔ رکوں گا نہیں۔ اس اندھیکار کی نہ کوئی تھاہ ہے نہ کوئی اور چھور۔ ایسی تنہائی ہے جس میں آدمی کا اپنا آپ پھیل جائے۔ دور باغ کے کونے میں رات کا پرندہ تیز آواز میں چلاتا ہوا اڑا اور میرے قریب سے بولتا ہوا گزر کر درخت کی گھنی شاخوں میں چھپ گیا۔ پھر میں نے اُوپر نظر کی آکاش تاروں سے بھرا تھا۔ اور ان کی ٹھنڈی روشنی ہلکا ہلکا لگتا سا اجالا پھیلا رہی تھی۔ تیز چمک والے تارے بڑے بڑے اور روشن لگ رہے تھے۔ کہکشاں سفید غبار کی طرح تھی۔ بالکنی کے اُوپر سیاہی میں چمکتے ہوئے راکھشے کی طرح یہ ذرا پرے کی پہاڑیوں میں گیدڑوں نے بولنا شروع کیا اور بہت شور مچانے لگے۔ پھولوں کے ایک نیچے سے پیڑ میں کوئل کی کو ہو کو ہو بولی پھر بانسی کی صدا ہوا کی لہروں کے ساتھ بہتی ہوئی آئی۔ میرے پیچھے تاریکی میں ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ ہوئی۔ میں اتھاہ تاریکی میں سے نکل آیا۔

ماتا نے بڑی دلنوازی سے اپنا سر میرے کندھے پر رکھا۔ اس کے جسم میں سے تیز خوشبو نکل رہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ لگایا تو اس کا گوشت میرے ہاتھوں میں لگ گیا جو مارکول کے رنگ کا تھا۔ میں نے اسے دھکیلنے کی کوشش کی۔ مگر وہ مجھے پاگل کیے دیتی تھی اور میرا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی ماتا کی آنکھوں میں ہنسی تھی۔ "اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔"

جب جاگا ہوں تو پسینے سے تر تھا۔

کیا میں ہی تنہا ماتا کی تباہی کا ذمہ دار ہوں ؟

گوپال نے جو کہا ہے کہ وہ ذرا خوش باش عورت ہوگی۔ تو کیا ساری خوش باش عورتوں کا انت ایسا ہی ہوتا ہے ؟

وہ اس ہولی کنڈ میں جلتی ہی رہے گی کیا ؟ کیا کوئی اور کبھی اسے اس اندھیرے سے نجات دلانے نہیں آیا ؟ ہر عورت اسی طرح اپنی محبتوں اور کامیابیوں کے باوجود سائے کی طرح ڈھلتی ہے۔ پھر ماتا نے کیوں اسے قبول نہیں کیا۔ کیا اب اس کے دوار پہ میری طرح کا کوئی

مجھے کچھ نہیں آتا؟ وہ اپنی بیتی یادوں کے ساتھ اکیلی ہے اپنے پرانے وجود کا سایہ ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اسے کس طرح یوں اپنا آپ برباد کرنے کی اجازت دی؟ اس کا کچھ سوچتا ہوا سراپا جس میں اس کی سیاہ آنکھیں ادھ کھلی کھڑکیوں کی طرح تھیں شاید میں اس کی زندگی میں ایسے رخ سے داخل ہوا تھا کہ مجھے کبھی اس کی پوری صورت دکھائی نہیں دی اور یہ جو میں گزرے بیتے واقعات کے ذرا ذرا سے ٹکڑوں سے اس کی شبیہ کو جوڑ رہا ہوں۔ جانے کتنا کامیاب ہوا ہوں؟ آخر میں ہوتا یہ ہے کہ آدمی کندھے اچکا کر کہتا ہے۔ "میں کسی تباہی میں شریک نہیں تھا۔"

"میں بھی کسی تباہی کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ مگر تم کسی تباہی کا ذمہ دار نہیں ہے۔ بھلا ہم کیسے اس آگ کنڈ کو بجھا سکتے تھے؟"

میری آنکھوں میں مایا کی کچھ سوچتی ہوئی صورت گھومتی ہے۔ آگ کے شعلوں کے ساتھ لپکتی ہوئی ہوتے ہوتے بجھتی ہوئی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی راکھ میں چنگاری کی طرح دبی دبی سی!

وکے باز

کٹر محمد احسن فاروقی

کمال پور کے تمام لوگ بڑے حرامی دھوکے باز کہلاتے تھے اور اس لئے لکھنؤ کا کوئی شریف زادہ وہاں جانے کو تیار نہیں ہوا
ے صاحبزادے مرزا علی خاں کے۔ آخر وہ جاتے بھی کیسے، عاشق بُری بلا ہوتا ہے۔ وہاں کی ایک لڑکی سینما پر نظر پڑ کر ایسے
ہوئے تھے کہ سب سے چھپا کر وہاں پہنچ ہی گئے اور سرائے میں قیام کیا۔

سب سے پہلی ادھیڑ سرائے کی بھٹیاری تھی موٹی جو حمل سے بڑھے ہوئے پیٹ کو سنبھالتی ہوئی سامنے آئی۔ رنگ کی
جوان کی بدی عورت ان کو دیکھ کر ہنسی اور کہنے لگی: "آئیے آئیے۔ یہ کوٹھری خالی ہے، پلنگ بھی ہے۔ میں ادوان کسے
ہوں۔ آپ اپنا بستر اس پر کریں۔ ایک روپیہ روز پڑے گا۔"

"ایک روپیہ!" مرزا علی خاں بولے۔ "ہم تو سنتے تھے کہ دو آنے پڑتے ہیں۔"

"وہ کہیں اور پڑتے ہوں گے کسی گاؤں میں۔ ہماری سرائے میں ایک روپیہ سے کم نہیں ہوتا۔ جی چاہے رہیے نہیں تو بسرا
کو درخت بہتیرے ہیں۔"

"اچھا خیر، ایک روپیہ ہی سے لینا اور کھانے کا کیا انتظام ہے؟"

اس پر بھٹیاری چیخی۔ "باری جان، باری جان!"

اور پاس کی کوٹھری سے یہ آواز آئی: "آتی ہوں۔" اور پھر ایک سانولے رنگ کی نہایت موٹی مگر قبول صورت عورت نکل
آ کر کہنے لگی: "دو وقت کھانے کے چاول دال شوربا۔ روٹی ہم بارہ آنے لیتے ہیں اور پیٹ بھر کر ... تو دو آنے اور ہمارا
... پھونس کا نہیں جیسا آپ کے شہر میں ہوتا ہے گا۔ خاص شفاخانے کے نسخے کا بنتا ہے۔"

صاحبزادے نے ان دو روپیوں کا خیال کیا جو ان کی کمر سے بندھے تھے اور دو روپیہ روز خرچ کا حساب لگا کر کے بیٹھنے سے ساتھ
ہنسے بولے: "اچھا میرا اسباب رکھواؤ۔" اور جیب میں سے ایک روپیہ اور ایک چونی نکالتے ہوئے بولے۔ "یہ سوا روپیہ بیٹھے والے کو دیدو۔"

"اے سوا روپیہ؟ کوئی دلی ہے؟" بھٹیاری بولی "بس ڈال دی ہے ان بیٹھے والوں نے۔"

بیٹھے والا جو سامنے سے کھڑا سن رہا تھا بولا: "بھٹیاری مرتی ہے۔ حرامزادی کہیں کی۔ سوا روپیہ بیٹھے ہی سے ہو گیا تھا۔"

اس پر دونوں میں خوب ہی کچھ ہوئی۔ "حرامزادہ تو تیرا باپ، تیرا دادا، خاندان بھر۔ منہ سنبھال کے بات نہیں تو۔ مارے جوتوں کے
منہ بنا دوں گی۔ حرامزادی بنے جاتا ہے۔ حرام کیا، تیری ماں نے تو خود حرامزادہ کہیں کا۔"

صاحبزادے پیسے میں سے پہلے ہی دے دیا تھا۔ اب رستہ ہی دو۔

سازندوں کے ہاتھ سے پیسے چھینتے ہوئے پنکھے والے سے بولی: "جا حرامی کے بچے ایک پیسہ نہیں دوں گی تجھے۔ دھوپ اگر جاتی تو
پنکھے والا سٹپٹا گیا اور نرم پڑتے ہوئے بولا: "معاف کرو چودھرائن۔ چار کوس کا تھکا ہوا، منہ سے نکل گیا۔ تم نے بھی جتنی چاہیں
لیں۔ مجھے واپس جانا ہے۔ ادھر سے سواری ملتی نہیں۔ اور رات بھی ہو رہی ہے۔"

گوری بولی: "خوب ہی گرمی کی نکال ہے۔ اچھی زبان ہے۔ نہ آدمی دیکھیں نہ عورت اور پھٹ سے حرامزادی کہہ دیا۔ نہ
وہ گھر خود جہاں اور کوئی ہوتا تو منہ کھلا بنا دیتا۔ واہ ایک ہی رہی۔"

"دیدو اس کا کرایہ۔ شاذ قصہ" صاحبزادے بولے۔

سازندی نے روپیہ پھینکتے ہوئے کہا: "لے یہ روپیہ لے جا۔ سامنے یہاں سے تو یہ آنے میں جاتا ہے یکہ۔"

"ادھر سے جانے والے کو تو ادھر سے سواری مل جاتی ہے۔ ادھر سے سواری کم نکلتی ہے کہیں۔ اسی لئے تو سوا روپیہ لیا۔"

"لے ایک پیسہ نہیں ملے گا۔ اٹھا روپیہ چلتا بن۔ نہیں یہ بھی میں اٹھائے لیتی ہوں اور پھر تیری وہ گت بناؤں کہ یاد کرے۔"

یکے والا خاموشی سے صاحبزادے کا منہ تکنے لگا۔ ان سے بھی کہتے نہ بنی ایک چونی اور جیب سے نکال کر دی اور وہ چلتا بنا۔

"واہ میاں آپ بھی بگاڑتے ہیں۔ ہماری بات کھوٹی کرتے ہیں اور ایسے حرامی نپٹتے ہیں۔" دونوں بھٹیاریوں نے ایک ساتھ کہا اور بہت کچھ بڑبڑا کر رہ گئیں۔ بھٹیاریں سمجھ گئیں کہ صاحبزادے کیسے بھولے ہیں اور ان کو کس طرح ہاتھ میں لیا جائے۔ دونوں بڑے شوق سے ان کی خدمت میں لگ گئیں۔ وہ کبھی پہلے تحصیل کی سرحد بھی باہر نہیں آئے تھے اور تعجب کی بات تھی کہ اب پہلی دفعہ کیسے یکہ کرکے پہنچنے کی جسارت ہوئی تھی۔ یہ عشق کا کرشمہ بلکہ معجزہ تھا کہ وہ یہاں تک آ گئے تھے۔ ان کو کوئی خیال نہ تھا کہ وہ کیا کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ گلی کوچوں میں چکر لگا کر واپس ہو جائیں گے۔ بہت ممکن تھا کر لیتے، کہیں دکھائی دے جائے۔ خدا کی کرنی ایسی بھی ہو سکتی تھی کہ ٹھکانہ رسائی بھی ہو جائے۔ ان کا گھر سے نکل کر اس طرح اسی گاؤں میں آ جانا ان کی زندگی کی بڑی ہی عجیب بات تھی۔ عجیب کرشمہ جس پر ہر شخص کو شاید انھیں بھی تعجب ہوتا، مگر عشق کے کرشمے ہی یہی ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

رات ہو گئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ صاحبزادے کا پلنگ صحن میں بچھا تھا کوئی دس قدم دور پر تین پلنگ اور بچھے تھے۔ ادھر ادھر کے مکا... پر دونوں بھٹیاریاں لیٹ گئی تھیں۔ تیسرا پلنگ خالی تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لمبا دبلا آدمی کندھے پر ڈھولک رکھے ہوئے آیا۔ اندھیرے میں صاحبزادے کو بھوت ایسا معلوم ہوا۔ انھیں بچپن سے بھوتوں سے بہت ڈرایا گیا تھا۔ اس کو آتا ہوا دیکھ کر جھجکے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"کیا ہے میاں؟" دونوں بھٹیاریاں جن کی نگاہ ان کی طرف لگی تھی ایک ساتھ بولیں۔

"یہ کون ہے؟"

"یہ ہمارا میاں ہے۔ ہم دونوں کا۔"

وہ مرد ڈھولک وغیرہ اندر رکھ کر آیا اور صاحبزادے کے پلنگ کے پاس بیٹھ گیا: "میرا نام حسن ہے میاں۔ اس سرائے میں حصہ ہے۔ میں روئی دھنکتا ہوں۔ اب جاڑہ قریب ہے تو کام ملنے لگا ہے۔ شہر بھی جاتا ہوں اور یہاں بھی گرمی میں کام نہیں لگتا تو

اور کام کر دیتا ہوں۔ یہ سرائے بھی چلتی ہے۔ مگر کون آتا ہے اور آپ ایسے آدمی تو برسوں میں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں رہتے ہیں۔ ان عورتوں کا خرچہ چل جاتا ہے۔ دو چھوٹی بیٹیاں ہیں۔ پیٹ سے کوئی پڑھی جوبن آ جاتا ہے۔ آپنے دیکھا کتنی اچھی لگتی ہے اور وہ بڑی کا تو لازوال حسن ہے۔ یہ ساؤنی نگست بڑی پختہ چیز ہے۔ مزے میں نمکین اور بڑی دیر رہنے والی۔ ڈھلتی ہی نہیں۔ میری پہلی وہی ہے۔ مگر لوگ گوری زیادہ پسند کرتے ہیں تو ایک گوری بھی کر لی عورتوں کی کوئی کمی ہے۔ ایک روپیہ پھینکئے تو دس گریں۔"

وہ اسی طرح باتیں کرتا رہا۔ ساؤنی نے اس کو نارجیل کا حقہ لا کر دے دیا وہ دم لگانے لگا۔ صاحبزادے سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ زور کا دم لگا کر کھانستا ہوا بولا "میاں آپ ادھر کیسے آ نکلے۔ کوئی گاؤں واؤں خریدنا ہے؟ تمہیں یہاں کوئی کام ہے؟ زمین وسین خریدیں گے یا کسی موڑھیا کی تلاش ہے؟ میں سب قسم کی خدمت کرتا ہوں۔ قانون کو صاحب۔ مولدار صاحب چٹکی سے دور دور تک سب ہی میرے ہاتھ میں ہیں۔ بچہ بچہ مجھے جانتا ہے۔ جس سے پوچھئے جمن کہے گا وہی بھٹیارا ہاں ہم خوب جانتے ہیں اور یہ میری بھٹیاریاں۔ ساؤنی اور گوری پورے گاؤں میں مشہور ہیں اور یہیں کیا۔ گاؤں گاؤں کے لوگ انھیں دیکھنے آتے ہیں۔ ساؤنی کے نک نقشے پہ سب ہی جان دیتے ہیں۔ واہ کیا نمک ہے ہر ایک دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے اور گوری بھی۔ اتنی گوری ضلع بھر میں نہ ملے گی۔ میں اسے شہر سے لایا تھا۔ بہت تحفہ مال ہے۔ ہاں تو میاں آپ کا جو کام ہو تو اس کے لئے یہ غلام حاضر ہے۔ کل دیکھئے نہ جاؤں گا کیا لگتا ہے۔ ایک روپیہ۔ تو وہ آپ دے دیں میں آپ کے پیچھے پیچھے جہاں کہیں گے چلوں گا۔"

صاحبزادے یہ سب سنتے رہے اور کچھ نہ بولے۔ اس سے دل میں آتا کہ دل کا راز کہہ دیں مگر اس بھٹیارے سے زیادہ ان دو بھٹیاریوں سے سامنے حال دل کہتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ وہ صرف اتنا بولے "میں تمہیں صبح ہی ایک روپیہ دے دوں گا۔ مجھے سفر کرنا ہے۔ ان جگہ میں پورے گاؤں کا جائزہ لینا چاہتا ہوں اور بھی کام سے پھر بتاؤں گا۔"

جمن کافی سیانا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے پلنگ پر جا کر لیٹنے لگا تو بولا "ارے میاں کا پلنگ الگ کیوں بچھایا۔ رات کو کچھ ضرورت ہو تو۔ ان کا بستر ان پلنگ پہ لگا دو۔" تھوڑا ذرا دیر رک کر کچھ رنگین آواز میں بولا "کیوں میاں۔ آپ کا بستر اسی پلنگ پر لگا دیں۔"

صاحبزادے کچھ نہ بولے

ساؤنی بولی "بڑے شرمیلے ہیں۔ ان کا الگ ہی پلنگ بچھایا۔ ہم سے آنکھ ملانے میں ڈرتے ہیں۔"

بڑے۔ ذرا تنہا چھوڑ کے دیکھ۔ گوری بولی اور قہقہہ مار کر ہنسی۔

ان باتوں پر صاحبزادے کے دل میں پسینے چھوٹ گئے۔ عورتوں کے درمیان وہ پہلے تھے اور انھیں عورتوں کا شوق نہ تھا۔ وہ بچپن ہی سے ہر چیز سے ڈرا دئے گئے تھے اس لئے عورتوں کو غور سے دیکھنے یا ان کی طرف بڑھنے سے ڈرتے تھے۔ ان کے ہمجولی انہیں اس کمزوری پر بنایا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک آدھ دفعہ مت باندھی بھی تھی مگر کانپ کر رہ گئے تھے۔ سیما کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہمت اس لئے بڑھ گئی تھی کہ وہ خود آنکھیں مسکا کر انھیں دیکھتی تھی اور منہ بھی چڑھا دیتی تھی بلکہ ایک دن تو اس نے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے چٹکی بھی لے لی تھی اور ایک رات اس کے پلنگ کے پاس ٹھہر گئی تھی مگر اس نے اپنا دوپٹہ اس طرح اوڑھا تھا کہ

دامن ان کے منہ پہ ملتا تھا۔ اس کی اس قسم کی حرکتوں سے ان کی کچھ نہ کچھ بہت بندھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے گاؤں چلے آنے پر ان کو اتنی بے قراری ہوئی کہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ سیلما معمولی جوان لڑکی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ اچھی لڑکیاں بھی قرب و جوار میں انھیں دکھائی دی تھیں مگر یہ لڑکیاں بہت روز ملول ہوتی تھیں اور ان سے صاحبزادے کو بڑا ڈر لگتا تھا۔ سیلما خود ہی تیار تھی اور وہ خواب بھی اسی بات کا دیکھا کرتے تھے کہ کوئی لڑکی اس کے پاس خود سے آ جائے۔ اس وقت جمن کی باتوں نے اس کے سامنے ایک اور ہی سماں باندھ دیا۔ سراے میں اترتے ہی ان کی نگاہ ان دونوں جھیریوں پہ پڑی تھی اور دونوں انھیں اچھی ضرور لگی تھیں مگر انھیں آنکھ بھر کر دیکھنے سے وہ برابر ڈرتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان بسٹ ہونے کا سماں ان کی آنکھوں کے سامنے چھا۔ انھیں ایک سنسنی محسوس ہوئی مگر چہرے پہ غالب آ گیا۔

"تو یہاں آپ کا بستر! دیجیے وہاں پلنگ پہ کر دوں!" جمن کی آواز اس کے کان میں آئی اور وہ چونکے مگر ان کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

جمن [illegible] لپیٹ کر بغل میں دبائے ہوئے اس کے پاس آیا اور بولا۔ "انھیں یہاں میں اپنا بستر اس پہ کر [illegible] اس پہ بچھا دوں؟"

میاں گھبرا کے کرسی پہ اٹھ ہی کھڑے ہوئے۔ دونوں دونوں کے درمیان [illegible] گھبراہٹ ہی ہوئی مگر ساوتری نے اس کا اندازہ لگا کر انھیں تسلی دی۔ جمن اپنا چہرہ بچا کر [illegible] ٹھنڈی ہی دیر میں خراٹے لینے لگا۔

۳

دلی کی جانب جب وہ اور جمن گاؤں دیکھنے نکلے تو دونوں اب صاحبزادے سے زیادہ مانوس ہو چکے تھے اور ان سے گاؤں آنے کا سبب بار بار پوچھ چکے تھے مگر انھوں نے اپنے راز کو راز ہی رکھا تھا [illegible] کہ وہیں تک زبان رکتی تھی۔ جمن کا [illegible] سمجھنے چلے تو وہ ہاں لیے [illegible] کی طرف تھا اور اگرچہ یقین کر رہا [illegible] کے گاؤں میں کہیں نہ کہیں اتفاق سے نظر ضرور دکھائی دے جائے گا۔ جمن نے ان کو [illegible] قسم کی [illegible] دکھائیں۔ بستی جا بجا ہی سے لیا جہاں سب کچے ہی کچے مکان تھے اور بستی میں ایک دکان تھی جس میں ہر قسم کا سامان ملتا تھا۔ کچے مکانوں پر چھپر ان کی چھت تھی سب ایک ہی سے تھے۔ [illegible] اندر کون لوگ تھے معلوم کرنا مشکل تھا۔ [illegible] پورا گاؤں گھوم لیے مگر کوئی نشان نہ ملا جس سے سیلما کا پتہ ملتا۔

جمن بولا [illegible] بیٹے دیکھ لیا۔

پھر کچھ سوچ کر انھوں نے اپنے دل کی بات [illegible] یاد آیا۔ یہاں کی ایک عورت ہمارے یہاں ملازم تھی۔ کچھ دن ہوئے واپس آ گئی۔ اس کو ہی دیکھتے چلیں۔

کیا نام تھا اس کا اور اس کے [illegible] کا؟

[illegible] کا نام تو [illegible] معلوم نہیں۔ اس کے ایک لڑکی تھی [illegible] اور [illegible] سیلما [illegible] کہتے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ گاؤں [illegible] سے آتی ہے۔

"اچھا۔ اچھا ہاں وہ بدّو بھٹیارے کی جورو۔ ہاں۔ ہاں۔ اس کا گھر یہ آ گئے ہے۔ لڑکی جوان بیٹھیا ہے۔ بڑے زور بیانی ہوئی ہے۔ تب سے لنگی کتی کسی مرنے کو پھانسنے کے لئے کمر پھینہ جھری میں واپس آ گئی۔" اسی طرح کہتا ہوا وہ اور صاحبزادے آگے بڑھتے چلے گئے اور کوئی بیس قدم کے بعد ایک مٹی کے گھر کے پاس رک گئے جس میں بڑا بھدہ سا لکڑی کا دروازہ لگا ہوا تھا۔

"سلیماں کی اماں۔ او بھابی۔ او بھابی۔" جمن چلایا۔

"کون ہے۔ کا ہے؟" اندر سے آواز آئی تبھی صاحبزادے نے پہچان کر کہا۔ "آواز تو اسی کی سی ہے۔"

پھر جمن بولا۔ "ارے یہاں تو آ۔ دیکھ کون آیا ہے۔"

دروازہ کھلا، سلیماں کی ماں سر پہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی سامنے آئی۔ صاحبزادے کو دیکھ کر بولی۔ "نواب میاں آپ۔" اور خوشی سے اس کی باچھیں کان سے کان تک کھل گئیں۔ دُبلی ہوئی گھٹے ہوئے رنگ کی عورت تھی مگر کچھ ایسی زیادہ ڈھلی بھی نہ تھی۔ اس وقت حد سے زیادہ خوشی کا عالم طاری تھا اور اس لئے اچھی لگنے لگی تھی۔

"آؤ میاں آؤ۔ کیسے آئے ادھر؟"

صاحبزادے اور جمن گھر کے اندر گئے۔ یہ گھر ایک ہی کمرہ کا تھا جس میں داخل ہوتے ہی صاحبزادے نے دیکھا کہ ایک کونے میں جو دیوار کی طرف منہ کئے چپکی بیٹھی رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا مسکرائی اور پھر گھونگھٹ نکال کر جلدی سے باہر ہو گئی۔ اس کی ماں نے صاحبزادے کو ایک پیڑھی پر بٹھا دیا۔

جمن بولا۔ "آپ کہیں تو میں ٹھہروں۔ نہیں میں چلتا ہوں آپ آ جائیے گا۔"

"ہاں میں پہنچائے دیتے ہوں۔ کہاں ٹھہرے ہیں میاں۔ اس کی سرا میں؟"

"ہاں وہیں ٹھہرا ہوں۔"

اور جمن چلا آیا مگر وہ تاڑ گیا کہ سو روپے یوں کاغذ میں آئے تھے اور اس نے ان کے ہاتھ میں اپنا پارٹ بیچتے اور چپکے اٹھتے [illegible] دیکھ لیا تھا۔ وہ دونوں جوتیوں سے آ کر بولا۔ اب میں کیا کہتا کیوں ہاں [illegible] چپ سادھ کر سی طرف [illegible] سے [illegible] تو نے [illegible] میں کیا باندھ کر رکھے ہیں؟"

"ہاں کوئی سو روپے ہوں گے۔"

"اس میں سے سب نوٹ بارہ تو ہم رکھ لیتے ہیں۔ [illegible] سوچ کیا کہیں۔ [illegible]"

"سو دو آنے کہیں [illegible] نوکری سے پوچھ۔"

وہ سلیماں کی ماں نہیں سے [illegible] ہوں جو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] کوئی [illegible] اور [illegible] آتی ہیں۔ [illegible] اچھا ہے۔ زندگی بھر کی کمائی کا [illegible] ہو جائے گا۔

[illegible] بھولا۔ [illegible] زیادہ [illegible] ہوگا۔ کچھ [illegible] نہیں۔ یہ بات میں نے بتائی [illegible]

[illegible]

پھر بھی اس کے یہاں اور ۔ وہ ڈرتا ہوا بولا۔ خیر، اب نہیں ڈرے گا۔ میں نے سب سمجھا دیا ہے۔ کہنے لگا کہ یہ مزا تو معلوم ہی نہ تھا۔"

"ہاں بالکل اُلو کا پٹھا ہے۔ میں نے بھی یہی نظر میں جان لیا تھا۔ مگر مجھے اسے چھوڑنے کی ہمت نہ پڑی۔ نہ معلوم کیا بات ہے۔ دیکھنے میں بھی ٹھیک تھی مگر ساڈنی نے تو جیسے الہ دست کھینچ لیا اور کھل گیا بس منڈوں میں آ گیا۔ بات یہ ۔ ۔ ۔ ۔"

محسن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "یہ سب جانے دو۔ ایسے جو زنانے سوروں میں لڑکی کو ڈھونڈتے ہیں۔ یہ سو تو اپنے ہیں ہی۔ چار پانچ سو روپے مہینے کا معاوضہ ہے۔ ذرا ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا۔"

"اگر سیما کی ماں یہیں یہاں ہوئے تو؟"

"بیٹے، ہے کی۔ مزاج عجیب سی ہے۔ اور کبھی کبھار بیٹھی ہی رہتی ہیں۔ وہ بھی ایک مزا ہے۔ میاں کو موقع کی تپ کا ۔ دیکھتے رہنے دو ۔ نہیں ۔" محسن نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

(۳)

سیما کی ماں کے گھر پہنچ کر سامنا ہوا۔ اس کی خوشی اس وقت انتہا کو پہنچی جب سیما کی ماں نسیم کے کمرے سے باہر چلی گئی اور وہ اور سیما گھر میں اکیلے رہ گئے۔ سیما نے چکن کا دوپٹہ چھوڑ دیا اور اس کی طرف رخ کیا۔ وہ اسے بڑی حسرت سے دیکھنے لگے۔ بڑی جوان تھی۔ جوانی پھٹی پڑ رہی تھی۔ رنگ صاف تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، منہ بھرا بھرا اور بال جیوں توں کئے ہوئے بندھے ہوئے تھے۔ بہت پہلے وہ اسے اس وقت بھی اسی طرح سے دیکھا کرتے تھے جب وہ اس کے گھر آتی تھی۔ اب ان کی نگاہوں میں کچھ زیادہ ہی زور کی وجہ سے آ گیا تھا۔ ایک رات پہنچتے ہی وہ سیما کی اداؤں سے واقف ہو گئے تھے۔ عورت ہوتی کیا ہے۔ سیما کی ماں نے قریب دو ماہ اس کے یہاں نوکری کی تھی۔ اسی دوران میں وہ محسن سے اسے پہلے جانتے تھے۔ ان کا منہ چڑھا یا کرتی تھی۔ جس کو ان کی والدہ نے پسند کر کے سیما کی ماں کا انتخاب کر لیا تھا۔ ان کو اس سے عشق اسی دن ہو گیا تھا جس دن وہ اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ مگر وہ اسے عشق سے زیادہ نہ سمجھے۔ ان کا تو زیادہ تر عمل مجبوری کر دیکھنے کا تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹ جاتے اور ان کی نگاہیں سیما پر لگ جاتیں کہ سیما کے ساتھ ساتھ کھڑی ہوں۔ گھنٹوں وہ انہیں دیکھا کرتے کہ وہ کہاں بیٹھی ہے۔ کدھر جا رہی ہے اور کیا کر رہی ہے۔ اس کا جواب سیما نے دیا۔ وہ ان کی ان حرکتوں پر نہیں، بلکہ پیشتر ان پر نظر رکھی جاتی اور اپنا رخ ان کی طرف اس طرح کر لیتی کہ وہ اچھی طرح اسے دیکھ سکیں۔ وہ بیٹھے رہتے اور دیکھتے رہتے۔ سامنا ہوتا اور کچھ نہ ہوتا۔ ان کی ہمت نہ پڑتی کہ کوئی پیش قدمی کرتے۔ یہ سیما ہی کی پیش قدمی تھی کہ وہ ان کا منہ چڑھا دیتی تھی۔ اس وقت جب وہ گھر میں اکیلی رہ گئی تھی اور ایک رات پہلے ہی ان کی ہمت بڑھا دی گئی تھی تو ان کی یہ ہمت ہوئی کہ بڑھ کر آگے بڑھ کر اس سے بات کریں۔

"تم یہیں بیٹھے رہے ہو یہاں آنے کے بعد یہی کہتے ہو؟" اُنھوں نے کہا۔

سیما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں نیچی ہو گئیں اور اس کے چہرے پر خون دوڑ گیا۔

"تمہارے کپڑے بہت میلے ہیں۔" دوسری بات انہوں نے کہی۔

"کہاں سے پہنے آئیں۔ اماں کی نوکری بھی چھوٹ گئی۔"

"کتنے میں کپڑے بن جائیں گے۔ کئی جوڑے بنالو۔ صاف رہا کرو۔"

اتنے میں سلیما کی ماں آگئی۔ صاحبزادے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ "تم لوگوں کے پاس کپڑے نہیں ہیں میلے کپڑے پہنے ہو۔ کتنے میں ٹھیک کپڑے بن جائیں گے۔"

"نہیں بیس روپیہ ہوں تو چار جوڑے اس کے اور دو جوڑے میرے بن جائیں۔"

"کل بیس روپیہ میں؟"

"ہاں یہی بیس اکیس زیادہ سے زیادہ بائیس۔ تو وہ کہاں سے آئیں۔ چار روپیہ کھانا پر تمہارے یہاں نوکر ہوئی تھی۔ اب وہ نوکری بھی چھٹ گئی۔ پورے تین آنے روز گھر کا خرچہ ہے۔ دو چار روپیہ پاس ہیں دیکھو کب تک چلیں۔ اللہ مالک ہے۔ کپڑے کہاں سے آئیں۔"

صاحبزادے کے دل میں آئی کہ فوراً کمرے میں جا کر پچیس روپیہ نکال کر اسے دے دیں۔ مگر اس حرکت سے اس کے دل کا راز فاش ہو جاتا تھا اس لئے انھیں ڈر معلوم ہوا۔

"ہمارے کپڑوں کو میلا کہتے ہیں۔ ایسا ہی ہے تو بنا دیں نئے کپڑے۔" سلیما نہایت بے باکی سے بولی صاحبزادے نے اسے تعجب سے دیکھا۔ اس نے اپنی آنکھیں ترچھی کر کے انھیں دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔ اب ان کی ہمت بڑھی اور انھوں نے کمرے سے روپیوں کی تھیلی کھولی۔ اور ماں بیٹیوں کے سامنے زمین پر رکھی اور اس میں سے پچیس روپیہ گنے۔ "لو یہ پچیس ابھی کپڑے بنوا لو۔ کوئی بات بھی ہے یہ۔"

ماں نے روپیہ اٹھانے اتنے ذرا سے زیادہ تکلفی نہیں آتی تھی۔ اس نے دس دس کی دو اور پانچ کی ایک ڈھیری لگائی اور پھر اٹھا کر اپنے دامن میں لے لئے۔ انھوں نے دیکھا کہ سلیما کا چہرہ خوشی سے بے انتہا روشن ہو گیا۔ اس کا منہ کھل گیا۔ باچھوں کی نئیں سر پر پہنچتی ہوئی وہ بولی۔ "اماں تو جاؤ ابھی لے آؤ کپڑا میں شام تک ایک ایک جوڑا تو سی لوں گی۔"

"اچھا" کہہ کر ماں فوراً گھر سے باہر چلی گئی۔ سلیما مسکرائی۔ صاحبزادے کے دل میں ایک لہر آئی۔ ان کا جی چاہا کہ اسے اس طرح لپٹا لیں جیسے رات میں سپنے میں ان سے لپٹ گئی تھی مگر ان کی ہمت نے جواب دے دیا۔ انھوں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا مگر محسوس ہوا کہ جیسے ہاتھ شل ہو گیا۔

"میں چاہتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ۔ ہاں تم لوگوں کے لئے کچھ ایسا ہو جائے۔ ایسا ہو کہ تم لوگ آرام سے رہو۔" لڑکھڑائی ہوئی آواز میں وہ بولے۔

"اماں کہتی تھیں کہ اگر تین سو روپیہ مل جائیں تو زندگی بن جائے۔"

"کیا کیا کریں گی تین سو میں؟"

"اماں کہتی تھیں۔ ادھر ایک دیوار اٹھائے اور باہر چھپرا لگا کے ایک دوکان بنا لیں گی۔ کوئی پچاس روپیہ کا حساب آتا ہے۔ سو روپیہ کا مال لا کر اس میں رکھیں گی۔ پچاس میں اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ تو دو سو ہی ہوئے۔"

ستو میں اور بہت سود کیا کریں گی۔ ہمیں یاد نہیں کیا کتنی تھیں کتنی ہی ہیں لیکن تین سو کوئی دے دے تو سب ٹھیک ہو جائے۔ کھانا تعمیر کی آمدنی ہوگا یا گرے اور نیچے بھی رہے۔ کہاں سے تین سو ہیں گے۔ مہاجن سو روپیہ اس مکان پر دینے کو کہتا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ مہینہ سود کاٹے گا۔ دس روپیہ مہینہ ادا لی۔ اماں کہتی ہیں پچاس میں تو دوکان بنے گی اور پچاس میں کیا سامان آئے گا اور پھر اماں نہ ہو سکا تو گھر بھی سود میں چلا جائیگا۔ قرضہ لینے سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ بچائے۔"

وہ یہ نہایت بھولے پن سے کہتی رہی۔ صاحبزادے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چمک کو دیکھتے رہے۔ کبھی نگاہ اس کے بھرے بھرے گالوں پر جاتی۔ کبھی اس کے سارے جسم کا جائزہ لیتی۔ جسم کی لذت انھوں نے ایک بات پہلے ہی محسوس کی تھی سلیما کا جسم اس جسم سے زیادہ لطیف معلوم ہو رہا تھا۔ ان کا جی بے تحاشہ چاہ رہا تھا کہ اس جسم کو اپنے آغوش میں لے لیں۔ مگر اتنی بھی ہمت نہیں کر پاتے آگے بڑھانے۔ اس سلسلے میں ابھی تھیں پہلا ہی درس تو ملا تھا۔ ابھی سبق ہی لگائے تھے۔ رواں کہنا نہیں آیا تھا رواں ہو جانے میں بہت دیر تھی۔ انھوں نے سوچا۔ دو سو سے تین سو روپیہ تک میں اس کی زندگی کا خواب پورا ہو جاتا ہے اور پھر جب اس پر بلا شرکت غیرے اور بلا مزاحمت دیگرے قابض اور مسلط ہو جاؤں گا۔ کیا میں اتنی رقم کا انتظام کر سکتا ہوں؟ اس کے سامنے وہ کہانیاں آئیں جو اس کی کھلائی انھیں سنایا کرتی تھیں جن میں محبوبہ اپنے عاشق سے کوئی مہم فتح کرنے کو کہا کرتی تھی اور انھیں محسوس ہوا کہ ان کی محبوبہ وصل کی محض ایک شرط لگا رہی تھی۔ تین سو روپیہ کی رقم۔ زیادہ بڑی بات نہ تھی۔ حالانکہ کچھ مشکل ضرور تھی۔ آسانی سے تین سو روپیہ جمع ہو جانا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ کچھ دن ضرور لگیں گے۔ کوئی صورت ضرور نکالنا پڑے گی۔

"یہ آپ گم کیوں ہو گئے؟" سلیما نے پوچھا۔ "کیا سوچ میں پڑ گئے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ کہاں سے تین سو کا کیسے انتظام کروں۔"

"سچ؟" کہہ کر سلیما پھڑک گئی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر صاحبزادے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ صاحبزادے کے جسم بھر میں سنسنی دوڑ گئی۔ ان کا جی چاہا کہ ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیں۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ بھی یہی چاہ رہی تھی۔ مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ ساز دل کی طرح وہ خود ان سے لپٹ جائے مگر سلیما کی جھجک نے یہ نہ ہونے دیا۔

سلیما کی اماں کپڑا سر پر لاتے ہوئے آگئی اور پلنگ پر ڈالتے ہوئے بولی۔ "میاں کا شربت پان نہیں دیتے۔ ابا بھی بیٹھے ہیں۔"

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میاں بولے۔ "ہاں تم کو تین سو روپیہ کی ضرورت ہے مجھے معلوم ہوا۔ سلیما نے دو سو کہا تھا بتایا۔ ایک سو کہا کر دی۔"

"سب حساب کر کے دکھا دیا ... دوکان بنانے کا تخمینہ پچاس ہوتا ہے مگر کیا معلوم ساٹھ لگ جائیں۔ سامان سو کا لانے کو کہتی ہوں کیا معلوم ڈیڑھ سو کی ضرورت پڑ جائے اور پھر بیس پچیس اوپر لگ جائیں آخر سلیما پہاڑ سر پر بیٹھی ہے۔ اس کا نکاح کہیں کر دوں۔ بیاہ میں بیس سے کم تو خرچ نہیں ہوتے۔ اماں کہتی ہے مجھے چھوڑ دیکھ۔ بیاہ کر نسبت مجھے رہا دیکھ۔ دونوں کام کرنے ہیں اس لئے کچھ رقم زیادہ ہی پاس ہونا چاہئے۔ اس مارے تین سو کہہ دیئے۔ ڈھائی سو سے زیادہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ میں یہی کہتی ہوں ڈھائی تین سو ہوں تو سب کام بن جائیں۔ اس نے تمہیں تین سو بتائے۔ ڈھائی سو ہی میں سب کچھ ہو جائے گا۔"

جب وہ یہ سب کہہ رہی تھی تو سیما پر یہ اثر ہوا کہ اپنی شادی کا ذکر آتے ہی گھونگھٹ نکال لیا اور چکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ صاحبزادے کو محسوس ہوا کہ وہ تین سو روپیہ دے کر نہ صرف محبوبہ کا سوال پورا کریں گے بلکہ طرب گاہ رقیب کی تعمیر میں بھی مدد کریں گے۔ سیما کی شادی۔ کیا وہ خود سیما سے نکاح نہیں پڑھا سکتے تھے؟ یہ کیسے ممکن تھا۔ امی جان اپنا منہ پیٹ لیں گی۔ تمام خاندان ہنسے گا۔ نہیں یہ تو ناممکن بات تھی۔ آخر وہ چاہتے کیا تھے؟ اس کے ذہن میں یہ بات صاف نہ تھی۔ کوئی پراسرار جذبہ انہیں سیما کی طرف کھینچتا تھا۔ وہی انہیں شہر سے کھینچ کر گاؤں میں لایا تھا۔ مگر وہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے یہ انہیں بالکل نہ معلوم تھا۔ وہ خاموش سنتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ سوچتے رہے۔

اندر سے سیما کی ماں بولی۔ "سوچ میں کیا پڑ گئے بھیا؟"

"یہی سوچ رہا ہوں کہ تم لوگوں کے لئے تین سو کا کیسے انتظام ہو۔ تمہاری پوری زندگی اس رقم میں بن جائے گی۔"

سیما کی ماں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر ان کی بلائیں لیں۔ اور سیما سے بولی۔ "ارے کہیں کی بیچ بانٹی ہے۔ میاں تو تیرے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں اور یہ آئے کو شربت پان بھی نہیں لا دیتی۔"

صاحبزادے کے دل میں وہی جوش آیا جو کہانیوں کے شہزادوں کے دل میں آتا ہوا سن چکے تھے اور وہ فخر کے ساتھ بولے "نہیں میں شربت اور پانی اسی وقت لوں گا جب تین سو کی رقم تمہارے ہاتھ میں رکھ دوں گا۔ میں آج ہی واپس جاؤں گا۔ اگر پھر یہ رقم لا کر ہی منہ دکھاؤں گا۔ کہہ نہیں سکتا کتنے دن لگیں گے مگر میں اس کام کے کرنے کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔"

"میاں ایسی جلدی نہ کرو۔ چٹنی روٹی یہاں کھا کر تب جاؤ۔ شہر پہنچتے پہنچتے بھوک لگنے لگے گی۔"

"نہیں نہیں۔ ایک گھنٹہ ہی تو لگتا ہے۔ کھانے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا اور ابھی سے تین سو روپیہ جمع کرنے کی کوشش شروع کروں گا۔ دیکھو کتنا وقت لگتا ہے۔ مگر خدا مالک ہے۔"

یہ کہہ کر وہ گھر کے باہر تیزی سے آئے اور دم بھر میں سرائے پہنچ گئے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ جیسے کہانیوں کے شہزادوں کی طرح انہوں نے معشوق کا سوال سنتے ہی ایک گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھا اور بجلی کی طرح مہم فتح کرنے پر روانہ ہو گئے۔

(۵)

سرائے میں واپس ہو کر صاحبزادے نے اپنا سامان سنبھالنا شروع کیا تو بھتی جو ان کا انتظار کر رہا تھا پریشان ہو کر پوچھنے لگا۔

"سرکار میاں۔ کیا آج ہی چلے جائیے گا۔"

"ایسی اتنی جلدی۔" گوری بولی اور سانولی نے بھی یہی کہا۔

"ہاں مجھے جلد سے جلد جا کر تین سو روپیہ کا انتظام کرنا ہے اور پھر واپس آنا ہوں۔"

"تو وہ سیما کی ماں تین سو مانگتی ہے۔ ایسی اچھی تو نہیں ہے لونڈیا۔"

"سو روپیہ پر تو ستر پا جاتی ہے اور کیسی اچھی۔ ناک نقشہ اور یہ بڑی بڑی آنکھیں۔ ستو پہلے لئے تھے ایک میاں جب ابھی جانا

سکا۔ پھر واپس آگئی تھی اور اسی طرح سے جا بیٹھے ہیں۔ آج کل خالی ہے۔ میں مرد ہوتی تو اس کو گھر بٹھا لیتی آپ دیکھیں تو اس کو بھول جانے کا نہیں، لو ہنسے ہی گیا ان میں بس کنواری ہے اور جوانی پھٹی پڑتی ہے۔ ماں نے کہی تھی شہر ہی سے کر کوئی پیشے تاپ پیشے اچھے پیشے۔ تین سو روپیہ اندھیرا۔ کوئی اور پچاس بھی نہ رسے گا۔ سالڈول کہتی رہی۔

"تم یوں نہیں سمجھتیں۔ میرا معاملہ ہی اور ہے۔ میں سلیمہ کی ماں کو ایک دوکان کرا دوں گا۔ اس کی آمدنی سے وہ اور سلیمہ گزر بسر کر لے گی۔ دونوں اچھی طرح رہیں گی میری اپنی خوشی یہ ہے۔ میں بھی یہاں آجایا کروں گا۔"

"اچھا۔ اچھا۔ تو نہ رہیں۔ سلیمہ کی ماں سے بھاگ جاگ۔ جتے میں۔ زندگی بھر کا سہارا۔ دوکان تھیں کی تین سو روپیہ کی۔" گوری بولی۔

"میاں آپ بھی کہاں پھنس رہے ہیں بے فضول کے لئے ستر پاکر جانے دیجیے۔ گوری جوان چاہتے ہیں تو میں تمہیں دلا دوں ابھی سلیمہ سے اچھی نہ ہوں تو کہیے گا۔ بے فضول روپیہ نہ پھینکیے۔"

"ان سب باتوں سے کوئی فائدہ نہیں میں اپنی ہی کرنے کا عادی ہوں۔ آئی تم پیسے کام میں ہو۔ جا زیگر سے آؤ۔ بس میں نہ جاؤں گا۔"

"اور کھانا دانا کھا کے جائیے۔ ہم نے پکا لیا ہے۔" سالڈول بولی۔

"کھانا گھر ہی جا کر کھاؤں گا۔ تم نے پکا لیا ہے تو اس کے دام لے لینا۔ اب میں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ اپنا سب حساب اور بھی اور جو تم نے فورا کہ جتنا ہو۔ آتے ہی میں نے دیکھا تھا یہ کمرا ہے۔ میں نے تم میں خود جو آتا ہوں ... کہ پھر خیال ہو کہ تم دے دوں گا۔ تم جا کر کہہ دو میں ان سے حساب کرتا ہوں یہ بستہ دیکھتا ہوں۔"

کل سے صاحبزادے کا ارادہ اس قدر پختہ دیکھا تو اب بہت حیرت ہی تھی۔ دونوں عورتوں نے مختلف باتوں کا حساب لگا کر دو روپیہ صاحبزادے سے اینٹھ لئے اور انہوں نے جا کر دے دیئے۔ یہ پیر جنید کر قریب چھتے بھر میں لکھنؤ اپنے گھر جا پہنچے یہاں کا عجب حال تھا۔ ان کی والدہ پریشان ہو رہی تھیں کہ کہاں چلے گئے۔ رات بھر جاگ میں کیا کیا تھیں۔ گھر والوں نے حیرت چرت پڑا مانگی تھی صاحبزادے کو دیکھتے ہی شکر کے سجدے میں گر پڑیں۔ فورا ہی دونا اور بڑا سلامی گئی۔

"اے میاں کہاں چلے گئے تھے۔ کہہ کر بھی نہیں گئے۔"

"میرے دوست سلیمہ صاحب نے کل شام روک لیا دعوت تھی۔ دیر ہو گئی کچھ ناچ گانا بھی تھا۔ پھر ان ہی کے یہاں سو گیا۔ دن چڑھے آسودہ۔"

"بیٹا کہہ تو دیا ہوتا۔ یہاں قلب پر جانے پڑ رہے تھے۔ دھڑکا لگا رہا۔"

"سلیم نے اپنے ملازم کو بھیجا تھا کہ کہہ آئے۔ وہ کہہ نہیں گیا۔ حرامزادہ، خیر جانے دیجئے۔ جیسے حرامی ہیں یہ سب نوکر لوگ"

وہ کھانا وانا کھا کر اپنی طرف آئے اور روپیہ کی بابت سوچنے لگے۔ والد کے مرنے کے بعد ان کا ایک سو تینتیس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ مگر یہ والدہ کے ہاتھ میں دیتے تھے۔ والدہ انہیں دس روپیہ ماہوار مٹھائی کھانے کا دیا کرتی تھیں اب انہوں نے بیس روپیہ ماہوار کر لیا تھا۔ سو روپیہ کا قرض بھاری ہے دس روپیہ ماہوار کی قسط پر دے کر وہ

کو دیکھنے کے لئے گئے تھے۔ اب اس سو میں سے کوئی پچھتّر باقی تھے۔ ان کو پچھتر کی جگہ تین سو کرنا تھا۔ مدن بہاری تیس روپیہ کی قسط مانگے گا۔ وہ اپنا خرچہ دس کم کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ پورے بیس بھی دے دیتے مگر تیس بلکہ چالیس کہاں سے دیئے جائیں گے اور پھر تین سو اور بھی تو ہونا چاہیے۔ آخر آنے جانے میں بھی کچھ خرچ ہوا کرے گا۔ سارا خرچہ پانچ سو کا بیٹھ رہا تھا۔ کیا کیا جائے؟ کون دے گا؟ آخر سمجھ میں آیا کہ مدن بہاری ہی سے ذکر کریں۔ ایک رات یوں ہی گئی۔

دوسرے دن وہ لالہ کی کوٹھی پر پہنچے۔ لالہ پوتھی کھولے تکیہ سے لگے حساب کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی بولے "کیوں میاں کیا اور ضرورت پڑ گئی؟"

"نہیں جو سو لے گیا تھا اس میں بھی پچھتر بچ رہے ہیں۔ میں نے کہا واپس کر دوں پانچ قسطیں ادا ہو جائیں گی جیب میں رہا تو خرچ ہو جائے گا۔"

"خدا خیر کرے صاحب، مزاج ہو رہے ہیں آپ نوابوں کے۔ روپیہ کا یوں خیال کرتے ہیں۔ ارے آپ کے والد مرحوم ہزار لے گئے تو وہ خرچ۔ سو لے گئے تو وہ خرچ۔ یہ تو انہوں نے کیا سمجھے۔ یہ سب مکان ان ہی کے دیے ہوئے ہیں۔ قرضہ دس ہزار تک ہو گیا تھا۔ اس میں یہ سب مکان دے دیئے۔ کوئی بات تھی، نواب نواب ہی ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو ہم لوگوں کی پرورش کیسے ہو۔ تم روپیہ واپس کرنے آئے ہو یہاں۔ تمہارے ابا جان مرحوم کی روح لرزتی ہوگی۔ ہاں اگر کچھ اور کی ضرورت ہو تو میں دینے کو تیار ہوں۔ تمہارے والد کہہ گئے تھے کہ جیا مدن بہاری میرے گھر کا خیال رکھنا تو بیٹے صاحب کو یا تم کو جو بھی ضرورت ہو ہم حاضر ہیں گلے گلے پانی۔ لے جاؤ یہ پچھتر روپیہ بھی اور قسط آتی رہے گی۔ نچنت۔"

"نہیں چچا۔ آپ کا پچھتر میں کام نہ چلے گا۔ سو تو لے چکا ہوں تین سو نہیں چار سو کی اور ضرورت ہے تو میں چالیس روپیہ مہینے کی قسط کہاں سے لاؤں گا۔ اچھا یہ ہے کہ وہ پچھتر ادا ہو جائیں رہے پینتالیس اس کو ادا کر کے پھر دیکھا جائے گا کہ آگے کیا ہو۔"

"اف اف، چھوٹی کل جگہ ہے عجب۔ تم نواب لوگ ایسے سوچنے لگے تو پھر ہم لوگوں کا بھگوان ہی حافظ ہے۔ تمہیں پانچ سو کی ضرورت ہے۔ یہ بھی کوئی رقم ہوئی۔ کہو ابھی دے دوں نکال کے۔"

"مگر ادائیگی:"

"کوئی بات نہیں۔ گھر کے مالک اب تم ہو۔ اس پر پانچ سو ابھی لے جاؤ۔ پچھتر جو کل لے گئے تھے وہ مجرا ہو جائیں گے چار سو اور لے لو۔ یہ رہن نامہ لکھ دینا۔"

مدن جی کے پاس پرونوٹ رہن نامے اور قانونی جکڑ بندی کے تمام کاغذات ہر وقت موجود اور تیار رہا کرتے تھے۔ انہوں نے صاحبزادے کے دستخط لئے اور چار سو روپیہ ہی نہیں دیئے بلکہ ان کو رکھنے کی ایک تھیلی بھی دی اور اسے صاحبزادے کی کمر سے باندھ دیا۔ اس کی خوشی کا عجیب عالم تھا۔ انہوں نے گھر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ شکرانے کی نماز ادا کی۔

(۶)

سہ پہر تک صاحبزادے نے والدہ سے دوست کے ساتھ اس کے گاؤں جانے کی اجازت بھی لے لی تھی اور کچھ دن رہنے کو بھی

کہہ دیا تھا اس لئے اب پگڈنڈی کے گاؤں پہنچ جانے کے سوا کچھ رہ ہی نہ گیا تھا۔ جب وہ جنگل میں بستر دبا کر اڈے پر آئے تو قسمت سے اسی گاؤں کی طرف جاتا ہوا ایک یکہ تیار بھی مل گیا جس نے چار آنے پر انہیں بٹھا لیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب قسمت اچھی ہو رہی ہے۔ سب اچھا ہی اچھا ہوا جا رہا ہے اور یہی سوچتے سوچتے وہ گاؤں کے ٹانڈے پر پہنچ گئے جہاں یکے والے نے انہیں اتار دیا اور جھٹ سے وہ سلیما کی ماں کے گھر پہنچ گئے۔

"آ بھی۔ تم گئے نہیں بھتیا؟" سلیما کی ماں نے انہیں دیکھ کر کہا۔

"گیا بھی اور واپس بھی آ گیا اور تمہارے لئے روپیہ بھی لے آیا۔ تم کل ہی سے سب سامان کر دو۔ میں ادھر محلے میں ٹھہروں گا۔"

"نا میں سرائے میں کاہے ٹھیرو۔ گھر ہے۔ ایک کھٹیا تنے جائے گی۔ اس پہ سونا۔"

صاحبزادے نے پھر محسوس کیا کہ ان کی قسمت بہت ہی زوروں پر تھی۔ راو نچین ہی چین لکھ رہا تھا۔ کتنی آسانی سے ساری مہم فتح ہوتی جا رہی تھی۔ پیڑھی پر بیٹھ کر انہوں نے کمر سے تھیلی کھولی اور روپیہ کی ڈھیریاں نکالنے لگے۔

سلیما کی ماں بولی: "بڑی اپاہج لڑکی ہے۔ دیکھت ہے۔ روپیہ گنے دے نا۔"

سلیما نے بڑے ناز سے ان کے ہاتھ سے تھیلی لے لی اور اس کو پوری انڈیل کر وہ اور صاحبزادے دونوں دس دس کی ڈھیریاں لگانے لگے۔ سلیما کی ماں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ باچھیں کھل کر کانوں تک پہنچی تھیں اور بار بار صاحبزادے کی بلائیں لیتی تھی۔

دس دس روپیوں کی بیس ڈھیریاں لگ گئیں۔ سلیما نے صاحبزادے سے زیادہ تیزی دکھائی۔ سلیما کی ماں نے دس دس اور دس کر لیں۔ باقی روپیہ نواب نے تھیلی میں رکھ کر اسے اپنی کمر سے باندھ لیا۔ سلیما کی ماں ایک ٹاٹ کا ٹکڑا لائی اور اس میں تین سو روپے لپیٹ کے باندھ لئے۔ گھر کے واحد کمرے میں چکی کے نیچے ایک گڑھا تھا جس کو اس نے کھود کر اور گہرا کیا اور اس میں روپیہ رکھ کر زمین برابر کی اور اس پر چکی رکھ دی گئی۔

اب وہ صاحبزادے کے قیام کے سلسلے میں کھٹیا بننے گئی۔ صاحبزادے اور سلیما اکیلے رہ گئے۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ خوش معلوم ہو رہی تھی۔ صاحبزادے کی نگاہوں میں اس کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ وہ اسے بڑی حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ سلیما کی آنکھیں جھک گئیں اور صاحبزادے کا جی چاہا کہ اسے چوم لیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس ہوا جیسے کہ ان کے اور اس کے درمیان ایک دیوار سی حائل ہے اور وہ اس دیوار کو پار کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

"آپ ہمارے لئے یہ سب روپے لے آئے۔"

"ہاں تمہارے لئے۔"

"آپ ہمیں بہت چاہتے ہیں۔"

صاحبزادے کو اس سوال کا جواب دینے میں جھجک ہوئی۔ چونک کر بولے "ارے تم نے کپڑے نہیں بدلے۔ کپڑا جو دیا تھا وہ ابھی تک نہیں سیا گیا۔"

"روپیے تو اس وقت پھاڑ لئے گئے۔ ایک کرتی میں نے سی لی ہے۔ اماں تھوڑے گھر سینے دے آئی تھیں سی کے کل دے

یہی کرتے ہیں۔ ایک سل گیا ہوگا۔ اماں آئیں تو منگواؤں"۔

اس کے لہجے کی شیرینی اور اس کے انداز کے بھولے پن میں صاحبزادے محو ہو گئے۔ اس کی باتوں کا کیف ہی ان کے لئے کافی تھا اور آگے بڑھنے کی کوئی ضرورت نہ محسوس ہوئی۔

سلیما کی ماں ایک مزدور کے سر پہ کھٹیا لدوائے ہوئے اور بغل میں پاجامہ دبائے ہوئے آئی۔ پاجامہ سلیما پہ پھینکتی ہوئی بولی "لے جا نہا کر کپڑے بدل" اور ایک کنارے مزدور سے کھٹیا بچھوا کر اس پر صاحبزادے کا بستر بچھا دیا اور بولی "میاں تم تھک گئے ہو گے کل گئے اور آج آئے۔ آرام کرو۔ میں اب کھانے کا سوچتا کروں"۔

صاحبزادے کھٹیا پر لیٹ گئے۔ انھیں اپنی قسمت پہ خود رشک آ رہا تھا۔ ہر کام کتنی آسانی سے ہو گیا تھا اور اب سلیما بالکل ان کی تھی جس وقت چاہیں ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیں۔ مگر انھیں شک تھا کہ وہ ہاتھ بڑھا بھی سکیں گے۔ کیوں نہیں؟ جھجک کا ہے کی؟ مگر جھجک تھی ضرور۔ دیکھیں یہ کیسے جاتی ہے؟

وہ اسی خیال میں تھے کہ سلیما اجلے کپڑے پہنے سر میں کنگھی کئے۔ آنکھوں میں کاجل لگائے اس کے سامنے آئی۔ دو چار دفعہ پہلے بھی وہ جب ان کے گھر میں تھی اس انداز میں سامنے آ چکی تھی اور بہت ہی بھلی معلوم ہو چکی تھی مگر ان موقعوں پر اس کی طرف بڑھنے میں بڑے رخنے تھے اس لئے صاحبزادے دیکھ دیکھ کر اور ترس ترس کر رہ گئے تھے۔ اس وقت میدان صاف تھا۔ اس کی ماں کے آ جانے کا ڈر تھا مگر یہ بھی یقین تھا کہ وہ کچھ نہ کہے گی۔ اس کے علاوہ ان کا ڈر کچھ نہ کچھ نکل بھی چکا تھا۔ ان کے دل پر ایک لہر دوڑی اور انہوں نے ارادہ کیا کہ ایکدم سے اٹھ کر سلیما کو لپٹا لیں۔ مگر محسوس ہوا کہ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے اور وہ محویت سے دیکھتے ہی رہے۔ سلیما کئی دفعہ ادھر ادھر آتی ہوئی اندر آئی اور گئی۔ پھر ان کے پلنگ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ان سے بہت قریب تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پلنگ پر گر جانا چاہتی تھی مگر اشارے کی منتظر تھی۔ صاحبزادے اشارہ بھی نہ کر سکے تو اس نے اپنے تئیں دھڑ سے ان کے پلنگ پر گرا دیا۔ انھیں اپنی قسمت پر اور بھی زیادہ خوش ہونے کا موقع ملا۔ ان میں اور عورتوں کو پکڑ لینے کی ہمت نہ تھی تو کیا قسمت ہر عورت کو اور اس کو جسے وہ سب سے زیادہ چاہتے تھے ان پر ٹپکا رہی تھی۔ حقیقت میں [illegible] رہے تھے۔ اب کیا وہ اتنے گئے گزرے تھے کہ منہ پھیلا کر حلق سے اتار نہ لیتے۔

مگر ان کا منہ بھی چھپنے پایا تھا کہ سلیما کی ماں آ گئی اور بولی میں سکھرا سے کہہ آئی۔ "میں صباح سے آ کر شام تک دوکان بنا دے گا اور ادھر ایک چھپر بھی پڑ جائے گا۔ آپ کے لئے یہاں۔ آپ الگ آرام سے رہیں جب آئیں۔"

شام قریب تھی۔ صاحبزادے کا پلنگ انگنائی میں بچھا دیا گیا اور اس پہ بستر کر دیا گیا۔ وہ اس پر لیٹ گئے۔ مکان کا صحن بہت کشادہ تھا۔ دیواریں کچی تھیں اور زیادہ اونچی نہ تھیں۔ ایک دیوار سے لگا ہوا ایک نیم کا درخت تھا جس کی پتیوں پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ یہ پتیاں عجیب طرح چمکتیں اور صاحبزادے ان کی چمک سے خوش ہو جاتے۔ ایک نگاہ موڑ کر سلیما کو بھی دیکھ لیتے جو کام میں مصروف ہو گئی تھی اور پھر ان پتیوں کو دیکھنے لگتے۔

اندھیرا چھا گیا تو سلیما نے دیوار پر رکھا ہوا ٹین کا چراغ جلایا اور ایک اسٹول پر صاحبزادے کے پلنگ کے پاس رکھ کر کھانا رکھا۔ یہ سرائے کے کھانے سے زیادہ بہتر تھا۔ وہ کھانا کھا چکے تو ماں بیٹی کھانا کھاتی رہیں اور نہ معلوم کیا کیا باتیں۔ رات بہت کافی ہو۔

چلی تھی جلد چراغ بجھ گیا۔ سیمیا کی ماں نے آنگن میں ایک طرف کو، صاحبزادے کے پلنگ سے کوئی دس قدم دور اپنی کھٹیا ڈالی اور اس پر دری بچھائی اور تکیہ رکھا۔ ماں پہلے اس پر لیٹ گئی۔ پھر بیٹی بھی اس کے پاس آکر پڑ گئی۔ صاحبزادے سوچ رہے تھے کہ ماں سو جائے گی تو بیٹی کو متوجہ کرنے کی کوشش کرنا ہوگی اور انھیں شک تھا کہ وہ یہ کوشش کر بھی سکیں گے کہ انھیں ماں کی آواز سنائی دی۔ "اری سونے والی۔ میاں اتنی دور گئے اور تھکے تھک گئے ہوں گے۔ جا پاؤں داب دے۔"

ایک دم میں سیمیا ان کے پاس آئی اور پائنتی بیٹھ کر پاؤں دابنے لگی۔ پھر لڈو ان کے منہ میں آکر گرا۔ منہ چلانے کے درجے سے وہ گزر چکے تھے۔ اب نگل جانے میں کیا تامل تھا۔

(۷)

"سیمیا کی ماں کے دن پھر گئے۔" "منہ مانگی مراد مل گئی۔" "بڑی قسمت والی ہے۔" "سب سے زیادہ مالدار وہی ہے ہمارے گاؤں میں۔" "دولہا میں جتنا سامان ہے کسی نے کبھی دیکھا نہیں۔" گاؤں بھر میں اس قسم کے چرچے عام ہو گئے۔ تمن کو سب سے زیادہ جلن ہو رہی تھی۔ وہ بولا "ہم نے سوچا تھا کہ ستو اور یہ جو میاں سے کر رہے تھے وہ ان کو ٹھہرا لیں گے۔ مگر وہ بھی نہ ہوا۔ یہ ہم نے دو دو جگہ جھونپڑی میں ایک بیٹھک اور ایک نشیمن ان میں سے کوئی کام نہ آئی۔ کوئی نہ پھانس سکی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ستریا ہی ان سے آگے نکل گئی مگر سیمیا کہاں سے نکل آئی۔ معلوم ہوتا ہے آسمان سے ٹپک پڑی۔ ناک نقشے میں میری والیوں سے کسی طرح اچھی نہیں ہے۔ ہاں جوان چشمہ ہے۔ جوانی چڑھتی پڑتی ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔"

وہ یہ کہتا رہا اور اس کی دونوں بیویاں اپنا اپنا کام کرتی رہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھیں۔ ایک دم سے ستریا بولی "اور یہ تو دیکھو وہ صاحبزادے گھر سے باہر نہیں آتے۔ دن رات سیمیا میں گم ہیں۔"

"تین چار دن کے بعد اس کے گھر سے نکل کر اوٹ پر آتے ہیں تب بیٹھ کر لکھنؤ چلے جاتے ہیں۔ پھر دو چار دن کے بعد آتے ہیں اور سیدھے اس کے گھر میں چلے جاتے ہیں۔ باہر نکلتے ہی نہیں۔ جب تک گاؤں میں رہتے ہیں۔" تمن بولا۔

"یہاں اس گاؤں میں نکل کر دیکھیں ہی کیا۔" زری بولی۔

"آج کل نئے رہتے ہیں۔ اب کی آنے دو تو میں دکھاتا ہوں کیا چیز ہے دیکھنے کی۔"

"کیا دکھاؤ گے؟"

"ستریا کو دکھاؤں گا۔"

"اس میں اب کیا رکھا ہے بری طرح استعمال ہوئی ہے ڈھل گئی۔"

"تم کیا سمجھتی ہو تم اپنی نظر سے دیکھتی ہو۔ مرد کی نظر اور ہی ہوتی ہے۔ سیمیا سے دل ضرور بھر سے گا۔ بھرنے کا ہو گا اور پھر اور اور باتیں بھی تو ہیں۔ خیر اب کی آنے دو دیکھا جی کر۔"

چنانچہ اب کی جو صاحبزادے یکے پر سے اتر کر سیمیا کی ماں کے گھر چلے تو سامنے تمن کو دیکھا۔ وہ بولا "آداب عرض ہے میاں۔ اف اف۔ ہم کو تو بھول ہی گئے۔ اگر ہم گھر نہ بلاتے تو آپ کیسے پہنچتے۔ آپ نے وہ شکل کر دی پہلے تھے ہم کا گنا ج کا اب بھی بن

۔ میاں بیوی مل بیٹھے اور ہم کو مارا۔ پتوا۔ آپ بڑے بھولے آدمی ہیں۔ ذرا دیکھ بھال کر چلئے۔ دیکھئے آپ کے پیٹھ پیچھے کیا ہوتا ہے۔"

"کیا ہوتا ہے؟" صاحبزادے نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا ہوتا ہے۔ آیئے آپ کو سنوا دوں۔ ایک قدم ذرا ادھر ہو لیجئے پھر جایئے اس کے گھر۔"

وہ انہیں ایک گھر پر لے گیا جہاں ایک بڑی نازک سی لڑکی سجی بنی بڑی بوڑھی میں ادائیں بناتی ہوئی آئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل پھیلا ہوا تھا اور ترچھی نگاہ اور بھی ظلم کر رہی تھی۔ بیٹھنے اور کھڑے ہونے کے انداز میں بھی خاص فن تھا۔ کمر کی لچک عجیب قیامت تھی۔ صاحبزادے کے دل پر عجیب قسم کا وار ہوا۔ وہ بڑی ہی سریلی آواز میں بولی: "کہو حضرت بھٹکا کیسے آئے؟"

"میں اپنی زبان سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ تم ہی میاں کو بتا دو کہ اس سلیمہ کی ماں سے کیا کوتک ہیں۔"

ثریا نے بڑے انداز سے گردن پھیری آنکھیں مٹکائیں اور بولی: "مجھے کیا پڑی کہ کسی کے احوال کھولوں جس کا جی چاہے آپ دیکھ لے کوئی چھپی بات ہے۔ وہ گھسنا اب تو وہاں پڑا ہی بیٹھنے لگا ہے۔"

"آخر کچھ بتاؤ تو۔ میاں بڑے شریف۔ باپ۔ بھولے آدمی ہیں۔ جھوم سے بھولے پن میں پلے ہوئے۔ آخر کچھ تو بتا ہی دو۔"

ثریا نے گردن مٹکائی۔ صاحبزادے کو نظر بھر دیکھا اور بڑے انداز سے آنکھیں بھپکا کر بولی: "خدا نے آنکھیں دی ہیں خود نہ دیکھ لیں۔ ابھی جا کر دیکھ لیں۔ کیا ہو رہا ہوگا۔ سلیمہ کی ماں نے اس لفنگے کو بٹھا رکھا ہے۔ جا کر دیکھ لے جس کا جی چاہے کہ ماں بیٹی دونوں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔"

ثریا نے اس سے زیادہ اور کچھ بتانے سے انکار کیا۔ پھر دونوں ہاتھ سر کے اوپر اٹھا کر انگڑائی لی جس نے صاحبزادے کو بڑے تعجب سے دیکھتے [illegible] اس کی چھینٹ کی تنگ کمر اور کرتی میں جوبنوں کا نہایت [illegible] ابھار دکھائی دیا۔ عورت ان کے لئے ایک نیا تجربہ تھی۔ وہ اس کے پاس سے اٹھے تو اس کی صورت ان کی آنکھوں کے سامنے تھی لیکن ان سے الگ ہو گیا اور وہ سلیمہ کی ماں کے گھر پہنچے۔ دیکھا کہ لفنگے وہاں پر بیٹھا ہے۔ عجیب بے [illegible] ہونا جس سے آمنی ملزم ہوتا ہوا۔ ثریا کو دیکھنے کے بعد اس کی شکل صاحبزادے کو اور بھی بے ڈھنگی معلوم ہوئی اور پھر یہ سمجھ کر کہ سلیمہ تو اب کی نسبت میں اس سے تعلق نہ [illegible] رقابت کا جذبہ اس کے دل میں ابھرا۔ لفنگے نے جھک کر ان کو سلام کیا اور وہ سر ہلا کر جواب دیتے ہوئے بات کے [illegible] ہوئے کچھ زیادہ تیزی سے گھر کے اندر گئے۔ سلیمہ کھلتی ہوئی سامنے آئی تو انہیں آنکھیں ایسی [illegible] کرتی تھی۔ ثریا کی صورت ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ [illegible] اور اس کے مقابلے میں سلیمہ کی صورت بڑی بھدی بڑی سیدھی اور بے کیف نظر آئی۔ سلیمہ نے بھی محسوس کیا کہ صاحبزادے کی اب وہ توجہ نہیں رہی اور اس پر وہ افسردہ ہو گئی۔ صاحبزادے کو اس افسردگی پر شبہ ہوا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ دونوں میں سے کسی نے کچھ کہا نہیں مگر اس دن صاحبزادے سب کو ہی شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ لفنگے ان کی خدمت کرتا۔ [illegible] خاطر کمان بڑھتا گیا۔ رات کے اندھیرے میں انہوں نے سلیمہ کو ثریا تصور کرنے کی کوشش کی مگر کچھ بات نہ بنی۔ صبح کو خیال ہوا کہ ثریا کو جا کر چھیڑ دیکھیں۔ وہ عجیب تذبذب کے عالم میں تھے۔ پاؤں [illegible] نہ جانے رکتی۔ آخر کو باہر آنے کے بجائے وہ پلنگ پر پڑ گئے اور چادر سے منہ لپیٹ لیا۔

سلیمہ کی ماں پاس آئی اور کہنے لگی: "کیا میاں کچھ طبیعت خراب ہے۔" اور ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولی: "کچھ بھی نہیں سب

ٹھیک ہے۔ ٹھنڈائی بناؤں؟"

"نہیں سب ٹھیک ہے۔ میں آج ہی گھر چلا جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد گھر سے مل کر پیسے کے اڈے کی طرف چلے تو خیال ہوا کہ جمن سے بھی ملتے جائیں اور سرائے میں آئے۔ یہاں معلوم ہوا کہ جمن کی گاڑی کے ٹکر لگی اور وہ اسے لے کر شہر اسپتال میں داخل کرنے گیا ہے۔ ساؤکی نے کہا: "وہ ایک ہی دن میں واپس ہو رہے ہیں۔ بات کیا ہوئی؟"

"کچھ نہیں۔ اب یہاں کبھی نہ آؤں گا۔"

"آخر ہوا کیا۔ تم بھی تو نہیں۔"

"تم کیا جانو۔ تمہارا میاں ہی جانتا ہے" اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ اور وہ سٹر پٹا۔ اس نے کچھ کہا نہیں مگر سب کچھ کہہ گئی۔

"اچھا تو ستا پاکا جادو چل گیا۔ وہ مشل کر لیں اور بچہ جنے گی۔ تو بات کیا ہے۔ اگر نسیما کی ماں کے یہاں نہیں تو یہاں سہی۔"

صاحبزادے خاموش رہے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اب پیسے کرانے جیسے روپے تھے لے کر آیا کرتے تھے اور اب ان کی رہ میں صرف اتنے دام تھے کہ گھر واپس ہو جائیں۔

ساؤنی نے کہی بلکہ "آخر کیا ہے۔ آخر ہے کیا؟" کہنے پر وہ بولے "روپیہ پاس نہیں رہا۔"

اس پر ساؤنی بھی خاموش ہو گئی اور وہ اٹھ کر چلے تو سیدھے بیٹھ کر گھر پہنچ گئے۔

(۸)

گھر پہنچ کر صاحبزادے نے ٹھنڈائی گھلوائی، کپڑے بدلے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی والدہ کو خبر ہوئی کہ وہ کس عالم میں ہیں تو وہ ان کے پلنگ کے سرہانے والے حصے پر بیٹھیں اور اپنا ہاتھ ماتھے پہ رکھ کر بولیں "اف کس قدر جل رہا ہے۔" اور ان کی ماں نے بھی اسی طرح ہاتھ رکھ کر کہا: "ٹھیک تو ہے بیوی۔" دونوں نے ایک دوسری کو یقین دلایا کہ صاحبزادے کو بخار آ گیا ہے اور ان کے لئے فوراً حکیم صاحب کو بلایا جائے۔ ماما فوراً دوڑی گئی اور حکیم صاحب کو بلا لائی۔ اسی دوران میں والدہ صاحبہ پڑھ پڑھ کے پھونکتی رہیں۔ حکیم صاحب نے آ کر نبض دیکھی تو بولے "ہاں ہے مگر کوئی پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ آپ کبھی میں مار۔ ہاں حرارت ہے۔ بلکہ نزلہ۔ ادھر دیہاتوں میں تنے جانے میں شکار کا۔ یہ پانی بدلتا ہے۔ ہوا بدلی ہے۔ خیر۔ خیر ماما جی آپ میرے ساتھ چلیں۔ دوا دے دیں۔ انشاء اللہ شام تک افاقہ ہو جائے گا۔ ہاں ماما جی چلئے۔ ہاں۔ ایک پانچ روپے بھی چلئے۔"

حکیم صاحب کے یہاں سے دوا آئی اور انہیں پلائی گئی۔ محلہ میں خبر ہو گئی۔ عزیز و اقارب آ گئے۔ ٹوٹکے۔ صدقہ۔ عمل سب ہی کچھ ہوتے رہے۔ پنڈت جی نے آ کر پوتھی دیکھی اور سات دن نحس بتائے۔ انہوں نے ورتی کو بھی خبر کر دی اور لالہ جی اس گھر سے محبت نے جوش کھایا۔ انہوں نے کالی دیوی کا اتارا اپنی مہری کے ہاتھ بھیجا اور اس سے اتارا کرتے ہی کہا۔ بس ہو گیا بخار۔ لالہ صاحب خود ولدہ ہوئے اور صاحبزادے کو دیکھنے کے بعد ڈیوڑھی میں تخت پر بیٹھ گئے اور بیگم صاحب سے مشورہ کرنے

کے لئے آڑے میں بلوایا۔ جب ماما نے بتایا کہ بیگم صاحب آگئیں تو لالہ جی گویا ہوئے "حضور مجھے اس گھر کا بڑا خیال ہے اور نواب مرحوم کی وصیت تھی کہ گھر کا خیال رکھنا۔ اس لئے صاحبزادے کا میں ہر طرح خیال کرتا رہا۔ آپ کو یاد ہوگا ان کے اسکول کے اخراجات دینے میں کبھی کوتاہی نہیں ہونے دی اور پھر آپ کو جب بھی ضرورت ہوئی۔ خیر یہ سب جانے دیجیے۔ ان صاحبزادے نے عجیب حرکت کی ہے جو مجھی کو معلوم ہے۔ ادھر ایک گاؤں ہے وہاں ایک نہیں کئی کئی عورتوں کے پاس جاتے ہیں۔ سب مرد والی عورتیں۔ جوان لڑکوں کو پھانستی ہیں اور مرد شوہر بن کر لوٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ آگے حضور نہ کہلوائیں وہ لوگ بڑے حرامی ہیں۔ ایک بھٹیارا ہے جمن نام کا، یہاں روٹی دھکلنے آتا ہے۔ دو عورتیں ہیں اس نے پھانسا ہے۔ ایک عورت ہے اس کے یہاں جا کر ہفتوں رہتے ہیں اور اس کے سلسلہ میں پانچ سو کے قرضدار بھی ہو گئے ہیں۔ اب سنا ایک اور ہے جو مدِ نظر ہے۔ خیر یہ سب دوڑ۔ محلکے۔ قرقی وغیرہ کی نوبت لانے والے ہیں۔ اب اس وقت بھی نہ بچاؤں تو کون بچائے۔ مجھے نواب صاحب مرحوم کی وصیت یاد آتی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوگا لالہ۔"

"پانچ سو روپیہ تو فوراً دینا پڑے گا۔ وہ میں دے دوں گا۔ کہہ دیا ہے کہ صاحبزادے کی طبیعت ناساز ہے اور میں ضامن ہوں۔ مگر حضور اس لیپا پوتی سے تو کام نہیں چلے گا۔ کوئی مستقل صورت ہونا چاہیے۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ لالہ۔ تم نواب مرحوم کے بھی مشیر تھے۔ اور میں عورت ذات کیا جانوں۔"

"سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اب صاحبزادے کی شادی ہو جائے۔ پڑھنا لکھنا تو آپ بالائے طاق رکھ دیجیے۔ یہ فیس ویس برباد ہو رہی ہے۔ اسکول کا بہانہ کر کے اس گاؤں پہنچتے ہیں اور وہاں کے لوگ بڑے حرامی۔ ایک ایک اپنا الّو سیدھا کرتا ہے۔ یوں تو آپ نے کہیں نسبت لگائی ہے تو جلد کر دی جائے۔"

"نسبت تو کہیں نہیں۔ مگر شادی کرتی ہے مجھے رچا دیکھ آخر روپیہ کہاں سے آئے گا۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں اور اگر کہیں نہ لگی ہو تو میں اس کا بھی انتظام کر دوں۔"

"تو تمہاری نظر میں کوئی ہے؟"

"نواب بدھن صاحب کی لڑکی ماشاءاللہ آپ کے ایک جدی ہیں۔ سب حالات معلوم۔ لڑکی اب جوان ہو چلی ہے۔ ماشاءاللہ کیا صورت پائی ہے میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔"

"مگر وہ کا ہے کو کریں گے۔"

"یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں ان کو راضی کر لوں گا۔ خرچہ کی ان کو بھی فکر ہے۔ اس کا انتظام بھی میں کر دوں گا۔ آپ دونوں مسلمان کرا دینا لکھا لیں۔ آپ کا بھی ایک یہ بڑا خدا کا دیا اور ان کے بھی ایک لڑکی۔ میں سب انتظام کر دوں گا۔"

لالہ جی چلے گئے۔ کچھ دنوں میں سب معاملات طے ہو گئے۔ لالہ جی سے بدھن صاحب نے اپنے مکان پر پانچ ہزار قرض لے لیا۔ [illegible] صاحبزادے کے دل پر [illegible] قرض یہ ہوئی۔ صاحب کو تین ہزار بتایا گیا کیونکہ صاحبزادے کے لیے بھی پانچ سو جوڑ لئے گئے اور بیگم صاحب سے چھپ گئے۔ دونوں کی خرچ کے بعد لالہ جی نے دل بہلانے کے لئے کہا۔

"شاید یہ تمہیں کچھ پتہ ہو تو وہ یہاں شادی میں جب بھی اور جس وقت بھی ضرورت ہو فوراً منگا لیجئے گا۔"

صاحبزادے کو ثریا کے مشورے میں جو طلسم ہو گیا تھا وہ شادی کے خواب نے غلط کر دیا۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی نظر آتی۔ گاؤں بھر اچھا اور سیلما کی ماں بھی خوش ہوئی اور فوراً سیلما کا نکاح گھسیٹے کے ساتھ کر دیا۔ صاحبزادے کو یہ خبر ملی تو وہ بھی خوش ہوئے مگر سب سے زیادہ خوش لالہ جی تھے جن کو دو تین بیگہ کی قیمت کا ایک لاکھ تو ضرور ہو گی آٹھ ساڑھے آٹھ ہزار میں مل گئے۔ "ہاں مل ہی جائیں گے دو چار برس میں۔ سود در سود اچھا ڈگری۔ کچہری ... گھسیٹے کے پڑیں گے۔ کیا بڑے ہیں۔"

ہم نے یہ بات ثریا کو لالہ جی کی نقل بناتے ہوئے سنائی۔ لالہ جی کی مرہون منت وہ بھی تھی بولی۔ "اچھا یہ بات اس بنئے کی۔ بڑا حرامی ہوتا ہے۔"

"ہاں ہم لوگوں کو بڑے حرامی کہتا ہے۔ سب سے کہتا ہے کہ بڑے حرامی ہیں اس گاؤں والے۔ مگر سب سے بڑے حرامی تو وہ خود ہیں۔"

(۹)

پانچ برس گزرنے کے بعد صاحبزادے کے حادثے کا حال یہ تھا کہ وہ گاؤں جس سے ان کی عملی زندگی یعنی شکر کی مل کھلنے کی وجہ سے بالکل بدل گیا تھا۔ تین اور اس کی دونوں بیویاں مل میں کام کرنے لگی تھیں اور ان کی سرزاد وجود بھی نہ رہا تھا۔ اب ان کے پاس تین الگ الگ نوکر تھے اور دونوں نے بچپن سے طلاق لے لی تھی۔ لوری ایک جمعدار سے ... جو پنجاب کی طرف سے آ کر یہاں ملازم ہوا تھا ... سے جو بیٹی ... بیٹا کو ایک شخص شہر لے گیا تھا اور اس کے گھر پر وہ مرکز تھی۔ صاحبزادے کو اس کا خیال آتا تو دل میں یہ بھی کہتے: "اللہ نے بہت بچایا۔ مجھے نہیں آج میرا بھی کیا حال ہوتا۔" اکثر وہ یہ سوچ کر کر دو کیسی ... بیماری سے بچے سجدۂ شکر میں گر جاتے۔ وہ سارے حادثات یاد رہتے۔ اپنے دل کی تڑپ جیسے کا نہ ہوا۔ لالہ جی کا قرض، بنیا اور شادی ہو جانا۔ اگر اس دن لالہ رو دیتے ... سے دیتے تو فوراً بھاگ کر ثریا کے پاس جاتا اور مجھے بھی لگ جاتی بیماری۔ دل میں یہ کہہ کر وہ لرزتے اور پھر سیلما کا خیال کرنے لگتے۔ سیلما کا نکاح گھسیٹے سے ہو گیا تھا مگر صاحبزادے کی آمد و رفت پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ اس کی ماں نے صاف کہہ دیا تھا: "تم نے تو ہم کو مول لے لیا ہے۔ تمہارے راستے میں کون آ سکتا ہے۔" اور پھر انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ گھسیٹے تو بس ان کے بچوں کا قانونی باپ بننے کے لئے ضروری تھا۔ سیلما کے تین بچے ہو چکے تھے جن کے بابت گاؤں کی رائے تھی: "نہ معلوم کس کس کے ہیں۔" مگر سیلما اور اس کی ماں صاحبزادے کو یقین دلاتی تھیں کہ سرکار ہی گھسیٹے کے ہیں مگر اصل میں میاں کے۔ یوں تو صاحبزادے میر کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا — تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

اور عمل میں تبرکے اس مصرع سے کہیں آگے نکل جاتے تھے یعنی دیکھ لیا دل شاد کیا خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔ مگر سیلما ان کی پہلی محبت تھی اور اس کا نقش دل سے مٹنا ناممکن تھا۔ انہیں اس پر غالب کا یہ شعر یاد آتا۔

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال — ہے مجھے گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اس کے محل کا یہ عالم تھا کہ دادا کا انتقال ہو چکا تھا اور اب وہ پورے محل اور سارے وثیقہ پر بلا شرکتِ غیرے و مزاحمت دیگرے قابض اور مستند تھے۔ مگر اس محل پر لالہ جی کا قرضہ سود در سود سے نہ معلوم کس طرح قریب بیس ہزار ہو گیا تھا۔ لالہ نے ان کے اور ان کی بیوی اور تین بچوں کے رہنے کے لئے قدیم شہ نشین اور اس کے سامنے تھوڑی سی انگنائی وغیرہ الگ کر کے باقی سب پر قبضہ کر لیا تھا اور رہائش کے مکانات بنوا دیئے تھے۔ لالہ کو زیادہ تر لوگ بڑا حرامی کہتے تھے مگر صاحبزادے اور ان کی بیگم دونوں ان کا احسان مانتے تھے۔ آخر سرکاری ڈگری سے تو پورا محل لالہ کو ملا ہی تھا مگر یہ ان کی عنایت نہ تھی تو کیا تھا کہ انہوں نے بزرگوں کی یادگار والا حصہ نہیں لیا۔ اس کو الگ کرنے کی دیوار بھی خود بنوائی اور اس کو ایک مستقل الگ گھر کر دیا۔ جمن نے کہا تھا: "آپ میاں سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ سالہ بنیا۔ نوٹا بھی تو بہت ہے۔ آپ کے باپ دادا اور آپ کی بیگم کے باپ دادا کی ساری جائداد ہضم کر گیا ہے۔ ڈرتا ہے کہ اگر ان جگہوں پر بھی قبضہ کرے گا جہاں ان کا انتقال ہوا تو ان کی روحیں اس کا گلا دبائیں گی۔ سالہ ہندو ہے نا۔ ڈرتا ہے بھوتوں سے میں کیا کہوں۔" مگر میاں نے اس پر جواب دیا تھا: "کچھ بھی ہو ہمارے تو رہنے کا ٹھکانا بھی نہ ہوتا اگر وہ نہ دیتا۔ اور اب بھی یہ سب ہے اسی کا جس دن چاہے نکال دے۔"

صاحبزادے کی بیگم نہایت بھولی بھالی نیک مزاج لڑکی تھی جس کے ساتھ ایک ماما اور اس کی لڑکی بھی آئی تھیں۔ یہ ماں بیٹیاں گھر کا سب کام دیکھتیں۔ بیگم کو انگلی ہلانے کی ضرورت نہ پڑتی اور وہ پلنگ پر بیٹھی پان کھاتی بیٹھی ہوئی سوتی نظر آتیں۔ انھیں اپنے میاں کے سینما سے تعلق کا حال معلوم ہوا تھا تو وہ بولی تھیں "یہ کون نئی بات ہے۔ مردوں کا شیوہ یہی ہے۔" ماما کی لڑکی بھی ان کے میاں سے کھیلا کرتی اور انھیں بالکل برا نہ لگتا۔ ان کا خود کا وثیقہ کوئی چالیس روپیہ کا تھا اور صاحبزادے کے روپے مل کر بڑی وافر آمدنی ہو جاتی تھی۔ صاحبزادے کا کام سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ صبح آٹھ دس بجے تک سو کر اٹھیں۔ ان کی بیگم بھی دیر کر کے اٹھتی تھیں۔ ناشتہ اور کھانا ایک ہی ہو لیا تھا۔ گیارہ بجے ہو جاتا اور اس کے بعد قیلولہ ہوتا اور صاحبزادے جناب نواب کہلاتے تھے سردیوں میں ذرا جلدی اور گرمیوں میں دیر کر کے گھر سے باہر آتے۔ دوستوں سے ملنا۔ ادھر ادھر گھومنا کبھی سلیمان کے یہاں گاؤں چلے جانا کبھی کسی اور عورت سے دل بہلانا۔ سینما ایک تفریح کی نئی چیز بہت ہی عام ہو چلی تھی اور ان کو بھی اس سے بہت دلچسپی ہو گئی تھی۔ کچھ ذاتی دلچسپی کچھ دوستوں کے اشعار کی وجہ سے۔ اگر مرد دوست ساتھ ہوتے تو پہلا شو دیکھ کر اور اگر کوئی عورت ساتھ ہوتی تو دوسرا شو دیکھ کر ایک یا دو بجے رات کو گھر واپس آتے۔ دروازہ ماما کی لڑکی کھولا کرتی۔ گھر کے سب لوگ بے خبر سوتے ہوتے۔ یہ لڑکی ان عورتوں کے مقابلے میں جن کے ساتھ وہ تفریح کر کے آتے ہوتے بڑی زیادہ قدرتی معلوم ہوتی حالانکہ اس کا منہ بہت بری طرح کھردرا تھا اور جسم بالکل بھدیا کا سا تھا۔ عموماً اس لڑکی کا تجربہ ان کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کر دیتا جو بازاری عورتوں کے بنے ٹھنے روپ اور بناوٹی توجہ سے پژمردہ ہو چکی ہوتی۔ یہ ہوتا آرام کرنے سے پہلے اس لڑکی کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھا لیا جاتا اور عموماً وہ پیر دابتی ہوتی اور یہ سو جاتے تو وہ بھی آ کر اپنی کھٹیا پر پڑ رہتی۔ اس طرح دن بھر کا دھندا ختم ہو جاتا اور دوسرے دن پھر یہی کچھ معمول اور رد و بدل کے ساتھ چلتا۔

مگر اس یکساں زندگی میں ایک عجیب تبدیلی آئی۔ ہوا یہ کہ ایک ڈاکٹر تھے ان کے گھر والوں سے جو صاحبزادے کے محل کی زمین چھوڑ دی تھی ایک گھر کرایہ پر لیا۔ اس میں مطب۔ ڈسپنسری وغیرہ نیچے کے حصہ میں سڑک کے قریب تو ان کی اور اوپر کے

حصہ میں خود معہ اپنے چند دوستوں کے رہنے لگیں۔ صاحبزادے کی بیگم کو کچھ نسوانی تکلیف ہوئی اور وہ انھیں ڈاکٹرنی کو دکھانے کے لئے لے گئے۔ ڈاکٹرنی کے ایک ساتھی نعیم صاحب سے صاحبزادے کی ملاقات ہو گئی۔ نعیم صاحب خاص قسم کے پھٹے سے کھدر کے بھینے اور ملگجے کا پاجامہ اور کرتہ پہنے ہوئے ہر وقت شاعری میں گم رہنے والے انسان نظر آئے۔ صاحبزادے سے ان کو بڑا گہرا لگاؤ ہو گیا۔ اب کیا تھا! تو صاحبزادے ان کے پاس چلے جاتے یا وہ خود صاحبزادے کے یہاں ڈیوڑھی میں آ کر ٹوٹی کرسی پر بیٹھ جاتے اور بڑی طویل باتیں کیا کرتے۔ صاحبزادے ان کی باتوں کو بڑے تعجب سے سنتے۔ ان کی بابت کہا جاتا تھا "نعیم۔ ارے وہ بہت بڑا آدمی ہے۔" مگر صاحبزادے "بڑے آدمی" کے معنے بڑا مالدار آدمی جیسے لالہ جی یا تعلقہ داران اودھ سمجھا کرتے تھے۔ نعیم کو بڑا ہی نہیں بلکہ بہت بڑا کہتے ہوئے سن کر انھیں پہلے تو تعجب ہوا مگر بعد میں انھیں محسوس ہوا کہ آدمی کی اصل بڑائی کیا ہوتی ہے۔ نعیم کو ہر کام میں بڑا انہماک تھا۔ پہلے وہ کانگریس میں تھے اور بڑے تیز اور جوشیلے کارکن کہے جاتے تھے۔ اب کمیونسٹ ہو گئے تھے اور اس سلسلے میں بھی ان کے انہماک پر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ صاحبزادے پر بھی اس انہماک کا بڑا رعب پڑا اور ان کی سمجھ میں آیا کہ اصل بڑائی یہی ہے۔ نعیم صاحب نے ان کو بہت سی باتیں سمجھائیں جن میں ایک یہ تھی کہ "لالہ جی بڑے حرامی ہیں۔ یہ خون چوستے ہیں۔ آپ کا خون سارا چوس لیا۔ یہ سب جائداد آپ کی ہوتی۔ اس نے چند ہزار روپیہ میں اپنی کر لی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ پارٹی کی کامیابی پر سب چھین لی جائے گی۔" یہ سن کر صاحبزادے کو امید ہوئی کہ یہ سب انھیں مل جائے گا اور اس لئے انھیں کمیونسٹ پارٹی بہت ہی پسند آئی اور وہ اس کے ہمدرد ہو گئے۔ پھر انہوں نے کہا کہ "یہ شادی بیاہ کے پرانے طریقے غلط ہیں۔ مرد اور عورت دونوں کو آزاد ہونا چاہئے۔" اور اب صاحبزادے کی سمجھ میں آیا کہ وہ جو کچھ بھی دوسری عورتوں کے ساتھ کرتے رہے تھے اور جس کو بہرحال گناہ ہی مانتے رہتے تھے وہ سب جائز ہی نہیں بلکہ بڑا ترقی پسند عمل تھا اور خاص طور پر اسی وجہ سے بھی کہ ان کی زیادہ تر معشوقائیں غریب اور پست طبقہ کی تھیں جن کو ترقی دینا نعیم صاحب سب سے اہم انسانی فرض بتاتے تھے۔ تیسری بات جو صاحبزادے کے سامنے نعیم صاحب کے توسط سے آئی وہ یہ تھی کہ اس حصہ میں جو ڈاکٹرنی نے نعیم صاحب کو دے دیا تھا بہت سی پڑھی لکھی وضعدار لڑکیاں نظر آئیں جو بڑی جلدی ان سے بے تکلف ہو گئی تھیں۔ اور جن کی تفریحات میں وہ شریک ہو کر اپنے کو ایک نئی جنت میں آ گیا ہوا تصور کرتے تھے۔

نعیم صاحب سے انہوں نے بیگم کا پردہ توڑ دیا تھا اور نعیم صاحب کی دوست لڑکیاں بھی بیگم کے پاس آنے لگی تھیں۔ انہوں نے بیگم کو بھی بہت کچھ بدلنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے بیگم سے کہا تھا: "ہم لوگ کمیونسٹ ہیں۔" بیگم اس لفظ کو "کمینسٹ" کہا کرتی تھیں اور ایک دن اپنی ایک رشتے کی بہن سے اس کی بابت باتیں کرنے لگیں۔

"اے بہن۔ یہ کمینسٹ لوگ تو بہت اچھے ہیں۔ آپ کے بہنوئی کہتے ہیں کہ لالہ کی سب جائداد ہمیں دلا دیں گے آخر ہماری زمین پہ ہے اور ہمارا ہی محل تھا سارا کا سارا۔"

"اے ہٹو بھی"، بہن نے جواب دیا "تم بھی کن کے دھوکے میں آئی ہو۔ تمہارے بہنوئی بھی ان پھیروں میں آ گئے تھے۔ یہ کمینے۔ کمین ہیں۔ کنبہ پرست۔ دلچسپی نہیں۔ سب کمینوں ہی کو جمع کرتے ہیں۔ ان ہی کے طرفدار ہیں پھر کیا ترقی سر پہ لا رہے ہیں۔ ہر کمینی حرکت ان کے لئے مباح ہے۔ جیسے کمینی گوری چماریاں مرد بدلتی ہیں ویسے ہی یہ لوگ بھی جب چاہیں مرد بدل دیں نہ نکاح نہ بیاہ۔ میں تو

ہوں کہ ہر کمینی حرکت اپنا رہے ہیں۔ اور ان کو بادشاہت ملے گی۔ بیوی کی باتیں اور اگر مل بھی گئی تو دیکھ لینا لالہ جی سے زیادہ بڑے حرامی
ت ہوں گے۔ تمہارے بہنوئی تو چلے تھے بڑے جوش میں مگر اب ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ خیر تمہارے میاں بھی سمجھ ہی جائیں گے ایک دن
یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے شرافت کے طریقے چھوڑ دیں اور کمینوں کے طریقے اختیار کریں۔ میں کہتی ہوں کہ ان کا ہر طریقہ کمینوں کا ہے
زیادہ ہوگا کہ چپلیں کھٹکنیں پہن کر آیا کرتی تھیں اور دیکھو یہی یہ لوگ بھی پہن رہی ہیں اور مجھ سے بھی کہا کہ چپل پہنا کروں۔ میں نے پھٹکار دیا
میرے یہاں کوئی نہیں آتی۔ تم بھی ایک دن نگاہ ٹیڑھی کرو میاں تمہارے کچھ کریں۔ ان مردوں مُردوں کا بیا جر چلے گا
تے پھریں گھر کے باہر۔ مگر گھر کے اندر تمہارا راج ہے تم ان کمینیوں کو ہرگز نہ گھر میں گھسنے دو۔"

بیگم ان سب باتوں پہ ہاں ہاں کرتی رہیں مگر ان کی طبیعت میں آنا زور ہی نہ تھا کہ نعیم صاحب اور ان کی بازیوں سے کچھ کہتیں
نہ صرف ان کے میاں پر بلکہ سارے گھر پہ ان سب کا اثر بڑھتا ہی گیا۔

صاحبزادے ہی کے ذریعہ نعیم صاحب گاؤں میں پہنچے اور سلیماؔ کے گھر میں مقیم ہوئے۔ نعیم صاحب نے سلیماؔ کی بڑی تعریف کی اور ساڑی
بھی ملے۔ یہ سب ان کی پالسی کے ہمدرد ہو گئے اور ان کے ذریعہ تحریک کے گاؤں میں پہنچنے کا امکان بڑھنے لگا۔ جن نے ان سے "مزدور
حقوق" کا نقرہ سیکھا اور مل والوں میں عام کیا۔ مل کے مزدور چوکنا ہوئے اور نہ زیادہ مزدوری ملنے اور کم وقت کام کرنے کے
ب دیکھنے لگے۔ جمن نعیم صاحب کا خاص نمائندہ مردوں میں اور ساڑی عورتوں میں ہو گئی۔ سلیماؔ اور اس کا میاں کھیتے بھی نئی طرح سوچنے
ے۔ ان کی باتوں سے سارے گاؤں کے عوام میں ایک بیداری پھیل گئی۔ نعیم صاحب کے ساتھ ساتھ صاحبزادے صاحب بھی ایک
ن پر بیدار ہو گئے وہ سوچتے تھے میں اس گاؤں میں کس وجہ سے آیا تھا اور اب کیا ہو گیا اور کیا معلوم کسی دن اس کا راجہ ہو جاؤں۔
دن بادام دینا بہتر ہے یا اس گاؤں کی رجا رہٹ۔ یہاں مل بھی تو ہے جس کی آمدنی لالہ کی جائداد سے زیادہ ہوگی ضرور۔ بہرحال دیکھا
ے کہ نعیم پہلے بہت بڑا آدمی ہے اور بڑا شاعر بھی تو ہے کیا کہتا ہے واللہ

ایک دن لے کے رہیں گے ہم سب　　　جو حراموں نے ہم سے چھینا ہے

دوسرے مذاق کی بنا پہ میر مرزا انیس۔ دبیر کی شاعری سے واقف تھے اور ان کا مذاق سلیم نعیم کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔
ن کی نگاہ لفظ حراموں پہ جاتی اور وہ کہتے یہ کون لفظ ہے حرامیوں۔ حرامزادوں لفظ ہیں۔ مگر ان کو بتایا گیا تھا کہ نئی شاعری کے معنے ہی
یہی ہیں کہ نئے لفظ گھڑے جائیں اور پھر یہ شاعری امید کی جو صورت دکھا رہی تھی اس کے سامنے پہلے قواعد کی کیا حقیقت تھی۔ انہیں
اسوس ہوا کہ ان شعروں کے پڑھنے ہی سے جیسے ان کا خواب اپنی تعبیر تک پہنچ گیا۔

(۱۰)

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ عین میٹنگ کے وقت نعیم صاحب کی انجمن پہ پولیس نے چھاپا مارا۔ اور سب کو پکڑ کر لے گئی۔ ڈاکٹر نی صاحبہ
ذرا دیر کی ہوئی تھیں۔ اس لئے بچ گئیں۔ نواب نعیم کے بالکل قریب بیٹھے ہونے کی وجہ سے اس طرح پکڑے گئے کہ پولیس نے دو ہری ہتھکڑی
یعنی حلقہ ان کے ہاتھ میں اور دوسرا نعیم کے ہاتھ میں ڈالا۔ نواب کانپنے لگے اور ان کو بڑے زور سے پیشاب لگا۔ عجیب منظر یہ دکھائی دیا
باہر کی نالی پہ دونوں کو پولیس نے پاس بٹھا دیا۔ نواب پیشاب کرتے رہے اور نعیم اپنا منہ اپنے گھٹنوں کے درمیان چھپاتے رہے۔ نعیم کی بزیوں

میں سے ایک ان کی سمجھ میں یہ بھی آ گئی کہ اسے کسی قسم کی گھبراہٹ تک محسوس نہ ہوئی بلکہ اس کا عزم اور بھی زیادہ بڑھ گیا اور اس نے چہرہ کو بڑا رعبدار بنا کر کہا: "اس کے لئے تو ہم ہر سانس تیار رہتے ہیں۔" نواب نے اپنے دل میں کہا: "میں نے تو کبھی اس کے امکان تک کا تصور نہیں کیا تھا۔" مگر تھر درویشی پہ جاؤ درویش سب کے ساتھ چوروں کی گاڑی میں بیٹھ کر جیل روانہ ہو گئے۔

کچھ ہی دیر کے بعد ان کے گھر میں خبر ہوئی۔ ان کی بیوی نے دھاڑیں مار کر رونے اور اپنے زانوؤں کو پیٹنے لگیں۔ ماما نے جا کر محلہ بھر کو خبر کی اور سواریاں آنے لگیں۔ وہ کہرام بپا ہوا کہ تمام محلے کو خبر ہو گئی۔ ہر قسم کی عورتیں آ آ کر پوچھیں کیا ہوا۔ کچھ یہ کہیں کہ نواب کسی گاڑی سے کچل گئے۔ کچھ کہیں کہ دریا میں جا ڈوبے۔ مگر رفتہ رفتہ بات صاف ہوئی تو ڈھولک بجنے لگی۔ اس پر کسی نے کہا: "ڈاکوؤں میں شریک تھے پکڑے گئے۔" کسی نے کہا: "شراب کے نشے میں پڑے تھے پولیس پکڑ لے گئی۔" کسی نے کہا کہ "کسی کی عورت بھگا رہے تھے۔ پکڑے نہ جاتے تو ہوتا کیا۔" غرض جتنے منہ اتنی باتیں کہی گئیں۔ آخر کو یہ کھلا کہ حکومت کو الٹنے والوں کے ساتھ پکڑا جانا لازمی تھا۔ نعیم کے محلے میں پارٹی کو مقبول بنانے کی کافی کوشش کی تھی اور انہیں پیچھے جیتے کے سب ہی لوگ جان گئے تھے۔ انہوں نے سب کو لالہ جی کے (جنہیں انہوں نے بڑے حرامی کا نام دے دیا تھا) خلاف کرنے کی کوشش کی تھی اور جو یہ سوچ کر کہ لالہ کی مہینے مہینے کی کمائی سے بچ جائیں گے پارٹی کے بڑے ہمدرد ہو گئے تھے۔ نعیم اور ان کے کارکنوں کی گرفتاری پر سب سناٹے میں آ گئے۔ خبر لالہ جی تک بھی پہنچی اور انہوں نے ہنس کر کہا: "اچھا ہوا پکڑے گئے بڑے حرامی ہیں۔"

نواب کے گھر میں رونے چلانے کی آواز سن کر وہ ڈیوڑھی پر پہنچے اور پکار کر بولے: "تم سب چپ ہو جاؤ میں ٹھیک کر دوں گا سب کچھ دولہن بیگم دروازے پر آؤ۔"

دولہن بیگم یعنی نواب کی بیگم کو محسوس ہوا کہ ان کی دعا خدا نے سن لی اور ایک فرشتہ مدد کے لئے بھیج دیا۔ وہ لپک کر دروازے پر آئیں۔ لالہ جی کہنے لگے: "دیکھو بیگم۔ تمہارے نواب صاحب بھی ان لوگوں میں پھنس گئے۔ یہ لوگ مجھے بڑا حرامی کہتے ہیں۔ اب دیکھو کون بڑا حرامی ہے۔"

بیگم نے روتی آواز میں کہا: "آپ سچ کہتے ہیں لالہ جی۔ یہ لوگ بڑے حرامی ہیں۔ مگر اب ہو کیا؟"

"تمہارے پاس کوئی چار پانچ سو کا زیور ہو تو دو میں ابھی ضمانت کر کے چھڑا کے لاتا ہوں۔"

"قربان کیا زیور۔" کہہ کر بیگم نے جیسی توڑے کے سونے کے کڑے ہاتھوں سے اتار کر لالہ جی کو دے دیئے۔ وہ تیزی سے روانہ ہو گئے۔

اب گھر میں لڈو اور شربت کی تیاریاں کرنے کے انتظام ہونے لگے۔ شام ہونے سے پہلے ہی نواب گھر واپس آ گئے اور حلوہ کی دستر خوان ہوا۔ بیگم نے ان سے قسم لی کہ اب نعیم کے پیچھا میں تک سے بچیں گے اور انہوں نے بڑے خلوص سے قرآن شریف پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ بڑے حرامی لالہ ہی نہیں۔ بلکہ نعیم بھی بڑے آدمی کہلاتے ہیں بڑے حرامی کہلانے جائیں تو بہتر ہو گا۔ مجھے بعد میں یہ شبہ ہو گیا کہ نعیم صاحب بڑے حرامی تھے۔ نعیم کی دوستی کا حاصل یہ ہوا کہ پانچ سو کے کڑے کی جوڑی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یہ جوڑی لالہ جی نے ضمانت کے طور پر رکھ لی تھی اور اس پر بھی سود در سود لگنے لگا۔ لالہ جی نے ان کو رائے دی۔ "دیکھو میاں ان سیاسی جماعتوں میں کبھی شریک نہ ہونا۔ یہ سب بچنے والوں کو سزا کی ہوتی ہے۔" اور نواب نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ وہ سیاست کا نام پر تین حرف کہتے اور الیکشنوں میں عزیزوں کے اصرار پر بھی کبھی ووٹ دینے

تھے۔ حافظ کا یہ شعر انھیں ایک صاحب کے پڑھنے پر یاد ہوگیا تھا اور اسے ہی وہ ہر سیاسی معاملے پر دہرا دیا کرتے تھے۔

رموزِ مملکت و ملک خسرواں دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

لالہ جی یہ دیکھ کر نواب کا اسی شعر پر ایمان ہے بڑے خوش ہوتے۔ مسلم لیگ کا جب پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو نواب لالہ جی کے مشورے سے گاؤں چلے گئے اور سلیمہ کے پاس رہے۔ جب یہ سنا کہ شہر میں امن ہوگیا تو واپس آئے۔

مگر نو برس کے بعد جب ہندوستان آزاد ہوا اور انہوں نے سنا کہ واجد علی شاہ کے لڑکے کی مسجد آصفی میں تاج پوشی ہوگی تو ان سے نہ رہا گیا۔ لالہ سے بغیر پوچھے ہوئے وہ جلوس دیکھنے وکٹوریا اسٹریٹ پہونچے۔ وہاں ان کے کئی جاننے والے ملے جنہوں نے کہا "جلوس نکل گیا"۔ ان کو کوئی افسوس نہ ہوا کیونکہ ایک طرف دیکھنے کا شوق بھی دب گیا اور دوسری طرف خیال ہوا کہ جلوس میں نہ معلوم کیا ہوتا جس سے وہ بچ گئے کیونکہ جنگ کی وجہ سے اب سب ہی زیور لالہ جی کے پاس رہن تھا اور اگر وہ پکڑے جاتے تو ضمانت کے لئے گھر میں چھلا بھی نہ نکلتا۔ انھیں بتایا گیا کہ بارہ بجے رات کو شہزادے کی تاج پوشی مسجد آصفی میں ہوگی۔ اس میں شریک ہونے کا کچھ خیال انھیں ضرور ہوا مگر نہ ان کی بیوی نے جانے دیا اور نہ پھر ان کا جی ہی اٹھا۔

ہندوستان کی تقسیم ہوگئی۔ ان کی بیوی ایک دن ڈولی میں میکے سے لوٹ رہی تھیں۔ راستے میں انھوں نے کہاروں کو ڈانٹ کر کہا "یہ ادھر سے جا رہے ہو۔ ادھر کی گلی سے چلو" کہار جو بہت پرانا تھا اور عرصہ سے ان کے خاندان کی عورتوں کو پھرایا کرتا تھا تڑ کر بولا "اب ہم پر مت بگڑو۔ حکم چلاوے کا ہے تو پاکستان جاؤ۔ تمہارے لئے بنا کے دیا ہے"۔

وہ خاموش رہیں اور گھر پر آکر میاں سے ذکر کیا۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "کیا کیا جائے بیوی۔ سب جا رہے ہیں مرنے لئے جا رہے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک عورت سکینہ تھی۔ شادی سے پہلے اس کا میاں اور بچے سب بھیجے گئے۔ بہت لوگ جا رہے ہیں۔ راتی رات سب [illegible] ہو گئے ہیں۔ بوستے بھی کہتے ہیں پاکستان جاؤ۔ ہم وہاں جاکر کیا کریں گے۔ یہاں ہمارا تمہارا وثیقہ ہے اس سے روٹی چل رہی ہے۔ وہ اس گھر میں بیٹھے ہیں وہاں جب آئیں گے کیا کریں گے کہاں رہیں گے۔ لالہ جی سے میں نے رائے لی۔ وہ بولے "ہرگز نہ جاؤ نہ کچھ سہی۔ لوگ انھیں بڑا حرامی کہے مگر ہماری تو دلجوئی کرتے ہیں۔ سوائے صبر کے اور کیا چارہ ہے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن"۔

مگر جب لالہ جی مر گئے تو ان کے لڑکوں نے مکان خالی کرایا تو نواب بہت سٹپٹائے۔ انہوں نے کہا "یہ صحن کافی بڑا ہے۔ خالی زمین بھی بہت ہے۔ اس پر عمارت بنا کر آمدنی کریں گے"۔ نواب تمام عزیزوں سے کہتے پھرتے ہر ایک نے کہا "لالہ میں کچھ مروت تھی مگر یہ لونڈے بڑے حرامی ہیں"۔ بڑے حرامی کہنے اور لوگوں کے کہتا سننے سے انھیں کوئی تسکین نہ ہوئی۔ مکان ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا اور کرایہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ان کی مقدرت سے باہر تھا۔ آخر کو اٹھ کر اپنے خاندانی شکستہ مقبرے میں آگئے۔ وہ کہا کرتے "پشتیں کر مرنے کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ ہم جیتے جی مقبرے پہنچ گئے"۔ وہاں بزرگوں کی ٹوٹی قبروں کے درمیان پہلے تو ان کی بیوی کا جی اٹھا۔ رات رات بھر نیند نہ آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ قبروں سے مردے نکلے چلے آرہے ہیں۔ مگر کچھ عرصے میں سارا ڈر جاتا رہا۔ نواب تو پہلے ہی سے ڈرے نہیں۔ اور بعد میں تو یہ محسوس کرتے تھے کہ خاندان والوں کی ارواحیں ان کو پناہ دے رہی ہیں۔ جب کوئی ان سے پوچھتا "پاکستان جا رہے ہو" تو ہنستے: "پاکستان ارے میاں ہم قبرستان پہونچ گئے۔ ہمارے لئے پاکستان نہیں قبرستان بنا ہے"۔

(۱۱)

مہنگائی بہت بڑھتی گئی بچوں کی تعداد بھی بڑھتی ہی گئی۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ بڑھا۔ وقت بے وقت پر لالہ جی سے قرض لے لیتے تھے اور وثیقہ ملنے پر قسط وار ادا کرتے رہتے تھے۔ آدھا وثیقہ سود اور اصل کی نذر تھا۔ لالہ کے لڑکوں نے قرض دینا بند کر دیا تھا مگر پرانا قرضہ مع سود کی قسط ہر مہینے لے جاتے تھے۔ مشکل سے چالیس یا پچاس گھر کے خرچ کے لئے بچتے تھے جو دس دن سے زیادہ نہ چلتے تھے۔ لڑکیاں جوان ہو رہی تھیں۔ ان کی شادی کا کوئی امکان نہ نظر آتا تھا۔ لڑکے واہی تباہی پھرتے تھے۔ نہ کوئی کام سیکھے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ وہ سوائے اس کے کچھ اور نہ سوچ سکتے تھے کہ مقبرہ و مکان ان سب پر ٹوٹ جائے اور قصہ ختم ہو جائے یا زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے کہ سب ایک ساتھ جا کر گومتی میں ڈوب جائیں۔ اکیلے مرنے کا بھی خیال آتا مگر پھر سوچتے کہ بیوی اور بچوں کا کیا ہوگا۔ دماغ شل ہوا جا رہا تھا۔ حسین عورتیں بھی بری لگنے لگی تھیں۔ "سیما" کا خیال آتا اور کہتے "کاش میں بھتیجے کی طرح ہوتا۔ یہ نواب ہونے کا کیا حاصل۔" افسردگی حد سے زیادہ طاری ہو گئی۔ راتوں کی نیند غائب ہو گئی۔ مذہب کی طرف رجوع ہوا اور مولویوں کے یہاں جانے لگے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ لکھنؤ کے ایک مولوی جو بمبئی میں رہتے تھے کچھ عرصے کے لئے گھر آئے۔ نواب ان کے پاس بھی گئے۔ انہوں نے کہا "ہمارے سیٹھ ہر سال زیارت کے لئے لوگوں کو بھیجتے ہیں۔ آپ۔ آپ کی بیوی اور آٹھوں بچوں کو اگر جانا چاہیں تو آمد و رفت کا کرایہ اور کچھ اوپر کا خرچ مل سکتا ہے مگر ایک شرط پر کہ آپ کے گھر کی تمام مستورات کو سونے کا گہنا پہنایا جائے گا وہ آپ وہاں پہنچ کر ایک صاحب ہیں ان کو دے دیں اور واپسی میں جو کچھ وہ دیں لے کر کراچی اتریں اور کراچی میں ایک صاحب ملیں گے انہیں دے دیں۔"

نواب نے اس تجویز پر بیگم سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "نا نا۔ کراچی اترنے کی شرط بُری ہے۔ سنتے ہیں کہ اُدھر کراچی میں اترے اور اِدھر وثیقہ بند ہو جاتا ہے۔ نا۔ میں کراچی نہ اتروں گی۔ ان سے کہو سب منظور ہے سوائے کراچی اترنے کی شرط کے۔" نواب کی سمجھ میں نہ آیا کہ مولوی صاحب کو کیا جواب دیں۔ سوچا کہ عورت کو بہلایا جائے کہہ دیا جائے کہ کراچی نہ اتریں گے تو کوئی اور بہانا بنائیں گے۔ اب تک انہوں نے سب کچھ کیا تھا مگر سٹے بازی کے قریب نہیں گئے تھے۔ اسے وہ حرامی پن سمجھتے تھے مگر اب کیا کرتے انہیں بھی یہ کرنا پڑا۔ بڑے حرامی۔ انہیں بھی بڑے حرامی ہونا ہی تھا۔ بغیر اس کے کام نہیں چلتا۔

انہیں معلوم ہوا کہ وہ مولوی صاحب بھی جنہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی بڑے حرامی تھے اور بمبئی کے تاجروں کے لئے زیارت پر جانے والے لوگ پھانسنے کا کمیشن لیا کرتے تھے مگر ان پر اعتبار کرنے میں کوئی حرج نہ تھا۔ کرایہ اور روپیہ نقد مل جاتا تھا اور راستے میں مدد کے لئے ایک آدمی ساتھ جاتا تھا جو سیٹھ کی چیزیں کسٹم ہو جانے کے بعد لے لیا کرتا تھا۔ نواب کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ پیچ کیا تھا مگر ان کا کوئی ذاتی نقصان نہ تھا۔ سیٹھ کی جو بھی مصلحت ہو اس سے انہیں کیا مطلب۔ غرض سارا کنبہ کربلا جانے پر تیار ہو گیا۔ لالہ کے لڑکوں کو خبر ملی تو انہوں نے اپنے قرضہ کی ادائیگی چاہی۔ وہ بھی مولوی صاحب نے ادا کر دیا۔ نواب کو یہ اطمینان ہوا کہ واپسی پر اب وثیقہ بھی پورا ملا کرے گا اور وہ سمجھے کہ اب ان کے دن پھر رہے ہیں۔ وہ یہ بھی سوچا کرتے تھے کہ اگر انہیں ایک لاکھ روپیہ مل جائے کہیں پڑا ہوا تو زندگی کے سب مراحل حل ہو جائیں۔ مکان بنوا لیں کرایہ سے آمدنی کر لیں لڑکیوں کی شادیاں کر دیں۔ ڈھائی سو کی آمدنی کو وہ معقول سمجھتے تھے اور ایک لاکھ مل جانے پر اتنی آمدنی ہو جانے کی صاف صورت دکھائی دیتی تھی انہوں نے نیت کی کہ سب روضوں پر یہی دعا مانگیں گے کہ انہیں کہیں ایک لاکھ روپیہ پڑا مل جائے

بہرحال وہ اس نیت سے زیارت کو روانہ ہوئے اور بصرہ کی بندرگاہ پر اترے۔ جہاز ایسے وقت پہنچا کہ بغداد جانے والی ریل لی تھی۔ رات بھر انہیں ایک بہت بڑے شیڈ میں قیام کرنا پڑا۔ انہوں نے دیوار سے ملے ہوئے حصے کے ایک کونے میں سب بستر بچھا کے بیوی بچوں کو ان پر لٹا دیا۔ اپنا بستر بالکل ادھر رکھا اور بیوی کا دیوار سے لگا ہوا۔ بچے سب بیچ میں ہو گئے۔ رات گئے ساتھ بندھا ہوا کھانا نکال سب نے کھایا اور سو رہے۔ نواب کی آنکھ لگی ہی تھی کہ ان کو ایک نامانوس لہجہ میں مگر اردو زبان میں آواز سنائی دی "یا اللہ! سب کو معاف دینا۔ شیطان کو بھی معاف کر دینا......" انہوں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ شیڈ کے دوسرے کنارے پر جو ان سے چالیس قدم دور ضرور تھا ایک آدمی لیٹا نظر آیا جس کا وجود زیادہ تر اس کی بک بک سے ثابت ہو رہا تھا۔ وہ قرآن شریف کی نہ معلوم کون کون سی آیتیں ہی آدھی پڑھ پڑھ کر رہ جاتا اور پھر ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ نواب کا دھیان ایک آیت کی طرف گیا جس کو اس نے آدھا کر اپنی تفسیر شروع کر دی تھی۔ وہ آیت یہ تھی "یضل بہ کثیراً و یہدی بہ کثیراً" نواب نے دل میں کہا اور یہ شخص "وما سل بہ الا الفاسقین" تو چھوڑ ہی گیا مگر وہ اس کی بکواس سننے لگے "ہاں خدا خیر و شر دونوں تیری طرف سے ہے۔ تیری ب حد سے زیادہ بیباکی بھی ہے اور حد سے زیادہ ہدایت بھی کرتی ہے۔ میں بہک گیا تو تو نے بہکایا۔ میں نے گناہ تیرے حکم سے کیا۔ تو اف کر دے۔ مجھے نہیں سب کو معاف کر دے۔ شیطان تک کو معاف کر دے......" اس کی بکواس ریل گاڑی کی آواز کی طرح متواتر تی رہی اور کیونکہ نواب اس قسم کی آوازوں کے باوجود سو جانے کے عادی ہو گئے تھے اس لئے سو گئے اور صبح ہوتے ہوئے اٹھے۔ زیارت ار ہے تھے اس لئے نماز کے پابند ہو گئے تھے۔ باہر جا کر پانی تلاش کیا وضو کی اور نماز پڑھی۔ ان کی بیوی بھی اٹھیں اور تیمم کر کے نماز پڑھنے ں۔ نواب ناشتے کی فکر میں شیڈ کے باہر گئے اور جو کچھ سامان ملا لے کر واپس ہوئے۔

ان کی بیوی نے مٹی کے تیل کے اسٹو کو جلا کر پانی چڑھا دیا تھا۔ بچے سب اٹھ کر بیٹھ گئے۔ دو منٹ میں چائے تیار ہو گئی اور چینی کے پیالوں میں سب کو دی جانے لگی۔ بیگم نے بسکٹ وغیرہ بھی سب بچوں کو بانٹ دیئے۔ اور اب نواب نے اپنی چائے کا پیالہ نہ سے لگایا۔ انہوں نے دیکھا کہ بک بک لگانے والا آدمی ان کی طرف آیا اور آ کر ان سے کچھ دور پر فرش پہ پلتھی مار کر بیٹھ گیا اور بولا ل رات میں نے سب کے گناہ معاف کرا دیئے۔ شیطان تک کے گناہ معاف کرا دیئے" نواب نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ بولا پ لوگ زیارت کو جا رہے ہیں۔ یزید نے بڑا گناہ کیا تھا۔ حضرت حسین کو مروا کر میں نے اس کا گناہ بھی معاف کرا دیا"

نواب کو اس کی باتیں بہت ہی عجیب معلوم ہو رہی تھیں۔ مگر غیر ملک میں ڈر کے مارے وہ کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔ بس اتنا بولے۔ "آپ ہیں کون حضرت؟"

"حضور۔ حضور۔ ہاں مجھے حضور کہئے۔ مجھے اللہ کی حضوری حاصل ہو گئی کل رات۔ مجھے بھی پیغمبری کا درجہ مل گیا"

نواب اس پر چونکے اور بیگم کی جو برقعہ میں لپٹی دیوار کی طرف رخ کئے تھیں آواز آئی "تو اس آدمی کو بھی چائے دے دو۔ نظر لگا رہا ہے ر سے بچوں کے کھانے میں"

نواب نے بیوی کے ہاتھ سے پیالہ لے کر اس آدمی کو دیا اور اپنے پاس سے ایک بسکٹ بھی بڑھا دیا۔ وہ بولا "ایک میں میرا کیا بھلا

نے ایک لقمہ بنایا تھا مگر یہ عباس دو نگل رہا تھا اور دونوں بھکر بھکر کھا گیا اور چائے کا پیالہ منہ میں انڈیل کر بولا: "تم سب کو جنت میں عباس کے بدلے میں مذو ذو پیالے شراب طہور کے دوں گا۔ میں ہی تو ساقیِ کوثر ہوں گا۔"

بیگم یہ سن کر جھنجھلا اٹھیں اور بولیں: "دفان کرو اس کو یہاں سے۔"

اس نے بیگم کی بات نہیں سنی اور یا سنی تو سمجھا نہیں کیونکہ وہ لکھنؤی اردو سے ناواقف معلوم ہوتا تھا۔ وہ کہے گیا: "میں نواب کے ساتھ ہوں گا۔ آپ کی زیارت قبول کراؤں گا۔ دیکھا اللہ کیا کرتا ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ اس نے ہمیں کیسے عیاش بنایا۔ مجھے حکم ہوا تھا کہ بعد از ایک نیک بندہ زیارت کو جا رہا ہے جاؤ اس کی ہمراہی کرو اور اس کی زیارتیں قبول کراؤ۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے خلیفہ ہو میرے بعد۔"

غرض ریل پر وہ شخص نواب کے ساتھ ہی سوار ہوا۔ ڈبے میں کچھ ہندوستانی بھی تھے جن میں سے ایک شخص نے نواب سے یوں پوچھا: "یہ شخص تمہارے ساتھ ہو لیا ہے؟"

"کیوں، کیا آپ جانتے ہیں؟"

"خوب۔ میں یہاں تجارت کے سلسلے میں ہر ہفتہ بصرے سے بغداد اور بغداد سے بصرے جایا کرتا ہوں۔ یہاں کے لوگ اسے حرامی کہتے ہیں۔ یہاں لفظ حرامی کے وہ معنے نہیں ہیں جو آپ لوگ لکھنؤ میں لیتے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے مطلب ہے چور یا غنڈا۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ٹکٹ بابو اس ڈبے میں آئے اور اس آدمی کو دیکھ کر عربی زبان میں نہ معلوم کیا کیا بکنے لگے اور اسے ریل سے اتار دیا۔ وہ نواب کی طرف اشارہ کر کر کے کہتا رہا: "ان کی زیارت قبول کرانے جا رہا ہوں۔" مگر نواب نے اس کی طرف رخ نہ کیا۔

اس کو اتارنے کے بعد جب ریل چل رہی تھی تو ٹکٹ بابو نواب کے پاس آیا اور بولا: "شما شریف زادہ ہندی ہستی۔ نمی دانی کہ این مردک حرامی است۔ بسیار حرامی است۔ خیلے حرامی است۔" نواب نے فارسی بولنے کی ناکام کوشش کے بعد کہا: "آپ کا بڑا شکریہ۔ آپ نے میرا اس سے پیچھا چھڑایا۔ میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ وہ حرامی ہے بڑا حرامی۔"

نواب نے تمام زیارتیں کیں۔ مگر ہر اس شخص کو جو ان کی طرف بڑھا: "بسیار حرامی، خیلے حرامی" یعنی بڑا حرامی سمجھ کر اس سے اختلاط بڑھانے سے پرہیز کیا۔

(۱۲)

واپسی پر سیٹھ کے آدمی نے ان کی بیوی اور لڑکیوں کو سونے کے زیورات سے لادا اور ان کے کراچی میں ایک ہفتہ عزیزوں سے ملنے کے لیے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔ ان کی بیوی کراچی کے نام سے ڈرتی تھیں کیونکہ ان کے حساب کراچی اترتے ہی وثیقہ بند ہو جانا لازمی تھا۔ بڑی مشکل سے انھیں سمجھایا گیا کہ یہ وہم ہے اور سات دن کے اندر ہی ان کو لکھنؤ روانہ کر دیا جائے گا۔ جہاز سے اتار کر کھارادر کے ایک فلیٹ کے ایک کمرے میں ان کا سارا خاندان بھر دیا گیا۔ سب لوگ زمین پر بستر کر کے لیٹ رہے۔ نواب کو سلیما یاد آئی۔ وہ جانتے تھے وہ یہیں کہیں ہے اور سہ پہر کے وقت وہ شہر دیکھنے نکلے۔ دل میں دعا مانگتے جاتے تھے کسی طرح سلیما کا پتہ لگ جائے۔ بولٹن مارکٹ تک پیدل گئے اور وہاں سے ٹرام پر بیٹھ کر صدر پہنچے۔ انھیں اندازہ ہوا کہ کراچی کس قدر بڑا شہر ہے اور یہاں کسی کا پتہ لگنا کتنا مشکل ہے۔

مگر کراچی سے انھیں ایک خاص لگاؤ ہو گیا۔ وہ اپنے فلیٹ سے صبح ہی ناشتہ کر کے نکلتے اور بس پر بیٹھ کر ——— اس مقام تک نکل جاتے جہاں بس کا روٹ ختم ہوتا تھا۔ یہ عموماً کسی نئی بستی میں ہوتا اور وہ اس بستی میں چکر لگانے۔ کچھ بنے ہوئے۔ کچھ بنتے ہوئے مکانات نظر آتے، زیادہ تر لوگ اپنی طرف کے نظر آتے جو اردو بولتے ہوئے ہوتے۔ ان ہی میں سے ——— انھیں ایک دن نعیم دکھائی دیا۔ وہی نعیم جو بڑا ترقی پسند شاعر تھا۔ اور ایک دن پوری کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔ انھیں اسے پہچاننے میں دیر ہوئی کیونکہ اس کی وضع بدلی ہوئی تھی۔ بڑھے ہوئے پٹوں کے بجائے اس کے سر پر باقاعدہ کٹے ہوئے بال تھے۔ اور پھر وہ انگریزی سوٹ پہنے تھا اور ٹائی لگائے تھا۔ اس نے انھیں پہچانا اور اک دم سے کہا: "نواب تم! تم یہاں کہاں؟"

نواب نے کہا "تم یہاں ہو۔ کیسے بدل گئے۔ پہچان ہی میں نہیں آتے۔"

وہ نواب کو اپنے گھر لے گیا۔ نواب نے دیکھا کہ گھر نیا بنا ہوا تھا اور بڑے ٹھاٹھ کا تھا۔ سامنے لان بھی تھا اور کمرے بڑے بڑے اور باقاعدہ تھے۔ جس کمرے میں وہ بٹھائے گئے تھے وہ آدھا ڈرائنگ روم اور آدھا ڈائننگ روم تھا اور فرنیچر نہایت عمدہ اور نیا تھا۔

نواب نے ہر چیز کو تعجب سے دیکھ کر پوچھا: "اماں یہ سب ٹھاٹ تم کو کہاں سے ملا اور تم تو اس کے خلاف تھے۔"

"وہ زمانہ گیا۔ زمانہ بدل گیا۔ یہاں کیا کرتا۔ یہاں روپیہ آدمی کو ڈھونڈھتا ہے۔ اس پر برستا ہے جیسے اوپر گرا تو کیا میں الگ پھینک دیتا۔ میں جب یہاں آیا تو میرے پاس کل چار روپیہ بارہ آنے تھے۔ قصہ لمبا ہے مگر شروع شروع میں میں نے پانچ پانچ سو روز کمائے۔ اب کمائی کم ہوتی جا رہی ہے مگر پھر بھی سو پچاس روز تو آ ہی جاتے ہیں۔ تمھیں زہرہ یاد ہے۔ جو ہماری پارٹی میں آتی تھی۔ اس سے شادی کر لی ہے۔ وہ ایم اے۔ بی۔ ٹی ہو گئی ہے اور ایک اسکول چلاتی ہے۔ میں پڑھا وڑھا تو زیادہ تھا ہی نہیں۔ متفرق قسم کی ایسی تجارتیں کرنے لگا کہ جن سے فوراً روپیہ مل جاتا۔"

"وہ تجارتیں کیسی ہیں۔ کیا میں نہیں کر سکتا؟"

"شروع میں آئے ہوتے تو تم بھی کر لیتے۔ مثلاً میں سگریٹ کی ڈبیاں بندرگاہ پر خرید لیتا تھا اور شہر کے تمام پان والوں کو دیتا تھا سمجھو کیماڑی سے ٹرام گودی تک آتے آتے سب ڈبیاں ختم ہو جاتیں اور مجھے پچاس ساٹھ بچ رہتے۔ اسی طرح اور بھی بہت قسموں کا مال دوسرے دوکانداروں کو دیتا رہتا اور اپنی رقم سیدھی کرتا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ باہر سے آنے والے سامان کے ایجنٹ مقرر ہو گئے ہیں۔ سامان بھی آنا بند ہو گیا ہے۔ خیر پھر بھی کچھ نہ کچھ پیٹ لاتا ہوں۔ بیوی کا اسکول مستقل آمدنی سمجھو۔"

"میں بھی یہاں آ جاتا۔ مگر میاں بیوی کا رشتہ ہے۔"

"وہ کتنا ہوتا ہوگا۔ یہی دو سو روپیہ کے لگ بھگ۔"

"اس سے کم ہے۔ ایک سو ستتر۔"

"تمھارے رشتہ دار لوگ بہت سے چھوڑ آئے ہیں اور یہاں مکانات بنا لئے ہیں جن سے ہزار ہزار کی آمدنی ہے اور پھر کمائیاں بھی کرتے ہیں۔"

نواب نے سوچا کہ انہوں نے ایک لاکھ روپیہ ملنے کی جو دعا مانگی تھی وہ اس شہر میں پوری ہو سکتی ہے اگر کیا معلوم ہوا نے دعا قبول کر

ں۔ اسی لئے اس شہر میں آگیا اور یہاں اس قسم کے سننے کا موقع اچھا ہے۔

نسیم نے انھیں اپنے ساتھ کھانا کھلوایا۔ کھانے پر باتیں ہونے لگیں۔ باتوں باتوں میں نواب نے پوچھا: "وہ لکھنؤ تمھیں یاد ہے جس
...ایک عورت بیگما کی ماں رہتی تھی۔ وہ بھی یہاں آگئی تھی۔ اس کی بھی کوئی خبر ہے؟"

...ہیں ہے۔ اس کا میاں جو تھا اس کو نہ معلوم کیسے ایک پرانی بڑی کوٹھی پر قبضہ مل گیا اور پھر نہ معلوم کیا کیا
...بنے تھے۔ ایک دفعہ ملا تھا۔ بتاتا تھا کہ اس کی ساس مر گئی۔ بڑا موٹا ہوا تھا۔ ٹھسے ٹھاٹھ تھے پھر سنا کہ مر گیا

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ کہاں رہتا تھا اور اس کی بیوی اب کہاں ہے؟"

"میں نے کبھی دریافت نہیں کیا۔ مگر ادھر شکار پور کالونی یا آل کالونی میں رہتا ہوگا۔ وہیں ٹھسے پرانے گھروں میں جو اسے مل گئے تھے۔"

"اگر تلاش کی جائے تو شاید کچھ پتا لگے۔"

"ان دونوں کالونیوں میں ایک دن چکر لگاؤ۔ ہر گھر کے پھاٹک پر لکھے ہوئے نام پڑھو۔ مسٹر جی خان کہتا تھا۔ بیوی مسز جی خان ہوگی۔ ممکن ہے پتہ لگ جائے۔ تمہارا جی اسے دیکھنے کو چاہتا ہے۔ ہاں بھائی پہلی محبت بڑی گہری ہوتی ہے۔ اور سنا تھا کہ اس کے بچے بھی تمہارے سے ہی ہیں۔ وہ نواب بہت اچھی طرح تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے۔ میں نے دیکھا نہیں۔ تمہاری بیوی کے بچوں سے زیادہ اچھی حالت میں ہوں گے۔ تمھیں وہ بھی یاد آتے ہوں گے؟"

"ہاں۔ ضرور۔ وہ بھی میرے بچے ہیں اور پھر پوچھو تو گھسیٹے ایک اڈے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اسی لئے ہم دونوں میں کبھی رقابت کا جذبہ نہیں ہوا۔ اچھا تو وہ مر گیا تمھیں معلوم ہے؟"

"ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ کیا معلوم کوئی دریافت کرنے کی ضرورت نہیں تھی یوں ہی کان تک بات آگئی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ وہاں تک پہنچ جاؤں۔ مجھے ابھی پانچ دن اور یہاں رہنے کی اجازت ہے۔"

"میرا موٹر بیوی لے جاتی ہے۔ اس لئے میں پیدل چلتا ہوا تمھیں مل گیا۔ مگر موٹر ہو تو موٹر میں بیٹھ کر کسی انجان مکان کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ تم پیدل ہی چل کر تلاش کرو۔ تین دن سے تم گھومتے پھر رہے ہو کل کا دن شکار پور کالونی اور آل کالونی کو چھاننے میں صرف کرو۔"

"ابھی آدھا ہی دن تو گیا ہے۔ آج ہی کیوں نہ کوشش کی جائے۔"

"اچھا۔ تو پھر میں تمھیں بس پر بٹھائے دیتا ہوں۔ گرو مندر اترنا۔ وہاں سے یہ دونوں کالونیاں پوچھ کر ہر گھر کے پھاٹک پر دیکھتے چلے جانا۔ چاہے گا تو مل ہی جائے گا۔"

نسیم کے منہ سے اللہ کا نام سن کر نواب چونکے: "ارے میاں۔ اب تو تم بھی اللہ کا نام لینے لگے جو جب بائیں کے شاعر تھے تو اللہ سے انکار کرتے تھے۔"

"یہاں آکر ہر قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ اللہ ہی سب کچھ کرتا ہے۔"

(۱۳)

نواب آل کا صبح کی ہر سڑک پر چکر لگا کر تھک چکے تھے اور پورے پورے ناامید ہو کر بس اسٹینڈ کی طرف جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بولا: "آپ لکھنؤ کے ہیں۔ ہماری امی جان بھی وہیں کی ہیں۔ انہوں نے آپ کو جاتے دیکھا اور مجھے دوڑایا کہ پوچھ آؤں۔"

نواب نے اس لڑکے کو غور سے دیکھا۔ ان کو اس لڑکے کا بچپن یاد آیا۔ اندر سے خون نے بھی جوش کھایا اور انھیں یقین ہوا کہ وہ ان ہی کا لڑکا ہے جو یہاں سے گیا تھا۔ لڑکا نہایت صاف قمیص اور پینٹ پہنے تھا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں۔" انہوں نے کہا۔

"ضرور چلیے یہ کیا گھر ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ نواب نے دیکھا گھر کیا تھا محل تھا۔ دو منزلہ اوپر کے برآمدے پر ان کی خاص طور پر نظر گئی چار دیواری پر پیڑ نظر آئے اور نیچے کا حصہ ان کے پیچھے چھپا تھا۔ ان کے دل میں پنکھے لگ گئے۔ وہ لڑکے کے ساتھ ہو لئے۔ کچھ دیر میں محل کے اندر تھے۔ لان پر کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، جن میں سے ایک پر سلیمہ بیٹھی تھی۔ ہاں سلیمہ ہی تھی۔ جسم بہت بھر گیا تھا۔ چہرہ بدلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر بڑی نفاست آگئی تھی۔ نواب کے پاس پہنچتے ہی وہ بے تحاشہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ لڑکا بڑے تعجب سے دیکھنے لگا۔

سلیمہ نے لڑکے سے کہا: "جا بیرے سے کہہ کر چائے وغیرہ لائے۔"

نواب نے محسوس کیا کہ سلیمہ کے لہجے میں دیہاتی پن جو تھا وہ بالکل غائب ہو گیا تھا۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سلیمہ خوشی کے مارے کھلی جاتی تھی۔ نواب کو اس میں ایک نیا حسن دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب حسن پہلے کے حسن سے کہیں زیادہ دلکش اور پُراسرار۔ عمدہ اور نفیس کپڑوں نے اسی حسن کو اور بھی دوبالا کر دیا تھا۔

"تم کتنی اچھی لگ رہی ہو سلیمہ بہت ہی اچھی لگ رہی ہو۔ ہائے۔"

"میں تم کو ہمیشہ یاد کرتی رہی اور جب سے گھسیٹے مرا ہے تب سے تو اور بھی زیادہ یاد آتے ہو۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ بچے بڑے دھندے میں لگے ہیں۔ کام کاج کچھ نہیں ہے۔ مزے سے تمہارے بیٹھی رہتی ہوں۔ تم یہاں آجاؤ۔ بیگم کے بچے جو ہیں وہ بھی یہاں ٹھکانے سے لگ جائیں گے۔"

"میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ اس محل میں رہوں۔ مگر یہاں آگیا تو وثیقہ جاتا رہے گا۔"

"وثیقہ کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو ہوگا۔ تم نے اماں کو تین سو روپے دے کر ہماری زندگی بنائی تھی۔ میں تم کو آسانی سے تین سو روپے مہینہ دے سکتی ہوں۔ یہ گھر بہت بڑا ہے اس کے دو حصے پانچ پانچ سو پر اٹھے ہوئے ہیں۔ بیچ میں میں رہتی ہوں۔ اتنے ہی میں تمہاری بیگم اور سب بچے رہ سکتے ہیں۔ تم کہاں ٹھہرے ہو۔ نہیں وہاں نہ ٹھہرو۔ میں ابھی موٹر لے کر چلتی ہوں اور تم سب کو یہاں لے آؤں گی۔"

ل۔ اس نے اس شہر میں آنا اور یہاں اس قسم کے شغل کا موقع اچھا ہے۔

نسیم نے انھیں اپنے ساتھ کھانا کھلوایا۔ کھانے پر باتیں ہونے لگیں۔ باتوں باتوں میں نواب نے پوچھا: "وہ محلہ تمھیں یاد ہے جس میں جایا کرتے تھے۔ وہاں ایک عورت سیما کی ماں رہتی تھی۔ وہ بھی یہاں آ گئی تھی۔ اس کی بھی کوئی خبر ہے؟"

"ارے میاں۔ وہ بڑے مزے میں ہے۔ اس کا میاں جو تھا اس کو نہ معلوم کیسے ایک پرانی بڑی کوٹھی پر قبضہ مل گیا اور پھر نہ معلوم کیا کیا اور خانے بھر کے نہیں ہی کر رہنے لگا۔ ایک روز ملا تھا۔ بتاتا تھا کہ اس کی ساس مر گئی۔ بڑا موٹا ہوا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ تھے۔ پھر سنا کہ مر گیا دل کی حرکت بند ہو گئی۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ کہاں رہتا تھا اور اس کی بیوی اب کہاں ہے؟"

"میں نے کبھی دریافت نہیں کیا۔ مگر ادھر سنگھ پورہ کالونی یا آل کالونی میں رہتا ہوگا۔ وہیں بڑے پرانے گھر ہیں جو اسے مل گئے تھے۔"

"اگر تلاش کی جائے تو شاید کچھ پتا ملے۔"

"ان دونوں کالونیوں میں ایک دن چکر لگاؤ۔ ہر گھر کے پھاٹک پر لکھے ہوئے نام پڑھو۔ مسٹر جی خان کہتا تھا۔ بیوی مسز جی خان ہوگی۔ ممکن ہے پتہ لگ جائے۔ تمہارا جی اسے دیکھنے کو چاہتا ہے۔ ہاں بھائی پہلی محبت بڑی گہری ہوتی ہے۔ اور سنا تھا کہ اس کے بچے بھی تمہارے سے ہی ہیں۔ وہ تو اب بہت اچھی طرح تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے۔ میں نے دیکھا نہیں۔ تمہاری بیوی کے بچوں سے زیادہ اچھی حالت میں ہوں گے۔ تمھیں وہ بھی یاد آتے ہوں گے۔"

"ہاں۔ ضرور۔ وہ بھی میرے بچے ہیں اور سچ پوچھو تو گیسٹ ایک آدھ سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اسی لئے ہم دونوں میں کبھی رقابت کا جذبہ نہیں ہوا۔ اچھا تو وہ مر گیا تمھیں معلوم ہے۔"

"ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ کیا معلوم کوئی دریافت کرنے کی ضرورت نہیں تھی یوں ہی کان تک بات آ گئی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ وہاں تک پہونچ جاؤں۔ مجھے ابھی پانچ دن اور یہاں رہنے کی اجازت ہے۔"

"میرا موٹر بیوی لے جاتی ہے۔ اسی لئے میں پیدل چلتا ہوا تمھیں مل گیا۔ مگر موٹر ہو تو موٹر میں بیٹھ کر کسی انجان مکان کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ تم پیدل ہی چل کر تلاش کرو۔ تین دن سے تو تم گھومتے پھر رہے ہو۔ کل کا دن سنگھ پورہ کالونی اور آل کالونی کو چھاننے میں صرف کرو۔"

"ابھی آدھا ہی دن تو گیا ہے۔ آج ہی کیوں نہ کوشش کی جائے۔"

"اچھا۔ تو چلو میں تمھیں بس پر بٹھائے دیتا ہوں۔ گرو منڈی اترنا۔ وہاں سے یہ دونوں کالونیاں پوچھ کر ہر گھر کے پھاٹک پر دیکھتے پھرنا۔ انشاءاللہ چاہے گا تو مل ہی جائے گا۔"

نسیم کے منہ سے انشاءاللہ کا نام سن کر نواب چونکے۔ "ارے میاں۔ اب تو تم بھی اللہ کا نام لینے لگے ہو۔ جب پاکستان کے شاعر تھے تو اللہ سے انکار کرتے تھے۔"

"یہاں آکر ہر قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ اللہ ہی سب کچھ کرتا ہے۔"

(۱۴)

نواب آس کالونی کی ہر سڑک پر چکر لگا کر تھک چکے تھے اور پورے پورے ناامید ہو کر بس اسٹینڈ کی طرف جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بولا "آپ لکھنؤ کے ہیں۔ ہماری امی جان بھی وہیں کی ہیں۔ انہوں نے آپ کو جاتے دیکھا اور مجھے دوڑایا کہ پوچھ آؤں۔"

نواب نے اس لڑکے کو غور سے دیکھا۔ ان کو اس لڑکے کا بچپن یاد آیا۔ اندر سے خون نے بھی جوش کھایا اور انھیں یقین ہوا کہ وہ ان ہی کا لڑکا ہے جو سلیمہ سے تھا۔ لڑکا نہایت صاف قمیص اور پینٹ پہنے تھا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں"۔ انہوں نے کہا۔

"ضرور چلیے یہ کیا گھر ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ نواب نے دیکھا گھر کیا تھا محل تھا۔ دو منزلہ اوپر کے برآمدے پر ان کی نگاہ طور پر نظر گئی چار دیواری پر پیڑ نظر آئے اور نیچے کا حصہ ان کے پیچھے چھپا تھا۔ ان کے دل میں پنکھے لگ گئے۔ وہ لڑکے کے ساتھ ہو لئے کچھ دیر میں محل کے اندر تھے۔ لان پر کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر سلیمہ بیٹھی تھی۔ ہاں سلیمہ ہی تھی۔ جسم بہت بھر گیا تھا۔ چہرہ بدلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر بڑی نفاست آ گئی تھی۔ نواب کے پاس پہنچتے ہی وہ بے تحاشہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ لڑکا بڑے تعجب سے دیکھنے لگا۔

سلیمہ نے لڑکے سے کہا۔ "جا بیرے سے کہہ کہ چائے وغیرہ لائے۔"

نواب نے محسوس کیا کہ سلیمہ کے لہجے میں دیہاتی پن جو تھا وہ بالکل غائب ہو گیا تھا۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سلیمہ خوشی کے مارے کھلی جاتی تھی۔ نواب کو اس میں ایک نیا حسن دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب حسن پہلے کے حسن سے کہیں زیادہ دلکش اور پُر اسرار۔ عمدہ اور نفیس کپڑوں نے اسی حسن کو اور بھی دوبالا کر دیا تھا۔

"تم کتنی اچھی لگ رہی ہو سلیمہ بہت ہی اچھی لگ رہی ہو۔ ہائے۔"

"میں تم کو ہمیشہ یاد کرتی رہی اور جب سے مجھلے مرا ہے تب سے تو اور بھی زیادہ یاد آتے ہو۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ بچے بلے تجینہ وغیرہ میں لگے ہیں۔ کام کاج کچھ نہیں ہے۔ منہ تھتھائے بیٹھی رہتی ہوں۔ تم یہاں آ جاؤ۔ بیگم کے بچے جو ہیں وہ بھی یہاں ٹھکانے سے لگ جائیں گے۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ اس محل میں رہوں۔ مگر یہاں آ گیا تو وظیفہ جاتا رہے گا۔"

"وظیفہ کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو ہو گا۔ تم نے اماں کو تین سو روپے دیے کہ ہماری زندگی بنائی تھی۔ میں تم کو آسانی تین سو روپے مہینہ دے سکتی ہوں۔ یہ گھر بہت بڑا ہے اس کے دو حصے پانچ پانچ سو پہ اٹھے ہوئے ہیں۔ بیچ میں میں رہتی ہوں۔ اتنے ہی میں تمہاری بیگم اور سب بچے رہ سکتے ہیں۔ تم کہاں ٹھہرے ہو۔ نہیں وہاں نہ ٹھہرو۔ میں ابھی موٹر لے کر چلتی ہوں اور تم سب کو یہاں لاؤں گی۔"

"بیگم شاید نہ آئیں۔"

"انھوں نے کبھی مجھے نہیں دیکھا اور نہ میں نے انھیں دیکھا۔"

"وہ تم سے میرے تعلق کو جانتی تو ہیں۔"

"مگر تم بتاؤ ہی کیوں کہ میں سلیماؔ ہوں۔"

"بات تو چھپی نہیں رہے گی۔"

"مگر ابھی نہیں۔ مجھے ابھی اپنے دوست کی بیوی بتاؤ اور سب گھر آجاؤ۔ پھر دیکھا جائے گا۔ تم سب یہیں رہو۔ یہیں رہ جاؤ۔ اس اجڑے لکھنؤ میں واپس جا کر کیا کرو گے۔"

"جی یہی چاہتا ہے سلیماؔ پیاری۔ اب تم اور بھی پیاری پیاری ہو گئی ہو۔ بڈھی ہو کر یہ حسن نکلا ہے۔ مگر بڈھی کیوں کہوں اب تم جوان ہوئی ہو۔ میں مصیبت کا مارا بڈھا ہو گیا۔"

چائے وغیرہ آئی۔ دونوں کھانے پینے میں ایسے جی لگے کہ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہوتے جا رہے ہیں۔

"نہیں سلیماؔ بیگم کو ابھی یہاں نہ لاؤ۔ وہ آجائیں گی تو میری اور تمہاری ملاقات میں رخنہ پڑے گا۔ آج میں تمہارے ساتھ رہوں گا اکیلا۔ بالکل اکیلا۔ کل چل کر سب کو لے آنا۔"

"تم رات تک نہ پہنچے تو وہ سب گھبرائیں گے۔"

"دو دن سے میں بہت رات گئے پہنچا ہوں۔ وہ سب سو جاتے ہیں۔ سو بھی جائیں گے اور صبح ہم دونوں پہنچ ہی جائیں گے۔ گھبرانے کا وقت ہی نہ آئے گا۔"

(۱۴)

دن بڑھ چکا تھا۔ سلیماؔ کو ضد تھی کہ نواب صاحب بیوی بچوں کو اس کے گھر لے آئیں۔ مگر نواب جھجک رہے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کی بیوی سلیماؔ کی طرف ان کی توجہ نہ برداشت کر سکیں گی۔ یہ بات وہ صاف صاف سلیماؔ سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ آخر کو طے ہوا کہ وہ فلیٹ پر جا کر بیوی سے باتیں کریں۔ سلیماؔ کا ڈرائیور بڑی شیورلٹ کار نکال کر لایا۔ وہ اس میں بیٹھے اور ان کو بہت اچھا لگا۔ انھیں اپنی دعا یاد آئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ انھوں نے مانگے تھے ایک لاکھ مگر اب چار لاکھ ان کے پیروں پر پڑے تھے۔ سلیماؔ سے نکاح کر لیں اور وہیں رہ جائیں سب کچھ ان ہی کا ہے۔ مگر ایک بیوی اور اس سے چھ بچے چار لڑکیاں جن میں دو جوان شادی کے قابل۔ دو لڑکے بھی قریب قریب جوان اور کسی کام میں لگ جانے والے۔ اگر ان کی طرف سے اس پردیس میں منہ موڑتے تو ان سے بڑا حرامی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اگر سب کو سلیماؔ کے گھر لے آتے ہیں تو بیوی ضرور ناراض ہو جائے گی اور حالانکہ اسے کبھی پروا نہیں ہوئی کہ وہ کن عورتوں سے تعلق رکھتے تھے مگر سر پر سوت لانا اور ہی بات تھی۔ عجیب کشمکش پیچ و تاب کا عالم تھا اور وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔

فلیٹ پر پہنچ کر وہ بولے۔ "چلو تم سب کو کراچی کی سیر کرا لائیں۔ ایک دوست کا موٹر ہے۔"

"مگر تم رہے کہاں۔ ہم لوگوں کو تو پاؤ فکر کے مارے۔" بیوی نے کہا۔

"ان ہی دوست کے یہاں۔ لکھنؤ کے ہیں۔"

"کون؟"

"تم نہیں جانتیں وہ ڈاکٹرنی تھیں نہیں ہمارے پڑوس میں۔"

"جن کے یہاں لڑکیاں جمع ہوتی تھیں اور تم پڑھنے گئے تھے۔"

"ہاں وہی۔ ان میں سے ایک لڑکی تھی۔ اب عورت ہے بچوں والی ہے یہاں چار لاکھ کی جائداد ہے۔ بنگلہ کوٹھی۔ موٹر سب ہی ہے۔ اسی کے موٹر پہ آیا ہوں۔ تم کو سب گھما کر اس کے یہاں بھی لے چلیں گے۔"

"مگر؟"

"مگر وگر کیا؟"

"دیکھیں تمہیں پھانس تو نہیں لے گی؟"

"اگر پھانس لے تو کیا ہے۔ چار لاکھ کی جائداد۔ دو ہزار روپیہ مہینے کی آمدنی۔ ہم سب کے دلدر پھر جائیں گے۔"

"نا۔ نا۔ سب گھر کا گھر تباہ ہو جائے گا۔ اور میرا وثیقہ بند ہو جائے گا اور سامان جو چھوڑ آئے ہیں وہ سب جائے گا۔ ایسی بالکل نہ سوچو۔"

"خیر چلو سیر تو کر آؤ اور پھر وہ میرے دوست کی بیوی کا گھر بھی دیکھ آؤ۔ انہوں نے کہا ہے کہ کھانا دانا وہیں ہو گا۔"

غرض سب تیار ہو کر چلے۔ ڈرائیور پٹھان تھا اور شکل ہی سے نواب کی نستعلیق اردو سمجھ پاتا تھا۔ راستے میں انہوں نے اس سے دو چار پھیر تو دلوائے مگر وہ سیدھا گھر پہ ہی آ کر رکا۔ سلیما نے سب کا بڑی محبت سے استقبال کیا۔ بچے بچوں کے ساتھ ہو گئے اور بیگم سلیما سے باتیں کرنے لگیں۔

"لکھنؤ میں آپ کہاں رہتی تھیں؟"

"میرا گھر دیہات میں تھا لکھنؤ سے پانچ کوس پر کمال پور۔"

"اچھا تو دیہاتن ہیں۔ مگر آپ تو بالکل صاف بول رہی ہیں۔"

"پڑھنے لکھنے سے بولی صاف ہو جاتی ہے اور پھر یہاں آ کر تو سب ہی دیہاتی بھول جاتے ہیں۔" نواب نے ٹکڑا لگایا۔ سلیما بالکل پڑھی لکھی نہیں تھی اس بات پر اس کا ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔

باتیں کرتے کرتے اس نے کہا: "آپ لوگ سب یہیں رہیں۔ کیوں نہیں یہ یہیں ہیں اور میں تو ہوں گی کہ ہمیشہ یہیں رہیں ماشاء اللہ لڑکے لڑکیاں ہیں۔ ان کے لئے جہاں سب بہتا ہو جائے گا۔"

"اے بہن ہم لوگ یہاں کیسے آ سکتے ہیں۔ ہمارا وثیقہ ہے۔ وہ بند ہو جائے گا۔"

"وثیقہ ان سب بچوں پر بٹ کر کتنا پہونچے گا۔ یہاں وثیقے سے دو گنی آمدنی آپ کی ہو جائے گی۔ اور پھر ان بچوں کو بھی کچھ نہ کچھ کرنے کو مل جائے گا۔ میں تو نواب سے بھی کہتی ہوں کہ اب واپس ہی نہ جائیں۔"

"یہ تو ہرگز نہ ہوگا۔ ہم وطن نہ چھوڑیں گے۔ عزیزیا ادب۔ گھر تو اپنا نہیں ہے اب۔ گھر ہے وہی گھر جس میں باپ دادا کی ارواح ہیں اور پھر اپنے امام باڑے۔ چوں کہ روپیہ زیادہ مل بھی گیا تو کیا بھٹ پڑے ایسا سونا جس سے ٹوٹیں کان۔"

اس قسم کی باتیں دن بھر ہوتی رہیں۔ سلیما کو یقین ہو گیا کہ بیگم اس کے گھر پر نہ ٹھیریں گی۔ بلکہ انھیں نہ معلوم کیا محسوس ہوا کہ وہ ہفتہ بھر بھی اس کے گھر میں ٹھیرنے کو تیار نہ ہوئیں۔ دوسرے ہی دن فلیٹ پر واپس آ گئیں۔ نواب دن بھر اور رات گئے تک اس کے گھر میں بیٹھے ان کی منت سے طریقہ پر ہو کر آئی تھی۔ انھوں نے کہا بھی "مجھے تم سے ہمیشہ محبت رہی مگر اب تو بے پناہ محبت ہو گئی ہے تم کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ بھاڑ میں جائے وثیقہ اور بال بچے۔ آخر یہ بچے بھی تو میرے ہی ہیں۔"

"میں بھی نہیں چاہتی کہ تم واپس جاؤ۔ یہاں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ میرا اپنا سب کچھ تم کر دینے کے لئے تیار ہوں۔ یہیں رہنا۔ کاہے کو جاؤ۔"

اور اس نے یہ سب اتنے خلوص سے کہا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نواب نے اس کا منہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور خوب پیار کئے۔ مگر آخر کار انھیں اسے چھوڑ کر واپس ہی ہونا پڑا۔ اس کا پتہ لکھ کر لے گئے اور جلد واپس آنے کا وعدہ کر گئے۔

کراچی سے لکھنؤ تک کا سارا سفر نہ معلوم کیسے پورا ہو گیا۔ وہ راستے بھر سلیما ہی کے تصور میں محو رہے۔ کبھی کربلا کا خیال کر کے دل میں کہتے "واہ رے دینے والے مولا۔ مانگا تھا ایک لاکھ اور دیئے چار لاکھ اور اپنی جیتی جاگتی عورت کھاتے پیتے بچوں کے ساتھ۔ میری۔ مانتا پوری ہوئی۔ مگر میں اس سے فائدہ ہی نہیں اٹھا سکتا۔ لکھنؤ میں آ کر بھی ہفتوں اسی سوچ میں رہے۔ سلیما کو روز ایک خط بھیجتے اور روز ہی اس کا جواب بھی ضرور آتا۔

(۱۵)

جس مقبرے میں نواب رہتے تھے اس کے پیچھے چار دیواری تک کافی جگہ خالی تھی اس کے ادھر ادھر الگنی باندھ کر ایک آنگن سا ہو گیا تھا جس میں وہ ایک طرف سب سے الگ پلنگ بچھاتے اور دوسری طرف ان کی بیوی اور بچوں کے پلنگ بچھتے۔ گرمیوں کی رات تھی کہ ان کی بیوی کے پاس ایک صاحبہ برقعہ اوڑھے آئیں اور بین کرنے لگیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"اے ہے یہ پاکستان نہیں بلا ہے۔ ہم کو تباہ کر رہا ہے۔ عجیب نشا ہے پاکستان جانے کا جیسے پر سوار ہوتا ہے بھوت کی طرح جو دیکھو بھاگا چلا جا رہا ہے۔ میرا میاں بھاگ گیا۔ تین جوان لڑکیاں اور میں کیا کروں۔ بڑا حرامی نکلا۔ بیس برس شادی کو ہو گئے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک دن بھی مجھے چھوڑ کے جاتا۔ مگر پاکستان کا بھوت ایسا سوار ہوا کہ اس حرامی پن پر آ گیا۔"

"اے ہے بہن اور وثیقہ؟"

"اب وثیقہ کیسے گٹے کر کے بکتے ہیں۔ اس نے اپنے تینوں روپیہ بیچ لئے۔ ہاں میرے پندرہ ہیں۔ مگر اب اسے میں کیا کروں اپنے منہ تک سہارا نہیں پڑتا۔ ایسی حرمزدگی سوار ہوئی اس کے سر پہ۔ میں منع کرتی تھی۔ وہ سبز باغ دکھاتا تھا۔ آخر کر چلا گیا۔"

نواب نے اپنی جگہ پر کہا "شریفہ کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟"

نواب کی بیگم نے کہا "ہاں ہاں مہک بیری ہیں۔"

"آپ لوگوں کو نہ عقل ہے اور نہ صبر۔ وہ مجھ سے برابر باتیں کرتا تھا۔ کچھ دن صبر سے بیٹھئے دیکھئے وہاں وہ کیا کرتا ہے۔ تینوں لڑکیوں کی مناسب شادی کا ڈول ڈالنے کا سامان ہو جائے گا۔ کسی کام میں لگے گا۔ آپ سب کو بلالے گا۔ دن پھر جائیں گے۔"

اب ان صاحبہ کی آواز آئی "اس وقت تو مصیبت ہے۔ کٹتے نہیں کٹتی۔"

"ابھی دو مہینے تو ہوئے ہیں۔ چھ مہینے سال بھر انتظار کیجئے۔"

یہ کہہ کر نواب اپنے خیالات میں گم ہو گئے۔ ان کی بیوی اور وہ صاحبہ چپکے چپکے باتیں کرنے لگیں۔ نواب کی اسی دن بمبئی والے مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ مولوی صاحب ایک اور قافلے کی تلاش میں آئے تھے۔ نواب کے اب کربلا جانے کا سوال نہ تھا مگر پاکستان جانے پر جان جا رہی تھی۔ انہوں نے مولوی صاحب سے پاسپورٹ اور ویزا کرانے کی درخواست کی تھی اور یہیں روپیہ وثیقہ کا بھی بیچ دینے کی درخواست دی تھی۔ دونوں کام ایک مہینے میں ہو جانے کی اُمید تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وثیقہ بک کر سات ہزار اور دو سو ملیں گے۔ سات ہزار بیوی کے پاس چھوڑ جائیں گے اور دو سو لے کر خود سلیما کے پاس پہنچیں گے۔ بیوی کو یہاں تنگی نہیں ہوگی۔ کیا معلوم وہاں سب لڑکیوں کا سیتا ہوتے ہوتے سال بھر لگ جائے۔ بیوی اپنے چالیس وصول کرتی رہے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لڑکیوں کی شادیاں ٹھہرا کے یہاں آئیں اور یہیں سے رخصت کر کے وہاں پہنچ جائیں۔ لڑکے اپنے آپ جاتے رہیں گے۔

یوں ہی سوچتے سوچتے انھیں خیال آیا کہ شمشیر کی بیوی بھی انھیں بڑا حرامی کہتی پھرے گی۔ ضرور کہے گی۔ مگر انہوں نے کہا کوئی پرواہ نہیں۔ ہم جس چیز کو حرامی پن کہتے تھے وہ اب ضروری ہو گیا ہے نہیں تو کام نہیں بنتا۔ سلیما کی محبت میں اب کی اس کی خوش حالی کی وجہ سے ضرور ہو گیا تھا۔ روپیہ کے لئے محبت کرنا بھی حرامی پن تھا۔ مگر اب وہ کیا کرتے کہ محبت کا جوش بڑھتا ہی چلا آرہا تھا۔ سلیما کا تصور اب حسن صفائی اور زور کے ساتھ ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ویسا کبھی پہلے نہ ہوا تھا۔ اصل میں انھیں سچا عشق اب جا کر ہوا تھا۔ اس جوانی والے عشق میں یہ زور نہ تھا۔ آنکھیں ہر طرف سلیما کو ہی ڈھونڈتی تھیں۔ افسانہ پڑھنے میں سلیما ہی کی تصویر سامنے آتی تھی۔ خوابوں میں بھی وہ ایسی حسین پہلے نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ان کا سن چالیس اوپر آ گیا تھا اور سلیما بھی قریب اتنی ہی ہوگی۔ جہانگیر اور نور جہاں کا قصہ انھیں معلوم تھا۔ اسی سن میں دونوں کا عشق کمال پر پہنچا تھا۔ ان کے اندر بھی مغلوں کا خون تھا۔ وہ اسی سن میں آ کر اپنے پورے جوش پر آیا تھا۔ راتیں تڑپ تڑپ کر بسر ہوتیں۔ دن ذرائع ڈھونڈھنے کی کوششیں کر کے گزر رہے تھے۔ دس بجے گھر سے نکل کر وثیقہ کے دفتر جانے اور وہاں لوگوں سے روپیہ ملنے پر منہ میٹھا کرنے کے وعدے کرتے۔ کاتدوں کے آگے بیٹھنے کی باتیں کرتے۔ دوپہر کو آ کر کھانا کھاتے۔ سو جاتے۔ سہ پہر سے دریا کے کنارے نکل جاتے۔ وہ شہر جس کی گلیاں ان کو بچپن سے پیاری تھیں۔ اب کاٹنے لگا تھا۔ سڑک پر چلتے تو معلوم ہوتا کہ سڑک زمین سے اٹھی جا رہی ہے۔ کوئی دوست نہیں دکھائی دیتا جس سے باتیں کرتے۔ کبھی کوئی مل گیا تو پاکستان ہی کی باتیں چھڑتیں اور وہ بھی پاکستان پہنچنے کی حسرت میں نظر آتا۔ ایک ان کی بیوی تھیں اور بیوی کی کچھ بہنیں جن کو پاکستان کے نام سے نفرت تھی ان احمقوں کے ساتھ حرامی پن کرنا ان کے لئے لازمی ہو گیا تھا۔

چنانچہ وثیقہ سے روپیہ ملنے پر بیوی سے غل کیا: "دیکھو۔ وہی مولوی صاحب جنہوں نے ہمیں کربلا بھجوایا تھا اب بمبئی رہ رہے ہیں۔ نواب کی عورتوں کے جانے کی ضرورت نہیں ہے میں نے کہا چار جوان لڑکیاں اور بیوی یہاں اکیلی کیسے رہیں گی اور اس مقبرے کا معاملہ۔

کھلا معلوم تو انہوں نے کہا تو کسی عزیز کے پاس ٹھہرے کر رہو۔ تمہاری بہنیں اپنے اپنے گھروں میں ہیں ان کے پاس ایک کرایہ کا گھر سو روپیہ مہینے پر مل رہا ہے۔ سال بھر کا کرایہ بارہ سو مولوی صاحب دے دیں گے۔ اور پھر تمہارے خرچ کے لئے جو کچھ وہ دیں تم کتنا چاہتی ہو۔

"تمہارا وثیقہ تو بند رہے گا میرے چالیس ہیں گے۔ اسے ڈیڑھ سو مہینہ تو ہو۔ لڑکے بارے ہیں۔"

"لڑکے ساتھ جائیں گے۔ لڑکیاں تمہارے ساتھ رہیں گی۔ دو سو روپیہ کے حساب سے سال بھر کے ہوئے چار سو اور دو ہزار میں نے کہا اس کے دیگئے۔ بعد سے پانچ ہزار دے دیں۔ وہ راضی ہو گئے۔"

"پانچ ہزار۔ پانچ ہزار۔" بڑے تعجب میں آ کر بیگم کے منہ سے نکلا۔

"ہاں بیگم پانچ ہزار ابھی لا دوں"

"بیگم نہال و نہال ہو گئیں۔"

"اور کرایہ بھی اسی میں دینا ہو گا مکان کا نہیں؟"

"نہیں اس کے بارہ سو الگ۔"

"تو تم لوگ مزے۔ جاؤ۔ بڑے اچھے ہیں وہ مولوی صاحب۔ خدا ان کا بھلا کرے۔"

چنانچہ سات ہزار دو سو روپیہ میں سے مٹھائی وغیرہ کھلا کے انھیں کچھ اوپر سات ہزار پہنچے۔ اس میں سے مکان والے لالہ کو پیشگی بارہ سو دیکر مکان میں سب منتقل ہو گئے۔ پانچ ہزار بیگم کو گنا دیئے۔ بیگم نے نوٹوں کو جو سو سو کے تھے اپنے تکیہ میں رکھ کر سی لئے اور بہت خوش ہوئیں۔ باقی آٹھ سو میں نواب نے اپنے اور اپنے لڑکوں کا سامان ٹھیک کیا۔ چار سو میں سب کا سامان ٹھیک ہو گیا اور چار سو کرایہ کے رکھ کر وہ اطمینان سے چل دیئے۔ وہ خوش تھے کہ انہوں نے دوسروں کی طرح کوئی حرام پن نہیں کیا ہاں بات کو بیوی سے چھپانا کچھ مشکل تھا مگر یہ کرنا لازمی تھا۔ اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ لڑکوں میں ایک انیس کا تھا اور ایک اٹھارہ کا۔ ان کو بھی نہیں معلوم ہوا کہ کہاں جا رہے تھے۔

غرض نواب اور اس کے دونوں لڑکے کراچی پہنچ گئے اور سلیمان کے گھر اترے۔ سلیمان تینوں لڑکوں کے ساتھ۔ دونوں لڑکے بھی گھر کی طرح رہنے لگے۔

(۱۶)

کراچی میں سلیمان کے ساتھ رہنے لگا۔ اس کی دولت سے فائدہ اٹھانے کی خوشی کو کچھ ہی دن میں نواب کی ایک فکر نے کم کر دیا۔ وہ فکر ان لڑکیوں کی شادی کی تھی جن کو لکھنؤ میں چھوڑ آئے تھے۔ سلیمان کے لڑکے ہی لڑکے تھے اس نے اس کے پاس ایسی فکر کبھی نہیں آئی مگر اب کیونکہ وہ نواب کی ہر خوشی اور غم میں شریک تھی اس نے بھی کوشش کی کہ یہ فکر دور ہو۔

بہت سے لوگوں سے ذکر کئے گئے اور اشتہار بھی دیئے گئے۔ ان سب سے نواب نے نتیجہ نکالا کہ لڑکے پڑھی لکھی لڑکیاں چاہتے تھے اور ان کی لڑکیوں کو بس سپارے پڑھوا کر قرآن ختم کرا دیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ لڑکے جائداد اور روپیہ پر نظر رکھتے تھے اور ان کے لئے سلیمان کی جائداد میں سے لڑکیوں کو کچھ دلوانے کا خیال بے ایمانی تھا۔ ان سلیمان کو مناسب طریقہ پر رخصت کر دینے کو تیار تھی۔ ان کے

خاندان میں شادیوں کا بس ایک طریقہ رہا تھا کہ وثیقہ دار آپس میں وثیقہ کا حساب لگا کر شادی کر دیتے کوئی شخص بیچ میں بھی پڑ جاتا جیسے لالہ ان کی شادی کے بیچ میں پڑے تھے۔ اب لالہ لوگ بھی بدل گئے تھے اور ان کو شادیاں کرانے سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی اور پھر وثیقہ داروں میں جوان لڑکے سب ہی بھاگ بھاگ کر پاکستان آ رہے تھے اور پھر لڑکے بڑے حرامی ہوتے جا رہے تھے۔ شادیاں کر کر کے چھوڑ دیتے تھے۔

نواب نے یہی دیکھا کہ کراچی میں دھوکے بازی بڑی عام تھی۔ ہر معاملہ بڑا ہی نازک تھا۔ چھ مہینے میں بجائے لڑکیوں کے لئے لڑکے ملنے کے ان کو کافی ناامیدی ہو گئی کہ اب لڑکیوں کی شادی ہونا محال ہے۔ سلیمٰی کی رائے ہوئی "لڑکیاں یہاں آ جائیں۔ گھر میں پھریں ملیں جلیں تب شاید کہیں شادی ہو جائے"۔ نواب کو یہ عمل بڑا ناگوار تھا۔

ادھر ان کی بیوی پر سارا راز کھل گیا تھا۔ وہ اپنے میاں کو بڑے حرامی۔ بڑے دھوکے باز کہنے لگی تھیں اور پریشانی سے دبلی ہوتی جا رہی تھیں۔ ہوا یہ کہ ان کے ایک بہنوئی نے آ کر کہا "سنا تم نے باجی تمہارے میاں نے وثیقہ بیچا اور تم کو روپیہ دے کر اور خود لے کر کہاں پہنچے ہیں کراچی اور وہاں کسی کے پاس ہیں۔ وہی سلیمٰی کے پاس جو وہاں لکھ پتی ہو گئی ہے۔"

"کون سلیمٰی؟"

"اب ایسی بھولی نہ بنو۔ سب ہی جانتے تھے۔ تم کو بھی معلوم تھا کہ شادی سے پہلے اور پھر تمہیں معلوم نہیں شادی کے بعد بھی چھپا چھپا کے اس کے گاؤں کمال پور جاتے تھے۔"

"یہ سب ہو گا۔ مگر اس کا کراچی سے کیا تعلق؟"

"اسی کے گھر تمہیں سے ملنے تھے اور اب اسی کے یہاں گئے ہیں۔"

"تو وہ بھی بڑے حرامی دھوکے باز نکلے۔"

یہ کہہ کر ان کو آنا روز آ آیا کہ گھگھی بندھ گئی اور وہ کہتی رہی "ارے میرے لڑکوں کو بھی اس ڈائن کے گھر لے گئے۔ زہر دے کر نہ مار دے۔ یہ تو اپنے مزوں میں رہیں گے۔"

خیر اس دن کو انھیں سنبھالا گیا مگر ان کو جو دھن اور رٹ لگی اس کا علاج نہ ہو سکا۔ بیٹھے بیٹھے چونک اٹھتیں اور کہتیں "بڑے حرامی دھوکے باز۔"

پاس جو روپیہ تھا وہ علاج میں صرف ہونے لگا۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ کراچی میں کہاں ٹھہرے تھے اس کا پتہ بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور معلوم بھی ہوتا تو خط لکھنے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔ نواب نے بھی خط نہ بھیجا کہ راز کھل جائیگا۔ وہ یہ بھی نہ طے کر پاتے تھے کہ ٹھہریں یا جائیں کیونکہ لڑکیوں کا لکھنؤ میں سہارا تو وثیقہ تھا مگر کراچی میں کسی سہارے کی امید نہ تھی۔ وہ یہ بھی سوچا کرتے کہ اگر ایک لاکھ روپیہ نقدان کے ہاتھ میں آ جاتا تو دوسری بات ہوتی۔ سلیمٰی کا چاہا کر جو ان کے سامنے آیا تو اس سے انھیں کیا ملا۔ اپنی دعا کا خیال کرتے اور سوچتے کہ وہ پوری ہوئی بھی تو کیسے اور اپنے ہی کو الزام دیتے کہ دعا مانگی تو صاف صاف نہ مانگی اس لئے مولا نے جس طرح مناسب سمجھا ایک ایک کے چار دے دیئے۔ سارا معاملہ الجھا نظر آتا۔ سلیمٰی کے ساتھ خوش رہنا محال ہو گیا آخر کر ایک دن بولے "میں سوچتا ہوں لکھنؤ ہو آؤں۔ بیوی اور لڑکیاں

کا کیا حال ہوا معلوم نہیں۔"

"ان سب کو یہاں سے آنے نا۔ گھر بھر جائے گا میرا۔"

"بیوی کیسی ضدی نہیں ہے۔ وہ کہیں کھسکے گی اور پھر وہاں وثیقہ کی امید ہے یہاں کچھ بھی تو نہیں ہے۔"

"پھر میں جتنا جتنا وثیقہ ہر ایک کا ہوگا اتنا دے دوں گی ہوا بھی کیا کوئی سارا دو سو روپیہ ہی تو ملے گا۔"

تم میرے لیے سب کچھ کر دو گی اور تمہارے لڑکے بھی آخر میرے ہی ہیں یہ بھی ان بھائی بہنوں کے ساتھ اتنا تو کر ہی دیں جتنا دیتے ہیں۔ مگر وہ بیوی۔ اس کو سمجھانا ناممکن ہے۔ وہ کوئی بات سمجھنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئی ہے سمجھانے اسے کوئی ہم اُلّو کا پٹھا۔"

"آخر کو یہ ٹھہری کہ نواب لکھنؤ جائیں لڑکوں کو کراچی چھوڑتے جائیں کیونکہ لڑکے کاموں میں لگ گئے تھے اور گرفتہ بیوی اور لڑکیوں کو لے آئیں اور اپنے ہندوستانی پاسپورٹ پر جس کو انہوں نے کٹوایا نہیں تھا نواب لکھنؤ واپس آئے گھر پہنچے تو بیوی نے گھر میں گھسنے نہیں دیا۔ اندر سے آواز آتی رہی "بڈھے حرامی دھوکے باز" میرے لڑکوں کو کہاں چھوڑ آیا۔ ان کو کرکے سمندر میں ڈال دیا یا دریا کے نیچے۔ میں تو ہرگز نہ گھر میں گھسنے دوں گی۔ وہیں جاتے کیوں آیا ہے یہاں میں صورت نہ دیکھوں گی۔ وہ دروازے ہی پر بیٹھے رہے سمجھتے رہے کہ ابھی سفر نہیں ختم ہوا ہے۔ رات گئے جب بیوی سو گئیں تو لڑکیوں نے دروازہ کھولا اور باپ کو گھر میں داخل کر دیا۔

صبح کو نواب سب کاموں سے فارغ ہو گئے بیوی سوتی ہی رہیں۔ دس بجے وہ وثیقہ لے دفتر روانہ ہوئے تاکہ اپنا چڑھا وثیقہ وصول کریں۔ لڑکوں سے ملتے جاتے رہے۔ بیوی جو سو کر اٹھیں تو بولیں کہاں وہ بڈھا حرامی۔ دھوکے باز" لڑکیوں نے کہا۔ وہ پھر بولیں "ارے میرے لڑکوں کا تو حال پوچھا ہوتا۔"

"ہم نے پوچھا۔ سب بھائی اچھی طرح ہیں۔ کام کر رہے ہیں۔ کما رہے ہیں۔ وہ آ نہیں سکتے۔ وہیں کے ہو گئے۔ ہم کو بھی وثیقہ کی آمدنی وہاں ضرور ہو جائے گی۔ یہاں گزارہ کر کیا کرے کوئی۔" چاروں لڑکیوں نے ایک زبان کہا۔

"ارے تم بھی بڑی حرامی ہو دھوکے باز کی جنی تم بھی اسی کی طرف ہو گئیں۔ رات میں کیا معلوم اس نے تم کو کیا سبز باغ دکھائے میں تو بے خبر سو گئی۔ تم منہ در منہ ہر گئی ہو گی اور کہیں بیٹھ کر باتیں بنائی ہوں گی۔"

"ہمیں کیوں جاتے ہم نے گھر میں جا لیا۔ آخر ہمارے ابا ہیں ———— ہماری چاہت میں یہاں آئے اور ہماری وہاں بھی سوچتے رہے۔"

"ارے اب تم بھی اس کے ساتھ جاؤ۔ مجھے موت بھی نہیں آتی۔ مر چکوں تو عذاب کٹے۔ بیمار ہوں مرتی نہیں ہوں۔"

دن بھر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ نواب رات گئے آئے، اور لڑکیوں نے پھر انہیں گھر کے اندر کر لیا۔ مہینوں یوں ہی گزرے مگر میاں بیوی نے ایک دوسرے کو نہ دیکھا۔ نواب نے چڑھا ہوا وثیقہ وصول کیا بڑی لڑکی کی بیماری کا بہانہ کر کے اپنے وثیقے کے پیشگی لیے۔ بیوی کی بیماری میں دو مہینوں کے روپیہ خرچ کیا۔ بڑی لڑکی جو اب ماشاء اللہ سیانی تھی سارے روپیہ کو اپنے پاس رکھے رہی اور ہم

میں خرچ کرتی رہی۔ اس سے چاہا کہ ماں باپ کا آمنا سامنا ہو جائے مگر بیوی کی ایک نا اور ہزار نا ختم ہونا تھی نہ ہوئی۔" اف۔ نوہ۔ اف نوہ۔
ایسے حرامی۔ ایسے دھوکے باز۔ سامنے میں مرجاؤں کسی طرح۔ میرے والے سب جہاں ہیں وہاں پہنچ جاؤں۔" یہی صدا ان کی زبان پر رہی۔

(17)

کیا نواب کو بھی کبھی یہ خیال آیا کہ وہ خود بڑے حرامی دھوکے باز تھے! کیا شروع ہی سے ان کی زندگی دھوکے بازی نہ تھی؟ وہ اپنے ساتھیوں میں سیدھے مشہور تھے۔ جہاں بھی جاتے سیدھے اور بھولے کہلاتے، ان کو آسانی سے دھوکا دیا جاتا رہا۔ مگر کیا وہ اپنی والدہ کو دھوکا نہیں دیتے رہے۔ کیا بیوی کو دھوکا نہیں دیتے رہے! کیا وہ اپنے دل میں یہ نہیں چاہتے رہے کہ بیوی کسی طرح مر چلے! کیا اس کے مرنے پر انھیں دلی خوشی نہیں ہوتی؟ کیا اس کو انہوں نے اپنی راہ میں حائل نہیں سمجھا!

ان کی سالیاں ان کی بابت کہا کرتیں "کاس کمبخت بیوی کو کڑھا کڑھا کے مار ڈالا۔ زندگی بھر چھاتی پر کودوں دلی اور آخر میں تو قیامت ہی کر دی۔ کراچی میں اس دیہاتن کے گھر سے گئے تھے اور کہتے تھے کہ اسی کے ساتھ رہو۔ نہ معلوم کہاں سے روپیہ پھٹ پڑا۔ اور قسمت کا دھنی کہئے تو ایسا۔ خدا چھپڑ پھاڑ ہی کے دیتا ہے۔"

ہم زلفوں میں سے ایک کی رائے ذرا مختلف تھی "وہ چھپا حرامی ہے۔ ایسا ہی حرامی بڑا حرامی ہوتا ہے۔ اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ ہم لوگ اس کو احمق کہا کرتے تھے مگر اپنے کام میں کتنا ہوشیار نکلا۔ بیوی کی طرف سے لڑکیوں کو جو زیور ملا وہ سب بیچ کر لڑکیوں کو گہنے سے لاد کر ٹ کیا۔ اپنا بھی ہر ہر پہلو سے جتنا بک سکتا تھا بیچ لیا۔ اور پھر سنا ہے وہاں لکھ پتی بنے بیٹھے ہیں۔ وہ سلیما۔ کیا قسمت لے کر آئی تھی۔ اب اس سے نکاح کر لیا ہے۔ اس کے بچے بھی تو ان ہی کے تھے۔ گھسیٹے تو اوپر لگی ہوئی نام کی پرچی سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔"

دوسرے کہتے "اما غور سے دیکھو تو سارا کھیل حرامی پن ہی تھا۔ اور آج کل سب ہی ایسا کرنے لگے ہیں۔ یہ چودھویں صدی ہے تکڑم بازی۔ دھوکے بازی۔ دھاندھلی سارا کا سارا حرامی پن تکڑم کسے کہے۔ کیا ہم نے ایسا نہیں کیا۔ کیا ہم نے گھر سے چھپ کر موٹریں نہیں لیں۔ ہاں ہم سیانے تھے۔ اپنے اوپر بار کرکے کسی کو چار پانچ روپے نہ دیتے۔ اپنا کام نکالنے چل کھڑے ہوتے۔ یہی دن ہنس کر خرچ کر دیتے۔ مگر اس نے سلیما کی ماں کا گھر بھر دیا۔ اور اب وہی نتیجہ ملا۔ بڑی اچھی تجارت چار دے کر چار لاکھ لے اور وہ چینی چاہنے والی کھاتے ہیں۔ یعنی وہ کہانیوں میں کہا کرتے تھے۔ بہن۔ جیسے ان کے دن پھرے ویسے کہتے سنتوں کے دن پھریں۔ خوب دن پھرے۔ واہ۔"

نواب کے والد اور والدہ کی طرف سے عزیز بہت کم تھے۔ مگر ان کے کراچی آجانے کے بعد معلوم ہوا کہ ایسے عزیز بھی پڑے ہیں۔ دفتروں میں تجارتوں میں لاتعداد عزیز دکھائی دینے اور ان کے گھر پر آنے لگے۔ ان کے جوان لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں اور نواب کے لڑکے لڑکیوں کی شادیوں کا سلسلہ بندھنے لگا چنانچہ وہ پریشانی اور ناامیدی جس نے انھیں پہلے پہلے ستایا تھا دور ہو گئی۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

آدم اور حوا کی طرح اپنی کوٹھی کے فردوس میں دونوں شام کے وقت لان پر آرام کرسیوں پر پاس پاس بیٹھے نظر آتے۔

نہ معلوم کس پیار کی باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی کبھی شیطان نہیں تو شیطانی خیال سانپ بن کر نواب کے دماغ سے پھن کاڑھتا ہوا نکلتا۔

"میری بیوی مجھے بڑا حرامی، دھوکے باز کہتی ہوئی مر گئی۔"

سلیمہ اس سانپ کے کہنے پر شجرِ ممنوعہ دکھانے کے بجائے اس کا سر کچلنے کے لئے کہتی: "ان کو کیا حق تھا حرامی کہنے کا۔ تم نے اُن کے ساتھ کیا حرامی پن کیا۔ ان کی ایسی چڑچڑی بددماغ عورتیں شوہروں کو مرتے مرتے نہ بخشا۔ اور پہلے تم بیمار تھے۔ روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی روک نہ سکی تھیں تو بھلا تمہاری ان سے شادی ہوتی مجھ سے ہوتی۔"

"اور اپنے شوہر والے بھی تو اسی طرح یاد کرتے ہیں۔"

"وہ سب جلتے ہیں اور ان کے کہہ کر مر جانے پہ چھٹی ملی تو وہی کہتے پھرتے ہیں۔ جتنے وہ حرامزادوں کو بڑے حرامی وہ ہفتاد بست۔"

نواب سلیمہ کے بھرے ہوئے چہرے کو سرخ ہوتا ہوا، بھوؤں پہ بل پڑتے ہوئے، ناک چڑھتی ہوئی غور سے دیکھتے۔ اُن کا تاسف محبت میں بدل جاتا۔ سلیمہ بھی ان کی نگاہ میں پیار بھرتا دیکھ کر مسکرا دیتی۔ دونوں منہ سے منہ ملا دیتے۔ ان کی جنت میں شیطان کا گذر نہ تھا جو ان کے میل میں رخنہ ڈالتا اور ان کے جنت سے نکلنے کا باعث ہوتا۔ اُس بڑے حرامی دھوکے باز کو انہوں نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔

راکھ میں آگ

میرزا ادیب

کردار:

جس ترتیب سے سٹیج پر آتے ہیں

زیبو :— ایک یتیم لڑکی

نوری بابا :— گھر کا بوڑھا نوکر

الطاف :— قاضی جلیل احمد کا لڑکا

صفیہ :— قاضی جلیل احمد کی لڑکی

بیگم :— قاضی جلیل احمد کی بیوی

قاضی جلیل احمد

عائشہ :— قاضی جلیل احمد کی ایک غریب رشتہ دار

خان صاحب :— شہر کے ایک معزز آدمی

منظر:

قاضی جلیل احمد کا ڈرائینگ روم

ڈرائنگ روم کے فرنیچر پر پہلی نظر ڈالتے ہی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ جو لوگ یہاں رہتے ہیں وہ زندگی کی ظاہری چمک دمک کا بطور خاص خیال رکھتے ہیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے گہرے رنگوں کے ہیں، تصویریں جو دیواروں پر آویزاں ہیں، شوخ رنگوں ہی کی مظہر ہیں۔ کرسیاں، تپائیاں اور میز اس ترتیب سے رکھی گئی ہیں کہ ان سے کسی سلیقہ شعاری کا ثبوت نہیں ملتا۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ ہر شے نمایاں طور پر دکھائی دے۔

سامنے مینٹل پیس پر سجاوٹ کی چھوٹی چھوٹی چیزیں پڑی ہیں۔ اس سے آگے کچھ فاصلے پر صوفہ سیٹ ہے۔ بائیں جانب جو دروازہ ہے وہ کسی دوسرے کمرے میں کھلتا ہے اور دائیں جانب کے دروازے سے لوگ باہر جاتے اور اندر آتے ہیں۔

وقت: موسم سرما کی ایک دوپہر

جس وقت پردہ کھلتا ہے زیبو کمرے کے وسط میں کھڑی ہے۔ ایک ہاتھ میں کوئی پینٹنگ ہے اور دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑی۔ کمرے کا اس طرح جائزہ لے رہی ہے جیسے سوچ رہی ہو کہ اس تصویر کو کہاں لگانا چاہیے۔

زیبو : تیرہ چودہ برس کی ایک بھولی بھالی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ چہرے پر ایک غمناک متانت ہر وقت رہتی ہے
لباس بہت معمولی۔ پاجامہ، قمیص، سویٹر اور اوپر دوپٹہ۔

تین چار لمحوں کے بعد گھر کا بوڑھا ملازم نوری بابا آتا ہے۔ خمیدہ قامت، میلی کچیلی چادر لپیٹے ہوئے کھانسی سے برا حال ہے۔

زیبو اسے دیکھ کر کرے کا جائزہ لینا چھوڑ دیتی ہے اور اس کی طرف آتی ہے۔

زیبو : نوری بابا! کیا حال ہے۔ توبہ اتنی کھانسی :

نوری : (کھانسی سے عارضی نجات پا کر) مر اجا رہا ہوں بیٹی!

زیبو : بڑی کھانسی آ رہی ہے آج تو

نوری : ہے ۔ کیا کیا جائے بیٹی ۔ اچھا اللہ کا شکر ہے۔

زیبو : گھر میں کیا حال ہے!

نوری : دونوں چھوٹی بچیاں ابھی تک بخار میں پھنک رہی ہیں۔

زیبو : ابھی آرام نہیں آیا!

نوری : کہاں زیبو بیٹی ۔ میری تو کمر توڑ دی ہے ان لڑکیوں نے۔

زیبو : اللہ اچھا کرے۔

نوری : مولا رحم کرے۔

زیبو : بڑے دکھی ہو!

نوری : (آہ بھر کر) اچھا بھلا ہی مرتی اس نیل چھت والے کی۔ کوئی کیا کر سکتا ہے (کھانستے ہوئے) ہائے مر گیا۔

زیبو : پانی لاؤں بابا!

نوری : پانی کیا کرے گا!

زیبو : بابا! دوا کیوں نہیں پیتے!

نوری : زیبو! تم بھی کیا پاگلوں کی سی بات کرتی ہو۔ دوا اپنے جیسے لوگوں یا بیمار بچیوں کے لیے۔ ان کا رونا دیکھا نہیں جاتا۔ کسی کو بخار ہوتا ہے تو وہ رونے لگتی ہے کیوں روتی ہے!

زیبو : تکلیف کی وجہ سے!

نوری : یا یہ سوچ کر کہ ہمارا غریب باپ علاج کے لیے پیسے کہاں سے لائے گا۔ یہ زیبو! اولاد بیمار ہو تو علاج کرانا ہی پڑتا ہے۔ چوری کریں، ڈاکہ ڈالیں یا پیٹ کاٹیں۔

زیبو : جی ہاں!

نوری : تم یہاں کیا کر رہی ہو؟

زیبو : یہ تصویر لگانی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں لگاؤں

نوری : اچھا بیٹی! ہر وقت کام نہ کیا کرو۔ آرام بھی کر لیا کرو کسی وقت۔ صبح سے شام تک کام میں جُتی رہتی ہو۔ (کھانستا ہے ، اور میرے مولا —

(نوری جانے لگتا ہے۔ الطاف سیٹی بجاتا ہوا آتا ہے۔ پتلون شرٹ پہنے ہوئے
سمارٹ نظر آتا ہے عمر گیارہ برس کے لگ بھگ۔ ہاتھ میں ریکٹ)

الطاف : زیبو! میرے بوٹ پر پالش کی؟

زیبو : کر دی ہے چھوٹے بابو

الطاف : سفید بوٹ پر پالش کی ہے ناں۔

زیبو : جی نہیں۔ براؤن پر۔

الطاف : (چیخ کر) تو اب میں کھیلنے کے لیے پہنوں گا کیا۔ تمہارا سر؟

زیبو : سفید بوٹ پر کیے دیتی ہوں۔

الطاف : تو جلدی کرو۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔ پالش کر کے بوٹ میرے کمرے میں رکھ دینا۔ سُنا تم نے زیبو کی بچی!

زیبو : سن لیا ہے چھوٹے بابو۔

(الطاف جانے لگتا ہے۔ بیرونی دروازے کی طرف رُخ ہے)

میں نے کہا — چھوٹے بابو؟

الطاف : کیا ہے؟ (رُک جاتا ہے)

زیبو : یہ تصویر؟

الطاف : ہاں یہ تصویر

زیبو : میرا مطلب ہے کہاں لگاؤں!

الطاف : میں کیا بتاؤں۔ باجی سے پوچھو۔

(الطاف سیٹی بجاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ زیبو پھر کمرے کا جائزہ لینے لگتی ہے۔ صفیہ
آتی ہے ماڈرن قسم کی ساڑھی پہنے ہوئے عمر سترہ اٹھارہ کے قریب۔ بڑی مغرور لڑکی ہے)

صفیہ : اے زیبو — بو

زیبو : جی باجی!

صفیہ : میرا کشیدہ استری کر لائی ہے؟

زیبو : لے کر گئی تھی جی پر دھوبی کہتا تھا استری میں کوئلے نہیں ہیں۔

صفیہ : استری میں کوئلے نہیں ہیں تو کیا بازار میں اور کوئی دھوبی نہیں ہے۔ کوئی واشنگ فیکٹری نہیں ہے۔ کوٹ ضرور اسی دھوبی کو دینا تھا؟ عقل تیرے بھیجے سے بالکل غائب ہو چکی ہے۔ تنگ آ چکی ہوں تم سے۔ جو جی میں آئے کرتی ہو۔ مجال جو کسی کی سن جائے۔

زیبو : وہ کہتا تھا ابھی کوئلے لا کر استری گرم کرتا ہوں۔ کوٹ گھر میں بھجوا دوں گا۔

صفیہ : کب بھجوائے گا؟

زیبو : کہتا تھا ابھی بھجوا دوں گا۔

صفیہ : خاک بھجوائے گا۔ زیبو تو بہت سست ہو گئی ہے۔ ایک کام کے لیے تجھے پورا ایک دن چاہیے۔

زیبو : ابھی جا کر لے آؤں بیگم باجی!

صفیہ : مجھے آدھ گھنٹے تک کوٹ چاہیے۔ اور میں کچھ نہیں جانتی۔ نہ ملا تو تیری خیر نہیں ہے۔

(صفیہ دائیں اندرونی دروازے کی طرف قدم بڑھاتی ہے)

زیبو : باجی! یہ تصویر کہاں لگاؤں؟

صفیہ : جہاں سے اتری ہے وہاں لگاؤ اور کہاں لگاؤ گی؟

زیبو : اتری کہیں سے نہیں ہے۔ تپائی کے اوپر پڑی تھی۔

صفیہ : ان سے پوچھو۔

(صفیہ ابھی دروازے میں ہے کہ ذرا دور سے بیگم کی آواز آتی ہے)

بیگم : اے زیبو کی بچی!

زیبو : جی بی بی جی

(بیگم آتی ہے۔ ادھیڑ عمر کی عورت۔ لباس نمائش۔ سرخ چادر اوڑھے ہوئے)

بیگم : کیا ہو رہا ہے یہاں پر!

زیبو : کمرے کی صفائی کر رہی ہوں۔

بیگم : صفائی کر رہی ہے تو یہ ہاتھ میں تصویر کیسی ہے؟

زیبو : (ایک تپائی کی طرف اشارہ کر کے) یہ اس کونے والی تپائی کے اوپر پڑی تھی۔

بیگم : کہیں شیشہ ویشہ تو نہیں توڑ ڈالا اس کا

(بیگم آگے بڑھ کر تصویر دیکھتی ہے)

زیبو : جی نہیں۔ لگاؤں کہاں بی بی!

بیگم : تپائی پر کس نے رکھ دی تھی۔ جھوٹ بولتی ہے۔ دیوار سے گری ہو گی صفائی کرتے وقت بے احتیاطی سے فرش پر گرا دی ہے۔

زیبو : تپائی پر ہی پڑی تھی جی۔

بیگم : وہاں کیسے جاسکتی تھی

زیبو : جی میں کیا جانوں۔ میاں جی باہر سے لائے ہوں گے

بیگم : وہ لاتے تو کرنے میں تپائی کے اوپر رکھ دیتے کہ زیبو بی بی آئے گی اور اسے اپنے ہاتھ سے لگائے گی۔ زیبو! ہزار بار کہا ہے جھوٹ بولنا چھوڑ دے۔ مار مار کر تیری ہڈیاں توڑ دوں گی' بے شرم' بے حیا۔ نقصان کرکے بالکل مکر جاتی ہے۔

زیبو : سچ کہتی ہوں جی

بیگم : پھر وہی بکواس۔ خاموش رہ۔

زیبو : اچھا جی

بیگم : پانی گرم کرکے برتن مانجھے ہیں؟

زیبو : جی——

بیگم : دگر جی کر، جی کیا؟

زیبو : ابھی نہیں!

بیگم : وہ کیوں؟

زیبو : باجی کا کوٹ استری کروانے باہر چلی گئی تھی۔

بیگم : وہ تو بڑی دیر کی بات ہے۔ کام چور، تجھ سے کوئی کام بھی وقت پر نہیں ہوتا۔ دو گھنٹے سے کمرے میں بیٹھی تفریح کر رہی ہے تصویر تپائی پر رکھ دے اور جا اپنی منحوس شکل گم کر

زیبو : کیا کروں جی!

بیگم : سنا نہیں تم نے

زیبو : تصویر؟

بیگم : تپائی کے اوپر رکھ دے۔ بہری ہوگئی ہے کیا بدبخت!

، زیبو تصویر لیے ہوئے تپائی کی طرف جانے لگتی ہے ،

باورچی خانے میں مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ دھو انہیں جا کر۔ جب تک سارے برتن صاف نہ ہو جائیں۔ باورچی خانے سے باہر نہیں نکلنا

زیبو : باجی نے کہا تھا میرا کوٹ لے کر آنا۔

بیگم : بک بک بند کر۔ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ سن۔ بے حیا! ہر کام کا کھونکا سا جواب دے دیتی ہے۔ رکھ تصویر تپائی پر۔

، زیبو تصویر تپائی کے اوپر رکھنے لگتی ہے ،

ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے ہیں کیا۔ جلدی رکھ تصویر۔ پندرہ بیس منٹ تک آتی ہوں باورچی خانے میں۔ برتن سارے کے سارے مانجھے ہوئے نہ دیکھے تو کھال اُدھیڑ دوں گی تیری۔

(زیبو جاتی ہے)

پانی گرم کر لیا۔ ٹھنڈے پانی سے برتنوں کو نہیں دھونا

زیبو : اچھا جی۔

(قاضی صاحب آتے ہیں۔

قاضی صاحب پچاس کے پیٹے میں ہیں، اچکن زیب تن، آنکھوں پر عینک، ہاتھ میں چھڑی، منہ میں پائپ۔ بات ذرا دھیمے انداز میں کرنے کے عادی ہیں، مزاح پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

زیبو انھیں اندر آتے دیکھ کر قدم اٹھاتی ہے۔)

قاضی صاحب : کیوں زیبو!

زیبو : جی کچھ نہیں۔

(زیبو جانے لگتی ہے)

قاضی صاحب : بیگم! آخر یہ ہنگامہ کیا ہے۔

بیگم : کیسا ہنگامہ!

قاضی صاحب : تمہاری آواز سڑک پر سنائی دے رہی تھی۔

بیگم : ذرا بلند آواز سے بول کر دیکھتے ہو۔ تمہاری آواز سڑک پر سنائی دیتی ہے۔

قاضی صاحب : بلند آواز سے بولنے کی ضرورت کیا ہے آخر!

بیگم : یہ کم بخت زیبو جو ہر کام بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

قاضی صاحب : مثلاً

بیگم : مثلاً کیا!

قاضی صاحب : (ہنس کر) یہی تو میں نے پوچھا ہے۔

بیگم : میں نے کہا برتن مانجھ دینا۔ آواز دی تو معلوم ہوا محترمہ یہاں تشریف فرما ہیں۔

قاضی صاحب : بیگم! صبح تم نے خود اسے میرے سامنے کہا تھا کہ کمروں کی صفائی کرنا۔ صفائی کی ہوگی اب تک۔

بیگم : مگر میں نے یہ کب کہا تھا کہ سارا دن کمروں کی صفائی ہی میں لگے رہنا اور کوئی کام نہ کرنا اور یہ! (تصویر اٹھا کر دکھاتے ہوئے) ملاحظہ فرمائیے

قاضی صاحب : تصویر ہے۔

بیگم : نہ جانے کس دیوار سے اتاری ہے۔

قاضی صاحب : کسی دیوار سے نہیں اتاری۔

بیگم : تو کیا آسمان سے نیچے گر پڑی ہے۔

قاضی صاحب : ایسا بھی نہیں ہوا اور زمین سے بھی نہیں پھوٹی۔

بیگم : تو پھر کہاں سے آئی ہے۔

قاضی صاحب : یہ تصویر، بیگم! میں بازار سے خرید کر لایا تھا اور لا کر احتیاط سے تپائی پر رکھ دی تھی۔ بیگم! ایک بات تو بتاؤ

(بیگم تصویر دوبارہ تپائی کے اوپر رکھ دیتی ہے)

بیگم : ارشاد!

قاضی صاحب : تم خدانخواستہ یا خدانخواستہ اس یتیم لڑکی سے تنگ تو نہیں آگئیں۔

بیگم : یہ سوال پوچھنے کا مطلب!

قاضی صاحب : میرا مطلب ہے شاید تم چاہتی ہو کہ یہ کہیں اور جگہ چلی جائے۔

بیگم : میں نے کبھی کہا ہے!

قاضی صاحب : کہا تو نہیں لیکن تمہارے رویّے سے یہی بات نکلتی ہے۔

بیگم : وجہ بتائیے!

قاضی صاحب : ویسے ہی پوچھ رہا ہوں بیگم!

بیگم : ویسے تو نہیں پوچھ رہے۔ کوئی بات ہے ضرور

قاضی صاحب : معاملہ صرف یہ ہے کہ تم ہر وقت اسے سختی سے ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہو اور آواز اس قدر بلند کر دیتی ہو کہ ——

بیگم : (جلدی سے) یہ سڑک تک پہنچ جاتی ہے۔

قاضی صاحب : سڑک تک پہنچے نہ پہنچے، ہمسایوں تک تو ضرور پہنچ جاتی ہے

بیگم : کسی نے کچھ کہا تم سے!

قاضی صاحب : کسی ہمسائے نے تو نہیں کہا۔

بیگم : پھر کس نے کہا ہے!

قاضی صاحب : خان صاحب کہتے تھے قاضی صاحب! آپ نے کسی یتیم لڑکی کو سہارا دے رکھا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ بولے ہماری بھابی کے اس لڑکی سے کچھ اچھے تعلقات معلوم نہیں ہوتے۔

بیگم : کیا مطلب؟

قاضی صاحب : مطلب صاف ہے۔ تم ہر وقت اسے ڈانٹتی رہتی ہو۔

بیگم : یہ کس نے کہا ان سے جا کر!

قاضی صاحب : کسی نے کہہ دیا ہوگا۔ مگر بیگم! اس میں برا ماننے کی بھلا کیا بات ہے۔

بیگم : بُرا ماننے کی بات کیوں نہیں ہے!

قاضی صاحب : تمہارا سلوک اس سے اچھا — میری مُراد ہے کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے

بیگم : تم بھی یہ کہتے ہو۔

قاضی صاحب : میں نہیں دوسرے کہتے ہیں۔

بیگم : دوسرے کون!

قاضی صاحب : یہی خانصاحب وغیرہ وغیرہ قصہ مختصر۔ اپنے دل کی بات کہو اگر تم چاہتی ہو کہ اسے رخصت کر دیا جائے تو آسانی سے اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔

بیگم : آسانی سے انتظام ہو سکتا ہے۔ وہ کیسے!

قاضی صاحب : لیکن پہلے یہ تو معلوم ہو کہ تم اسے رخصت کرنے پر آمادہ بھی ہو۔

بیگم : ویسے تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہے مگر اس کی طرف سے ایک بڑی الجھن لگی ہے۔

قاضی صاحب : کیسی الجھن!

بیگم : تم کیوں سوچنے لگے بھلا۔ مجھے گھر کا سارا انتظام کرنا ہوتا ہے اس لیے میں ہی سوچتی ہوں۔ تم تو تنخواہ میرے ہاتھ میں دیکر مہینے کی فرصت پا جانے لگتے ہو۔ جو کچھ مجھ پر بیتتی ہے، میں ہی جانتی ہوں

قاضی صاحب : کچھ کہو گی بھی یا نہیں؟

بیگم : قصہ یہ ہے کہ اس وقت تو اس کی عمر تیرہ چودہ برس ہوگی، مگر دو تین سال بعد شادی کے لائق ہو جائے گی۔ عام طور پر اسی عمر میں لڑکیوں کا بر ڈھونڈا جاتا ہے۔ ہمارے گھر میں رہتی ہے اس کا بیاہ کرنا بھی ہمارے ذمے ہوگا۔ ہوگا کہ نہیں!

قاضی صاحب : اصولاً تو ہمارے ذمے ہی ہونا چاہیے۔

بیگم : اپنی پوزیشن کے مطابق خرچ بھی کرنا پڑے گا۔

قاضی صاحب : لوگوں کی تو ہم سے یہی توقع ہوگی۔

بیگم : ہوگی ناں۔

قاضی صاحب : کہہ تو رہا ہوں ہوگی اور ضرور ہوگی۔

بیگم : بتاؤ یہ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ ہماری اپنی بیٹی خیر سے جوان ہو چکی ہے اس کی شادی کے لیے بیس بیس ہزار چاہییے، بیس تیس کیوں پچاس ہزار کہیے۔ پورے پچاس ہزار۔ اللہ رکھے جہاں جانے والی ہے وہ بڑا اونچا گھر ہے، وہ لوگ لاکھوں خرچ کریں گے، ہمارے سامنے اپنے خاندان کی عزت کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے کہاں سے روپیہ آئیں گے سوچا ہے کبھی تم نے۔ بھلا کیوں سوچا ہوگا کیا مصیبت پڑی ہے تم کو سوچنے کی۔

قاضی صاحب : (پیشانی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے) درست کہتی ہو۔ مسئلہ تو بڑا سوچ بچار کا ہے۔ مگر بیگم میں کہتا ہوں ہم کم خرچ کر کے

بھی تو زیبو کا بیاہ کر سکتے ہیں۔

بیگم : ناک کٹوانے کا ارادہ ہے کیا؟ دیکھنے والے بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے۔ تمہارے عزیز رشتہ دار ہی کہیں گے کہ یتیم بچی کو گھر میں لاکر رکھا اور اسے رخصت کیا تو تین کپڑے پہنا کر۔

قاضی صاحب : کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی ناں بیگم۔

بیگم : کچھ نہ کچھ نہیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اپنی حیثیت کے مطابق۔

قاضی صاحب : تو بیگم! دارالنسواں میں داخل کرائے دیتے ہیں۔ یہ ادارہ یتیم لڑکیوں کا خود بیاہ وغیرہ کرتا ہے۔

بیگم : اوّل تو اسے اپنے گھر میں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لائے ہو تو اب سامنا کرو حالات کا۔

قاضی صاحب : کیسے نہ لاتا!

بیگم : کیوں لاتے؟

قاضی صاحب : باپ کے مرنے سے بالکل بے سہارا ہو گئی تھی۔

بیگم : تو اور کوئی لے جاتا۔ تمہاری انسانی ہمدردی کا دریا کیوں جوش میں آ گیا تھا

قاضی صاحب : بیگم! تمہیں معلوم نہیں کہ محلّے میں اس وقت سب سے اچھی مالی حالت ہماری ہے اور اس کا باپ اسی محلّے میں رہتا تھا سب نے کہا اس یتیم، بے سہارا اور بے آسرا بچی کو اپنے یہاں لے جاؤ۔ کیا کرتا۔ لوگوں کا کہا ماننا ہی پڑتا ہے۔

بیگم : تم تو لے آئے لوگوں کی بات مان کر یا اپنی شان دکھانے کی خاطر مگر یہ نہ سوچا کہ آگے چل کر کیا الجھن پیدا ہو جائے گی۔ مانا ہماری اپنی لڑکی نہیں ہے لیکن رہتی تو ہمارے گھر میں ہے ناں اور شادی بھی ہمیں ہی کرنا ہوگی۔ مناسب بر ڈھونڈنا، جہیز بنانا براتیوں کے لیے کھانے دانے کا انتظام کرنا کوئی ایک خرچ ہے۔ ہزاروں ہی اٹھ جائیں گے۔ پھر قصہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ ذمے داری ساری عمر کی ہے۔ میاں بیوی میں جھگڑا ہو، سمیٹنا ہمارا کام۔ بچہ پیدا ہو تو اور خرچ۔ ساری عمر کا جھنجھٹ ہے۔

قاضی صاحب : بیگم! تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو، جو کچھ ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔

بیگم : میں کہتی ہوں شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے کچھ نہیں ہوگا اور اس پہلو پر بھی غور کر لو کہ جس شان سے صفیہ کا بیاہ ہوگا، اسی شان سے اس کا بھی ہوگا۔ اس کے معاملے میں ذرا بھی ہاتھ کھینچا تو ساری برادری کہے گی۔ اپنی لڑکی کو تو سونے میں تول دیا اور یتیم لڑکی کو یتیم ہی جانا!

قاضی صاحب : تم درست کہتی ہو بیگم بڑا الجھا ہوا مسئلہ ہے۔

بیگم : ابھی تو صرف سوچ ہی سوچ ہے عمل کا وقت آئے گا اس وقت دیکھنا کیا ہوتا ہے۔

قاضی صاحب : دارالنسواں میں داخل کرانے کے متعلق کیا آئیڈیا ہے؟

بیگم : توبہ توبہ۔ آہستہ بات کرو، کسی نے سن لیا تو معاملہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ سننے والے کہیں گے اپنے گھر میں جگہ نہیں تھی تو یتیم لڑکی کو اپنے ہاں لانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ چاروں طرف سے طعنوں کے تیر برسیں گے۔ کنجوس اور بےرحمی کے الزام

گئیں گے۔ نہیں جناب! یہ بیل یوں منڈھے نہیں چڑھے گی غلطی کی ہے تم نے۔ اب اسے کسی طرح نبھانا بھی ہوگا۔

(الطاف آتا ہے)

الطاف : امی! میں نے زیبو سے کہا تھا میرے بوٹ پالش کردے اور وہ برتن مانجھ رہی ہے۔

بیگم : برتن مانجھ کر پالش کردے گی الطاف بیٹا!

الطاف : مجھے ابھی جانا ہے دیر ہو جائے گی۔

بیگم : تو کہہ دو اس سے۔ ہاتھ دھو کر پالش کردے۔

الطاف : میں نے کہا ہے کہتی ہے پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔

بیگم : پانی دوبارہ گرم نہیں ہو سکتا۔؟

(نوری بابا الطاف کے پالش کیے ہوئے بوٹ لے کر آتا ہے)

نوری : الطاف میاں! یہ لو اپنے بوٹ۔

بیگم : پالش تم نے کی ہے؟

نوری : میں نے ہی کر دی ہے۔ اس کام کا مجھے زیادہ تجربہ ہے۔ دیکھو تو مرغی کے انڈے کی طرح چمک رہے ہیں ناں۔

الطاف : ٹھیک ہے!

(الطاف بوٹ لے کر کمرے سے نکل جاتا ہے)

بیگم : نوری بابا! اب تم کیا کام کرنے والے ہو۔

نوری : ذرا دھوبی تک جانا ہے۔

(صفیہ آتی ہے)

صفیہ : امی! آپ نے زیبو کو کہیں باہر بھیجا ہے۔

نوری : باورچی خانے میں برتن مانجھ رہی ہے تمہیں کوٹ چاہیے ناں۔

صفیہ : میں نے اسے کوٹ استری کرنے کے لیے دیا تھا۔

نوری : تو میں جا رہا ہوں دھوبی کے ہاں۔

بیگم : بابا! زیبو کی عادتیں مت بگاڑو۔

نوری : عادتیں کیا بگاڑوں گا بی بی! اس کا کام اپنے ذمے لیتا ہوں جو وہ اچھی طرح نہیں کر سکتی یا باہر کا کام کر دیتا ہوں۔ زیبو اب جوان ہو گئی بی بی جوان لڑکیوں کا گھر سے نکلنا کچھ ٹھیک نہیں ہے اور مجھے کیا واسطہ اس سے وہ چولہا کام کرتی ہے اور میں اپنا۔

(نوری جانے لگتا ہے)

قاضی صاحب : (ہنس کر) نوری کیا کہتا ہے۔ زیبو جوان ہو گئی ہے۔

بیگم : سُنا نہیں ہے۔ لڑکیاں تو گھاس بیل ہوتی ہیں جو دیکھتے ہی دیکھتے پھیل جاتی ہے، اور پھر اسے یہاں اچھا کھانے پینے کو بھی مل رہا ہے۔

قاضی صاحب : کیا مل رہا ہے۔ ہر وقت اُسے جھڑکی رہتی ہو۔ لڑکی سہمی سہمی سی رہتی ہے۔

بیگم : جھڑکی اس لیے ہوں کہ آپے میں رہے۔ صفیہ کی طرح مطالبے نہ کرنے لگے کہ مجھے یہ چیز چاہیے اور وہ چیز چاہیے۔ یہ ساڑھی لے دو اور وہ پوڈر خرید دو۔

قاضی صاحب : اس لیے جکڑ رکھا ہے بے چاری کو۔

(عائشہ آتی ہے رشتے میں قاضی جی کی بہن، معمر خاتون، معمولی لباس، چہرے سے پریشانی نمایاں)

بیگم : آپا آئی ہیں۔ سلام وعلیکم

عائشہ : وعلیکم السلام۔

قاضی صاحب : آج کدھر سے آ نکلیں۔

بیگم : آپا کو تو ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گیا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پورے ایک سال بعد اپنی شکل دکھائی ہے۔

عائشہ : (برقعہ اتارتے ہوئے) نادرہ بیگم! تم کیا جانو ہم غریب لوگ کس حال میں رہتے ہیں۔ مصیبتیں پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ ایک ختم نہیں ہوتی کہ دوسری آجاتی ہے۔

قاضی صاحب : آج کل کیا مصیبت ہے۔

عائشہ : ایک ہو تو کہوں۔ انوری کے ابا کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ ایک مہینے سے چارپائی پر پڑا ہے۔ بڑی بیٹی اُجڑ کر گھر آ بیٹھی ہے، بیمار

: رہتی ہے۔ چھوٹی کے بچہ ہوا ہے۔

بیگم : لڑکا یا لڑکی۔

عائشہ : لڑکا ہے۔

بیگم : مبارک ہو آپا۔ مٹھائی کھلاؤ۔ اللہ نے تمہاری مُراد پوری کر دی ہے۔

عائشہ : یہ کیا مُراد پوری ہوئی ہے ان مصیبتوں میں لڑکے کی کس کو خوشی ہوگی۔ اُلجھنوں اور بیماریوں نے تو ہمیں نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔

مٹھائی نہ کھلاؤ گی۔ یوں ٹالو بھی تو نہ آپا!

عائشہ : کھاؤ مٹھائی۔ میں کب انکار کرتی ہوں؟ ذرا سُکھ کا سانس تو لوں۔

قاضی صاحب : بیٹھو ناں

(عائشہ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

عائشہ : گھر میں سب طرح خیریت ہے۔

قاضی صاحب : سب طرح خیریت ہے۔

عائشہ : بچے دچے !

قاضی صاحب : سب ٹھیک ہیں۔ اپنی کہو۔

عائشہ : کیا کہوں بھیّا (لمبی آہ بھر کر) کبھی نہ کبھی طرح کھینچے جا رہے ہیں۔

قاضی صاحب : بڑی ہمت ہو آپا! ساری ذمے داریاں خود سنبھال رکھی ہیں۔

عائشہ : کیا سنبھال رکھی ہیں۔ جوانی تو ہے نہیں کہ آدمی صبح سے کام شروع کرے اور آدھی رات تک کرتا ہی رہے۔ کبھی کام کرتی تھی تو تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ہر وقت جُتی رہتی تھی۔ پر اب تو (آہ بھر کر)، بارہ مہینے نزلہ زکام رہتا ہے۔ کمر جھک گئی تھی۔ تھکاوٹ ہو جاتی ہے بڑی جلدی۔

قاضی صاحب : اور ہو

عائشہ : بھیّا! ایک غرض سے آئی ہوں۔

قاضی صاحب : کہو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔

بیگم : ہم ہر طرح حاضر ہیں۔ ویسے پریشانی تو آپا آج کل کون پریشان نہیں ہے۔ اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ آمدنی بہت کم ہے۔ م... کا خرچ ہی پورا نہیں ہوتا۔

عائشہ : (ہنس کر)، میں اُدھار مانگنے کے لیے نہیں آئی نادرہ!

بیگم : ہم نے بھی کیا کہتے ہیں۔ کاش ہم اپنے عزیزوں کے لیے کچھ کر سکتے۔ کہو آپا! معاملہ کیا ہے۔

عائشہ : میں نے کہا ناں، اب کام نہیں ہوتا مجھ سے۔ پچاس اوپر آٹھ برس ہو گئے ہیں۔

قاضی صاحب : ساری عمر کام کیا ہے اور بہت کام کیا ہے۔

عائشہ : ہر وقت کی فکروں نے مار ڈالا ہے۔ تمہارے پاس اس لیے آئی ہوں کہ جب تک رقیہ زچگی میں ہے۔ زیبو کو بھائی اں ہم...

(قاضی صاحب اور بیگم جلدی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور پھر مُنہ پھیر لیتے ہیں)

بیگم : زیبو کیا کرے گی ؟

عائشہ : کرے گی کیا ؟ میرا ہاتھ بٹائے گی۔ اوپری کام آ جاتا، پانی پر پڑا ہے۔ چھوٹی لڑکی رضیہ نہیں کہ سنبھالے یا کام کرے۔ زیادہ سے زیا... ایک مہینے کی بات ہوگی۔

قاضی صاحب : ٹھیک ہے آپا

بیگم : آپا!

عائشہ : کیوں نادرہ

بیگم : زیبو کی حیثیت سمجھتی ہو کیا ہے ؟

عائشہ : سمجھتی ہوں۔

بیگم : کیا ہے!
عائشہ : جو ہے میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میں تو اُسے اس لیے لے جاؤں گی کہ ذرا ہماری مدد کر دے۔ جو کچھ دال روٹی ہمیں اللہ دیتا ہے وہ بھی اس شامل ہوگی۔
بیگم : آپا! تم نے غلط سمجھا ہے!
قاضی صاحب : زیبو گھر کا کام ضرور کرتی ہے۔ مگر خدانخواستہ نوکرانی نہیں ہے۔ جو حیثیت صفیہ کی ہے، وہی اس کی ہے۔ ہم نے اسے اپنی بیٹی بنا کر گھر میں رکھا ہے۔ سوانہ اتفاق رہی اس کے۔ کیا مجال جو اسے کوئی میلی آنکھ سے دیکھ جائے۔
عائشہ : میں اس سے کب انکار کرتی ہوں۔
بیگم : تم جو کچھ کہتی ہو وہ ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ زیبو اپنے دل میں یہ سوچے کہ بی بی نے مجھے نوکرانی ہی سمجھا تھا جو کام کرنے کے لیے کسی کے گھر بھیج دیا۔ اگر اس نے ایسا سمجھا اور وہ ضرور سمجھے گی تو ہمارے سامنے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میں تمہارے لیے کوئی بندوبست کر دوں گی۔ کام ہی کرانا ہے ناں تمہیں۔
قاضی صاحب : مگر بیگم ——
بیگم : (جلدی سے) تم نہیں جانتے۔ یہ لڑکی کس قدر حساس ہے۔ ذرا سی بات کا وہ اثر لیتی ہے کہ خدا کی پناہ۔
عائشہ : وہ بھی تو اس کا اپنا گھر ہے۔ غیر تھوڑی ہے۔
بیگم : اپنا تو ہے مگر — آپا! مگر یتیم لڑکیوں کا دل بڑا نازک ہوتا ہے۔
عائشہ : اچھا
بیگم : مجبوری ہے، لیکن میں نے کہا ناں۔ بندوبست کر دوں گی۔ کوئی فکر نہ کرو۔
عائشہ : یہ لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ کام کی دھنی۔ کم زباں۔ دل کی نیک۔ کام سے کام رکھنے والی (آہ بھر کر) اللہ مجھے ایسی بہو مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔

(بیگم اور قاضی صاحب ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں)

بیگم : آپا! یہ نہ بھولو زیبو میری اپنی بیٹی ہے۔
عائشہ : ضرور اپنی بیٹی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ یتیم لڑکی کو اپنی سگی بیٹی بنایا ہوا ہے۔

(عائشہ اٹھتی ہے)

قاضی صاحب : چلیں کہاں جانے چلے بغیر۔
بیگم : اتنی مدت کے بعد آئی ہو اور ابھی جانے پر بھی تیار ہو گئی ہو۔
عائشہ : گھر میں ہزاروں کام ہیں۔ پھر کبھی آ جاؤں گی۔
قاضی صاحب : نہیں آپا!

بیگم : ٹھیک جاؤ آپا

عائشہ : اس وقت نہیں

بیگم : میں ایک دو روز تک آؤں گی۔

عائشہ : تم کہاں آؤ گی۔ بڑے لوگ چھوٹے اور غریب رشتہ داروں کے ہاں کب آتے ہیں۔

بیگم : یہ بات نہیں ہے آپا۔ فرصت ہی نہیں ملی۔ اب جلدی آؤں گی۔ انشاءاللہ!

عائشہ : بہتر

(عائشہ برقعہ اوڑھ کر چلی جاتی ہے)

بیگم : تم بھی کمال کر دیتے ہو کبھی کبھی۔

قاضی صاحب : اس میں حرج ہی کیا، آخر جو زبیدہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ وہاں رہ آئے۔

بیگم : حرج کیوں نہیں ہے۔ یتیم لڑکی ہے تو کیا ہوا۔ رہتی تو یہاں ہے ناں۔ ایک معمولی سے گھر میں کام کرنے جائے۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔

قاضی صاحب : بیگم، تمہیں لوگوں کی باتوں کا بڑا خیال رہتا ہے۔

بیگم : کیوں نہ ہے۔ اس دنیا میں باتوں کے سوا اور ہے بھی کیا۔ باتوں کی ملمع کاری سے تانبا سونا اور باتوں ہی کے تیزاب سے خالص سونا محض تانبا بن جاتا ہے۔

قاضی صاحب : تمہارا فلسفہ غلط نہیں ہے (ہنس کر) فلسفی ہو ماشاءاللہ

بیگم : یہ فلسفہ واسفہ نہیں ہے۔ دنیاداری ہے۔

(دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دیتی ہے)

: صفیہ!

صفیہ : (باہر سے) جی!

بیگم : اِدھر آؤ

قاضی صاحب : خان صاحب کہہ رہے تھے کہ کسی روز تمہارے ہاں آؤں گا۔

بیگم : ان کا بیٹا ہمارے اصغر کے محکمے کا سپرنٹنڈنٹ ہے اور اصغر کہتا تھا کہ اس کا کیس سپرنٹنڈنٹ کے پاس پہنچ چکا ہے۔ ترقی کا سوال ہے۔

قاضی صاحب : خانصاحب تو اپنے آدمی ہیں۔

(صفیہ آتی ہے)

صفیہ : کیوں امی!

بیگم : زیبو نے برتن مانجھ لیے ہیں!
صفیہ : دیکھا نہیں میں نے۔ دیکھتی ہوں جا کر۔
بیگم : برتن مانجھ لے تو اس سے کہنا الطاف کا پاجامہ سی دے۔ کپڑا الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں ہے۔
صفیہ : اچھا امی!

(نوری آتا ہے۔ صفیہ جاتی ہے)

قاضی صاحب : کیوں نوری!
نوری : خان صاحب آئے ہیں۔
قاضی صاحب اور بیگم : (ایک ساتھ) خانصاحب!
نوری : جی ہاں
قاضی صاحب : بیگم! چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔ میں انہیں لے کر آتا ہوں۔

(بیگم جانے لگتی ہے۔ قاضی صاحب بیرونی دروازے کی طرف رُخ کرتے ہیں
دروازے پر پہنچتے ہیں کہ خانصاحب آجاتے ہیں۔
بھاری بھر کم شخصیت۔ اعلیٰ سوٹ میں ملبوس۔ چہرے پر خشونت۔)

قاضی صاحب : آئیے خانصاحب! بڑی زحمت فرمائی آپ نے
خانصاحب : ملنے کو جی چاہا آگئے۔

(دونوں کمرے کے اندر آتے ہیں)

قاضی صاحب : (صوفے کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے

(خانصاحب صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں)

خانصاحب : ادھر آیا تھا — شیخ وجیہہ الدین کے بنگلے پر۔ سوچا آپ سے بھی ملاقات ہو جائے تو بہتر ہے۔
قاضی صاحب : شکریہ خان صاحب!
خانصاحب : کہیے کیا احوال ہیں۔ قاضی صاحب!
قاضی صاحب : ٹھیک ہوں۔
خان صاحب : مزے میں ہیں نا
قاضی صاحب : آپ کی دُعا سے

(بیگم آتی ہیں)

بیگم : السلام علیکم بھائی جان!

خان صاحب : وعلیکم السلام۔

بیگم : برسوں کے بعد تشریف لائے ہیں۔

خان صاحب : یہ بھی غنیمت ہے کہ برسوں کے بعد آپ سے ملنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مصروفیت اتنی ہے کہ فرصت تو گویا عنقا ہو گئی ہے۔

قاضی صاحب : بجا ارشاد فرمایا۔

(زیبو کی باہر سے آواز آتی ہے: "چھوٹے میاں" اور وہ اندر آ جاتی ہے۔
خان صاحب کو دیکھ کر جھجک جاتی ہے اور باہر جانے لگتی ہے۔)

بیگم : کیا ہے زیبو بیٹی!

زیبو : جی وہ ۔ چھوٹے میاں نے کہا تھا سفید بوٹ پر پالش کر دو۔ بوٹ مل نہیں رہا۔

بیگم : پالش نوری بابا نے کر دیا ہے۔ جاؤ آرام کرو جا کر۔

(اس دوران میں خان صاحب زیبو کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ زیبو شرما کر نکل جاتی ہے!)

خان صاحب : یہ ہے وہ یتیم لڑکی۔

بیگم : جی ہاں۔ اپنی اولاد کی طرح رکھا ہے ہم نے ۔ سلیمہ سے کم عزیز نہیں ہے۔ اپنی بیٹی ہے

خان صاحب : اپنے گھر میں جو رہتی ہے اپنی ہی بیٹی ہوئی۔

بیگم : بھائی جان! لوگ تو یہ تک ٹھٹھے میں کہتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ توبہ توبہ۔ کون ماں دوسروں کی اولاد کو اپنی اولاد نہیں سمجھتی۔ اتنے برس گزر گئے۔ بیٹی کی طرح اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ پوچھ لیجئے بھلا اسے ذرا بھی تکلیف دی ہو کبھی

خان صاحب : مجھے معلوم ہے۔ بیکار کی باتیں کرنا تو لوگوں کا شیوہ ہے۔ اچھی خاصی سمجھدار معلوم ہوتی ہے

بیگم : ہماری کوشش تو یہی رہی ہے کہ اس کی تربیت اچھی ہو اور اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ مہذب لڑکی معلوم ہوتی ہے۔

قاضی صاحب : بڑی کم گو اور نیک طبع لڑکی ہے۔

خان صاحب : شکل سے بھی ظاہر ہوتا ہے (ذرا سنجیدگی سے) قاضی صاحب!

قاضی صاحب : حکم!

خان صاحب : کچھ مدت سے مجھے ایک مسئلے نے بڑا پریشان کر رکھا ہے۔

قاضی صاحب : کس فکر نے۔ کبھی ذکر نہیں کیا آپ نے

خان صاحب : کیا ذکر کرتا۔ ہر انسان کو کوئی نہ کوئی فکر گھیرے رہتی ہے۔

بیگم : بھائی جان! بتائیے۔ شاید ہم کچھ کر سکیں۔ اگرچہ ہم بھی کس لائق :

خان صاحب : ہاں خان صاحب بتائیے :

خان صاحب : میرا ایک بھتیجا ہے۔

(نوری ٹرالی لے کر آتا ہے۔ اس کی کھانسی وقفے وقفے سے ہوتی رہے گی)

قاضی صاحب : وہ بیرا والپنڈی میں رہتا ہے شاید۔

خان صاحب : وہی۔ بختیار شیخ نام ہے۔

قاضی صاحب : کبھی دیکھا تھا۔ کافی مدت ہوگئی ہے۔ شکل و صورت اچھی طرح یاد نہیں رہی

(خان صاحب ٹرالی کو آتے ہوئے دیکھتے ہیں)

خان صاحب : قاضی صاحب! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ بڑی زحمت کی آپ نے۔

بیگم : کوئی زحمت نہیں بھائیجان!

خان صاحب : ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جبار میرا بھتیجا ہے۔ اس کے لیے کوئی معقول رشتہ نہیں مل رہا۔

قاضی صاحب : آپ کو معقول رشتہ نہ ملے یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

خان صاحب : لڑکے کی عمر کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔ دو مرتبہ شادی کی۔ بدقسمتی یہ کہ دونوں مرتبہ نباہ نہ ہو سکا۔

بیگم : طلاق ہوگئی؟

(نوری ٹرالی ایک طرف لے جا کر روک لیتا ہے۔ ایک ہاتھ میں خالی پلیٹ اور دوسرے ہاتھ میں پیٹیز والی پلیٹ لے کر خان صاحب کی طرف بڑھتا ہے)

خان صاحب : اور کیا ہوتا۔ میں سوچتا ہوں اس لڑکی کو اس کے گھر کی ذمے داری سونپ دی جائے تو ان کا نباہ ہو جائے گا

(نوری دونوں پلیٹیں خان صاحب کے سامنے پیش کر دیتا ہے)

نہیں میاں! یہ پیٹیز ویٹیز نہیں چلے گی۔ سادہ چائے لاؤ بنا کر۔ شکر آدھ چمچے

قاضی صاحب : وہ تکلیف ہے ابھی؟

خان صاحب : اب تو کچھ کم ہوئی ہے۔ احتیاط کرتا ہوں کہیں بڑھ نہ جائے۔

(نوری دونوں پلیٹیں لے کر واپس ٹرالی کی طرف جاتا ہے)

بیگم : زبیدہ کو آپ ——

خان صاحب : بالکل۔ دیکھو میری بہن! میں رشتہ قائم کرنے میں خاندانی امتیاز کا قائل نہیں ہوں۔ خدا کسی کو زیادہ دیتا ہے کسی کو کم۔ اس یتیم لڑکی کی آئندہ زندگی کا بندوبست ہم نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟

بیگم : مہربانی۔ قابلِ قدر ارادہ ہے آپ کا بھائی جان!

(نوری چائے کی پیالی لے کر آتا ہے۔ خان صاحب پیالی اٹھا لیتے ہیں نوری واپس جا کر بیگم اور قاضی صاحب کے لیے چائے بنانے لگتا ہے)

خان صاحب : آپ پر کسی قسم کا بوجھ بھی نہیں ڈالا جائے گا۔ شادی کا سارا انتظام میں خود کروں گا۔

قاضی صاحب : نہیں خان صاحب

خان صاحب : قاضی صاحب! آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ساری نیکیاں آپ ہی سمیٹ لیں۔ دوسروں کو بھی نیکی کمانے کا موقع دیجئے۔ آپ نے اتنے سال اس کی پرورش کی آپ کا فرض یہیں تک تھا اب جو فرض باقی رہ گیا ہے وہ میری ذمے داری ہے۔

بیگم : ہم اتنے گئے گزرے تو نہیں ہیں بھائی جان!

خان صاحب : او ہو۔ تم اصل مسئلہ نہیں سمجھیں۔

بیگم : وہ تو میں بالکل سمجھ گئی ہوں۔

قاضی صاحب : ہم شادی کر کے ہی لے یہاں سے رخصت کریں تو بہتر ہے۔

بیگم : مگر اس طرح خانصاحب کی بات رہ جائے گی۔ وہ اسے نیکی سمجھتے ہیں تو ہم کون ہوتے ہیں انہیں رد کرنے والے۔

(خانصاحب جو آہستہ آہستہ چائے پی رہے ہیں۔ تشکر آمیز نظروں سے بیگم کی طرف دیکھتے ہیں۔

قاضی صاحب : میں یہ بہتر سمجھتا تھا۔ خیر جیسی آپ کی مرضی!

بیگم : بھائی جان! آپ لڑکی پر بھی احسان کر رہے ہیں اور ہم پر بھی۔

خان صاحب : احسان والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس وقت ایک ضروری کام کے لیے جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی بھیج دوں گا لڑکی میرے بنگلے میں بھیج دیں۔ آپ لوگ بھی ساتھ آ جائیں بلکہ آج دوپہر کا کھانا آپ سب میرے یہاں تناول فرمائیں۔

قاضی صاحب : آج ہی خان صاحب۔

خان صاحب : میرے بنگلے میں رہے گی۔ وہاں کا ماحول ذرا مختلف ہے یہاں کے ماحول سے۔ وہاں شادی سے پہلے چند روز رہنے سے کچھ سیکھ جائے گی۔ ہمارا طور طریقہ اسے معلوم ہونا چاہیے نا۔

بیگم : یہ تو بالکل ٹھیک سوچا ہے آپ نے۔

خان صاحب : (خالی پیالی نیچے رکھتے ہوئے) شادی بہت جلد ہو جائے گی۔ تیاری کرتے کیا دیر لگتی ہے۔ قاضی صاحب اور بھابی بیگم! میں تم دونوں کا ممنون ہوں۔ آج سر سے ایک بوجھ اتر گیا ہے۔

بیگم : اور ہمارا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا ہے۔

(نوری چائے کی پیالیاں لے کر آتا ہے۔ خان صاحب "سلام علیکم" کہ کر دروازے کی طرف جاتے ہیں، بیگم اور قاضی صاحب انہیں دروازے تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ نوری پیالیاں لیے کرسیوں کے پاس کھڑا رہتا ہے۔ دونوں واپس آتے ہیں اور کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ نوری پیالیاں لے کر آتا ہے)

قاضی صاحب : اب تو خوش ہو گئی ہو۔ خود چاہ رکھا تھا خرچ۔ خرچ۔ خرچ

بیگم : یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ خان صاحب دھوم دھام سے شادی کریں گے۔

نوری : جی اچھا

(بیگم اور قاضی صاحب پیالیاں لے کر پینے لگتے ہیں)

قاضی صاحب : اور کیا! بہت اچھا بندوبست ہو گیا ہے — مگر یہ زیبو

قاضی صاحب : یہ بھی خانصاحب کے ہاں جانے پر رضامند ہو جائے گی۔

بیگم : رضامند کیوں نہیں ہو گی۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے!

قاضی صاحب : بیگم! حیوان کو بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائیں تو ضد کرتا ہے' اور یہ تو پھر انسان ہے۔ سوچتی سمجھتی ہے۔ شاید یہاں سے رخصت ہونے پر یا خانصاحب کے ہاں جانے پر راضی نہ ہو۔

بیگم : اُسے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

قاضی صاحب : یہ تم کہتی ہو۔ وہ نہیں کہتی

(قاضی صاحب اور بیگم اب تک پیالیاں ختم کر چکے ہیں' خالی پیالیاں نوری کو دے دیتے ہیں' وہ انہیں ٹرالی پر رکھ کر' ٹرالی لے جانے لگتا ہے)

بیگم : (ذرا سختی سے) تم اس سے اعتراض کروانا چاہتے ہو۔

قاضی صاحب : نہیں بیگم! مگر پوچھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ محبت اور پیار سے بات سمجھا دو تو سمجھ جائے گی۔

بیگم : گفتگو کر لیتی ہوں بُلا کر۔ (آواز دے کر) صفیہ!

صفیہ : (باہر سے) جی امی!

بیگم : زیبو کو یہاں بھیج دے۔ (شوہر سے) میں تو کہتی ہوں بہت خوش ہو گی۔

قاضی صاحب : اس خیال سے خوش ہو جائے گی کہ اب رات دن کے کام سے نجات مل جائے گی۔

بیگم : تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔

صفیہ اور زیبو آتی ہیں۔ بیگم کوشش کر کے چہرے پر مسکراہٹ لے آتی ہے۔

صفیہ : لیجیے امی! آگئی ہے زیبو!

بیگم : زیبو بیٹی! آ میرے پاس آ۔

(زیبو جھجکتی ہوئی آگے بڑھتی ہے)

آ ناں میرے پاس۔ شاباش۔ بیٹھ جاؤ میرے قریب۔ ارے بیٹھو بھی۔

(زیبو بیگم کے پہلو میں بیٹھ جاتی ہے)

دیکھو بیٹی! ہم تجھے اپنی بیٹی بنا کر اپنے یہاں لائے تھے میرے لیے اور ان کے لیے (شوہر کی طرف اشارہ کر کے) جیسی صفیہ ویسی تو۔ ہم تو چاہتے تھے کہ تو ہمارے ہاں ہی رہے۔ مگر بیٹی — وہ۔ اپنے خان صاحب کا اصرار ہے کہ اب تیرا

کے مستقبل کا سارا بوجھ میں اٹھاؤں گا۔ خان صاحب کے متعلق تو جانتی ہے کہ شہر کے نہایت معزز اور باوقار شخصیت ہیں۔ دولت ان کے گھر لونڈی ہے بہت اونچا گھرانہ ہے ان کا۔

قاضی صاحب : دولت مند ہونے کے باوجود غرور ان میں نام کو نہیں۔

بیگم : بے سہارا لوگوں کی خدمت کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ زیبو بیٹی! تو بڑی خوش نصیب ہے کہ وہ تجھے ایک طرح سے اپنی بہو بنانے کی سوچ رہے ہیں۔ ان کا ایک بھتیجا ہے۔ لاکھوں میں ایک۔ تو اس کے گھر کی مالکن ہوگی۔

قاضی صاحب : اس میں ہر طرح تیری بہتری ہے

بیگم : خوش ہے نا

(زیبو خاموش بیٹھی رہتی ہے)

قاضی صاحب : زیبو بیٹی!

بیگم : ہم نے تیرے لیے بالکل ٹھیک سوچا ہے ناں۔

قاضی صاحب : ممکن ہے تو برا مانے گی۔

(بیگم خشمناک نظروں سے شوہر کو دیکھتی ہے)

زیبو : برا کیا مانوں گی۔ جانتی ہوں میرا مقدر کیا ہے؟ بے سہارا لڑکی تو ایک ایسی کشتی ہے جس کا اپنا کوئی ملاح نہیں ہوتا۔ جو بھی چاہے اس کے پتوار تھام جدھر چاہے لے جا سکتا ہے۔ موت نے وہ ہاتھ چھین لیے جنہیں قدرت نے میری ذمے داری سونپی تھی۔ آپ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاں لے آئے۔ اب خان صاحب یہی ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاں لے جا رہے ہیں۔ بے سہارا جو ہوئی۔ کوئی اپنا جو نہ ہوا۔

بیگم : نہیں زیبو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تیرے ہیں۔ ہمیں تیری بہتری مقصود ہے۔ چاہتے ہیں تو خوش رہے۔ اچھی زندگی بسر کرے۔

زیبو : زندگی تو کسی نہ کسی طرح بسر ہو ہی جائے گی۔

قاضی صاحب : شاندار زندگی بسر کرے گی انشاءاللہ تجھے آج سب سے بڑا سہارا مل رہا ہے۔

زیبو : جس کا کوئی سہارا نہ ہو اسے ایسے ہی سہارے ملتے ہیں۔

بیگم : (شوہر سے) تم تو خواہ مخواہ بچی کا دل برا کرتے ہو۔ ہم بھلا اس کا برا کیوں چاہیں گے۔ صفیہ!

صفیہ : جی امی:

بیگم : زیبو کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اسے وہ ساڑھی پہنا دو جو تو پچھلے سال کراچی سے لائی تھی۔

زیبو : میں انہی کپڑوں میں ٹھیک ہوں۔

بیگم : ماں کی بات رد نہیں کیا کرتے۔ زیبو! جا صفیہ بیٹی!

صفیہ : (جھوٹ موٹ آنسو پونچھ کر) امّی! میں زیبو بہن کو نہیں جانے دوں گی۔

(صفیہ زیبو سے بے اختیار ہو کر لپٹ جاتی ہے)

بیگم : (شوہر سے) کتنا پیار ہے اپنی بہن سے۔ (صفیہ سے) صفیہ بیٹی! ہم سب کو اس کے جانے کا صدمہ ہے مگر کیا کریں؟ اس کی بہتری کا خیال بھی تو ہمیں سوچنا ہے۔ اس کی خوشی کی خاطر یہ قربانی کرنا ہی پڑے گی۔

(صفیہ زیبو کا ہاتھ پکڑ کر جاتی ہے۔)

قاضی صاحب : اچھا اللہ ہمیں صبر دے!

بیگم : کیا کیا جائے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔

(صفیہ اور زیبو دروازے سے نکل کر جا چکی ہیں۔ یکایک صفیہ بھاگ کر آتی ہے۔)

صفیہ : امّی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟

بیگم : کیا ہے بیٹی!

صفیہ : زیبو چلی گئی تو گھر کے سارے کام کاج کون کرے گا؟

بیگم : اری پگلی! کوئی نوکرانی آجائے گی۔ جا اسے ساڑھی دے اور دیکھ۔ بڑے پیار سے۔ سمجھ لیا ناں

صفیہ : (مسکرا کر) جی ہاں

(صفیہ چلی جاتی ہے۔ نوری آتا ہے۔ اس کی کھانسی تھوڑے وقفے سے جاری رہتی ہے۔)

نوری : بی بی جی!

بیگم : کہو نوری!

نوری : آپ — زیبو کو خانصاحب کے ہاں بھیج رہے ہیں

بیگم : ہاں۔

نوری : اس کی شادی خان صاحب کے بھتیجے جبار سے ہوگی۔

بیگم : (غصے سے) تو کیوں پوچھ رہا ہے۔

نوری : آپ کو پتا ہے جبار اوّل درجے کا بدمعاش ہے۔ وہ تین بار جیل کی ہوا بھی کھا چکا ہے۔ عمر پچاس سے کم کیا ہوگی۔ دو بیویوں کو طلاق بھی دے چکا ہے۔

بیگم : تو کون ہوتا ہے یہ باتیں کرنے والا۔

قاضی صاحب : نوری! زیبو کی بُرائی بھلائی ہم سوچ سکتے ہیں۔ ہم کچھ سوچ کر ہی اُسے خانصاحب کے ہاں بھیجنے پر راضی ہوئے ہیں۔

نوری : میاں جی! آپ ایک معصوم لڑکی کو ایک پچاس برس کے اوباش شخص کے حوالے کر رہے ہیں

قاضی صاحب : وہ کیسا ہے اور کیسا نہیں ہے۔ یہ معاملہ ہمارے سوچنے کا ہے

نوری : یہی تو مصیبت ہے۔ آپ سوچ نہیں رہے۔

قاضی صاحب : تم جبار کے بارے میں کیا جانتے ہو۔ وہ راولپنڈی میں ہوتا ہے۔

نوری : میاں جی اس کی شہرت تو ہر جگہ پہنچ گئی ہے۔ یہاں بھی آتا رہتا ہے۔ ہوٹلوں میں رہتا ہے۔ آوارہ لوگوں کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔

قاضی صاحب : تجھے کس نے غلط بتایا ہے نوری!

نوری : میں خود اسے دیکھ رہا ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے بوٹ پالش کرنے کا دھندا کیا کرتا تھا۔ اس ہوٹل میں جاتا تھا جہاں بیٹھا کرتا تھا۔ جو کچھ ہوتا تھا میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ اس کی کوئی بات بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے

(نوری کھانستے ہوئے اپنے سینے پر دایاں ہاتھ رکھ لیتا ہے)

قاضی صاحب : جھوٹ ہے۔ غلط کہہ رہے ہو۔ تمہیں کچھ خبر ——

بیگم : (غصے سے ٹھہر ٹھہر کر الفاظ کاٹتے ہوئے) میں پوچھتی ہوں تم اس سے بحث کیوں کر رہے ہو۔ اپنی پوزیشن کا کچھ خیال نہیں ہے۔ مالک ہو کر نوکر سے الجھ رہے ہو۔

قاضی صاحب : اسے غلط اطلاع ملی ہے۔

بیگم : مگر یہ ہوتا کون ہے ہمارے معاملے میں دخل دینے والا۔

نوری : میں جانتا ہوں بی بی! میں ایک ادنیٰ نوکر ہوں۔

بیگم : ادنیٰ نوکر ہو تو اپنی اوقات مت بھولو۔

(صفیہ آتی ہے)

صفیہ : امی! زیبو سارھی نہیں پہنتی اور خانصاحب نے گاڑی بھیج دی ہے۔

بیگم : بھیج دو اسے یہاں

(صفیہ چلی جاتی ہے)

نوری : بی بی! میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ زیبو بے آسرا بے سہارا یتیم لڑکی ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑا ہے تو اب اسے اندھے کنوئیں میں تو نہ دھکا دیں۔

بیگم : اپنی حیثیت سے بڑھ کر باتیں نہ بناؤ نوری!

نوری : لیکن بی بی!

بیگم : اپنا کام کرو جا کر۔

نوری : آپ اسے ضرور اندھے کنوئیں میں دھکا دے کر ہی چھوڑیں گی؟

بیگم : (کھڑے ہو کر) تو نوکری کرنا چاہتا ہے یا نہیں؟

(قاضی صاحب بھی اُٹھ بیٹھتے ہیں)

نوری : آپ مالک ہیں۔ نوکری سے جواب دے دیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

(زیبو آتی ہے اور ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے)

بیگم : زیبو بیٹی! تو آگئی ہے۔

نوری : زیبو خان صاحب کے ہاں نہیں جائے گی۔ اس کی شادی بدمعاش اور لوفر جبار سے ہرگز نہیں ہوگی۔ اسے تباہی کے گڑھے میں نہیں دھکیلا جا سکتا۔

بیگم اور قاضی صاحب : (ایک ساتھ) نوری!

نوری : قدرت کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑتی — جس کا کوئی نہ ہو اُس کا خود آسرا بن جاتی ہے۔

بیگم : نوری۔ بُڈھے کھوسٹ! چل نکل یہاں سے۔ اپنا بستر گول کر۔ ٹکے کا آدمی بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہا ہے۔ ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں۔ بڑے گھر میں نوکر کیا ہوا ہے اپنی اوقات ہی بھول گیا ہے۔ سڑکوں پر بوٹ پالش کرتا پھرتا تھا۔ ہم نے تجھے عزت دی۔ تیرے بال بچوں کی روٹی کا انتظام کیا۔

نوری : محنت کرتا ہوں — اور بال بچوں کا پیٹ بھرتا ہوں۔ آپ جواب دے رہی ہیں تو کہیں اور محنت کروں گا۔ میں جا رہا ہوں بی بی! اور زیبو بھی میرے ساتھ جائے گی۔

بیگم : زیبو نہیں جائے گی۔

نوری : زیبو جائے گی۔ زیبو بیٹی! جرأت سے کام لے۔ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے یا خانصاحب کی موٹر میں بیٹھنا چاہتی ہے

(زیبو خاموشی سے آنسو بہا رہی ہے)

بول بیٹی: میرا ہاتھ پکڑ لے — یہ ہاتھ ایک باپ کا ہاتھ ہے — جو تجھے کسی خانصاحب کے حوالے نہیں کرے گا — جو تجھے آخری سانس تک نہیں چھوڑے گا۔

(زیبو آگے بڑھتی ہے اور نوری کا بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

بس بیٹی! اب تجھے کوئی بھی جدا نہیں کر سکتا۔ تجھے کوئی بھی مجھ سے نہیں چھین سکتا!

(نوری اور زیبو دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں!)

بیگم : (شوہر سے) تم کھڑے تماشا دیکھ رہے ہو۔

قاضی صاحب : دفع کرو بیگم! — جانے دو — ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے انہیں روکیں۔

(نوری اور زیبو دروازے سے نکلنے لگتے ہیں اور پردہ گرتا ہے)

درچمن ہر ورقی دفترِ حالِ دگرست

قرۃ العین حیدر

اکتوبر ۵۳۹ ق م میں تسخیر بابل کے وقت تک سائرس اعظم کی حکومت بحیرہ اسود سے لے کر باختر تک پھیل چکی تھی۔ اس نے ایشیائے کوچک کے یونانی شہروں پر بھی قبضہ کیا اور آئندہ کئی صدیوں تک جاری رہنے والی ایرانی اور یونانی کشمکش کی بنیاد پڑی۔ سائرس عہدِ عتیق کا سب سے روشن خیال، عدل گستر اور دادار فرمانروا تھا۔ ایرانیوں نے تو اسے اپنا ہی باپ کہا تھا مگر یونانیوں نے اسے قوموں کا باپ، آقا اور قانون ساز پکارا، اور عبرانیوں نے اسے پیغمبر سمجھا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ سکندر مقدونی کو قرآن شریف کا ذوالقرنین خیال کیا ہے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں کہ سائرس ہی دراصل ذوالقرنین تھا کیونکہ وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے لقب سے مشہور تھا۔ عبرانی اور عربی میں قرن کے معنی سینگ کے ہیں۔ اور حضرت دانیال کے خواب میں بھی دو سینگوں والے مینڈھے کی تمثیل بیان کی گئی۔ اس زمانے میں میڈیا اور فارس کی توام ریاستوں کو دو سینگوں[1] سے تشبیہ دینا عام روایت تھی۔ بقول مولانا آزاد سائرس اعظم موحد اور دینِ زرتشت کا پہلا حکمران داعی تھا۔ اس وقت تک اس مذہب کو مجوسیوں نے مسخ نہیں کیا تھا اور اسی سائرس ذوالقرنین نے سیتھین حملوں کی روک تھام کے لئے وہ دیوار بنوائی جسے بعد میں سکندر سے منسوب کر دیا گیا۔

سنسان پسارگاد میں سائرس کے محلات کے کھنڈر میں اس کی نوفٹ اونچی سنگی تصویر موجود ہے جس میں وہ مصری تاج، عیلامی قبا پہنے چار بڑے بڑے پروں والے (جو قدیم مغربی ایشیا کے فن بت سازی میں ملکوتی صفات اور طاقت کی علامت تھے) اپنی بے نور آنکھوں سے دنیائے فانی کا نظارہ کر رہا ہے۔ اسی ستون پر "آدم کوروش خشایتھیہ ہخامنشیہ" منقش ہے۔ ۵۳۰ ق م میں اس عجیب و غریب بادشاہ نے رحلت کی اور پسارگاد میں دفن کیا گیا۔ اس کا مقبرہ اندر سے خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ سائرس کی ممی مع زر و جواہرات کے

---

[1] طاقت کے پجاری آشوریوں کی فن سنگ تراشی میں سینگ ایک اہم علامت تھی۔ مینڈھوں، بارہ سنگھوں اور پہاڑی بکروں کے سینگ آشوری اور بابلی آرٹ کے پسندیدہ موٹیف تھے۔ مردوک دیوتا کے مقدس فرضی درندے کے سر پر دو خوفناک سینگ تھے (اس درندے کا بت اب تک پیرس میں موجود ہے) آشوری فوج میں ایک قسم کا ٹینک تھا جس کے اندر بیٹھ کر دو سپاہی دو سینگ نما ہتھیاروں کو "کنٹرول" کرتے تھے جن کے ذریعے غنیم کی شہر پناہ کو دھکے دے دے کر توڑا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں عبرانی مذہب میں نرسنگا یا قرنا مقدس حیثیت رکھتا تھا اسے آج تک عبادت کے وقت پھونکا جاتا ہے۔ انجیل میں خداوند خدا جا بجا اپنے نبیوں سے کہتا ہے کہ تو اپنے سینگ میں تیل بھر اور فلاں فلاں کو مسح کرنے کے لئے جا!

جانے کب کی غائب ہو چکی۔ قدیم یونانی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس مقبرے پر یہ عبارت منقش تھی: "میں سائرس، شاہوں کا شاہ، یہاں سوتا ہوں۔"

اور پلوٹارک مندرجہ ذیل کتبے کا ذکر کرتا ہے:-

"اے انسان! تو جو کوئی بھی ہے۔ اور جہاں کہیں سے بھی آیا ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک روز تو ادھر سے ضرور گزرے گا، آگاہ ہو کہ میں کوروش ہوں، جس نے پارسیوں کی سلطنت قائم کی۔ اس لئے اس ذرا سی مٹی کی خاطر مجھ سے بیر نہ رکھ جس نے میرے جسم کو ڈھانپ رکھا ہے۔"

کمبوجیہ دوئم سائرس کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اس نے مصر پر حملہ کیا اور فرعون وقت کو پکڑ کر سوسا بھیج دیا۔ اور اپنی فوج میں یہودی افسر مقرر کیے جن کے آبا ایرانی دور حکومت میں پہلے دن آ گئے تھے۔ کمبوجیہ دوئم نے اپنی یہودی رجمنٹ کو خاص مصر ہی میں تعینات کیا اور ابھی مصر ہی میں تھا کہ ایران میں بغاوت کی اطلاع ملی۔ جہاں گیومرث نامی ایک مجوسی تخت پر چڑھ بیٹھا تھا۔ کمبوجیہ اپنے باپ سے بالکل مختلف اور بڑا جابر بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے بھائی بردیا کو قتل کر کے سائرس کا تخت و تاج حاصل کیا تھا۔ سنا ہے عوام بھی اس کی فارن پالیسی سے بیزار ہو چکے تھے کیونکہ قرطاجنہ اور حبشہ کے خلاف اس کی لشکر کشی ناکام رہی تھی۔ مقبوضہ مصر میں تو وہ ظاہر ہے ہر دلعزیز ہو ہی نہ سکتا تھا۔۔ ابھی تک یہ طے نہیں کیا جا سکا کہ بغاوت کی اطلاع ملنے کے بعد اس پر مرگی کا دورہ پڑا جس کا وہ مریض تھا اور ۵۲۱ ق م میں وہ اس دورے میں مر گیا یا خودکشی کی۔ اس طرف ایران میں جو مجوسی گیومرث تخت پر بیٹھا وہ آنجہانی شہزادہ بردیا کا ہمشکل تھا اور اس نے یہ ڈھونگ رچایا کہ وہ خود ہی بردیا ہے۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی تین سال کے لئے ٹیکس معاف کر دیے اور متعدد مندر مسمار کر کے مذہبی اصلاحات نافذ کیں۔ نہ معلوم یہ اصلاحات کس قسم کی تھیں۔ گیومرث بہرحال فوجی جرنیلوں کی حمایت حاصل نہ کر سکا۔ اس کے خلاف سات ہخامنشی شہزادوں نے سازش کی اور فوج نے ان کا ساتھ دیا۔ اس سازش کا لیڈر ایک ذہین نوجوان شہزادہ دارا تھا۔ روایت یہ ہے کہ گیومرث کا کام تمام ہونے کے بعد ان ساتوں شہزادوں نے طے کیا کہ ان میں سے جس کا گھوڑا طلوع آفتاب کے وقت سب سے پہلے ہنہنائے اسے بادشاہ منتخب کر لیا جائے گا۔ اور دارا کے سائیس کی چالاکی سے اس کا گھوڑا سب سے پہلے ہنہنایا۔!

دارا نے بڑی پھرتی سے بگڑتے ہوئے حالات سنبھالے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کمبوجیہ دوئم کی خودکشی کے صرف دو ماہ بعد گیومرث قتل کیا جا چکا تھا اور نوجوان حکمران سلطنت کے مختلف حصوں کی بدامنی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ دارا اول کے ساتھ حکومت دوبارہ ہخامنشی خاندان کی اس شاخ کے ہاتھ میں واپس آ گئی جو اریہ رمنا کی اولاد تھی۔ کیونکہ دارا اس ارشاما کا پوتا تھا جسے اس کے کزن کمبوجیہ اول نے تخت سے اتار کر پارس پر خود قبضہ کر لیا تھا اور ارشاما کے بیٹے (یعنی دارا کے باپ) گشتاسپ کو پارتھیا کا گورنر بنا دیا تھا۔ یہ ذرا پیچیدہ سی بات ہے اور اس شجرہ نسب سے سمجھ سکے گی۔

هخامنش
|
چش پش

کوروش اول (شاہ پرسوش)	آریہ رمنا
کمبوجیہ اول	ارشا (معزول کیا گیا)
کوروش دوم (سائرس اعظم)	گشتاسپ (صوبائی گورنر بنا گیا)
کمبوجیہ دوم	دارایوش اول

گیومرت یا "ظل بردیا" کے قتل اور دوسری بغاوتیں کچلنے کے بعد دارا نے کرمان شاہ اور ہمدان کے درمیانی راستے میں کوہ بیستون پر ایک عظیم الشان سنگی تصویر ترشوائی جس میں اہورا مزدا اوپر سے فاتح کو برکت دے رہا ہے اور شاہ دارا ان کے سامنے وہ "آٹھ" بادشاہ یا سرپرآوردہ اشخاص پابزنجیر کھڑے ہیں جن کی بغاوتوں کو فرو کیا گیا۔ تصویر کے نیچے قدیم فارسی، بابلی اور عیلامی زبانوں میں دارا نے گیومرت کا قصہ خود نقش کروایا ہے:-

"بادشاہ بننے کے بعد میں نے یہ کیا۔ ہمارے خاندان کے کوروش کا لڑکا کمبوجیہ یہاں بادشاہی کرتا تھا۔ اس کمبوجیہ کا ایک سگا بھائی بردیا تھا۔ کمبوجیہ نے اس بردیا کو ہلاک کروا دیا۔ لیکن لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ بردیا مار ڈالا گیا ہے۔ پھر کمبوجیہ مصر چلا گیا۔ کمبوجیہ کے مصر جانے کے بعد پارس اور ماد اور دوسرے ملکوں میں جھوٹ اور دروغ گوئی بہت بڑھ گئی۔

"کہتا ہے دارایوش شاہ: ایک مجوسی گیومرت نامی نے لوگوں سے کہا کہ وہ ہی بردیا ہے۔ لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے بادشاہت غصب کر لی۔ اس کے بعد کمبوجیہ مر گیا[1]

"کہتا ہے دارایوش شاہ: یہ بادشاہت جو گیومرت مجوسی نے کمبوجیہ سے چھینی، یہ بادشاہت ہمارے خاندان میں بہت زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ گیومرت نے پارس اور ماد اور دوسرے ملکوں کو چھین لیا۔

"کہتا ہے دارایوش شاہ: کوئی پارسی یا مادی یا ہمارے خاندان کا کوئی فرد گیومرت کا مقابلہ نہ کر سکا۔ سب اس سے ڈرتے تھے کہ جو لوگ اصل بردیا سے واقف تھے وہ کہیں ان کو نہ قتل کر دے۔ جب تک میں گیومرت کے مقابلے پر نہ آیا کسی اور کی ہمت نہ تھی کہ اس سے کچھ کہتا۔ پھر میں نے اہورا مزدا سے دعا مانگی اور اہورا مزدا نے میری مدد کی۔ پھر میں نے اور میرے چند ساتھیوں نے گیومرت مجوسی اور اس کے ساتھیوں کو ماد کے ایک قلعے میں قتل کر دیا۔ اور بفضل اہورا مزدا میں بادشاہ ہو گیا۔

---

[1] یہاں کمبوجیہ کی موت کے لئے قدیم فارسی کا لفظ "ہوامرشیوش" مرتا ہے استعمال کیا ہے۔ اس کا ترجمہ "خودکشی" بھی کیا گیا ہے۔

"کہتا ہے دارا یوش شاہ: جو بادشاہت ہمارے خاندان سے چھن گئی تھی میں نے واپس لے لی۔ جو مندر گیومرت نے منہدم کروا دیئے تھے میں نے ان کو دوبارہ تعمیر کروایا اور رعایا کو ان کے گھر، نوکر چاکر، اور مکانات واپس کر دیئے جو گیومرت مجوسی نے ان سے چھین لئے تھے۔"

گیومرت کے متعلق کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ وہ ہی بردیا یعنی کمبوجیہ کا بھائی تھا۔ دارا نے اس کی حکومت چھینی اور دنیا کو دکھلانے کے لئے گیومرت مجوسی کا قصہ اپنی طرف سے گھڑ دیا کیونکہ کمبوجیہ لاولد تھا اور اس نے اپنے بھائی کو ہلاک نہیں کروایا ہوگا۔ بہر کیف اس قصے میں کچھ نہ کچھ گھپلا ضرور ہے (ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق دارا نے کمبوجیہ کی لڑکی سے شادی کی جو گیومرت کی بیوہ تھی۔ اور بردیا کی لڑکی کو بھی اپنی ملکہ بنایا) زیادہ تر گیومرت کے متعلق دارا کا بیان صحیح کہا جاتا ہے۔

لیکن اب گیومرت کے متعلق ایک اور الجھن پیدا ہوتی ہے جس کا تعلق ہخامنشی سلاطین کے مذہبی رجحانات اور دین زردشت سے ہے۔

ظہور زردشت سے قبل اہورمزدہ کے علاوہ (جو ایک قدیم آریہ دیوتا کا نام تھا) ایران میں مترا (سورج) ماہ، زم (زمین) آتھر (بعد کا لفظ آذر یعنی آتش) آب، وآریو (سنسکرت = وایو یعنی ہوا) اور زرخیزی اور باروری کی دیوی اناہیتا کی پرستش کی جاتی تھی۔ دیوتاؤں کے سامنے خونی قربانیاں پیش کرنے کے دستور بھی تھا۔ مجوسی میڈیہ کے آبائی پروہت تھے جن کے عقائد ثنویت و آتش پرستی کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ زردشت یا زرتشت (قدیم لفظ زرتوخشت) کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ روایت کے مطابق دارا اسفندیار یعنی دارا اول کے باپ گشتاسپ نے زردشت کی سرپرستی کی اور گشتاسپ شاہ بلخ تھا۔ ایک نظریے کی رو سے زردشت آذربائیجان میں پیدا ہوئے اور ہجرت کر کے بلخ آئے۔ ایک خیال یہ ہے کہ وہ خراسان (طلوع خورشید کی سرزمین) ہی میں پیدا ہوئے جہاں شاہ بلخ نے ان کا دین قبول کیا۔ تورانی بادشاہ ارجاسپ نے بلخ پر حملہ کیا۔ آتشکدہ آذر نوش کو آگ لگا دی گئی اور زردشت بھی قتل ہوئے۔ یہی واقعہ غالباً یہ ہے کہ ہخامنشی دور کے آغاز میں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں خراسان، باختر وغیرہ یعنی مشرقی ایران یا پارتھیا میں قائم تھیں اور ممکن ہے گشتاسپ ان میں سے کسی ایک کے فرمانروا کا نام رہا ہو۔ ہخامنشی عہد غالباً اوائل ساتویں صدی ق م سے شروع ہوتا ہے شاید اسی زمانے کے لگ بھگ زردشت پیدا ہوئے۔ ادھر اپنے ایک کتبے میں جو مورخین میں دستیاب ہوا ہے کہتا ہے دارا یوش شاہ کہ اس کے عہد حکومت کے ابتدائی برسوں میں اس کا باپ گشتاسپ اور دادا (جو پردادا ہونا چاہیے) ارشام دونوں زندہ تھے۔ اب مزے کی بات یہ ہے کہ زردشت کا زمانہ ۶۴۰ ق م سے ۵۹۰ ق م طے کیا گیا ہے۔ دارا اول کا سن جلوس ۵۲۱ ق م ہے۔ یہاں بھی کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ (یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ قبل از مسیح سنہ الٹی طرف چلتا ہے) بعض مورخین کے نزدیک زردشت کا سن ولادت ۶۶۰ ق م ہے۔ اور جدید محققوں کا خیال ہے کہ دارا اول کا باپ وہ شاہ بلخ والا روایتی گشتاسپ نہیں ہو سکتا جس نے زردشت کی سرپرستی کی تھی مگر یہ بھی ممکن ہے کہ دارا کے والد گشتاسپ صاحب چونکہ پارتھیا کے گورنر تھے عہد قدیم کے کوچہ گرد گویوں نے انہیں کسی اپنے ہم نام شاہ بلخ سے گڈمڈ کر دیا ہو۔ قدیم پارتھیہ و خراسانی داستان گوئی کا ذکر بعد میں کیا جائے گا جس کی بنیاد پر شاہنامہ قلمبند کیا گیا۔ اور کیا پتہ شاہ بلخ گشتاسپ دراصل پارتھیا کے صوبیدار گشتاسپ ہی کو کہا گیا ہو اور زردشت ان ہی کے زمانے میں پیدا ہوئے۔

تھے لیکن زرتشت نے اہورا مزدہ کا نام خیر کی طاقت کے لئے استعمال کیا۔ لیکن ہخامنشی دور میں زردشتی عقائد کی پیروی کے ساتھ ساتھ پرانے دیوی دیوتاؤں کی پرستش جاری رہی۔

اس دلچسپ آدمی گیومرت مجوسی نے کمبوجیہ دوم کے خلاف بغاوت کر کے شاہی ایاتانہ بھی جلا دیا تھا۔ قتل گیومرت کے بعد دارا نے ایاتانہ دوبارہ تعمیر کروایا اور کہا جاتا ہے کہ بے شمار مجوسیوں کو ہلاک کروا دیا۔ ایاتانہ (قدیم فارسی = یدَ۔ مادی = یَز = سنسکرت = یگیہ یا یجّ — یعنی عبادت) ہخامنشی سلاطین کے عبادت خانے کو کہتے تھے۔ سائرس اعظم، کمبوجیہ دوم اور دارا اول ایرانی، بابلی اور مصری معبودوں کے علاوہ عبرانی یاہ وہ کے بھی قائل تھے اور ان کے ایاتانہ میں غالباً تمام دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی گئی تھیں۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ گیومرت مجوسی نے پرانے خداؤں کی بیخ کنی کر کے خالص دین زردشت رائج کرنا چاہا ہو۔ اس کے ساتھ دوسرے مجوسیوں کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے ہیروڈوٹس گیومرت کا نام اسپنددات (اسفندیار) بتاتا ہے جو زرتشتی ہیرو کا نام بھی ہے۔ بعد میں بھی گیومرت کو مجوسیوں نے روایتی گشتاسپ شاہ بلخ کے لڑکے اسفندیار سے مماثل کیا۔ اور دارا کے ہاتھوں مجوسیوں کے قتل عام کی روایت اتنی مستحکم ہو گئی کہ اس کی سالانہ برسی منائی جانے لگی۔[1]

اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ خود دارا[2] ہی نے دین زردشت کی حمایت کی ہو اور اس لئے مجوسی پروہتوں کا زور توڑنا چاہا ہو جنہوں نے پرانے عقاید زندہ رکھے تھے۔ یا یہ قتل محض سیاسی نوعیت کا ہو اور اس کا مذہب سے زیادہ تعلق ہی نہ رہا ہو۔

ان سب باتوں سے بہر حال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک دین زردشت پوری طرح مرتب ہو کر رائج نہ ہوا تھا۔ دارا بار بار اہورا مزدہ کا ذکر کرتا ہے جو اشوری دیوتا اشور مزدا کی مانند (جو شاہان اشور کی شکل تصاویر کے اوپر پہیہ شکل میں بنایا جاتا ہے) ہر جگہ پر پھیلے ہوئے پنکھوں والی داڑھی والے بادشاہ کے روپ میں دکھایا جاتا ہے لیکن یہ اہورا مزدہ سارے ایرانی معبودوں کا چیف دیوتا تھا۔ گو ممکن ہے کہ شروع کے ہخامنشی سلاطین نے زردشت کی تعلیمات کو بھی قبول کر لیا ہو۔ دارا اول سائرس اعظم کے بعد ہخامنشی خاندان کا دوسرا جلیل القدر فرمانروا ثابت ہوا۔ اس نے ایران کو دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور اور وسیع سلطنت بنا دیا۔ یہی وہ دارا ہے جسے تاریخ عالم نے دارائے اعظم کے لقب سے نوازا اور اس کی شان و شوکت حضرت سلیمان کی دولت و حشمت کی مانند ضرب المثل بن گئی۔

صحیفۂ دانیال میں ذکر ہے کہ شوشن میں (اسے ہی سوسا، شوشان، شوش اور سوستا لکھا جاتا رہا ہے) دارا کا محل تعمیر کرنے کے لیے اہل بابل نے اینٹیں بنائیں۔ بختان، گندھارا اور لبنان سے لکڑی آئی۔ باختر سے سونا، سغدیہ سے جواہرات، حبشہ و سندھ سے ہاتھی دانت اور خوارزم سے فیروزے حاصل کئے۔ یونان و بابل کے سنگ تراش اور معمار، میڈیا سے مزدوروں کو بلایا گیا۔

لیکن یہ قصر شوشن (جس کا انجیل مقدس میں بے انتہا ذکر ہے) کافی نہ تھا۔ (اس سے قبل اشوری سارگون دوم نے جو قصر

---

[1] یہ مجوس کشی کی روایت اتنی پائیدار تھی کہ اٹھارھویں صدی میں جب شاہ عباس صفوی ایران کے بادشاہ تھے زرتشتیوں نے اپنے ہم مذہب پارسیوں کو جو ہندوستان میں بستے تھے خط لکھا کہ گیومرت کے زمانے سے اب تک ہم کو ایسے مصائب نہیں جھیلنے پڑے۔

[2] اصل نام داریوش یا داریہ وش (داریات = تھامنا، وہو = دولت) رکھنے والا، یا دارایاب

بنوایا تھا اس میں صرف دو سو نوکمرے تھے اور محض ۲۵ ایکڑ زمین پر پھیلا تھا) چنانچہ دارا اول نے پرسی پولس میں اس سے بڑا محل بنوایا
جس میں بعد کے بادشاہوں نے اضافے کیے) اور مشرق میں پنجاب و سندھ اور مغرب میں یونان کی مزید ریاستوں پر قبضہ کیا۔ اور اعلان کر دیا:
کہتا ہے دار یوش شاہ کہ بفضل اھورمزدہ یہ بہت سے شہر میں نے پارس سے دور حاصل کئے " (کتبہ نویسی کی روایت ہخامنشیوں
نے سلاطین آر تو سے حاصل کی تھی جو برابر ریکارڈ کرتے جاتے تھے کہ فلاں فلاں فتوحات انہوں نے دیوتا خالدی کے فضل و کرم سے
حاصل کیں) ۔ دارا اول نے بھی یہودیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور ان کو بیت المقدس میں ہیکل[1] دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دی
جسے بخت نصر نے ۵۸۶ ق م میں منہدم کروا دیا تھا ۔

۴۹۰ ق م میں دارائے اعظم نے ایتھنز اور اسپارٹا پر لشکر کشی کی اور اسی سال موسم خزاں میں MARATHON کی فیصلہ کن
جنگ ہوئی ۔ (یہ لمبی دوڑ کے لئے MARATHON RACE کا محاورہ اسی واقعے کی یادگار ہے جب اسپارٹا کی امداد حاصل کرنے کے
لئے PHIDIPIDES نے ڈیڑھ سو میل کا سپاٹا بھرا تھا) ۔ ایتھنز کی دس ہزار فوج نے ایک لاکھ ایرانی لشکر کا مقابلہ کیا اور فتحمند رہے
اور اس فتح کو یونانی آرٹ، شاعری اور ادب میں طرح طرح سے سراہا گیا ۔ ہیروڈوٹس کی مانند اہل یورپ آج تک اس جنگ کو مغرب
کی مشرق پر اخلاقی برتری کا ثبوت سمجھتے رہے ہیں ۔ ذرا غور فرمائیے ایک انگریز مورخ انیسویں صدی میں کیا لکھتا ہے : " مطلق العنانی اور جمہوریت
کا فیصلہ دو تہذیبوں کے محاذ پر ہوا ۔ جب یونان نے ایران کو ہرا کے یورپ کو مشرق کے جابرانہ تسلط سے بچایا اور یورپ کو صحیح معنوں میں اعلیٰ
تہذیب اور آزادی سے بہرہ ور ہونا ممکن کیا "

۴۸۵ ق م میں دارائے بزرگ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا خشایارشاہ تخت نشین ہوا ۔ پانچ سال بعد یعنی ۴۸۰ ق م
میں خشایارشاہ اتنی بڑی فوج لے کر یونان فتح کرنے کے ارادے سے چلا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اس فوج میں دولت ہخامنشیہ
کی چالیس اقوام کے سپاہی مع پنجابی تیر اندازوں کے شامل تھے باسفورس پر کشتیوں کا پل بنایا گیا جس پر سے گذر کر یہ قیامت خیز لشکر
تھریس، مقدونیہ اور تھیسلی ہوتا ہوا ایتھنز روانہ ہوا ۔ بارہ سو جہازوں کا ایرانی بیڑہ اس کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا ۔ گرمیوں کا
زمانہ تھا اور یونان میں اولمپک کھیل شروع ہونے والے تھے جب اچانک یونانیوں کو دفاعی جنگ شروع کرنا پڑی ۔ اسپارٹا کے
سپاہیوں نے ایرانی فوج کے پاؤں اکھاڑ دیے اور بے چارہ نوجوان خشایارشاہ محاذ سے کچھ دور اپنے تخت پر بیٹھا یہ منظر دیکھا کیا ۔
اس کے ذاتی باڈی گارڈ کے دس ہزار " لافانی سپاہی " (یہ ان کا خطاب تھا) بھی پسپا ہوئے ۔ شاہ کے دو بھائی مارے گئے ۔ لیکن بہت
جلد ایرانی لشکر نے آگے بڑھنا شروع کیا ۔ تب ایتھنز کی ساری آبادی کا جہازوں کے ذریعے انخلا کر دیا گیا (ان تفصیلات سے ہمیں
یونانیوں کی کارکردگی اور خوش انتظامی کا اندازہ ہوتا ہے) ایرانی فوج نے ایتھنز کو آگ لگا دی ۔ اس کے بعد سلامس کے نزدیک
دونوں ملکوں میں بحری جنگ چھڑ گئی ۔ یونان کے پاس صرف ساڑھے تین سو جہاز تھے ۔ ساحل پر سے خشایارشاہ لڑائی دیکھا کر

---

[1] حضرت سلیمان کا تعمیر کردہ ہیکل اشوری طرز تعمیر کا نمائندہ تھا ایشوں کی کئی منزلہ عمارت جس کی خصوصیت تھی ۔ یہی مینارہ بابل کا اسٹائل بھی تھا ۔
ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے قبل اس جگہ پر ایک چٹان تھی جس پر پہلے کبھی اناج پھٹکا جاتا تھا ۔ حضرت داؤد نے اس پر قربان گاہ بنائی ۔ عبرانی روایت کے
مطابق اسی چٹان پر حضرت ابراہیم نے اپنے فرزند کی قربانی کا ارادہ کیا تھا ۔

تھا کہ دیکھتے دیکھتے یونانی بحریہ نے اپنے سے تین گنا زیادہ بڑی ایرانی بحریہ کے چھکے چھڑا دیے۔ ستمبر ۴۸۰ قم میں اس جنگ کے بعد میں بھی میدان یونانیوں کے ہاتھ رہا۔ چند ماہ بعد ۴۷۹ قم کے شروع میں ستر ہزار یونانی فوج نے ایرانیوں کو قطعی شکست دے دی۔ ان کا قتل عام کیا اور ان کے لشکر کے شاہانہ ساز و سامان اور مال و دولت کو جی بھر کے لوٹا۔ (یہ بھی ایک ٹھیٹھ مشرقی بیوقوفی تھی۔ بھلا ایرانیوں کو اس تام جھام کے ساتھ اتنی دور کے میدان جنگ میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟) اس شکست سے بقول اسی بیہودہ انگریز مؤرخ "ایشیائی آمریت اور یونانی آزاد خیالی، مشرق اور مغرب، قدامت و جدیدیت، تاریکی اور روشنی، مشرقی تن آسانی اور مغربی چستی، کمزور اور کثیف ماضی اور یورپ کے درخشاں مستقبل کے درمیان فیصلہ ہو گیا۔ اور یونان نے ایشیا کو بتا دیا کہ اسے یورپ کا مقابلہ کرنے کی کبھی ہمت بھی نہ کرنا چاہیے۔" یونان کی اسی فتح کے بعد وہاں کی تہذیب کا دور زریں شروع ہوا۔

یونانی مؤرخوں نے ایران و یونان کی طویل جنگوں کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ خشایار شاہ کی شکست نے یونان میں جس نئی قوم پرستی اور قومی فخر و غرور کی لہر دوڑائی اس کا ایک نمونہ ہمیں اسکائی لس کے مشہور ڈرامے THE PERSIANS میں ملتا ہے۔ اسکائی لس (AESCHYLUS) جو ۵۲۵ قم میں پیدا ہوا یونان کے تین عظیم ترین ڈرامہ نگاروں میں سے ایک ہے۔ پیشے کے لحاظ سے خود سپاہی تھا۔ دارائے بزرگ کے خلاف ماراتھون کی جنگ میں لڑا اور شیکسپیر کی مانند اپنے لکھے ہوئے ڈراموں میں خود بھی اداکاری کرتا تھا۔ اس کا یہ ڈرامہ یعنی "اہل پارس" یونانی ٹریجڈی میں اس لئے بھی منفرد ہے کہ اس کے تینوں ایرانی کردار تاریخی ہستیاں ہیں۔ ان کے علاوہ کلاسیکل ڈرامے کے سارے کردار فرضی اور اساطیری ہوا کرتے تھے۔ اپنی قوم پرستی کے باوجود اس نے ان تین کرداروں یعنی خشایار شاہ، اس کی ماں اور اس کے باپ دارائے بزرگ کی روح کو ہمدردی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈرامے میں خشایار شاہ جسے یونانی XERXES (زرکسیز) کہتے تھے، ۴۸۰ قم کی جنگ سلامس کے بعد لوٹ پڑتا ہے۔ ایتھنز کا بحریہ ایرانی بحریہ کو بالکل تباہ و برباد کر چکا ہے۔ دارائے اعظم کی بیوہ یعنی خشایار شاہ کی ماں اور ایرانی امراء کے کورس کو ایک پیغامبر ان کی شکست کی مفصل اطلاع دیتا ہے۔ اس سے قبل دارا کی روح (ہملٹ کے باپ کی روح کی طرح!) اسٹیج پر آ کر کہتی ہے کہ اس کے نوجوان بیٹے کی جذباتیت اور جلد بازی نے یہ دن دکھایا۔ دارا خود ایک عاقل حکمران دکھایا گیا ہے جسے اپنی فتوحات کے باوجود یہ معلوم تھا کہ حد سے زیادہ بلند حوصلے ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ملکہ کہتی ہے کہ اس کے بیٹے کو مشیر اور صلاح کار غلط ملے۔ اب خشایار شاہ سامنے آتا ہے جو اپنی تباہ حالی اور ہزیمت خوردگی کی وجہ سے کلاسیکل ٹریجڈی کی مجسم تصویر ہے۔ ڈرامے کے پہلے حصے میں اس کی ماں ایک شاندار سلطانہ نظر آتی ہے جو اپنے بیٹے کی معرکہ آرائی کے سلسلے میں کورس سے ایتھنز کے متعلق سوالات کرتی ہے۔ اس عظیم المرتبت شاہ بانو کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ دور افتادہ چھوٹا سا شہر کہاں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شہر ایران کی طاقت کا بھلا کیا مقابلہ کر سکے گا۔ شکست کی ناقابل یقین خبر سننے کے بعد وہ اپنے شوہر یعنی دارائے اعظم کی روح بلاتی ہے اور اس سے مشورہ اور دلاسہ چاہتی ہے۔ دارا بھی مشورہ دیتا ہے کہ آئندہ ایران حملے کا ارادہ نہ کرے۔ لیکن دارا کی روح یہ بھی جانتی ہے کہ اس کی رائے پر عمل نہیں کیا جائے گا اور جلد ہی (یعنی اگلے سال ۴۷۹ قم میں) ایران کو دوبارہ یونان کے ہاتھوں شکست فاش ہوگی۔ اس المناک

پیش گوئی کے بعد آمرا کی روح اپنے مقبرے میں واپس چلی جاتی ہے۔ لیکن اس کی صلاح پر خوردارا اور بادشاہ ملکہ اپنے محل میں جاکر بہترین پوشاک زیب تن کرتی ہے اور اپنے مصیبت زدہ بیٹے کے بشاشس اور باہمت خیر مقدم کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

یہ ڈرامہ جنگ کے صرف سات سال بعد یعنی ۴۷۲ ق م میں اسٹیج کیا گیا۔ اور جس طرح آج کسی قومی ظفر یابی کے بعد اس کے متعلق کامیاب فلم بنتے ہیں ایتھنز کے تھیٹر میں (جہاں تیس ہزار تماشائی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔) اس نے کھڑکی توڑ ہفتے منائے۔[1]

خشایارشاہ اوّل ۴۶۵ ق م میں مرا اور اس کی جگہ ارتخشتر یا اردشیر اول تخت پر بیٹھا۔ اس نے بھی اپنے پیشرو کی مانند پرسی پولس میں مزید محل بنوائے۔ اس کے ایک ایوان کی دیوار پر خط میخی میں چار مرتبہ درج ہے — ''یہاں جو چیزیں حسین معلوم ہوتی ہیں ہم نے انھیں خدا کی مرضی سے بنایا۔'' یہ ایرانی حسن پرستی اور حسن کاری کا گویا اولین ریکارڈ ہے! اردشیر کے مرنے کے بعد ۴۲۴ ق م میں خشایارشاہ دوم صرف تین ماہ حکومت کر سکا۔ جس کے بعد دارا یوش دوم نے ۴۰۴ ق م تک راج کیا۔ اردشیر دوم (۴۰۴ ق م۔ ۳۵۸ ق م) اور اردشیر سوم (۳۵۸ ق م۔ ۳۳۸ ق م) کے زمانے سے سلطنت میں انحطاط شروع ہو گیا۔ دارا سوم (۳۳۶ ق م۔ ۳۳۱ ق م) ہخامنشی حکمراں تھا جس کا سکندر مقدونی نے تختہ الٹ دیا۔

ہخامنشی سلطنت اپنے وقت کی گویا برٹش ایمپائر تھی کہ اس میں دنیا کے سارے براعظم شامل تھے (امریکہ و آسٹریلیا دریافت نہ ہوئے تھے)۔ بادشاہ زمین کا مالک تھا۔ وفاداری، عالی ذات اور بندگی میں مقدم تھی۔ بادشاہ جس سے خوش ہوتا اسے جاگیر دے دیتا۔ اس شاہانہ عادت نے فیوڈل نظام کو جنم دیا۔ گدھوں اور خچروں کو اپنے مرجین کھلانے کی مجوسی اور پارسی رسم بھی رائج تھی مگر ان ہخامنشیہ کے مقابر بنائے جاتے تھے جہاں ان کی مصری رسم سے تجہیز و تکفین ہوتی تھی کہ بادشاہ کی نعش کو مومیائی کر کے رکھنا ایک قدیم رسم تھی۔ زمانے کے دستور کے مطابق بادشاہ کو الوہی درجہ مل گیا تھا۔ جشن نو روز پر وہ خود دیوتا بنتا تھا جشن سالگرہ بھی اس کے جنم دن پر منعقد کیا جاتا تھا گویا ہم نے تاریخ بھی کرتے شاہی لقب کے ساتھ روایات کو ساکن کی۔ (۱۳) ہخامنشی سلسلے کی بنا پر شاہ محمد رضا پہلوی کا جشن اڑھائی ہزار سالہ کے روز منایا گیا اور پارلیمنٹ نے ان کو نیا لقب شہنشاہ آریہ مہر دیا۔ پیشہ ور کاہن تاجپوشی کے بعد بادشاہ کو زرتشت بزرگ کا جامہ تبرکاً پہناتا تھا۔ ملک کی دیوی کی پوجا کرتا تھا اور ایک قریب رہنے کا عہد کرتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کے ذاتی آتش کدے کی آگ ٹھنڈی کر دی جاتی تھی بلکہ اس کے اہل خاندان اور ملازمین اس کے مرنے کے بعد ماتم کے طور پر ناخن کاٹ لیتے تھے بال کاٹ ڈالتے تھے ریاضی میں مصیبت تھی اور نہ کبھی ان کی تخت نشین ہوتا تھا شاہی خاندان کے افراد میں نہ جانے کتنے تھے جن میں اکثر غیر آریہ بیویاں بھی موجود تھیں۔ آریہ نسل پر فخر کرنا ساسانی عہد میں شروع ہوا۔ مصر کی مانند شاہی خاندان کی شادیاں

---

[1] ۔۔۔ ایتھنز میں ڈرامہ نگاروں کے ایک مقابلے میں اسکائی لس کے بجائے اس کے کم عمر معاصر سوفوکلیز کو ادبی انعام سے دیا گیا۔

اپس کے بعد تو یہی ستونوں میں کی جاتی تھیں۔ ہخامنشی فوج میں ساری محکوم اقوام کے افراد بھرتی کیے جاتے تھے۔ (جس کا نتیجہ جنگ یونان میں بڑا اعلیٰ) خوانتی سپاہی مصر میں اور مصری افسر بلخ میں تعینات تھے۔ ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت نہایت عمدہ سڑکوں سروس کام کرتی تھی۔ محکمہ ڈاک قابلِ تعریف تھا۔ بارہ میل کے فاصلے کو "فرسنگ" کہا جاتا تھا۔ دشمن چتر یا شاہزادے صوبائی گورنر بنائے جاتے تھے۔ (مگر بعد میں یہودیوں کے نبی حضرت عزرا، اور نحمیاہ نبی وغیرہ کو وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔) وزیر کا عہدہ شروع میں نہیں تھا۔ بعد میں ہزارہ پتی یعنی شاہی باڈی گارڈ کے افسرِ اعلیٰ نے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ ہخامنشی سلاطین عموماً مذہبی رواداری برتتے تھے۔ (ان آخری وقتی سلطنت زیادہ مدت نہیں پائی) بعد کی صدیوں میں جب دین زرتشت کو فروغ ہوا اس وقت غیر زرتشت کے متشدد عقیدے کی وجہ سے اہلِ پارس اخلاقی پاکیزگی میں ہم عصر اقوام سے ممتاز سمجھے جانے لگے۔ عبرانیوں سے ان کی دوستی کی یہ وجہ بھی یہی تھی کہ شرقِ اوسط میں جابجا انسانی قربانیاں ابھی تک رائج تھیں۔ نیک خیالات، نیک الفاظ، نیک اعمال کی زرتشتی تعلیم نے ان سے پیروؤں کو اخلاقی و مذہبی لحاظ سے قید بابل کے بعد والے مقتول یہودی اپنے ہم مشرب معلوم ہونے لگے۔ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ ایرانی بچوں کا زمانۂ تعلیم پانچ سے بیس سال کی عمر تک ہے جس میں ان کو صرف تین چیزیں سکھلائی جاتی ہیں، شہسواری تیراندازی اور راست گوئی! ایرانی یونانیوں کے قومی دشمن تھے۔ اس کے باوجود یونانی مورخوں نے ان کی ہمیشہ تعریف کی۔

ہخامنشیوں نے اشوریوں اور آرار تو فنِ سنگ تراشی اور طرزِ تعمیر سے بہت کچھ اخذ کیا اور ان کے اسٹائل سے ان کی عہد موریہ سلطنت کا فن ایک حد تک متاثر ہوا۔ (اشوک کے تین شیروں والے ستون میں جو اب ہندوستان کا سرکاری طغریٰ ہے۔ پرسی پولس کے ستونوں کی جھلک نظر آتی ہے) بادشاہوں اور شیروں کی دست بدست لڑائی اشوری سنگ تراشی کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ایک اشوری بازو بیف میں شیر پنجرے سے نکل کر جھپٹ رہے ہیں ان کا دروازہ پنجرے کے اوپر چڑھا بیٹھا ہے اور بادشاہ سلامت سامنے کھڑے تیر سے نشانہ باندھ رہے ہیں۔ اس شکل تصویر کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ حضرت دانیال کو غالباً اسی قسم کے پنجرے میں شیروں کے آگے ڈالا گیا ہوگا۔ شیر، بیل، مینڈھے، گھوڑے اور عقاب طاقت پرست اشوریوں کے فنِ سنگ تراشی کے محبوب موتیف تھے۔ STYLISED گھنگھریالے بال اور گھنگھریالی داڑھی بھی صورت سازی کی خصوصیت تھی۔ حتیٰ کہ بیلوں کے چہروں پر بھی داڑھی لگا دی گئی تھی۔ اس زمانہ میں داڑھیوں کا بڑا رواج تھا۔ چنانچہ ہر ایرانی اور اشوری بادشاہ ایک سا نظر آتا ہے۔ یونان و ہند میں داڑھیوں کا فیشن نہیں تھا۔ چنانچہ انڈو گریک فنکاروں نے یونانی دیوتاؤں کی مانند مہاتما بدھ کو بھی کلین شیو دکھایا۔ ورنہ کیا پتہ مہاتما بدھ داڑھی رکھتے ہوں۔ مسلسل گیان دھیان کی مصروفیت میں ان کو شیو کرنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہوگا۔ مگر آپ کو ان کا ایک مجسمہ بھی باریش نظر نہ آئے گا۔ اس کے برعکس تیرہ سو برس جو قدرے وسطے پر رومت کا داڑھی دار مجسمہ شرقِ اوسط کی روایت میں شامل معلوم ہوتا ہے۔)

ہخامنشی زوال دراصل یونان سے خشایارشاہ کی شکست کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ جنگ سے واپس آنے کے بعد وہ پرسی پولس میں اپنے حرم کی توسیع اور مزید محل بنوانے میں جٹ گیا تھا۔ دربار میں خواتین کا اثر بڑھ گیا۔ سازشیں شروع ہوئیں اور اسے قتل کیا گیا۔ یونانی اناطولیہ پر قابض ہو گئے اور مغربی ایشیا میں یونان کا تہذیبی اثر پھیلنا شروع ہوا۔ ادھر قتل، سازش اور جانشینی دربار کی روایت بن گئی۔ مصر نے ایران کی اطاعت سے بغاوت کر دی۔ اور آزاد ہو گیا۔ یونانی صوبوں میں بغاوتیں جاری رہیں اور ایرانی

بڑی حکومت یونانیوں میں "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرتی رہی - اردشیر اوّل کے بعد تخت حاصل کرنے کے لئے خانہ جنگی ہوئی۔ اردشیر سوئم نے جو ایک خونخوار بادشاہ تھا کچھ عرصے تک سلطنت کو مکمل انتشار سے بچائے رکھا - مگر اب فلیقوس (فلپ) مقدونی کے زیر اثر یونان متحد ہو چکا تھا - اردشیر سوئم کو بھی ایک خواجہ سرا نے زہر دے کر مار ڈالا - اور اس کے ایک دور کے رشتے دار یعنی دارا سوئم کو تخت پر بٹھال دیا گیا اور سکندر مقدونی کے ہاتھوں ہخامنشی عظمت کے خاتمے کا وقت آن پہنچا -

مسلمانوں نے ہمیشہ سکندر کو ذوالقرنین اور خدا کا ایسا نیک بندہ سمجھا جس نے ایک کافر آتش پرست بادشاہ دارا کا قلع قمع کیا - چنانچہ پندرھویں صدی عیسوی کی مشہور فارسی تصنیف روضۃ الصفا میں اس کے مصنف خوندمیر نے دارا و سکندر کی نہایت پُرلطف اور عبرت آموز خط و کتابت درج کی ہے - مورخ لکھتا ہے کہ جب دارا کو سکندر کی فتوحات کی خبر ملی تو اس نے تھریس کے باشندوں کو حکم دیا: "مابدولت کو روم کے اس چھوکرے کی شرارتوں کے متعلق اطلاعات موصول ہوئی ہیں - لہٰذا تمہیں چاہیے کہ تم اس لڑکے اور اس کے حواریوں کو اٹھا کر ایک دم سمندر میں پھینک دو۔" بعد ازاں دارا نے سکندر کو مندرجہ ذیل مکتوب بھیجا:

"شہنشاہ عالم کے پایہ تخت سے :-

سکندر نامی لٹیرے کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مابدولت کی اطلاع کے مطابق تم نے چوروں اور قزاقوں کی ایک نامعقول بھیڑ جمع کر کے ہماری سلطنت پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا ہے - اس قسم کی بیہودگی ظاہر ہے کہ رومیوں ہی کو زیب دیتی ہے - اب تم پر لازم ہے کہ یہ فرمان پڑھتے ہی اُلٹے پاؤں جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ - مابدولت تم کو ایک سونے سے بھرا صندوق اور گدھے پر لدا تل کا بورا بھیجتے ہیں تاکہ ہمارے مال و دولت کا تمہیں اندازہ ہو جائے جو تل کے دانوں کی مانند بے شمار ہے - ساتھ ہی ایک گیند اور ایک کوڑا ارسال ہے - تمہارے لونڈے پن کا تقاضا ہے کہ تم اس گیند سے کھیلو اور یہ کوڑا تمہاری پٹائی کے لئے ہے۔"

سکندر نے بواپسی ڈاک جواب دیا:

"ذوالقرنین کی طرف سے اس شخص کے نام جو خدائی کا دعوے کرتا ہے اور عالمگیر حکمرانی کا ڈھونگ رچاتا ہے - اتنا بڑا شہنشاہ ایک بے حیثیت سکندر سے خائف ہو گیا؟ کیا دارا کو علم نہیں کہ خدا جس کو چاہتا ہے طاقت اور عزت دیتا ہے - ایک فانی انسان جس کی سلطنت کسی لمحے بھی چھن سکتی ہے خدا کس طرح ہو گیا؟ لیکن بہر طور ہونے والا ہو کے رہے گا - سنو - اب میں میدان جنگ ہی میں تم سے ملاقات کروں گا کہ میں خود کو جس شاہ کا ایک ادنیٰ اور کمزور بندہ سمجھتا ہوں اور فتح و نصرت اسی پروردگار عالم کی جانب سے ہے - تم نے جو اشیا مجھے بھیجی ہیں میں انہیں ایک نیک شگون سمجھتا ہوں - یہ کوڑا خود تمہارے لئے تازیانہ عبرت ثابت ہو گا - گیند سے ظاہر ہوا کہ جلد ہی ساری دنیا میرے قبضے میں ہو گی - سونے کا صندوق اس بات کی علامت ہے کہ تمہارے خزانے عنقریب میری ملکیت بننے والے ہیں - یہ تمہاری بھیجی ہوئی تل کی بوریاں تو گو کہ تل کے دانے بے شمار ہوتے ہیں مگر بڑی آسانی سے مٹھی میں بھی بھرے جا سکتے ہیں - جواباً میں تم کو سرسوں ارسال کر رہا ہوں تاکہ تم اپنی شکست کی تلخی کا مزا ابھی سے چکھ لو۔"

چنانچہ گھمسان کی جنگ ہوئی اور سکندر میدان جیت گئے - دارا نے فرات کے اس پار جا کر مزید فوج جمع کی اور صلح کے طور پر اپنی آدھی سلطنت نذر کرنا چاہی - مگر بھائی سکندر سارے ایران پر قبضہ کرنا چاہتے تھے - چنانچہ انہوں نے مندرجہ ذیل خط دارا کو بھیجا:

"دارا! اگر مورخ سچ بولتے ہیں تو اس دارا نے جس کے تم ہمنام ہو، عرصہ گزرا یونانی شہروں اور نو آبادیوں کو تاراج کر دیا تھا گو بحری جنگ میں اسے منہ کی کھانا پڑی مگر اس کے جرنل مار دونیس نے سارے یونان کو تباہ کیا ہمارے شہر اور ہیکلے شکستہ اور باغات اجاڑ کر رکھ دیے۔ میں تم کو یہ بھی یاد دلا دوں کہ تم نے میرے باپ فلپ کے قاتلوں کو رشوت دی اور حالیہ جنگ بھی بزدلی سے تم ہی نے شروع کی۔ (یہ بات قابل غور ہے ہر فریق، فریق ثانی پر جنگ شروع کرنے کا الزام لگاتا ہے اور اسے بزدل بتاتا ہے) اور تم نے میرے قتل کے لئے ایک ہزار اشرفیاں قاتلوں کو دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ یہ جنگ جو میں لڑ رہا ہوں محض دفاعی جنگ ہے۔ اور تمہاری مملکت کے بیشتر حصوں پر میری فتح سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوتا میرے طرفدار ہیں۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم میرے مطیع ہو کر میرے سامنے حاضر ہو تو میں تم کو اور تمہارے بیوی بچوں کو بغیر کسی تاوان کے آزاد کر دوں گا۔ میری فاتحانہ حیثیت کا تعین تجربہ ہو چکا ہے اب تم یہ بھی دیکھ لینا کہ میں اپنے مفتوحوں سے کس عزت کے ساتھ پیش آتا ہوں اس دوران میں مجھے خط لکھو تو یاد رکھنا کہ تم اس سکندر سے مخاطب ہو جو نہ صرف ایک فرمانروا ہے بلکہ تمہارا آقا بھی ہے۔"

ستمبر ۳۳۱ ق م میں متحدہ لشکر نے فرات عبور کیا اور نینوا کے کھنڈروں سے کچھ دور پر وہ جنگ ہوئی جس نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ بے چارہ دارا میدان چھوڑ کر بھاگا مارا مارا پھرا اور باختر کے صوبیدار کے ہاتھوں قتل ہوا۔ [illegible] سکندر چند روز بعد اس بابل میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا جہاں دو سو سال قبل دارا سوم کے پیشرو اور ہخامنشی سلطنت کا بانی سائرس اعظم اپنے فاتح لشکر کے ساتھ وارد ہو کر بخت نصر کی جاہ و ثروت کا وارث بنا تھا۔

بابل سے نکلنے کے بعد سکندر نے شوش اور پرسی پولس کی اطاعت قبول کی اور قصر پرسی پولس میں قیام کیا۔ یہاں اس نے بسلسلہ ہم آہنگی مصلحت خود ایرانی شہزادیوں سے شادیاں کیں۔ تاج پہن کر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھنا شروع کیا اور اپنے فوجیوں کی شادیاں مقامی خواتین سے کروائیں۔ ایک ہنگامہ رہا۔ لیکن شراب بہت پیتا تھا۔ ایک شام ضیافت کے دوران ایتھنز سے ہمراہ آئی ہوئی ایک [illegible] گرل تائیس کی مسرور تجویز پر قصر پرسی پولس میں آگ لگوا دی۔ پھر سوچا کہ ذرا ایک چکر ہندوستان کا بھی لگا آؤں۔ چنانچہ باختر اور سغدیہ وغیرہ کو جیب میں ڈالتے ہوئے جہلم کے کنارے پہنچ کر اسی مقام پر بھائی پورس کا مقابلہ کیا جہاں کوئی سوا دو ہزار برس بعد ایک اور یورپین فاتح ایک اور پنجابی فوج سے بھڑنے کو تھا[1] پھر بلوچستان ہوتے ہوئے شوش واپس گیا۔ ۳۲۳ ق م کے موسم بہار میں وہ بابل آ کر سوچتا تھا کہ اسی شہر کو ہیڈ کوارٹرز بنائے کہ سال بھر بعد ہی بخار میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہوا۔ اور دنیا کے لئے اپنے افسانے چھوڑ گیا۔ اس کے بعد اس کی سلطنت اس کے سرداروں نے آپس میں بانٹ لی۔ سیلوکس نے ایران کی حکومت سنبھالی اور ہندوستان کا ترپ لگایا۔ دریائے سندھ عبور کر کے مہاراجہ چندر گپت موریہ سے ملاقات کی اور معاہدے پر دستخط کیے۔ جس کی تصویریں کھنچیں۔ جن میں دونوں حکمران مصافحہ کرکے کیمرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ مہاراجہ نے سیلوکس کو پانچ سو ہاتھی بھی بطور تحفہ پیش کئے۔ (آج بھی ہندوستان بسلسلہ خیرسگالی ہمسایوں یا بیرونی ممالک کو ہاتھی پیش کرتا رہتا ہے۔ یہ ایلیفنٹ ڈپلومیسی کہلاتی ہے) یہ بہت مفید ہاتھی تھے کیونکہ سیلوکس کی فوج ان کی

---

[1] انگریزوں اور سکھوں کا معرکہ چیلیانوالہ ۔ ۱۸۴۹ء

[redacted]

وجہ سے اناطولیہ اور شام میں کامیاب ہوئی۔ اب باختر سے لے کر یہودیہ تک کے ممالک سیلوکس اور اس کے جانشینوں کی عملداری میں آ گئے۔ ایک یونانی مورخ نے لکھا: "میں تم سے پوچھتا ہوں۔ آج سے پچاس برس قبل پارسیوں یا ان کے تاجدار یا مقدونیہ کے کسی دیوتا نے یہ پیشین گوئی کی ہوتی کہ آج کے دور میں یعنی جبکہ ہم زندہ ہیں اہل پارس کا نام و نشان تک مٹ چکا ہو گا جو ایک وقت تھا کہ ساری دنیا کے مالک تھے اور اہل مقدونیہ جو پہلے گمنام تھے آج سارے عالم کے فرماں روا ہوں گے — تو کوئی یقین کرتا؟"

سیلوکس کے علاوہ دوسرا یونانی سردار جس نے سکندر کے بعد اپنی حکومت قائم کی بطلیموس تھا جو فرعونِ مصر بن بیٹھا اور تین سو سال تک اس کی اولاد وادیٔ نیل پر راج کرتی رہی۔ اسی زمانے میں ہم ایک بار پھر یہودیوں سے ملاقات کرتے ہیں۔

ہخامنشی دور میں یہودیوں نے مدتوں بعد اطمینان کا سانس لیا تھا۔ تب ہی بابل سے لوٹ کر آل ابراہیمؑ نے مذہبی اصلاحات نافذ کیں۔ تورات کے قوانین رائج ہوئے اور انجیل کے وہ ابواب لکھے گئے جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہودیہ اب بطلیموسی فراعنہ کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن حصول اقتدار کے لئے بطلیموسی اور سیلوکسی خاندانوں میں لڑائیاں شروع ہوئیں اور یہودیہ پر مختلف اوقات میں شام اور مصر کا تصرف رہا۔ بطلیموسی حکمران یہودیوں کے دوست ثابت ہوئے۔ بطلیموس اوّل نے اسکندریہ بسا کر اس میں یہودیوں کی نو آبادی قائم کی اور اسکندریہ یونانی اور یہودی علماء و فضلاء کا مرکز بن گیا۔ بطلیموس اوّل ہی نے اس شہر کی مشہور لائبریری اور میوزیم[1] تعمیر کروایا۔ بطلیموس دوم نے اسکندریہ کے قریب روشنی کا وہ مینار بنوایا جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا تھا۔ بطلیموس سوم ایران جا کر وہ قدیم مصری نوادر اور دیوتاؤں کے بت واپس لے آیا جو ہخامنشی فاتح کمبوجیہ دوم یہاں سے لوٹ لے گیا تھا۔ اسکندریہ ہی میں ستر یہودی عالموں نے انجیل مقدس کا ترجمہ عبرانی سے یونانی میں کیا۔ جب دوسری صدی قبل مسیح میں ایران و شام کے سلوکی حکمران انطیوکس چہارم نے (جسے نسلاً اپنے یورپین ہونے پر بے حد فخر تھا) اپنی ایشیائی رعایا کو مہذب کرنے کا بیڑا اٹھایا اس وقت یہودیہ شام کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ سرکاری حکم سے یروشلم میں جمنازیم قائم ہوا۔ یونانی نام رائج کئے گئے اور ایتھنز سے ایک منطقی عوام کو یہ سمجھانے کے لئے بلوایا گیا کہ "یاہو" یہوہ دراصل جیوپیٹر دیوتا ہی کا نام ہے۔ ہیکل میں یونانی دیوتاؤں کے بت سجا دیئے گئے اور دینِ موسویؑ کی پابندی جرم قرار پائی۔ اسی زمانے میں غصے کے مارے یہودی مصنفین نے صحیفۂ دانیالؑ میں زوال یونان کی اس پیشین گوئی کا اضافہ کیا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ کچھ عرصے بعد سلطنت یونان کے بھی برے دن آ گئے اور مغرب میں اس کی جگہ روم نے لے لی۔ جس نے یہودیہ پر تسلط جما کر اس کا نام فلسطین رکھ دیا۔ ادھر تیرھویں بطلیموس کی لڑکی ملکۂ مصر ایزا بیتھ قلوپطرہ نے جولیس سیزر اور مارک انطونی دونوں کے ساتھ بیک وقت معاشقہ کیا اور ۳۰ق م میں اپنی جان گنوائی۔ اس کی موت کے بعد مصر بھی روم کا ایک صوبہ بن گیا۔ فلسطین کے رومی گورنر کے دور میں حضرت عیسٰیؑ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت عوام کی حالت بے حد خستہ ہو چکی تھی۔ حضرت عیسٰیؑ نے بھی قدیم عبرانی پیغمبروں کی روایت کے مطابق جابر حکومت اور حکومت کے پٹھو کاہنوں کی مخالفت کی اور ان کو صلیب پر پہنچایا گیا۔ چند سال بعد یہودی بغاوت زیادہ شدید ہوئی جسے فرو کرنے کے لئے رومی فوج نے بیت المقدس پر دھاوا بولا اور ۷۰ء میں تقریباً اس کا معبد جب آج سے ساڑھے چھ سو سال قبل بخت نصر نے ہیکل کو تباہ کیا تھا اور دیکھیں اس نے ہیکل کو جو دارا اعظم کے حکم سے دوبارہ بنایا گیا تھا نذرِ آتش کر دیا۔

---

[1] یہ لفظ اب عجائب خانے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ دراصل فنونِ لطیفہ کی نو یونانی دیویوں یعنی MOSES کا مندر تھا جس میں دار العلوم، آرٹ گیلریاں وغیرہ شامل تھیں۔

رومن عہد میں یہودی ایک بار پھر جلا وطن ہوئے اور فلسطین سے نکل کر سارے مغربی ایشیا شمالی افریقہ اور یورپ میں بکھر گئے۔

سلیوکی یونانی اقتدار مغرب میں روم اور مشرق میں وسط ایشیائی قبائل کے ہاتھوں ختم ہوا۔ باختر میں سلیوکی تسلط سے علیحدہ ایک یونانی باختری حکومت قائم ہو گئی جس نے اپنا دائرۂ اقتدار شمالی مغربی ہند تک پھیلایا۔ دوسری طرف جنگجو شہسواروں کے پارتی قبیلے نے سلیوکی آقاؤں سے بغاوت کر دی۔ اس قبیلے کے سردار دو بھائی ارشک اور تیرداد تھے جنہوں نے ۲۵۰ قم کے لگ بھگ ایران میں پارتھین یا اشکانی عہد کی بنیاد رکھی۔ معلوم پارتھین خود اپنے آپ کو کیا کہتے تھے۔ بہرحال یونانیوں نے ان کے علاقے مشرقی ایران یا خراسان کو پارتھیا کہا۔ سلیوکی حکومت بہت تیزی سے ابتر ہو رہی تھی اور سو سال کے اندر اندر پارتھین حکران مہرداد اول نے فرات سے لے کر ہرات تک اپنے تصرف میں لے لیا۔ مہرداد پنجاب جا کر وہاں کی باختری حکومت کا تیا پانچہ بھی کرتا آیا۔ اس نے دجلہ کے کنارے ایک وسیع فوجی چھاؤنی قائم کی جو بعد میں پارتھین دار السلطنت طیسفون کہلائی مہرداد کے پوتے فرہاد نے ۱۲۹ قم میں سلیوکی حکران انطیوکس چہارم کو زبردست شکست دی اور اس تاریخ سے گویا ایشیا میں حقیقی یونانی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

اس طرف ایک وسط ایشیائی قبیلے شاکا نے افغانستان اور مشرقی ایران کے خطوں پر قبضہ جما رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ علاقہ شکستان یا سیستان کہا جاتا تھا۔ یونانیوں نے ان کو سیتھیا کہا (سارے وسط ایشیائی قبائل کو عام طور سے سیتھین ہی کہا جاتا تھا) پھر اہل پارتھیا نے سیستان پر قبضہ کیا اور سیتھین اور پارتھین سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اسی دوران میں یہ حضرات ہندوستان میں برا جتے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے ناموں اور نسلوں اور مختلف حکومتوں میں بڑا سخت کنفیوژن ہے۔ شو یہ شاکا پہلوا اور انڈو پارتھین یا سیتھین پارتھین سبھی کچھ کہلاتے ہیں۔ اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون کیا ہے۔ پھر ان ہی میں باختری یونانی اور بعد میں یوچی یا تو خاری مزید جھمیلے پیدا کرنے کے شامل ہیں۔ گتھی کچھ اس طرح سلجھ سکتی ہے کہ شاکا لوگوں نے ہندوستان پر یلغار کی اور حکومت قائم کرنا اتنی آسان بات معلوم ہوتی ہے کہ جیسے دیکھیے اس نے حکومت قائم کر لی چنانچہ انہوں نے ہندوستان میں لمبی لمبی حرکت کی اور یہاں سات عدد "کھشتراپ" اور "مہاکھشتراپ" قائم کر دیے۔ پہلی صدی عیسوی میں یہاں باختری یونانی ریاستیں تو تھوڑی سی رہ گئی تھیں اور شاکا صاحبان متھرا میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اب پھر کچھ گھپلا ہوتا ہے اور یہ "شاکا پہلوا" بن جاتے ہیں یعنی ان میں ایران کے پارتھین پہلوان شامل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا بڑا بھاری بادشاہ GONDOPHARES ہے اور اس کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہیں۔ اسے مسیحی حکایت کے انہی مشرقی بادشاہوں میں سے ایک سے مماثل کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش پر تحفے تحائف لے کر بیت لحم گئے تھے۔ دوسری مسیحی روایت کے مطابق اس نے اپنا ایک سفیر ملک شام بھیجا تا کہ وہاں سے چند معمار چنے جو یونانی قسم کا ایک نیا شہر تعمیر کرنے کے لئے مطلوب تھے۔ یہ سفیر کسی مستند آرکی ٹیکٹ کے بجائے حضرت عیسیٰؑ کے حواری سینٹ طامس کو ساتھ لے آیا۔ سینٹ طامس نے اس شاکا پہلوا بادشاہ سے کہا کہ اے بادشاہ تو اپنا تک جنت میں ایک ایسے شہر کی تجھے خوشخبری دیتا ہوں جسے انسانی ہاتھوں نے نہیں بنایا۔ بالفاظ دیگر یہ کہ اے بادشاہ تو سیدھے سیدھے عیسائی ہو جا۔ چنانچہ بادشاہ (جس کا نام دوبارہ لکھنا بہت طوالت ہے) مع اپنے اہل و عیال و دربار کے کرسچین ہو گیا اور اس کے بعد سینٹ طامس نے

سلاوتھ انڈیا جاکر وہاں تبلیغ کی) ۔ بہرحال ان انڈو پارتھین پہلوانوں نے مالوہ، کاٹھیاواڑ، گجرات، ٹیکسلا، متھرا اور شمالی دکن وغیرہ پر مدتوں حکومت کی اور مقامی آبادی میں ادغم ہو گئے (کاٹھیاواڑ کے ہندو کسان آج تک یونانی وضع کی کرتیاں پہنتے ہیں اور پیچیدار پگڑیاں اور گھیردار شلوار نما دھوتیاں باندھتے ہیں) بعدازاں چینی ترکستان سے یوچی یا توخاری صاحبان وارد ہوئے۔ انہوں نے ہند کے باختری یونانیوں اور شاکا پہلوا دونوں کا صفایا کیا اور کشان سلطنت مشہور و معروف قائم کی۔ چنانچہ کنشک اول وہ زبردست شخص تھا جس نے باختر سے لے کر بنارس تک راج کیا اور بدھ مت کی جو سرپرستی کی وہ الگ۔ یہ یوچی یا کشان بھی شاکاؤں کی طرح ایرانی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبان بولتے تھے۔ گو چہرے مہرے سے اقوام زرد پوست کی مانند تھے۔ مہاراجہ کنشک جس کی راجدھانی پشاور تھی خود نسلاً شاکا نہیں تھا مگر ناموں کے اسی کنفیوژن کی وجہ سے وہ کیلنڈر جو اس سے منسوب ہے شاکا کہلاتا ہے (یہ شکہ سے شروع ہوتا ہے اور جنوبی ہند ہوتا ہوا یہی کیلنڈر جنوبی مشرقی ایشیا جا پہنچا۔)

اسی مہاراجہ کنشک والی یوچی قوم نے ایران پہنچ کر بھی تباہی مچائی اور وہاں کا پارتھین بادشاہ مہرداد دوم ان سے نپٹتا رہا۔ فرہاد دوم اور مہرداد سوم روم سے لڑنے جھگڑنے میں مشغول رہے۔ دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان فساد آرمینیہ نے کھڑا کر دیا تھا جس نے روم اور پارتھین سلطنتوں کی درمیانی BUFFER ریاست کی حیثیت سے بڑی پیچیدہ سازشیں شروع کر رکھی تھیں بالآخر ۵۳ ق م میں پارتھیا نے روم کو زبردست شکست دی اور ایک بار پھر ایک یورپین سلطنت کو ایران کا لوہا ماننا پڑا۔ ایرانی شہسواروں نے روم کی پیادہ فوج کا بھرتہ بنا دیا۔ ادھر روم کی سامی النسل محکوم اقوام یعنی یہودی اور عرب قبائل ایک مرتبہ پھر ایران کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے اور انجیل مقدس کے ابواب میں پارتھین شہسواروں کی فتح کی پیشین گوئی کا اضافہ بھی کر دیا گیا۔ فرہاد چہارم اور مارک انطونی کی افواج میں گھمسان کا رن پڑا۔ مارک انطونی کو پسپا ہونا پڑا اور فرہاد نے مارے خوشی کے مال غنیمت میں جو رومی سکے ہاتھ لگے تھے ان کے اوپر انطونی اور کلیوپیٹرا کے ناموں کے اوپر اپنے نام کا اضافہ کروا دیا۔ سیزر آگسٹس نے جو سکندر کے جانشین کی حیثیت سے تسخیر ایشیا کے خواب دیکھ رہا تھا اپنا ارادہ بدل دیا اور فرہاد چہارم سے دوستی کر لی۔ لیکن ہخامنشیوں کے دور انحطاط کی مانند اشکانی سلاطین کے ہاں بھی خانہ جنگیاں اور سازشیں شروع ہو گئیں اور اسٹیج پر ساسانیوں کے نمودار ہونے کا وقت آ گیا۔

پارتھین سلاطین پہلے یونانی اور بعد میں رومی تمدن سے بہت متاثر تھے۔ ان کے شہزادے اکثر سیاسی یا کلچرل کانفرنسوں میں شامل ہونے کے لئے روم جایا کرتے۔ لیکن اس کے باوجود اشکانی دور میں ایرانی کلچر کی تجدید ہوئی۔ اشکانی سماج بنیادی طور پر دلاوروں اور سورماؤں کا سماج تھا۔ قدیم ہخامنشیوں کی طرح ان کے ہاں بھی ایک نوع کا فیوڈل نظام قائم ہوا۔ رزمیہ داستان گوئی فیوڈل سماج کا خاصہ ہے۔ پارتھین سورما پہلوان کہلاتے تھے اور ان پہلوانوں کی داستانیں درباروں میں سنائی جاتی تھیں۔ زیادہ تر ان ہی قصوں پر ایران کے قومی رزمیہ شاہنامے کی بنیاد رکھی گئی۔ اہل پارتھیا کی زبان ہخامنشی فارسی سے مشابہ تھی۔ اور چونکہ پہلوانوں کی زبان تھی اس لئے پہلوی کہلائی۔ سیستان کے مشرق یعنی توران کے یوچی یا توخاری قبیلے سے اہل پارتھیا کی مسلسل جنگوں نے افراسیاب تورانی اور رستم سیستانی کی جنگ کی روایت تیار کی۔ (قصہ رستم کا کچھ حصہ سغدی زبان میں تھا جو چینی ترکستان میں بھی دستیاب ہوا ہے) پارتھین سماج جاگیرداروں، ازتان، آزادان اور دہقانوں [illegible] اپنی فوجی سواروں [illegible] یونانی اور رومی اثر کی وجہ سے ہرقلیس پہلوان کا بھی بہت چرچا تھا۔ پہلوانی اکھاڑے

آج تک اہل ایران کی محبوب تفریح گاہ ہیں۔ دین زرتشت نے بھی خراسان ہی میں جنم لیا تھا چنانچہ قدیم حکایات، مذہبی روایتوں اور داروگیر کے قصوں نے ایک قومی دیومالا کی تخلیق کی۔ گھوڑا ایک نہایت قابل قدر جانور تھا [illegible] [illegible] ان کی دوستی کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ پارتھین دور میں بابل میں یہودیوں کا علمی مرکز قائم ہوا۔ رومیوں کے خلاف یہودی بغاوت میں بھی ساسانیوں نے بنی اسرائیل کی مدد کی۔ (اور فلسطین میں یہ کہاوت مشہور ہوئی کہ جب تمہیں ایک پارتھین گھوڑا کسی [illegible] سے بندھا نظر آئے تو جان لو کہ ظہور مسیح کا وقت آن پہنچا) پہلی صدی عیسوی میں ایرانی، یونانی اور پارتھین فنی امتزاج سے ایران کے درباری آرٹ نے جنم لیا۔ ملک اپنی تہذیبی اور سیاسی عظمت کے ایک نئے دور کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

پارتھین دور کے خاتمے اور آل ساسان کے عروج کے درمیانی وقفے میں ایک نئی سیاسی پیچیدگی پیدا ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ کرسچان لوگ عالم وجود میں آ چکے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک محنت کش یہودی جو خیمے بنانے کا کام کرتے تھے اور جن کا اصل نام ساؤل تھا اور پھر عیسائی ہو کر سینٹ پال کہلائے زور شور سے اپنے تبلیغی سفر پر نکلے اور اناطولیہ، ایشیائے کوچک اور یونان میں جماعتیں قائم کیں۔ آخر جب روم پہنچے وہاں ان کو قید کر دیا گیا۔ روم والے نیرو نے (جسے سارنگی پر بے وقت کی راگنی چھیڑنے کا بہت شوق تھا) انھیں بہت ستایا اور ۶۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سینٹ پال نے شریعت موسوی کے بہت سے قوانین منسوخ کئے اور یورپین عیسائیوں کو پھر کھلے رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ سب سے زیادہ عیسائی سب سے پہلے مصر میں ہوئے جو قبطی کہلائے (COPT = GOPT = EGYPT) قبطیوں ہی نے رہبانیت کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک قبطی بزرگ سینٹ انطونی (غالباً ۲۵۱ء – ۳۵۶ء) نے مصر میں سب سے پہلی خانقاہ بنائی اور بہت جلد سارے صحرائے مصر و شام میں ان گنت خانقاہیں بن گئیں جن کے راہب ہندو سادھوؤں کی طرح طرح طرح عجیب عجیب طریقوں سے تزکیہ نفس کرتے۔ ایک مقبول عام طریقہ اونچے اونچے ستونوں پر چڑھ کر بیٹھ رہنے کا تھا۔ تیسری صدی عیسوی تک نظریہ تثلیث زیادہ رائج نہیں ہوا تھا لیکن اسکندریہ میں یونانی فلسفے کا زور تھا۔ وہاں یونانی LOGOS کے نظریے کے زیر اثر "کلمہ" جو خدا کے ساتھ تھا نے یسوع کے روپ میں اوتار لیا۔ (دین زرتشت میں بھی کلمہ تخلیق کائنات سے قبل موجود تھا) اب "ایک" اور "تین" والے عیسائیوں میں سخت جھگڑا شروع ہوا۔ تثلیث والے کہتے تھے کہ مسیح کی ذات بشریت اور الوہیت کا مجموعہ ہے۔ یہ مسیح کی وحدت فطرت کے حامی کہلائے۔ قبطی ہزار ہا سال سے دیوی آئسس کی مورتیاں پوجتے آئے تھے جن میں وہ اپنے بچے یعنی دیوتا ہورس کو دودھ پلاتی دکھائی جاتی تھی۔ اور چونکہ مسیح کی وحدت فطرت کے قائل ہو چکے تھے لہٰذا حضرت مریمؑ "ام المسیح" "مادر خدا" قرار پا گئیں۔ آئسس اور ہورس کی جگہ جلد ہی "مادر و پسر" کے مجسموں نے بآسانی لے لی۔ اس طرف قیصر روم قسطنطین نے عیسائی ہو کر ۳۳۰ء میں قسطنطنیہ بسایا اور روم سے علیحدہ بازنطیم کی حکومت قائم کی۔ (بازنطیم اس جگہ پر عہد قدیم میں ایک یونانی شہری ریاست کا نام تھا۔) اور سینٹ اناطولیہ اور آرمینیہ میں بھی پھیل گئی۔ "ایک" اور "تین" والوں کا جھگڑا زیادہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ کلیسا کی جنرل کونسل نے جو نیسیا (اناطولیہ) میں منعقد ہوئی ۳۲۵ء میں بالاتفاق رائے یہ ریزولیوشن پاس کر دیا کہ باپ بیٹا اور روح القدس تین خدا ہیں جو ایک

تھیوڈوسیس اعظم شہنشاہ بازنطیم نے ۳۸۰ء میں اپنے فرمان کے ذریعے ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا کہ خدا قطعی تین ہیں۔
یا نے ایمان بالغیب اور توحید کے پرچار کے لئے پچھلے دو ہزار سال تک جدوجہد کی تھی اور یہودی اب صدیوں سے توحید کے
ت کے قائل تھے۔ تثلیث اور اوتار کے عقیدے کے اس فروغ نے پیغمبروں کی ان ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ انبیائے
ا نے گردوپیش کی بت پرستی سے کسی قیمت پر سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ عیسائیت نے مصر اور یونان و روم کے اساطیری تصورات
وتہ کر لیا۔ چنانچہ ردِ عمل کے طور پر یہودیوں نے حضرت عیسٰیؑ کو پیغمبر تک ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ ادھر عیسائیوں نے
د "قاتلانِ مسیحؑ" کہہ کر ان پر جور و تشدد شروع کیا اور آئندہ دو ہزار سال تک یورپ میں ان کا تجربہ بناتے ہے۔
ا حد سے زیادہ کثیر ثابت ہوا۔ اور اوائل پانچویں صدی میں اسکندریہ کے عیسائیوں نے یہودیوں کا قتل
رع کر دیا۔ اور یہودیت اور یونانی عقلیت پرستی دونوں کے خلاف محاذ قائم کیا گیا۔ اسی زمانے کا
ہ المناک واقعہ یونانی فلسفی اور ماہر ریاضی خاتون ہائی پیشیا کا قتل ہے جسے بشپ سرل کے حکم سے رتھ کے پہیے سے باندھ
بربریت کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ ۴۱۵ء میں یہودیوں کو اسکندریہ سے بھی جلا وطن کر دیا گیا۔ (ان کارناموں کی وجہ سے بشپ سرل
کے بعد کلیسا نے سینٹ سرل بنا دیا) تو خود کلیسا کے اندر مختلف فرقے بڑھتے گئے۔ نسطوریس پطریق قسطنطنیہ نے ۴۲۸ء
کر دیا کہ مسیحؑ کی فطرت میں الوہی اور انسانی صفات علیحدہ علیحدہ تھیں۔ چنانچہ پھر سخت تکرار ہوئی اور نسطوری کلیسا علیحدہ ہو گیا
کلیسا "مشرقی قدامت پرست" یا "یونانی قدامت پرست" کلیسا کے نام سے بہت طاقتور ہو گیا (اور بعد کی صدیوں میں روس
) اسی زمانے میں ڈالمیشیا کے سینٹ جیروم نے انجیل مقدس کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ لیکن اب بھی بازنطیم کو مشرق میں

م کے خلاف مذاہب کے اتحاد اور عالمی سیاست کی ضروری مصلحتوں کی خاطر حال ہی میں پاپائے روم نے اپنے
فرمان کے ذریعے یہودیوں کو "قتلِ مسیحؑ" کے جرم سے بری کر دیا ہے۔ ادھر عرب قوم پرستی کے خلاف مغرب کے عیسائی اور
ب ایک ہو چکے ہیں جو دراصل خود کو برتر سمجھنے والی مغربی اقوام کا مشرقی نشاۃ ثانیہ کے خلاف اتحاد ہے۔ چنانچہ اب
یہودی مصنف "عیسائی یہودی غلط فہمیوں" کا ازالہ کرنے میں لگے ہیں۔

مصنف چارلز کنگزلے کے ناول ہائی پیشیا میں بیان کیا گیا ہے کہ فلیمن نامی ایک نوجوان راہب صحرا سے نکل کر سکندریہ کی زندگی
آتا ہے۔ (اسی طرح اناطول فرانس کے ناول میں ایک صحرائی راہب شہر آ کر طوائف تائیس کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے اور خود
ر میں پھنس جاتا ہے) ادھر اسکندریہ کے اسقف اعظم سرل کو معلوم ہوتا ہے کہ یہودی عیسائیوں کو مارنے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ عیسائی
پر حملہ کر دیتے ہیں جس میں بڑا سخت قتل و غارت فساد ہوتا ہے۔ بھائی فلیمن بھی مارا ماری میں شامل ہو کر یہودیوں کا صفایا کرنے میں جٹ
آپ ہائی پیشیا سے بھی بے حد متاثر ہیں۔ جو ابھی تک یونانی دیوتاؤں کی قائل ہے لہٰذا فلیمن پر ارتداد کا الزام لگایا جاتا ہے۔
ایک امیر یہودی نوجوان بھی ہائی پیشیا کا شاگرد ہے مگر وہ عیسائی ہو جاتا ہے فلیمن کی بہن جو ایک حسین طوائف ہے
صحرا میں جا کر تائیس کی طرح راہبہ بن جاتی ہے اور بطریق سرل کے راہب ہائی پیشیا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

ایک نئے اور زبردست حریف کا سامنا کرنا پڑا یعنی آتش پرست ساسانی ایران سے!

پہلوی کتاب کارنامک آردشیر کا کہنا ہے (اور یہ بھی سائرس اعظم کی پیدائش کی حکایت سے مشابہہ ہے) کہ پرسی پولس کے نزدیک شاہ پاپک حاکم شہر کے ہاں ایک گڈریہ ملازم تھا جس کا نام ساسان تھا۔ یہ ساسان دراصل شاہان ہخامنشیہ کی نسل سے تھا۔ (سلطنت کے بانی کا شاہی نسل سے ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح آل ارشک اپنا سلسلۂ نسب آردشیر دوم سے ملاتے تھے)۔ مگر کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی، پاپک نے خواب میں دیکھا کہ ساسان کا بیٹا ساری دنیا کا بادشاہ ہوگا۔ چنانچہ پاپک نے اپنی لڑکی کی شادی اس گڈریے سے کر دی اور اردشیر پیدا ہوا۔ ایک اور حکایت کے مطابق ساسان اصطخر کے مندر کا پروہت تھا۔ اس کے بیٹے پاپک ——— نے مقامی شہزادے گوچہر کی لڑکی سے شادی کی اور اس سے زبردستی حکومت چھین لی۔ (یاد کیجئے اسی طرح سائرس اعظم نے اپنے نانا سے میدیہ کا تخت چھین لیا تھا) ایک رومی مورخ نے لکھا کہ پاپک ایک جوتشی اور منجم تھا۔ اس کے گھر میں ساسان نامی ایک سپاہی مہمان ٹھہرا۔ اس کی بلند بختی کا اندازہ لگا کر پاپک نے اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی اور اردشیر پیدا ہوا۔ چند اور روایات کے مطابق ساسان فارس کا ایک امیرزادہ تھا، پاپک اس کا بیٹا اور اردشیر پوتا تھا اور غالباً یہی صحیح ہے کیونکہ پرسی پولس میں شاہ پور اول کے کتبے سے یہ کہا گیا ہے کہ ساسان ایک امیر اور شاہ پاپک کا باپ تھا اور پاپک شاہ پور کا دادا تھا۔ بہرحال اسی پاپک کے بیٹے اردشیر نے جو صوبہ فارس کا گورنر تھا اشکانی بادشاہ اردوان پنجم سے ۲۲۵ء میں بغاوت کر کے طیسفون پر قبضہ کر لیا۔ اور کشان سلطنت، بین النہرین اور آرمینیہ کے علاقوں پر تسلط جمایا۔ اس کے بیٹے شاہ پور اول نے ۲۶۰ء میں قیصر روم ویلیرین کو شکست دے کر ستر ہزار رومی سپاہ کو قید کیا۔ رومی بہترین انجینئر تھے (آج تک اٹلی والے انجینئرنگ میں لاثانی ہیں) چنانچہ انہی اطالوی جنگی قیدیوں سے ایرانیوں نے فن تعمیر میں بہت کچھ سیکھا۔ شاہ پور دوم کے عہد میں کشان سلطنت بھی ایران کا ایک حصہ بن گئی اور بلخ اس کا مستقر رہا۔ بازنطیم کا شہنشاہ قسطنطین شاہ پور اول کا ہم عصر تھا۔ چونکہ آرمنی عیسائی ہو چکے تھے حکومت ایران نے ان کو بازنطیم کا جاسوس سمجھنا شروع کر دیا۔ لیکن اسی زمانے سے زرتشتی اور مسیحی عقاید کی ضد شروع ہوئی۔ ایرانی مصور مانی نے یزدان کے فلسفے، مسیحی، زرتشتی اور بدھ تصورات کو ملا جلا کر ایک نیا کشادہ مشرب مذہب ایجاد کیا عالمگیر اخوت جس کی اساس تھی۔ اسی وجہ سے مانی کو رہبانیت کا پیشرو کہا جاتا ہے۔ مانی کی ماں روایت کے مطابق اشکانی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور یہ کنبہ ہجرت کر کے ہمدان سے بابل چلا گیا تھا۔ دین مانی دور دور روم و چین تک پھیل گیا اور روم میں پیروان مانی کو ایران کا جاسوس سمجھا جانے لگا۔ تردد ادا کے علم میں ملا کہ سینٹ آگسٹین جو شمالی افریقہ کے باشندے تھے شروع میں مانوی عقائد کے پیرو رہے۔ مانی کو غالباً بہرام اول کے حکم سے ۲۷۴ء میں قتل کیا گیا۔ بہرام گور اور کواد اول (عربی: قباد) کے دور میں موبدوں اور امراء کا زور بہت بڑھ گیا۔ جاگیرداروں نے کسانوں پر ظلم توڑنے شروع کئے۔ اور مزدک خراسانی نے اپنی سوشلزم کا پرچار کیا۔ مزدکیت دین مانی کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ چنانچہ قباد اول نے مزدکیوں کا قلع قمع کیا اور بائیں بازو کی تحریک کو کچلنے کی رسم کا اجرا ہوا۔ مگر خسرو اول یعنی نوشیرواں عادل (۵۳۱ء - ۵۷۹ء) نے موبدوں اور امیرزادوں کو مطیع کر کے مزدکیوں کی سرپرستی کی اور قیصر روم سے لڑ کر شام پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ عہد نوشیرواں عادل میں محمد رسول اللہ ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے۔

نوشیرواں کا بیٹا ہرمز چہارم (۵۷۹ء - ۵۹۰ء) بیحد ذہین اور بہت پڑھا لکھا انسان تھا - اس نے بھی اپنے والد کی طرح جاگیرداروں اور موبدوں کو قابو میں رکھنا چاہا - (اقتدار کے لیے بادشاہ کی طبقہ امراء اور مذہبی قائدین سے کشمکش ایران کا پرانا مسئلہ ہے جو موجودہ شہنشاہ ایران کی لائی ہوئی اصلاحات سے قبل تک باقی تھا) - اپنی حمایت کے لئے اس نے اپنی عیسائی رعایا کا سہارا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موبد اس کے اور زیادہ خلاف ہو گئے - بہرام چوبین ایرانی فوج کا نامور سپہ سالار تھا جس نے شمال کے ترکستانی قبائل کے دانت کھٹے کر دیے تھے - لیکن بازنطیم کے مقابلے میں اسے متواتر ہارنا پڑا - اس وجہ سے ہرمز نے ناخوش ہو کر اسے اپنے عہدے سے معزول کرنا چاہا - بہرام چوبین فوج اور عوام میں بیحد مقبول تھا - اس نے بغاوت کر دی - امراء نے اس کا ساتھ دیا - ہرمز کو زنداں میں ڈال دیا گیا - اور اس کے لڑکے خسرو پرویز دوئم کو تاج شاہی پہنایا گیا - لیکن بہرام چوبین جو اشکانی امراء کے ارفع ترین خاندان سے تعلق رکھتا تھا - اشکانی بادشاہت کی تجدید کا آرزومند تھا - فوج کی اعانت حاصل کر کے اس نے دارالسلطنت اور ایوان شاہی پر قبضہ کر لیا اور سال بھر تک حکومت کی - خسرو پرویز نے بھاگ کر بازنطیم میں پناہ لی جہاں شاہ جسٹین نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور ایک بازنطینی شہزادی ماریا سے اس کی شادی کر دی (جو نظامی گنجوی کی مثنوی "خسرو شیریں" میں مریم کے نام سے جلوہ گر ہے - ادھر بہرام چوبین کو بھی ایک عوامی ہیرو کا درجہ مل گیا) بازنطیم سے فوجی امداد لے کر خسرو پرویز وطن لوٹا اور بہرام چوبین کو قتل کر کے اپنی شاہی وراثت کا مالک بنا - کچھ عرصے بعد بازنطیم میں بھی بغاوت ہوئی اور ایک صوبیدار ہرقل نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا - اب ۶۰۳ء میں خسرو پرویز نے ہرقل کے خلاف قسطنطنیہ پر چڑھائی کر دی اور فلسطین سمیت متعدد بازنطینی صوبوں پر قابض ہو گیا - بیت المقدس کے یہودی بازنطینی حکومت سے پہلے ہی سخت نالاں تھے - انہوں نے حسب معمول ایک بار پھر ایرانیوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر ان کا ساتھ دیا - اس صلیب کو جس پر مسیحی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا تھا خسرو پرویز اکھاڑ کر ایران لے گیا اور یہودیوں نے خوب بغلیں بجائیں - بعد ازاں خسرو نے مصر پر حملہ کیا اور طرابلس کو جا لیا - ہرقل کی اس سے کنار دجلہ اسی جگہ جہاں سکندر دارا سوئم سے بھڑا تھا، بڑی بھیانک جنگ ہوئی - اب ہرقل بغلیں بجاتا ایران جا کر صلیب واپس لے آیا - اور جب یروشلم میں داخل ہوا ہے تو عیسائیوں نے اس کی راہ میں قالین بچھائے -

خسرو پرویز نے سلطنت کو بیحد وسعت دی تھی - لیکن شان و شوکت عیش و عشرت کا دلدادہ اور سخت فضول خرچ اور بد دماغ بادشاہ تھا (اسی کو رسول اللہ نے دعوت اسلام دی تھی اور وہ مسلمان قاصدوں سے انتہائی بدتمیزی اور گستاخی کے ساتھ پیش آیا تھا) - بیحد رومینٹک بھی تھا - چنانچہ ارمنی شہزادی شیریں پر عاشق تھا - اور بازنطینی ماریا کی وفات کے بعد اس سے شادی کی شیریں سے اس شادی میں عشق و محبت سے قطع نظر اس کے وزیر شاپور کی مصلحت یہ بھی تھی کہ آرمینیہ جو مدتوں سے ایران کے لیے درد سر بنا ہوا تھا سلطنت میں شامل ہو جائے - خسرو پرویز کے لیے ہرقل سکندر ثابت ہوا - اس نے کوہ قاف کے قبائل سے اتحاد کر کے وادی دجلہ کو تاراج کیا اور دستگرد کا محاصرہ کر لیا - خسرو نے فرار ہونا چاہا لیکن اس کی اپنی باغی فوج نے اسے قید کر لیا - اسی وقت دجلہ میں خوفناک سیلاب آیا جس کی وجہ سے تخت کسریٰ کا ایک حصہ تباہ ہو گیا - خسرو پرویز قید میں بیمار پڑ گیا - ان سب آفتوں کے باوجود اس نے ہرقل سے صلح کرنے سے انکار کیا فروری ۶۲۸ء میں خود اپنے سفاک بیٹے کے ہاتھوں (جو ملکہ ماریا کے بطن سے تھا) موت کے گھاٹ

اتھا۔ ساسانی ایران جو خسرو کے دور میں اپنی سلطنت کے نکتہ عروج پر پہنچ چکا تھا اس افسانوی تاجدار کے عبرت ناک انجام کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔ اگلے پانچ برسوں میں بارہ سلاطین تخت پر چڑھے اور اتارے گئے (یہی آخری منظر ہم ہخامنشی اور اشکانی ڈراموں میں بھی دیکھ چکے ہیں) عوام خسرو پرویز کے لگائے ہوئے بھاری ٹیکسوں سے نالاں تھے۔ سرحد پر ترکستانی قبائل حسب عادت اودھم مچا رہے تھے۔ ملک کے اندر مجوسی موبدوں کا زور حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ عیسائی رعایا الگ تباہ حال تھی اور اخلاقی تنزل سماجی بے انصافی اور سیاسی بے چینی کا یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں تھا۔

عجب ہے حکم اذاں ——!

۶۴۲ء میں کوہ البرز کے دامن میں تاریخ کی ایک اور فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ نہاوند کے محاذ پر یزدگرد سوئم مغلوب ہوا۔ صحرا بصحرا مارا مارا پھرا۔ اور دور افتادہ ترکستان میں ایک پنسہارے کے جھونپڑے کے اندر بیکسی کے عالم میں قتل کیا گیا۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل یہی حشر دارا سوئم کا ہوا تھا۔ ایک تسلسل اندھی۔ بوڑھی تہذیب ایک ترقی پسند، جوشیلے، تازہ دم نظام کے آگے دوبارہ سرنگوں ہوگئی۔

سید امیر علی لکھتے ہیں کہ جب مفتوحوں سے حاصل کیا ہوا مال غنیمت مدینہ پہنچا ہے تو حضرت عمرؓ رو دئیے۔ اور فرمایا کہ مجھے اس مال و دولت میں امت کی تباہی کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔
چنانچہ یہی ہوا۔ اسلام نے ملوکیت کا مخالف نظام حیات پیش کیا تھا۔ مگر اس کے پیرو بہت جلد عجمی شہنشاہیت کے طور طریق اختیار کرنے والے تھے۔

عہد قدیم کے ان تمام سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ بڑا سخت فکری پرابلم بھی چل رہا تھا۔ مصر قدیم کے تصویری رسم الخط کے بعد دوسری اسٹیج آئیڈیوگرافی کی تھی جس میں تصاویر اشیاء کے علاوہ خیالات کی نمائندگی بھی کرنے لگیں۔ یہ "عبوری" اسٹیج تھی۔ کلاسیکل مصری رسم الخط اور حروف کا خطرہ مخلوط تصویری اور صوتی طرز تحریر تھا۔ (چین و جاپان میں آج تک اسی قسم کا "عبوری" رسم الخط رائج ہے) اہل عراق نے گاؤدم شکل کا "خط میخی" اس لئے ایجاد کیا کہ وہ مٹی کی الواح پر نرکل کے قلم سے انشائیے اپنے افسانے لکھتے تھے اور ادیب لوگ ایک دوسرے کے "انشائیوں" کے متعلق تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ اس زمانے میں سومیری اور اکادی بین الاقوامی ڈپلومیسی کی زبانیں تھیں اور آراد، نینوا اور یروشلم اور دمشق کے سفارتی ڈنرز کے مواقع پر سب فر فر بولتے تھے۔ فنیقی تاجروں نے بہی کھاتے رکھنے کے لئے کوئی ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح عبوری طرز تحریر ترک کر کے ایک قسم کا شارٹ ہینڈ ایجاد کر دیا۔ اس کی مختصر علامتیں تعداد میں غالباً بائیس تھیں۔ بنی اسرائیل نے کنعان میں آباد ہونے کے بعد یہی حروف اختیار کر لئے۔ فنیقی رسم الخط بہت جلد مقبول ہو گیا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں ایک تو یہ ان کا شہر بائبلوس پچھلے دو ڈھائی ہزار برس سے مصر سے تجارت کر رہا تھا۔ مصر میں دریائی نرسلوں سے پیپائرس بنایا جاتا تھا۔ بائبلوس میں بھی اس کی فیکٹریاں کھل گئیں

غور فرمایئے کہ بائیبلوس میں پیپرس یعنی بائیبل کا پیپر یعنی کتاب کا کاغذ تیار ہونے لگا۔ کاغذ پر ابجد لکھنا اس سے کہیں زیادہ
تھا کہ پتھر لوح و قلم لئے خون دل میں انگلیاں ڈبو رہے ہیں۔ چنانچہ بائیبلوس کی انارکلی میں بے شمار ناشروں کی دوکانیں کھل
ں۔

سامی النسل فنیقیوں کے اس رسم الخط کی لگ بھگ ایک ہزار سال قبل مسیح کئی شاخیں ہوگئیں (۱) شمالی سامی: (الف)
نی جو ابتدائی عبرانی رسم الخط میں تبدیل ہوئی۔ (ب) فنیقی جو قرطاجنہ میں بھی رائج ہوئی (جو شمالی افریقہ میں فنیقی نو آبادی تھی)
ل سامی کی دوسری شاخ آرامی کہلائی جس نے عربی، سریانی، ارمنی اور جارجین تحریروں کو جنم دیا۔ لیکن جدید عبرانی کی اماں حوا
نی کے بجائے آرامی تھی۔ (۲) جنوبی سامی جو جزیرہ نمائے عرب میں محدود رہی مگر اس کی ایک شاخ نے ایتھوپیا میں رسم الخط کو جنم دیا۔
، یونانی۔

یونانی انڈو یوروپین زبان ہے اس نے سامی رسم الخط کیسے اختیار کر لیا؟ اس کا قصہ یوں ہے کہ یونانی لوگ فلسفے وغیرہ
چیز میں پڑنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بندرگاہوں پر آنے والے فنیقی تاجروں سے ان کے نرم و نازک حروف تہجی
ف، بیتھ، جیمل، والیتھ، زین، کاف، لامید، میم، نون، پے، رش، تے، واؤ، قو وغیرہ مستعار لے کر انھیں کاٹ کوٹ کر الفا، بیٹا،
یا، گاما وغیرہ بنا لیا۔ چند حروف اپنی طرف سے شامل کئے اور اس طرح ایک انڈو یوروپین زبان میں فنیقی
ف تہجی میں اپنے سامی ناموں سمیت داخل ہوگئے! شروع میں یونانی بھی سامی دستور کے مطابق دائیں سے بائیں طرف لکھی جاتی تھی۔
فنیقیوں سے لکھنا پڑھنا سیکھ کر اہل یونان اب دنیا کے سمندروں اور بازاروں میں اپنے استادوں کے بھی کان کاٹنے لگے۔ (آج
۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ مشرق قریب کے یونانی اور لبنانی تاجروں میں کون زیادہ تیز ہے۔)

آرامی شمالی سامی زبان تھی جس میں کلدانی اور سریانی شامل تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ (جو کلدانیہ کے پایہ تخت اُر میں پیدا ہوئے
ے) کی زبان عرب ارمی[1] تھی۔ کیونکہ بنی ارم دراصل صحرائے عرب کے باشندے تھے اور چراگاہوں کی تلاش میں ہجرت کر کے
رق وسطیٰ میں جا بسے تھے۔ کلدانیہ سے ہجرت کر کے کنعان میں آباد ہونے کے بعد آل ابراہیمؑ کی "عرب ارمی" زبان پر مقامی کنعانی
ن کا اثر پڑا اور اسی ابتدائی عرب ارمی اور کنعانی سانی اختلاط نے اس قدیم عبرانی کو جنم دیا جس میں توریت، صحف انبیا اور بعد
ت، تلمود (عربی = تلمیذ) اور ترگم (عربی = ترجمہ) یعنی اس کی تفاسیر لکھی گئیں۔ نسبتاً جمہوری سماج انہی ممالک میں پیدا ہوا۔ (فنیقیہ
۔۔ یونان و روم) جہاں حروف تہجی کی وجہ سے لکھنے پڑھنے میں آسانی ہوگئی تھی۔ اشور۔ مصر۔ بابل۔ عیلام وغیرہ کے آمریت پرست
ک تمدن میں "مجبوری" طرز تحریر کی وجہ سے تعلیم محدود اور کاتبوں اور کاہنوں کی اجارہ داری رہی۔ بعد کی صدیوں میں کاغذ یا چھاپہ لکھی جانے
والی ترقی پذیر آرامی مصر سے کر ایران تک رائج ہوگئی۔

سامی زبانوں میں معبود کے لئے لفظ ال کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہی ال ہمیں الہ، الوہی، الہٰ کی مختلف اشکال میں

---

[1] حضرت موسیٰ کی آخری موعظت کے موثر الفاظ یاد کیجئے: "تیرا باپ ایک بے خانماں ارمی تھا جو مصر جا کر ایک طاقتور قوم بن گیا۔"

اور انجیل کے ناموں میں نظر آتا ہے۔ (ہر عبرانی نام جو ایل پر ختم ہوتا ہے اسی عبرانی ایل سے مشتق ہے۔ مثلاً ڈینیئل۔ (دانی ایل۔ اللہ میرا منصف ہے) یوایل (اللہ آقا ہے) ایوزیل (اللہ ہمارے حافظ ہے) رفائیل (اللہ شافی و کافی ہے) مائیکل (اللہ کی مانند) گیبریل (قدرت اللہ) وغیرہ۔ اسی طرح ایلزبتھ خدا کو سونپی ہوئی یعنی اللہ رکھی! اب یاہ و یہہ والے نام لیجیے۔ ایلیاہ (ایلیاس) یعنی یاہ و یہہ خدا ہے۔ ذکریاہ (خدا نے یاد کیا یا ذکر کیا۔ ادیاہ (خدا کا شعلہ) متھیو (خدا کا تحفہ) یرمیاہ (خدا کا برگزیدہ)۔ اب ایک اور بہت عام انگریزی نام JOHN جان پر آئیے۔ بعل فنیقیوں اور کنعانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ حنی بعل یعنی بعل کی برکت ایک عام کنعانی نام تھا۔ ایک مشہور و معروف حنی بعل صاحب وہ تھے جنہوں نے قرطاجنہ سے نکل کر روم پر دھاوا بولا تھا۔ عبرانیوں نے بعل کے بجائے حنا یاہ اور یوحنا اپنے نام رکھے یعنی یاہ و یہہ کی برکت۔ یہی یوحنا ہمارے مسٹر جان JOHN ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ آرامی زبان بولتے تھے۔ آپ نے صلیب پر جانکنی کے عالم میں پکارا "ایلی ایلی لما سبقتنی۔" اتوہی۔ اتوہی۔ آبا۔ آبا۔ مجھے تو نے کیوں چھوڑ دیا۔" اسی آبا یعنی باپ سے بزرگ ترین یعنی راہب کے لیے انگریزی لفظ ABBOT فرنچ ABBE اور کسی خانقاہ کے لیے ABBEY نکلا۔ قدیم عبرانی الفاظ مسیح۔ ملک۔ ملک۔ کتاب۔ تحت۔ کبیر۔ امت۔ ابن و سما۔ عبد۔ حکمہ۔ خلیل۔ رب۔ کفارہ قربان۔ اربع۔ خطیہ۔ نبی۔ سلام وغیرہ عربی میں موجود ہیں اور ہماری اپنی روزمرہ کی بول چال میں شامل ہیں۔ بیت یعنی گھر امت شمس وغیرہ قدیم ترین اشوری الفاظ ہیں۔ عبرانی لفظ برک (برکت) لاطینی BENEDICO اور انگریزی BLESS میں منتقل ہو چکا ہے۔ یونانی میں فرشتہ کا تصور ناپید تھا۔ AN GELOS پیغامبر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ عبرانی "ملائکہ" نے لفظ ANGEL کو جنم دیا۔ قدیم ایرانی بادشاہوں کے باغات "فردوس" کہلاتے تھے۔ یونانیوں نے اسے PARADEISOS بنایا اور انجیل کے یونانی ترجمے میں یہ لفظ جنت اور "باغ عدن" کے لیے استعمال کیا گیا اور انگریزی میں PARADISE بنا۔ خود باغ عدن کا سراغ لگائیے تو معلوم ہوتا کہ جیسے کہ پہلے کہا گیا۔ باب پیدائش وغیرہ کا کچھ حصہ بابل میں لکھا گیا جہاں قدیم اساطیر کا پس منظر موجود تھا۔ بابل سے واپسی کے بعد عبرانی کی محض مذہبی اہمیت رہ گئی اور آرامی بنی اسرائیل کی روزمرہ کی زبان کی حیثیت سے رائج ہوئی۔ طلوع اسلام اور عرب فتوحات کے بعد عربی نے ایک عالمگیر تہذیبی زبان کا درجہ حاصل کیا۔ لیکن ایران میں اس کی وجہ سے ایک نیا لینگویج پرابلم پیدا ہو گیا جو "عربی فارسی کا جھگڑا" کہلایا۔

معرکہ نہاوند کے بعد آریہ ایران پر آل ابراہیمؑ کی دوسری شاخ یعنی بنی اسمٰعیلؑ یعنی مسلمان عربوں کی بالفاظ دیگر ایک سامی قوم کی حکومت قائم ہوئی۔ ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ کا انتقال ہوا۔ جنگ جمل کے بعد کوفہ دار الخلافہ قرار پایا۔ شیعان علیؓ اور خوارج کے تفرقے پیدا ہوئے۔ ۴۰ھ میں ایک خارجی ابن ملجم نے جناب امیرؓ کو شہید کیا۔ ۶۱ھ میں حسینؓ ابن علیؓ نے دشت کربلا میں جام

لہ یہودی روایات میں تاریخی واقعات کے علاوہ جو اساطیری عناصر شامل ہو گئے تھے ان کے مجموعہ مرکب سے بعض مسلمان راویوں نے حکایات تیار کیں جن کی بنیاد پر قصص الانبیا وغیرہ کی طرح بے حق جنت شداد و چاہ بابل وغیرہ کی محیر العقول داستانیں قلمبند کی گئیں جو یونانی اور ہندو دیومالاؤں سے کسی طرح کم نہیں۔

…ب ودت نوش فرمایا۔ رسول اللہؐ نے اپنے آخری خطبے میں فرمایا تھا: "یہ تم کو میری آخری نصیحت ہے کہ تم سب آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو" …ن نصیحت پر عمل کس طرح کیا گیا وہ سب کو معلوم ہے۔

دارالاسلام کے نئے معاشرے میں موالی یعنی غیر عرب مسلمان اور ذمی یعنی غیر مسلم بڑی تعداد میں شامل تھے۔ لیکن حکمراں طبقہ عرب تھا۔ موالی اور عربوں کے درمیان سماجی اور اقتصادی تفاوت بڑھتا گیا۔ اور عرب و عجم کی کشمکش شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے شیعہ تحریک نے ایرانی یعنی موالی آبادی میں زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ایران کے زرتشتی جاگیردار طبقے کے بیشتر افراد فتح اسلام کے بعد مازندران کے پہاڑوں میں جا چھپے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ سب مسلمان ہو گئے۔ اور اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر عرب حکومت کے وفادار رہے۔ موالی شیعوں نے جن میں زیادہ تر غریب ایرانی عوام شامل تھے ظہور مہدیؑ کا انتظار شروع کیا۔ انواع و اقسام کے نقلی "مہدی" سیاسی ہنگاموں کی قیادت کے لئے سامنے آئے۔ خراسان گویا ایران کا دل تھا کہ عموماً شدت پسند تحریکیں یہیں سے شروع ہوتیں۔ بہت جلد ان تحریکوں نے ایرانی قوم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ خلفائے بنو امیہ کے بے پناہ مظالم کے خلاف جب ابو مسلم خراسانی نے علم بغاوت بلند کیا تو اس نے، وہ خود کو قصہ رستم کے پہلوان گودرز کیانی کی اولاد بتاتا تھا، یہ کہہ کر امام محمدؑ کے سوگ میں اپنی فوج کی وردی سیاہ بنوائی کہ گودرز نے بے گناہ سیاوش کے غم میں سیاہ پوشی اختیار کی تھی۔ (اس کے بعد دولت عباسیہ کا سرکاری لباس بھی سیاہ ہو گیا!) ابو مسلم کے ہاتھوں اگست ۷۵۰ء میں اموی خلافت کا خاتمہ ہو گیا مگر بدامنی ختم نہ ہوئی۔ برمکی خاندان نے جو قبول اسلام سے قبل بلخ کے آتشکدہ نوبہار کے موبدوں کا گھرانا تھا بغداد میں اقتدار حاصل کیا۔ ساسانی وزیر کا عہدہ مع آداب و رسوم شاہانہ وجود میں آیا۔ امیر المومنین اب ساسانی بادشاہوں کی طرح دربار میں پردے کے پیچھے بیٹھتے تھے!! اور انہوں نے اب جی بھر کے بنو امیہ پہ ظلم توڑے!!

جیسے جیسے عرب مرکز کمزور پڑا ایران میں خود مختار حکومتیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ طاہریہ خاندان کے بانی کو خلیفہ المامون نے ۸۲۰ء میں خراساں کا گورنر بنایا تھا۔ انہوں نے موقع پاتے ہی اپنی ریاست قائم کر لی اور ۸۲۰ء سے ۸۷۳ء تک نیشاپور میں ٹھاٹھ کئے۔ اسی زمانے میں سیستان میں یعقوب بن لیث صفاری نے جو ایک لوہار کا لڑکا تھا طاہری حکمران کو معزول کر کے خراساں پر قبضہ جمایا۔ اسی نے قومی احیا کا باقاعدہ آغاز کیا عربی کے بجائے فارسی سرکاری زبان قرار دی۔ ورنہ فارسی ادب کی سرپرستی کی داغ بیل ڈالی۔ شاہ ایران محمد رضا پہلوی کے جشن تاجگذاری کے موقع پر ایران قدیم و جدید کے متعلق جو بے انتہا نفیس مصور کتابیں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ میں مغربی اور دوسرے غیر ملکی مہمانوں اور نامہ نگاروں کو پیش کی گئیں ان میں سے ایک میں یعقوب صفاری کے لئے لکھا ہے: "یعقوب بن لیث خصوصیت سے قابل ذکر ہے کیونکہ اس نے خلیفہ وقت سے بغاوت کی اور عباسی سفیر سے کہا۔ جاؤ اور جا کر اپنے آقا سے کہہ دو کہ اگر میں زندہ رہا تو تلوار ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ اگر میں جیت گیا تو جو میرے دل میں آئے گا کروں گا۔ اگر تم کامیاب رہے تو روٹی اور پیاز ہی میری قسمت میں لکھے ہیں۔ لیکن تم یا قسمت دونوں ایسے انسان کو کچھ نہیں بگاڑ سکتے جسے روکھی سوکھی روٹی پیاز کھانے کی عادت ہے۔" آگے چل کر اسی کتاب میں مرقوم ہے: "گو عرب تسلط کی وجہ سے ایران نے کئی صدیوں تک اپنی آزادی کھو دی مگر ایرانی قوم کا جذبۂ حریت فنا نہ ہو سکا۔ اسلام ایران میں آیا مگر یہاں پہنچ کر پہلے جیسا نہ رہا۔ ایران ایک مسلم ریاست بنا لیکن عرب ریاست نہ بن سکا نئے مذہب سے مطابقت ایرانیوں کے لیے ایک دور رس انگیز ذہنی تحریک بنی۔ لیکن یہ مطابقت ابتدا ہی سے پیدا ہوئی جب اہل ایران نے اپنا رشتہ وفا اہلبیت رسولؐ یعنی جناب زہراؑ

اور ان کے شوہر حضرت علیؓ (جو رسول اللہ کے کزن بھی تھے) سے پیار کیا۔ اور شیعیت کی بنیاد اسی وفاداری پر قائم ہے جو عربوں کے سُنی عقائد سے مختلف ہے۔ دراصل ایران میں شیعیت نے اسلام کے استقلال کے ساتھ ہی ساتھ عرب روحانی تسلط کا قیام ناممکن بنانے کا دوہرا فریضہ انجام دیا۔ سیاسی لحاظ سے گو ایرانی اب محکوم تھے لیکن بہت جلد ان کو حکومت میں شامل کر لیا گیا کیونکہ عرب امورِ مملکت سے بالکل نابلد اور انتظامی معاملات میں ناتجربہ کار تھے اور ملکی امور کے سلسلے میں ایرانیوں ہی کے دستِ نگر تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ خلیفہ سلیمان نے کہا: ایرانیوں نے ایک ہزار سال تک ساری دنیا پر حکومت کی لیکن دوسری اقوام کے تعاون کے محتاج نہ رہے۔ افسوس کہ ہمیں روزانہ امورِ سلطنت میں ایرانیوں کے مشوروں اور تعاون کی حاجت رہتی ہے۔ عربوں نے ساسانی طرزِ حکومت کو تبدیل نہیں کیا۔ حتیٰ کہ پہلوی رسم الخط سرکاری کاروبار کے لیے استعمال کیا گیا۔ اور آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم کے سکے بھی ٹکسال میں ڈھالے جاتے رہے۔ بعد میں عربی الفاظ فارسی میں داخل ہوئے جس طرح انگریزی زبان میں یونانی اور لاطینی الفاظ شامل ہو گئے تھے۔ سارے ممالکِ عرب سلطنت میں جو بحرِ ہند سے بحرِ اوقیانوس تک پھیلی تھی ایران ہی واحد ملک تھا جس نے اپنی قومی زبان برقرار رکھی۔ ورنہ باقی سارے ممالک میں عرب تسلط کے بعد وہاں کی مقامی زبانیں فنا ہو گئیں۔ لیکن ایران میں جو عربی الفاظ فارسی میں داخل ہوئے ان کے تلفظ اور معنی مختلف ہو گئے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ عرب تسلط کے صرف دو سو برس بعد ایران میں وہ حیرت انگیز تہذیبی گہما گہمی اور ادب، فلسفہ، آرٹ، سائنس اور کلچر کا وہ فروغ ہوا جو بہت صدیوں بعد اٹلی اور یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں ظہور میں آیا۔ گو درحقیقت ایرانی دانشوروں نے عربی میں لکھا جو سرکاری "انٹلکچوئل" زبان تھی مگر آج جسے اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے وہ درحقیقت ایرانی تہذیب ہی ہے۔ ابن سینا، رازی، فارابی، خیام، طوسی وغیرہ وغیرہ سب ایرانی تھے۔[1]

اس طویل اقتباس کے بعد زندہ رود یعنی وقت کی بھی سسکی پیش کیا جاتا ہے:

بعد مدت چشم خود بر خود گشاد — لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد
کشتۂ ناز بتان شوخ و شنگ — عاشق تہذیب و تقلید فرنگ
کار آں وارفتۂ ملک و نسب — ذکر شاپور و تحقیر عرب!
با وطن پیوست و از خود در گذشت — دل برستم داد و از حیدر گذشت
پیر ایران از زمان یزدجرد — چہرہ او بے فروغ از خون سرد
موج مے در شیشۂ تاکش نبود — یک شرر در تودہ خاکش نبود
تا ز صحرائے رسیدش محشرے — کو داد او را حیات دیگرے
این چنین محشر از عنایات خداست — پارسی باقی بروم الکبریٰ کجاست!
آنکہ رفت از پیکر او جان پاک — بے قیامت بر نیاید ز خاک

---

[1] Printed by Offset Press Inc Tehran) ۱۹۷۰ء PROFILE OF IRAN

مردِ صحرائی بایران جاں دمید ‏ ‏ ‏ ‏ باز سوئے ریگ زار خود رمید
کہنۂ ما از لوحِ ما بسترد و رفت ‏ ‏ ‏ ‏ برگ و سازِ عصرِ نو آورد و رفت!

آہ احسانِ عرب نشناختند
زاتشِ افرنگیاں بگداختند![1]

زندہ رود کے ہمراہ پھر یعقوب صفاری کے ہاں واپس چلیے جس کی اولاد ۹۰۳ء تک ہی حکمرانی کر سکی اور اس کی جگہ ترمز کے سامانیوں نے لے لی جنہوں نے خراسان اور ماوراءالنہر کے علاقے صفاریوں سے چھین کر ۸۷۴ء سے ۹۹۹ء تک بڑی دھوم دھام سے حکومت کی اور بخارا اپنا پایہ تخت بنایا۔ دوسری طرف زیاری خاندان ۹۳۲ء سے ۱۰۴۲ء تک طبرستان (موجودہ مازندران) میں ڈنکا بجواتا رہا۔ بحیرہ کیسپین کے قریبی علاقے میں دیلمی خاندان نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان لوگوں نے جو آل بویہ کہلائے ۹۳۲ء سے ۱۰۵۵ء تک وسطی اور مغربی ایران کو اپنے زیرِ نگیں رکھا اور ان کا اقتدار اتنا بڑھا کہ ۹۴۵ء میں انہوں نے بغداد پر اپنا تسلط جما لیا اور عباسی خلیفہ وقت کو پنشن دینے لگے۔

ان ساری ایرانی ریاستوں کے بانی قدیم ارسٹوکریسی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور سب مارے قوم پرستی کے اپنا رشتہ قدیم شاہانِ عجم سے ملاتے تھے۔ ابو مسلم خراسانی نے خود کو گودرز گیانی کی اولاد بتایا اور اسے انوشیرواں عادل کے شہرہ آفاق وزیر حکیم بزرجمہر کے اخلاف سے بھی منسلک کیا گیا۔ آل سامان نے بہرام چوبین اور زیاری حکمرانوں نے انوشیروان عادل سے اپنے اپنے شجرے ملائے۔ اور یہ سب شاہی گھرانے آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے۔

ان خاندانی ریاستوں کی خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مذہبی شورشیں بھی جاری تھیں جو سب ابو مسلم خراسانی کی تحریک کی آل اولاد تھیں۔ معاشی اور سیاسی بے اطمینانی نے حسبِ معمول مزدکی اور انتہا پسند شیعہ یا خارجی احتجاج کا جامہ پہنا۔ ۷۴۹ء میں نیشاپور میں بہآفرید نے سر اٹھایا تھا۔ یہ جب اپنے آپ کو اصلاح پسند زرتشتی پیغمبر بتلاتے تھے خود زرتشتی موبدوں کے کہنے پہ نئی عباسی حکومت نے ان کا اور ان کے پیروؤں کا قصہ پاک کیا۔ ابو مسلم کے مرنے کے بعد اس کے انتہا پسند پیروؤں نے کئی بغاوتوں کی قیادت کی۔ اور دعوے کیا کہ ابو مسلم بھی امام مہدی القائم المنتظر[2] کی طرح روپوش ہے۔ ۷۵۵ء میں ابو مسلم کے ایک ساتھی سالار فیروز یا سنباد نے جو غالباً خود بھی مزدکی تھا ہنگامہ کھڑا کیا۔ مغربی ایران کے کسان اور زرتشتی منافق اور مسلمان بدعتی سب جھنڈے تلے جمع کرتے اور متعدد شہروں میں گویا اپنی آزاد سرکار قائم کی۔ ان کی خلیفہ منصور کی افواج نے سرکوبی کی۔ پھر اسحاق ترک کی باری آئی جن کو ابو مسلم نے اپنے عقائد کی تبلیغ کے لئے ترکستان بھیجا تھا۔ ۷۵۸ء میں ان کی بغاوت فرو کی گئی۔ اس کے بعد مقنع صاحب اپنا سنہرا نقاب پہنے تشریف لائے۔ مرو کے باشندے تھے۔ آپ نے حلول کے عقیدے کا پرچار کیا اور سالہا سال فرزندی کی مانند اعلان کر دیا کہ ابو مسلم دراصل خدا تھا۔ المقنع کی عوامی تحریک خراسان اور ماوراءالنہر میں پھیل گئی۔ اور یہ بھی مقنع ذات کے دعوی تھے مگر کس قدر حیرت انگیز شخصیت تھی کہ آج تک لوگوں کو نہیں بھولے۔ مخالفوں کو مذاق اڑانے کے لیے

---

[1] جاوید نامہ

کہ اس نے شہر نخشب کے پاس ایک کنویں میں ایک خاص پارے سے بھر کر رکھوایا اور انعکاسِ شعاعِ قمر کا ایسا عمل کیا کہ دو چاند آسمان پر نظر آنے لگے۔ کمال ہے بھئی۔ (طامس مور کی مشہور ناول "لالہ رخ" میں "خراسان کا نقاب پوش پیغمبر" موصوف ہی ہیں)۔ بہرحال زابلستان بخارا وغیرہ میں اس کے بے شمار پیرو ہو گئے۔ اہلِ ترکستان نے مقنع کا ساتھ دیا۔ سب نے مل کر خوب لوٹ مار مچائی اور کئی شہروں پر قبضہ کیا۔ مقنع سرکاری افواج کا مستقل مقابلہ کرتا رہا۔ بالآخر جب قلعۂ کش کا محاصرہ ہوا ہے تو مقنع کو ہار ماننا پڑی۔ یہ اس کے اعمال میں نہیں لکھی تھی۔ اپنے بال بچوں کو زہر پلا کر خود بھی چتا میں کود گیا۔ مقنع اپنے زمانے کا زبردست انقلابی اور ANTI - ESTABLISHMENT لیڈر تھا جس کے حال کو دورِ حاضرہ کے مبصر زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

مقنع کی تحریک ۷۷۸ء میں ختم ہوئی۔ پھر بابک خرمی کا ہنگامہ کھڑا ہوا۔ بابک بھی ایک سنسنی خیز مزدکی لیڈر تھا اور مجوسیوں کے اس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو اشتراکیت اور NIHILISM کے قائل تھے۔ ۸۱۶ء میں اس نے آذربائیجان کے علاقے میں ایک منظم کسان بغاوت شروع کروا دی۔ یہ بغاوت جنوبی مغربی ایران، آرمینیہ اور شمالی صوبوں میں پھیلی اور دہقان یعنی چھوٹے زمیندار طبقے نے بھی اس کا ساتھ دیا کیونکہ زیادہ تر دہقان یا برانا مصداق کھونے کے بعد عربوں کا شکار رہ گئے تھے۔ سات برس میں مسلسل بابک کی فوجوں نے خلیفہ مامون کے چھ جرنیلوں کو شکست دی۔ بازنطیم سے بھی سازباز کی لیکن خلیفہ معتصم کے زمانے میں انہیں تہ تیغ کر دیا گیا۔ چند برس بعد فلسطین میں نقاب پوش مبرقع صاحب نمودار ہوئے۔ جو ایک اموی کی حیثیت سے عباسیوں سے انتقام لینے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے بھی بے شمار مرید جمع کر لیے۔ خلیفہ واثق نے ان کو قید کروایا۔ سب سے زیادہ اہم سیاسی ہنگامہ حبشی غلاموں کا تھا جو کانوں، بحری بیڑوں اور کھیتوں پر کام کرتے تھے اور مسلمانوں کے نئے سرمایہ دار طبقے کی اہم ملکیت تھے۔ بصرے میں ہزارہا بدحال زنگی غلام نمک کے علاقے اور ساحلی دلدلیں خشک کرنے کی جان لیوا محنت میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی حالت بے حد دگرگوں تھی۔ ان کو ستمبر ۸۶۹ء میں علی بن محمد نامی ایک ایرانی ہی نے باقاعدہ منظم کیا۔ اور پرولتاری بغاوت شروع ہو گئی۔ سرکاری فوج جو ان کی گوشمالی کے لیے بھیجی گئی اس کے حبشی سپاہی اپنے بھائی بندوں سے جا ملے۔ کسانوں نے بھی حبشیوں کا ساتھ دیا۔ (علی بن محمد کے دو نائبوں میں سے ایک آٹا پیسنے والا اور ایک شربت فروش تھا)۔ باغی حبشیوں نے سرکاری لشکر کے چھکے چھڑا دیے۔ جنوبی مغربی ایران پر دھاوا کیا۔ بصرے پر حملہ کیا اور ۸۷۹ء میں وہ بغداد سے ۱۷ میل کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ فروری ۸۸۱ء میں بالآخر حکومت عباسیہ کا پلہ بھاری رہا اور زنگیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ علی بن محمد نے معافی چاہنے اور سرکاری پنشن لے کر سیاست سے بے تعلق ہو جانے کی پیش کش مسترد کر دی اور نومبر ۸۸۳ء میں ترک علم بردار اس کا سر بغداد لایا۔ کوئی منظم پروگرام اور واضح مقاصد سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے جمہوری انقلاب آج بھی بری طرح ناکام رہتے ہیں۔ تو اس وقت بھلا کیا ہوتا! زنگیوں کے بعد بڑا بھاری فتنہ اسمٰعیلیوں، قرامطیوں کا تھا۔ جس نے سارا معاشرہ زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ عالمِ اسلام میں اب ان گنت مذہبی فرقے پیدا ہو چکے تھے اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔

لیکن ایران کی خاندانی ریاستوں کو جو ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے رہتے تھے ان مذہبی ہنگاموں کا سامنا کرنے میں مصروف تھے۔ یا پھر بھی ایک نئے تھیم یعنی اپنے پرانے دشمن تورانیوں کا مقابلہ کرنا تھا جو اب غزنویوں اور ان کے بعد سلجوقیوں کے روپ میں سرحد پر نمودار ہو رہے تھے۔

پیدائش مسیح سے قبل کے ایک ہزار سال میں وسط ایشیا اور جنوبی روس کی چراگاہوں پر سیتھین غالب رہے تھے۔ پہلی پانچ عیسوی صدیوں میں ہن اقوام کا ہنگامہ رہا۔ ان لوگوں نے کشان اور گپتا سلطنتوں کا شیرازہ بکھیرا۔ پھر ایک طرف چین اور دوسری طرف یورپ میں نت جوتی اور ہالی ووڈ پہنچ کر "ایٹیلا دی ہن" نامی رنگین فلم بنوایا۔ ہن حضرات سمرقند و بخارا و سغدیہ کے نخلستانوں سے اٹھے تھے اور ساری متمدن دنیا پر اس طرح چھائے کہ ان کا نام ہی خونخوار کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ چھٹی صدی عیسوی میں ترک سامنے آئے۔ اس وسط ایشیا میں ایرانی النسل اور ترک التائی نسلیں گڈمڈ تھیں۔ یہ سارے خانہ بدوش جنگجو قبائل ایرانی اور التائی اور یورالی زبانیں بولتے تھے۔ رفتہ رفتہ ترک باقی سب پر غالب آتے گئے۔ انہوں نے چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحیرہ اسود تک اپنی دھاک بٹھا دی۔ تہذیب آسمان پرستی، شامانیت۔ بدھ مت اور عیسائیت اختیار کی۔ آغاز خلافت کے وقت ایران سے اوپر ترک اقوام اناطولیہ سے لے کر منگولیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کا سب سے طاقتور سردار خان کاشغر تھا۔ وسط ایشیا پر اسلامی تسلط کے بعد ان لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ایرانیوں کا اثر کم کرنے کے لئے خلیفہ منصور نے ترکمان سخت کوش کو فوج میں بھرتی کیا۔ اور اسلامی معاشرے میں بقول پروفیسر مجیب[1] ترکوں کی وہی حیثیت ہوگئی جو ہندوستان میں کھشتریوں یعنی راجپوتوں کی تھی۔ خلافت کا شیرازہ سرعت سے منتشر ہو رہا تھا اس وقت سیاسی فوقیت حاصل کرنے کی جدوجہد میں ایرانیوں کو ان ہی اہل سیف تورانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایڈمنسٹریشن اور علم و ادب کا میدان ایرانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ بالآخر اہل سیف اہل قلم پر غالب آئے۔

الپتگین ایک ترکستانی غلام تھا جسے خاندان سامانیہ کی طرف سے خراساں کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ سامانی امیروں کے تنزل سے فائدہ اٹھا کر اس نے ۹۶۰ء میں غزنی میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اپنے غلام سبکتگین کو جو اس کا داماد بھی تھا وہاں کا فرمانروا بنا دیا۔ سبکتگین کے بیٹے محمود نے سامانیوں، زیاریوں، دیلمیوں وغیرہ سب کو راستے سے ہٹایا اور سارے ملک پر چھا گیا۔ ہندوستان کا رخ کیا اور اس کے ذریعے فارسی زبان و تہذیب پنجاب[2] پہنچی۔

چنانچہ اب اسلامی سیاست و تمدن میں بہت سے نسلی اور لسانی عناصر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدال میں مشغول تھے۔ ۹ ب

...نیہ میں ہن حکومت کے صدر مقام سیالکوٹ اور ماترہ تھے۔ مہرکل نامی ہن راجہ کا بڑا زور رہا۔ رفتہ رفتہ پچھلے شاکاؤں وغیرہ کی طرح ہن بھی راجپوت آبادی میں ضم ہو گئے۔

[1] سلطان محمود غزنوی۔ از پروفیسر محمد مجیب۔ مطبوعہ ہندوستانی اکیڈیمی۔ الہ آباد۔ سنہ ۱۹۳۰ء

[2] آٹھویں صدی عیسوی تک سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے افغانستان ہندوستان میں شامل سمجھا جاتا تھا جس کی آبادی میں پارتھین سیتھین ہن سب خلط ملط تھے۔ کابل میں پہلے سیتھی ترکوں کی "ترک شاہی" قائم تھی جس کا بانی برہتگین اپنا سلسلہ نسب مہاراجہ کنشک سے ملاتا تھا۔ اور مذہباً بودھ تھا۔ اس خاندان کے آخری حکمران کو معزول کر کے اس کے برہمن وزیر کلار نے "ہندو شاہی" قائم کی۔ یہی زمانہ تھا جب سارے ہندوستان میں بدھ مت کو زوال اور برہمنیت کو عروج حاصل ہوا۔ کلار ہی کی نسل کے راجہ جے پال اور آنند پال پنجاب کے فرمانروا تھے جو سبکتگین اور محمود سے لڑے۔

ایرانی اور ترک ؛ اور اقبال نغمہ سرا تھا ــ

در جہاں باز آمد ایام عرب ——— دیں ہزیمت خوردہ از ملک و نسب[۱]

مجمی شہنشاہیت کا رعب لوگوں پر اس قدر طاری تھا اور اپنے آپ کو تاجداران فارس کی اولاد ظاہر کرنے کی ہوا ایسی چلی تھی کہ بقول فرشتہ محمود بھی خود کو آل ساسان میں سے سمجھتا تھا۔ مصنف منہاج السراج کے حوالے سے فرشتہ لکھتا ہے کہ جب یزدگرد سوئم مرو میں ہلاک کیا گیا ہے اس کے تابعین اور خانوادہ ترکستان فرار ہوئی اور وہاں ترکوں سے شادیاں کیں۔ چنانچہ سبکتگین بن جوقان بن قرا الحکم بن قزل ارسلان بن قرا تا مان بن فیروز بن یزدگرد۔ (شہزادہ فیروز کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ وہ بھاگ کر چین چلا گیا تھا) محمود بہرحال تاریخ اسلام کا پہلا فرمانروا ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اور نئی شہنشاہی کی بنا ڈالی۔ اور اس کے دربار کے چار سو شعرا میں سے اکثر نے بادشاہوں کے مضمون پر طبع آزمائی کی۔ اسدی نے گرشاسپ نامہ اور فردوسی نے شاہنامہ لکھا۔

شاہنامہ فردوسی کے پس منظر میں ایران قدیم کی نیم اسطوری لسانی اور مذہبی تاریخ پنہاں ہے۔ اس لئے ہم ایک بار پھر ماضی کی سیر کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔

قدیم ترین ابتدائی انڈو یوروپین زبان کی بیٹی وہ آرین یا انڈو ایرانی تھی جس کی دو شاخیں مادی اور ہخامنشی کہلائیں۔ ان دونوں کی تیسری بہن ویدک سنسکرت تھی۔ اس وقت متمدن دنیا میں سومیری اور اکادی رائج تھیں۔ ایران میں آریہ قبائل یعنی مادیوں اور پارتیوں کی آمد سے قبل عیلام میں بھی سامی زبانیں مستعمل تھیں۔ ہخامنشی سلطنت میں آرامی سرکاری زبان بنی۔ قدیم ہخامنشی کتبات بیک وقت عیلامی اکادی، قدیم فارسی اور آرامی میں لکھے ملتے ہیں۔ ماد کے مجوسی پروہتوں نے دین زرتشت کی تعلیمات کو گاتھا (سنسکرت۔ گیتا) کے عنوان سے منظوم کیا اور اپنے مذہبی قوانین کو قلمبند کرکے اس مجموعے کا نام ویشتبا رکھا۔ کچھ عرصے بعد گاتھا اور ویشتا کو ملا کر اوستا کہا جانے لگا (اوستا میں مجوسی پروہت کے لئے لفظ آتروان استعمال کیا گیا ہے)۔ اوستا کے ایک اشلوک اور اس کے سنسکرت ترجمے کی مماثلت ملاحظہ ہو۔ اوستا: تم امہ وتم یزتم سورم دام ہو۔ سوشتم مہرم یزائے زوتر۔

سنسکرت: تم امہ وتم یجتم سورم دھام سو۔ سوشتم مترم یجاشے ہوتر۔ سلوکی دور میں یونانی رائج ہوئی۔ اشکانی عہد میں رستم وغیرہ پارتھین پہلوانوں کی داستانیں مقبول ہوئیں۔ ایرانی زبان آسان ہوتی گئی۔ پہلوانوں کی یہ زبان یعنی پہلوی بھی ہخامنشی فارسی سے بہت مشابہہ تھی۔ ساسان شاہی میں اسے مزید ترقی حاصل ہوئی۔ عربی الفاظ بھی ساسانی پہلوی میں داخل ہوئے۔ یہ ایرانی تجدیدیت کا دور تھا۔ لہذا قومی روایات، اساطیر اور دین زرتشت کی باقاعدہ تشکیل کی گئی۔ مجوسی مصنفین اوستا میں قدیم انڈو ایرانی دیومالا شامل کر چکے تھے۔ چنانچہ وید میں منو اور یم وِوسوت (سورج) کے توام بیٹے ہیں منو آریہ نسل کا باپ اور قانون ساز ہے۔ اوستا میں

---

۱ جاوید نامہ

۲ اشوک کے قندھاری کتبات بھی یونانی اور آرامی دونوں میں موجود ہیں شمالی مغربی ہند میں ۲۰۰ ق م کے لگ بھگ آرامی رسم الخط کی جگہ خروشتی نے لے لی۔

یم وونگت کا لڑکا ہے جسے خدا پیغمبری عطا کرتا ہے مگر وہ مارے انکسار کے قبول نہیں کرتا بعد میں زردشت قبول کر لیتے ہیں۔ جس طرح
نو ہندی نوح میں یم ایران میں یہی رول ادا کرتا ہے۔ طوفان سے قبل وہ اہورمزدہ کے حکم سے ایک زیر زمین محل تیار کرتا ہے۔
یہی یم جمشید ہے۔ یم اور خشیت (بادشاہ) کا مرکب یم جمشید)۔ ہندو دیومالا میں ایک صاحب ترتیتن نے راکھشوں کو زیر
کیا تھا۔ یہی بزرگ اوستا میں ترائتے تا(ز) کے نام سے موجود ہیں۔ آپ نے دہاک نامی اژدھے[1] کا کام تمام کیا۔ ہندوستانی
سوم رس کا رکھوالا گندھرو اوستا میں گندریپ دیو ہے جسے کیرساسپا قتل کرتا ہے۔ کیرساسپا ایک نہایت کڑوک قسم کی پیریکا یعنی
پری کے دام میں پھنس جاتے ہیں جو دراصل اہرمن کی ایجنٹ ہے۔ (بعد میں شاہنامہ میں یہ سب خواتین و حضرات نئے
تلفظ والے ناموں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ ترتیا جس نے دہاک مارا فریدون بن جاتا ہے جس نے ضحاک کا قصہ پاک
کیا۔ ترتیا کے تین لڑکے سیریما، توستا اور آیریو۔ سلم، تور اور ایرج بن جاتے ہیں۔ کیرساسپا اور نریمانو وغیرہ گرشاسپ
اور نریمان میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ منوش چیتر منوچہر کا روپ دھارتا ہے۔ ہاؤ شینگھا اور تخم آدیا ہوشنگ اور طہمورس کا بھیس
بدلتے ہیں۔ تین سر والا بھیانک اژدھا یعنی اژی دہاک اہرمن نے خاص طور پر ایرانی قوم کو ستانے کے لئے پیدا کیا تھا۔ اس کی دو حسین
بیویاں شہرنی ناز اور ارنواز تھیں۔ شاہنامہ میں ضحاک جمشید کی بہنوں شہرناز اور ارنواز سے بیاہ رچاتا ہے اور فریدون اس کا کچومر
نکال کر اسے کوہ دماوند[2] میں قید کر دیتا ہے۔

یہی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی آریائی لفظ ہندوستان اور ایران میں دو مختلف معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ ساری
انڈو یوروپین زبانوں میں 'دیو' یا اس کے ہم شکل الفاظ خدا کے لئے مستعمل ہیں۔ ایران میں دیو عفریت بن گیا۔ ویدکا اندرا اوستا میں
اندر یا اہرمن ہے۔ یم ہند میں موت کا دیوتا ہے۔ اوستا میں یہ زندگی کی نمو یعنی یم یا یم جس سے ہم ابھی ابھی جمشید کے روپ
میں متعارف ہو چکے ہیں۔

اوستا مجوسیوں کی مادری زبان میڈین یا مادی میں لکھی گئی تھی۔ اشکانی اور ساسانی زبانوں میں جب قدیم ہخامنشی فارسی کو
آسان بنایا جا رہا تھا اور وہ منزل بہ منزل پہلوی یعنی پہلوی میں تبدیل ہو رہی تھی اس وقت بھی موبدوں نے تندہی سے اوستائی زبان کی حفاظت کی
تاکہ مذہب پر ان کی اجارہ داری باقی رہ سکے شاہان ساسانیہ نے دین زرتشت کی ترویج و ترقی کا بیڑہ اٹھایا اور عوام کی تربیت
کے لئے اوستا کی تفسیر لکھی گئی جو ژند کہلائی۔ جس طرح گاتھا اور یشتہا کو ملا کر اوستا تیار ہوئی تھی اسی طرح اوستا اور اس کی تفسیر کا
مجموعہ ژند اوستا اور اس کے فارسی ژند یک کہلائے (جسے عربوں نے زندیق کر لیا) سلیوکی اور پارتھین ادوار میں اوستا کے ذریعے

---

[1] اژدہا چین سے لے کر یورپ تک ایک خاص اسطوری کردار تھا۔ مغربی حکایات میں سینٹ جارج نے DRAGON پر فتح پائی۔
ہندوستان میں سری کرشن نے ایک مہیب ناگ کو تسخیر کیا۔

[2] قتل ضحاک کی حکایت اتنی دیرپا ہے کہ ہندوستان میں راون پھونکنے کے تہوار کی مانند شہر آملہ کے باشندے زمانہ حال تک
ضحاک کے جہنم رسید ہونے کی خوشی میں "عید کردی" مناتے رہے ہیں۔

قدیم اژدہا، بابلی اور ہخامنشی سورماؤں کو زندہ رکھا گیا تھا۔ ساسانی قوم پرستی کے زیر اثر یہ اسطوری کردار تاریخی مشاہیر سمجھے جانے لگے اس اسطوری پیوند کے بعد پارتھین رزمیہ داستانیں، تاریخی واقعات یعنی اشوری حاکموں کے مظالم، تورانی حملے، یونان و روم و بابل سے معرکہ آرائیاں، ڈرامائی انداز سے شامل ہوگئیں۔ مجوسیوں نے اسرائیلی کاہنوں اور ہندوستانی برہمنوں کی مانند اپنی پیشہ ورانہ اہمیت تاریخ کے نشیب و فراز کے باوجود بڑی شد و مد کے ساتھ برقرار رکھی تھی۔ انہوں نے اپنی قدیم زبان مادی اور رسوم و رواج باقی رکھ کر اپنے طبقے کو بیرونی تبدیلیوں سے بچائے رکھا[1]۔ مجوسیوں کے نزدیک ضحاک اور افراسیاب کی مانند سکندر بھی اہرمن کا خاص چیلا تھا جس کے حملے کے بعد بہت عرصے کے لئے ان کی طاقت ختم ہوگئی۔ پارتھین دور میں بھی ان کی پہلی سی اہمیت نہ تھی کیونکہ اشکانی گو آتش و آفتاب پرست تھے مگر وہ یونانی بابلی سبھی دیوی دیوتاؤں کے قائل ہوگئے تھے۔ ساسانی ایران میں مجوسیوں کو ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا وقار اور رعب داب واپس ملا۔ زمانہ قدیم سے ان کے اہم مراکز رے، شیز اور بلخ تھے۔ (ہم دیکھ چکے ہیں کہ دورِ عباسیہ میں آل برامکہ نے جو پہلے بلخ کے موبد تھے ایک دوسرے روپ میں اقتدار حاصل کیا) شیز آذربائیجان کی جنوبی سرحد پر واقع تھا یہاں کے آتشکدے کی زیارت کے لیے (جس کے متعلق مشہور تھا کہ خود زرتشت نے قائم کیا تھا) شاہان ایران پیدل جایا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اوستا کا اصل نسخہ جو پرسی پولس کے دفتر خانے میں محفوظ تھا سکندر کی لگائی ہوئی آگ میں محل کے ساتھ جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ اولین ساسانی حکمران اردشیر بابکان نے اوستا کو از سر نو مرتب کروایا۔ شاہ پور دوم کے موبد آذرباد مار اسپنداں نے صحیفے کو نئے انداز سے پہلوی میں ترتیب کی اور یہ خردہ اوستا کہلایا۔ اس کتاب میں اوقات پنجگانہ اور کشتی اور تن درستی کی دعائیں درج ہیں[2] (کشتی بستن یعنی کمر کے گرد مقدس دھاگہ باندھنے کی آریائی رسم ہندوؤں کے ہاں جنیو کے نام سے مروج تھی۔ اسی کشتی کی رعایت سے پہلوانوں کا شغل کشتی کہلایا یعنی پہلوان اس دھاگے کی مانند ایک دوسرے کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالتے تھے۔ (ذرا غور فرمایئے کہ کشتی لڑنے کا محاورہ کہاں سے آیا ہے!) خردہ اوستا عیسائی مشنریوں کے اثر سے عوام کو بچانے کے لیے لکھی گئی تھی جو اناطولیہ اور آرمینیہ سے ایران پہنچ چکے تھے اسی طرح رد مزدکیت کے طور پر اوستا میں مزید اضافے کر دیے گئے۔ ساسانی عہد کے آخری زمانوں میں ژند اوستا کی تفسیر پازند کے نام سے قلمبند کی گئی یہ ساری کتابیں مذہب کی اشاعت کی غرض سے ترجمہ پہلوی میں ترتیب کی گئی تھیں۔ سنسکرت، قدیم مادی یعنی اوستا کی زبان، ہخامنشی فارسی یعنی اور قدیم پارتھین پہلوی یعنی مڈل پرشین اور فارسی جدید کے چند الفاظ سے زبان کے ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ سنسکرت کا اسورا میدہ، مادی کا اہورمزدہ جدید فارسی کا ہرمز یا ہرمز ہے۔ سنسکرت کا سوا دھاتا مادی کا خوا داتا جدید فارسی میں خدا ہے۔ سنسکرت کا کیشتا، مادی کا گیتا فارسی جدید میں گیسو بنا، پاتیاخش یعنی نائب حکمران سے غالباً بادشاہ نکلا اور کیلیپشی سونا زر بن گیا لیکن دری سے گزرا ہوا سکہ درہم ہی کی صورت میں باقی رہا۔

---

[1] ان کی اولاد یعنی ہندوستان کا پارسی موبد اب دستور آج بھی بڑی شدت سے قدامت پرست ہے۔

[2] ہر پارسی روزانہ جو نماز اپنی کشتی جو اب کشتی کہلاتی ہے میں عناصر اربعہ کے نام پر چار گرہیں ڈال کر خردہ اوستا کی ملی جلی مادی اور پہلوی زبان کی دعائیں پڑھتا ہے۔

اب ہمارے پرانے اور عزیز دوست دارئے اعظم کا نقش رستم والا ایک کتبہ ہخامنشی فارسی میں ملاحظہ فرمائیے :-

ثرات ی	داری وش	خشاسے ثر ی	وشنا آہورمزداہا
کہتا ہے	داریوش	شاہ	خواہش اہورمزدہ
ام ا	د ہ ی ا ر	ثَ ی ا	آدم
یہ	بہت سے دیہہ (دیہہ یعنی شہر)	کہ	میں
آک رب ای م	اپ ت رم	ہ جا ا	پارسا
کرب یعنی کرچکے	پرے دور	از	پارس

ثرات داریوش خشاسے ثری وشنا اہورمزدہا دھاو تا آدم اکربایم اپترم ہچہ پارس --- کہتا ہے داریوش شاہ بخواہش مزدہ یہ بہت سے شہر کہ میں نے پارس سے دور حاصل کیے[1]

اب پہلوی کی ایک عبارت اور اس کا جدید فارسی ترجمہ دیکھیے :-

پہلوی :- اوہرمزد وسپیمان زرتوخشت ماہ فرزوتر ہیں۔ وچ ی برتوت کان ی بانیکاں رات ہم۔

فارسی جدید :- ہرمزد پاسخ داد کہ سپیتمان زردشت ماہ فروردین روز خرداد جانیاں دام[2]

ساسانی عہد میں ہخامنشی فارسی اس حد تک متروک ہو چکی تھی جیسے آج ہم پاسریا ولی دکنی کی زبان استعمال نہیں کرتے۔ مذہبی سے پہلوی زبان نے مروجہ نئی زبان کی ترقی میں بہت مدد کی۔ الہامی صحف کا تصور یہودی اور مسیحی اناجیل کی مقبولیت کی وجہ سے ہر جگہ موجود تھا۔ ممکن ہے اس نے بھی ساسانی حکمرانوں کو اپنا باضابطہ مذہبی ادب مرتب کروانے کی ترغیب دلائی ہو۔ شاہ بہرام دوئم نے زرتشتی نظریات کے نئے میلان کو سختی سے کچل کر جارحانہ زرتشتیت کو فروغ دیا۔ ساسانی سلطنت میں چہار طاق یعنی چار کونے عمارتیں تعمیر ہوئیں جن کے اندر آتش بہرام روشن کی گئی۔ اس شہنشاہ کے بعد طاقتور اور متعصب موبد موبدان یعنی کرتیر کی کھدوائی ہوئی پہلوی عبارتوں میں جو پرسی پولس کے قریب نقش رستم او کعبہ زرتشت وغیرہ کی دیواروں پہ موجود ہیں ہے کہ آتش بہرام ایران سے باہر سلطنت کے کونے کونے سے ممالک میں روشن کی گئی۔ کعبہ زرتشت کی تحریر کی دوسری سطر سے معلوم ہے کہ اس موبد موبدان کے حکم سے سلطنت میں بسنے والے یہودی و شامانی و برہمن و نصرانی و کرتستیان و زندیک پکڑے گئے اور ان کے معبدوں کو مسمار کر دیا گیا۔

مذہبی کتب کے علاوہ پہلوی میں دوسرے مضامین پر بھی طبع آزمائی ہوئی۔ یونانی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ انوشیروان عادل

[1] بحوالہ "ایران صدیوں کے آئینے میں" از ڈاکٹر منور بیگ عشرت۔

[2] غالباً وسط ایشیائی شامانیت اور بدھ مت کے پیرو۔

کے دربار میں یونانی حکما کا اجتماع اور سنسکرت کتابوں خصوصاً پنچ تنتر وغیرہ کے پہلوی میں تراجم مشہور واقعات ہیں جن کو دہرانا لاحاصل ہے لیکن زیادہ زور بادشاہوں کے نسب ناموں اور نیم اسطوری تواریخ پر تھا۔ ساسانی دربار اور صوبائی حکومتوں میں تمام تر پہلی فارسی رائج تھی جو پہلوی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

عہد عباسیہ کے فارسیوں میں تین زبانیں موجود رہیں۔ عربی جو سرکاری اور علمی زبان تھی۔ پہلوی جس میں زرتشتی صحف محفوظ تھے اور جو اب عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو چکی تھی اور جدید فارسی جو عربی الفاظ کی شمولیت کی وجہ سے زیادہ مالا مال اور شستہ ہوتی جا رہی تھی۔ اور پہلوی سے مختلف ہو چکی تھی۔ باقی سارے ایران میں مقامی بولیاں رائج تھیں۔ نویں اور دسویں صدی میں زرتشتی سماج میں بھی ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ یہ نئی ذہن پرستی اور آزاد خیالی کا دور تھا۔ ہر طرف اسلام کے مختلف فرقوں کے دانشور فلسفیانہ مباحثوں اور مناظروں میں مصروف تھے۔ زرتشتیوں نے بھی جو اب سیاسی طاقت بالکل کھو چکے تھے۔ تحریر کے ذریعے مذہبی مدافعت کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ ابن الندیم جن پہلوی کتابوں کے عربی تراجم کا ذکر کرتا ہے ان میں غیر مذہبی مضامین بھی شامل ہیں۔ ساسان شاہی میں لکھنا پڑھنا بہر حال زیادہ موبدوں اور الٰہی جہتریوں تک محدود تھا اور یہاں بھی تحریر کے بجائے اب تک زبانی روایت کی اہمیت زیادہ تھی۔ عربوں کی لائی ہوئی نئی اور روشن علمی فضا سے زرتشتی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک مرتبہ اس سے بہت قبل ان کو اناجیل کی مقبولیت نے تصنیف و تالیف کی طرف راغب کیا تھا۔ موجودہ دور میں تو عربوں نے دنیا کے علوم و فنون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ زرتشتی ۹۰۰ء سے قبل تک (جب ان کی خاصی بڑی تعداد نے ہندوستان ہجرت کی) پہلوی میں متواتر لکھتے رہے۔ جو اب بولی جانے والی زبان نہیں رہی تھی اسی وجہ سے ماہرین لسانیات اس عہد کی زبان کو کتابی پہلوی کہتے ہیں۔

[مسلسل]

(صفحہ ۱۴۵ کے بقیہ حاشیے)

؎ غالباً نسطوری عیسائی۔

؎ پیروان مانی کو اب زندیک کہا جاتا تھا۔ بعد میں عربوں نے بھی یہ لفظ HERETICS کے لیے استعمال کیا۔

؎ ان سختیوں کے باوجود بڑی تعداد میں ایرانی اکابر و معززین عیسائی ہوتے رہے۔ چونکہ روم و بازنطیم سے مسلسل جنگ رہتی تھی اور وہاں سے قیدی لائے جاتے تھے جنہوں نے ایران میں عیسائیت پھیلائی۔ آرمینیہ کے قرب کی وجہ سے نسطوریت کا بول بالا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں ایک بیزنطینی عیسائی راہب ہندوستان کی سیر کے لیے آیا اور اس نے لکھا کہ مالابار اور لنکا کے گرجاؤں کو ایران کے نسطوری پادری چلا رہے ہیں۔ فتح اسلام کے بعد ایران میں نسطوری کلیسا کا زور گھٹ گیا۔ لہٰذا جنوبی ہند کے عیسائیوں نے اپنا تعلق انطاکیہ کے پیٹریارک سے قائم کیا۔ جس کی وجہ سے ان کا کلیسا اب ایرانی کے بجائے سیرین چرچ کہلاتا ہے لیکن مدراس اور کیرل کے قدیم گرجاؤں کی صلیبوں پر پہلوی زبان میں کھدی ہوئی عبارتیں اب تک موجود ہیں۔

پھول کی کوئی قیمت نہیں

آغا بابر

لوگ بابا مراد کو اٹھا کر اُدھر لے گئے جدھر بھیڑ کم تھی۔ منہ میں پانی ٹپکایا تو آنکھیں کھل گئیں۔ وہ پھول بیچنے والوں کی دکانوں کے قریب سڑک پر چت پڑا تھا۔

ایک پھول فروش نے کہا "پانی کا گلاس پی لے۔ لو لگ گئی ہے۔"

مراد پانی کے چند گھونٹ حلق میں اتار کر کر پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی جتانے والے سے بولا۔ "میں ہسپتال میں اپنا خون دے کر آ رہا تھا کہ چکر آیا۔۔۔"

"کوئی بات نہیں اٹھ بیٹھ۔"

لوگوں نے اُسے سہارا دے کر فیروزدین پھول فروش کے کھوکھے پر بٹھا دیا۔ فیروزدین کی ڈاڑھی اور چہرے کا رنگ بالکل موتیے کے اُن پھولوں کا سا تھا، جن کی ڈھیریاں اُس کے سامنے کیلے کے سبز پتوں پر دھری تھیں۔ فیروزدین کی آنکھوں میں ایک ایسی گھلاوٹ فہم اور دلداری تھی جو زندگی کا لیل و نہار دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے سے میسر آتی ہے۔

کلیاں اور پھول رات بھر ستاروں کے گیت سنتے ہیں۔ ظلمت اور ماہتابے کی آنکھ مچولی دیکھتے ہیں اور خاموش فطرت کے بھید دن کی کنوئیاں لے کر کھلنے لگتے ہیں تو کھلتے ہی چلے جاتے ہیں، جیسے پھول کا فرضِ منصبی بس یہی ہے۔ ابھی کوئی فیروزدین سے شادی کے ہار اور ابھی کوئی جنازے کے ہار لے جاتا ہے مگر پھول اپنی چشمِ حیران کو مشکلم نہیں ہونے دیتا۔ فیروزدین جس کی آنکھوں میں زندگی کی دھوپ چھاؤں دیکھ دیکھ کر فہم اور پھولوں کی معصوم محبت سے چہرے پر تقدس کا ایک نورانی پرتو جھلک رہا تھا۔ ہار گوندھتے ہوئے بولا "تو ہسپتال میں خون کیسے دے کر آیا ہے؟ کوئی بیمار ہے؟"

مراد بولا "میں بیروزگار ہوں۔ گھر میں فاقہ آ رہا تھا۔ خون کا ٹھیکیدار مجھے ہسپتال لے گیا۔ ہسپتال والوں نے میرا خون لیا جس کے بدلے میں ٹھیکیدار نے مجھے دس روپے دیئے۔"

اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا نوٹ نہ پا کر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ "خدا تجھے کہیں کا نہ رکھے۔ نوٹ کوئی نکال کر لے گیا۔"

اُس کا چہرہ پتھر کی طرح جامد ہو گیا۔ اس کی ساری اُداسی پتلیوں کے نقطوں میں سمٹ آئی۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

فیروزدین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا۔ "بابا جی کوئی بات نہیں۔ حوصلہ کرو۔ لو یہ پھول سونگھو۔"

[illegible]

پھول فروش نے گلاب کی ڈھیری میں سے ایک سرخ پھول اٹھا کر مراد بابا کے ہاتھ میں دے دیا جسے اس نے ذرا سونگھ کے فیروزدین کے آگے پھینک دیا اور خلاؤں میں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

لوگ باگ اپنے اپنے کاموں سے چلے جا رہے تھے۔ خوانچہ فروش اپنی اپنی صدا لگا رہے تھے۔ تانگے اور موٹر کاروں کے شور سے بازار کی فضا بھری ہوئی تھی۔ فیروزدین کے ہاتھ ایک انتہائی پرداختہ طریقے سے سوئی دھاگے میں گلاب کا ایک ایک پھول مقررہ فاصلوں پر گوندھ رہے تھے۔ چونی لے کر اس نے نگاہ اٹھائی اور مراد کے پیلے چہرے کی طرف دیکھا۔ دھاگا توڑ کر بولا:

"اوئے جمعہ، سنو۔ دو پیالے گرم دودھ کے لاؤ۔ ملائی ڈلوا کر"

اس لڑکے نے گلاس اٹھایا اور پاؤ بھر دودھ پیالے میں ڈال کر لے آیا۔ فیروزدین پھول فروش نے اپنی واسکٹ کی جیب سے پیسے نکال نکال کر اس لڑکے کو دیئے۔ پھر ایک گاہک کو پھولوں کے ہار دینے لگا۔

مراد نے گرم گرم دودھ ایک ایک گھونٹ کر کے پیا اور اس دوران دیکھتا رہا کوئی گاہک ایک پھول فروش سے اس کے دام پوچھتا تو دوسرا پھول فروش بالکل چپ رہتا۔ دخل نہ دیتا۔ نہ سستے دام بتا کر اپنی طرف متوجہ کرتا۔ پھول فروش فقط اسی گاہک سے براہ راست بات کرتا جو اس کی دکان پر آ کر سودا لیتا۔ یہ دیکھ کر اسے سری اوجھڑی والا بازار یاد آ گیا۔ جہاں ایک ایک دکان دار گاہک کو آوازیں دے دے کر اس کا برا حال کر دیتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ بتایا نہیں تم ادھر کدھر سے آ رہے تھے؟"

مراد نے کہا "میں سری اوجھڑی والے بازار سے آیا تھا۔"

"سودا لینے گئے تھے؟" فیروزدین نے پوچھا۔

"نہیں اپنی بپتا پوری کرنے۔ میرا ایک جوان لڑکا ہے۔ پہلوانی کرتا تھا۔ اس نے ایک دن اکھاڑے سے نکل کر ٹھنڈے پانی سے نہا لیا۔ ٹانگیں جکڑی گئیں۔ علاج کے لیے کچھ نہیں ہوا۔ گھر میں بیکار بیٹھا رہتا تھا۔ کسی مہربان نے سری اوجھڑی والے بازار میں اوجھڑیاں دھونے پر نوکر رکھوا دیا۔ میرا دوسرا بیٹا جو سبزی کی ریڑھی لگاتا ہے، بائیسکل پر اسے دکان پر چھوڑ آتا۔ جہاں وہ بیٹھا اوجھڑیاں دھوتا رہتا۔ بیس روپے مہینہ ملتا۔ دو مہینے ٹانگوں کی پیڑ سے اجاڑیاں آنے لگیں۔ اب پھر گھر میں بیکار بیٹھا ہے۔ ایک مہینے کی تنخواہ ابھی تک دکان دار کے ذمہ رہتی ہے وہ لینے گیا تھا۔ اس نے پھر ٹال دیا۔ سوچتا ہوں اگر وہ بیس روپے بھی جیب میں ہوتے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی چلے جاتے۔"

"چلو سر صدقہ سمجھو۔"

مراد ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "سر صدقہ کس کا میاں جی! ہم تو لوگوں کی زکوٰۃ پر پلتے ہیں۔ میری بیوی روز تغارہ اٹھا کر گھر گھر چلی جاتی ہے۔ ادھر ادھر سے گوبر اٹھا لاتی ہے۔ اوپلے تھاپ کر بیچتی ہے۔ کیا کیا مصیبتیں بتاؤں۔ بیٹی کا میاں جھگڑ کر ناراض ہو کر اسے چھوڑ گیا ہے۔ کس کا رونا روؤں۔ زندگی مصیبتوں کی پوٹ ہے میاں جی۔"

فیروزدین نے مٹی کی چھوٹی بالٹی میں ایک ہاتھ ڈبو کر تھوڑا سا پانی نکالا اور بڑے نفیس طریقے سے ہاروں، گجروں اور پھولوں کی ڈھیریوں پر چھڑکا۔ پھر ذرا سا پھر اسی گیلے ہاتھ کو اپنے نورانی چہرے پر پھیرا اور اللہ والوں کے سے لہجے میں بولا:

"میں ایک مشورہ دوں۔ تمہارا نام کیا ہے باباجی؟"

"بابا مراد۔"

"شام کو مجھ سے دو چار درجن ہار اور گجرے لے جایا کرو۔ مال روڈ پر کوئی ٹھکانہ بنا لو، جہاں تمہاری بکری ہو جائے۔ درجن ہار پیچو چونّی لے لو۔ درجن گجرے بکیں تو اٹھنی دوں گا۔ تم دن بھر جو بھی کام کرو اپنا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ جی بسے سے کہہ کر تمہارے بیس روپے بھی نقصانی سے دلوا دوں گا۔"

"جی بسا کون؟"

"ادھر ہی بابے بازار کا کمیٹی ممبر ہے۔ اگر منظور ہے تو کل دس روپے ضمانت لے کر آ جانا۔"

پھول فروش نے جی بسے سے کہہ کر بیس روپے نقصانی سے دلوا دیئے۔ مراد نے دس روپے ضمانت کے پھول فروش کی ہتھیلی پر رکھے اور تین درجن موتیے کی کلیوں کے ہار لے کر مال روڈ پر آ کر گھومنے لگا۔ بڑی مشکل سے ڈیڑھ درجن ہار بکے۔

اگلے روز فیروز دین پھول فروش نے مراد کا حوصلہ بڑھایا اور کہا پہلے روز ڈیڑھ درجن ہار بیچ لینا گھاٹے کا سودا نہیں۔ تم کوئی ہوٹل ڈھونڈ لو۔ وہیں جمے رہو۔ عورتیں آئیں تو سامنے جا کر ڈٹ جاؤ۔ ہار نہ لیں تو گجرے دو۔ گجرے نہ لیں تو ہار دو۔ نیا کام ہے پر شرماؤ نہیں۔"

بابا مراد نے دیکھا کہ چوک کے ساتھ مال روڈ پر جو کیفے ہے، وہاں بہت لوگ آتے ہیں۔ ابھی دھوپ ہی تھی کہ وہ ہار اور گجرے لیے جا کھڑا ہوا۔ ایک موٹر کار آ کر رکی، وہ آگے بڑھ کر بولا،

"موتیے کے ہار جی۔ گجرے بیگم صاب۔"

لڑکی صرف دو ہار اور دو گجرے لے کر بولی۔ "واپسی پر اور لیں گے۔ کہیں جاؤ گے تو نہیں؟"

یہ کہہ کر لڑکی پکے فرش پر ٹپ ٹپ چلتی اپنے خاوند کے ساتھ کیفے میں داخل ہو گئی۔ اس کی تاکید کی اثر انگیزی نے مراد بابا کو ادھر اُدھر نہ ہلنے دیا۔ بوہنی اچھی ہوئی کہ اس کے اور ہار بھی بکنے لگے۔ اب صرف چار ہار تیلی پر لٹک رہے تھے کہ وہ لڑکی اور اس کا میاں باہر نکلے۔ لڑکی نے وہ دونوں ہار جو پہلے تھے اپنے جوڑے پر لپیٹ رکھے تھے۔ مراد ہار لے کر آگے بڑھا۔

لڑکی بولی "صرف چار رہ گئے۔ گجرے سب کے سب بک گئے؟"

مراد چاروں ہار اس لڑکی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا: "آپ بھاگوان کی بوہنی ہوئی تھی کیسے نہ بکتے جی۔"

جب اس کے ہاتھ میں ہاروں کی خالی تیلی رہ گئی تو اس کے کندھے کا بوجھ اتر گیا جیسے پھولوں کا بھی کوئی بوجھ ہو۔ لڑکی ٹپ ٹپ کرتی اپنے میاں کے ساتھ موٹر کار میں جا بیٹھی اور پھر موٹر کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

شام ڈھلے مراد نے تین روپے اپنی بیوی کے ہاتھ پر جا دھرے تو اس کے مُردنی چہرے پر خوشی کی ایک کرن پھوٹ آئی اور وہ فیروز دین پھول فروش کو دعائیں دینے لگی۔ معذور تایا پیڑھی پر جکڑا بیٹھا تھا۔ اس کا بھائی بالا سبزی فروش بھی آ گیا۔ مراد کی بیٹی کھٹولی پر لیٹے دو بچوں کو جو سو رہے تھے پنکھیا جھل رہی تھی۔ سب کے چہروں پر خوشی کے پھول کھل رہے تھے کہ بابا کا اچھا روزگار لگ گیا۔ معذور تایا جو گھر پر بوجھ بنا ہوا تھا اپنی جگہ خوش۔ بالا یوں خوش کہ سبزی کی ساری آمدن اونٹ کے منہ میں زیرا ہی جا رہی تھی۔ شاید اب اسے کچھ بچت ہونے لگے۔ وہ بولا: الی

بیٹی یوں خوش ہو رہی تھی کہ وہ خواہ مخواہ کا بوجھ بن کر گھر آ بیٹھی تھی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے سبب محلے میں کسی کا بھانڈا برتن بھی مانجھ دیتی تھی۔

ایک دم گھٹا اُمڈ کر آئی اور بادل گرجنے لگا۔ بدرو سے سخت سڑاند اٹھی۔ مراد نے انگنائی کے سامنے پڑا ہوا گندا ٹاٹ اٹھا دیا۔ باہر بہنے والی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا کھٹ سے اندر چلا آیا۔ اسے فوراً بیوی کے اُپلوں کا خیال آیا۔ "تابے کی ماں بارش آ رہی ہے تمہارے اُپلے۔۔"

"میں نے شام کو سنبھال لیے تھے۔ وہ سیکڑوں تو بیچ بھی دیئے۔"

دراصل مراد بابا ہر پہر کے مال روڈ پر ہار بیچنے کے واقعہ کو بار بار سنانا چاہتا تھا اور گھر کا ہر فرد بار بار سننا چاہتا تھا۔ سوائے بلے کے جو اپنی چارپائی ہر روز بدرو کے پار اپنے دوستوں کے پاس جا بچھاتا تھا۔ سب اپنی اپنی کھاٹ پر لیٹے پڑے تھے۔ نیند کسی کو نہ آئی تھی۔ بادل کی وجہ سے سڑک پر کھمبے کی روشنی کا دائرہ تنگ ہو گیا تھا۔ مراد کی بیوی نے لیٹے لیٹے کہا۔ "تم نے جس بیگم صاحب کی آج بونی کی کل بھی اس کے پاس ہار بیچنا۔"

مراد لیٹے لیٹے کہنے لگا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

مراد کی بیٹی جو دو بچوں کو کھاٹ کے درمیان لٹائے خود پٹی پر لیٹ رہی تھی۔ کہنے لگی:

"ابا بے غم دیکھنے میں کیسی ہوگی؟" مراد بولا

"لمبے قد کی جوان لڑکی۔ کیا بتاؤں جیسی آپ ویسا میاں۔۔۔"

"سورج چاند کی جوڑی ہوگی نا؟" اندھیرے میں مراد کی بیوی کی آواز آئی۔

"میں نے غور سے دیکھا کب۔ سب بیگمیں ایک جیسی تو ہوتی ہیں۔" مراد بیچارہ بیگم کا سراپا بیان نہ کر سکا اور اس کی بیٹی اپنے تصور میں کوئی حلیہ مرتب نہ کر سکی۔

اگلی شام یہ جوڑا دیر سے آیا۔ مراد پھرتی سے آگے بڑھا اور بولا۔ "ہار موتیے کے:"

لڑکی نے چھ ہار اور بارہ گجرے خرید کر موٹر کار میں رکھ لیے۔ اس کے میاں نے کار کو بند کیا اور وہ ہوٹل میں جانے کے لیے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ مراد نے دیکھا۔ مناسب نقوش اور عمدہ لباس نے ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا تھا جو بیک وقت پُرکشش بھی اور پُرتمکنت بھی۔ چال میں ایک سبک رفتاری اور دھیما پن جیسے آہستہ آہستہ پھول کھلتا ہے۔ ہونٹ ایسے جیسے پھول برسانے والے گر بند بستہ۔ کونوں میں مسکراہٹیں جیسے بچپن شوخی شرارتوں میں گزرا ہو۔ بابا مراد اس لڑکی کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ اس نے غور کیا۔ ایک بچے نے اس کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ کتنی پُراسراریت تھی اس لڑکی میں۔ اس نے سوچا آج وہ گھر جا کر پورا ناک نقشہ بیان کر سکے گا۔ "ہار موتیے کے" وہ صدا لگا دوسری موٹر گاڑیوں کی طرف چل دیا۔

رفتہ رفتہ ہوٹل میں آنے والے اس صدا سے مانوس ہو گئے اور اب بابا مراد بھی سب کو پہچاننے لگا۔ کون کون پھولوں کا شوقین ہے کون بیگم کتنے پھول خریدتی ہے۔ گجرے ساتھ لے جائے گی یا پہنے گی۔ بال جوڑے پر سجائے گی یا کلائی پر لپیٹے گی۔ اسے اپنے گاہکوں سے آگاہی ہوتی چلی گئی۔

شہر بھر کی غلاظت بہا لے جانے والی سڑاند سے بھری بدرو پر بسنے والا یہ کنبہ ابھی گزشتہ برسات کی بے حالی اور آٹے دال والے کا پورا قرض بھی

دیا پایا تھا کہ مُراد کی بیٹی کے بچے کو سوکھے کی بیماری لگ گئی۔ اُس کی ٹانگیں سوکھنے لگیں اور بچے کے چہرے پر مُردنی سی چھانے لگی۔ تاہا جو خود اپاہج اور معذور تھا بہن کی بیٹی کی طرف دیکھتا تو اس کی ٹانگیں ڈبڈبا جاتیں۔ مُراد کی روزانہ بہت آمدن ہوتی تو ڈھائی تین روپے ہوتی۔ اس سے مہنگی دوا خریدنا محال تھی۔ قرض لینا یوں محال تھا کہ جن سے قرض لیا جا سکتا تھا۔ وہ پہلے والے قرض کی ادائیگی کا تقاضا کر رہے تھے۔ جمعہ کے جمعہ اس کی بیٹی بچے کو دم کرانے لے جاتی اور پیر صاحب کو پانچ روپے نذرانہ دینا پڑتا۔ رات کو سارا کنبہ چائے کے ساتھ سوکھی روٹی کھا کر پڑ رہتا۔ بازار میں ڈیوٹی پر لگا ہوا نیا سپاہی بابے کو الگ پریشان کر رہا تھا۔ بلا اجازت ریڑھی لگانے پر روز جرمانے کرتا۔ گھر کا ہر فرد ایک نہ ایک پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

ایک جمعہ کو سویرے سویرے بابا مُراد اپنی بیٹی اور نواسے کو دم کرانے کے لیے اُٹھا تو اس کا سینہ جل رہا تھا۔ پانی پینے کے لیے گھڑے کی طرف بڑھا تو دیکھا جو تین ہار رات کو بچ رہے تھے وہ گھڑے کی گردن میں پڑے پڑے تھے۔ اس نے وہ تین ہار اٹھا لیے اور بیمار نواسے کو لے کر چل دیا۔ راستے میں اس نے بیٹی سے کہا آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ بیٹی بولی " بابا آپ کو تو کچھ نہ ہو۔ سلا گھر تو آپ کے دم سے چل رہا ہے۔

نذرانہ کے ساتھ بابا مراد نے تین ہار بھی پیر صاحب کے سامنے رکھ دیئے۔ پیر صاحب نے دو ہار اپنے سامنے پڑے رہنے دیئے ایک اٹھا کر اس عورت کے گلے میں ڈال دیا جس کو آسیب کا سایہ بیان کیا جاتا تھا۔ اس کے گلے میں ہار ڈال چکنے کے بعد پیر صاحب نے عورت کا ماتھا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کچھ پڑھا، پھر اُن کے دونوں ہاتھ عورت کے رخساروں پر خاصی دیر رکے رہے جیسے وہ گالوں کی گرمی محسوس کر رہے ہوں یہ دیتے ہوئے ہوتے ناف تک اور پھر گھٹنوں تک پہنچ کر ہوا میں اُٹھ گئے۔ اور انہوں نے مُنہ سے پھوکی آواز نکالی۔

بابا مُراد نے عورت کی طرف دیکھا۔ اس کی مستانی آنکھوں میں ایک کرن سی پھوٹی اور مُنہ سے ٹھنڈی سی آہ نکلی۔ بابا مراد نے محسوس کیا اس عورت کے گلے میں پڑتے ہی اس کا ہار کس طرح اپنی شخصیت بدل گیا۔ کیا پھول کوئی پُراسرار شے ہے۔ کیا پھولوں میں کوئی بھید چھپے ہیں وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ پیر صاحب نے اپنے سامنے سے ایک ہار اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا:

"کتاب اللہ پر چھوڑ آ"

یہ ہار بھی ایک دم اپنی شخصیت بدل گیا جو ہار پیر صاحب کے سامنے پڑا تھا۔ اس کی تو یہ پُرشخصیت تھی جو دونوں سے الگ تھی سو پھولوں کی حروف ہیں جن سے کوئی ایسی زبان بنتی ہے جس کی بلاغت صرف ذہنت والوں کی وساطت سے سمجھ میں آتی ہے۔ کیا پھول کے سینے میں کوئی بھید چھپے ہوتے ہیں۔ کھوکھوں پر بیٹھنے والے تمام صفر دش اُس کی نگاہوں کے سامنے پھر گئے اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں کے ہار نہیں تو مذہب بلکہ ایک ایک راز اور ایک ایک بھید کو بھید بھید کر دھاگوں میں پروتے جا رہے ہیں۔ یہ ہار ایسی دو باتیں ہیں جو پیدہ دو قلی سے بنتی ہیں جیسے سرف پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں۔ ایسے معنی ہیں جو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ پھول کی اپنی شخصیت ہے جو نامی بھی ہے۔ نہیں بھی۔

اگلی سہ پہر کو جب وہ سرکتے پر بار ار گجرے لٹکائے ہوٹل کے سامنے پہنچا تو اس نے جھجکتے جھجکتے ایک بڑے سے کچھ روپے مانگنے چاہے مگر زبان گنگ ہو گئی۔ اتنے میں اس خانہ بیگم کی کار آ رکی۔ خاندانی ہی اُتنے ہی والے تھے کہ بابا مراد ہا ... لے کر اُسے

بڑھیا بیگم بولی:

"بابا کیا حال ہے؟ آج تمہارا چہرہ اتنا مرجھایا کیوں ہے؟"

مراد پھول والا سر کھجاتے ہوئے بولا:

"بیگم صاحب میرا بیٹا سخت بیمار ہے۔ میری لڑکی بے آباد بیٹھی ہے۔ مال بکتا نہیں۔ آپ آج سارے ہار لے لیں مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔" بیگم نے بابا کی طرف ہمدردی سے دیکھا اور بولی: "کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

اس نے سرکنڈے سے دو ہار اور دو گجرے اتار لیے۔ پرس میں سے دو دس دس روپے کے نوٹ نکال کر بولی:

"بیس روپوں سے کام ہو جائے گا۔"

"خدا زیادہ دے۔ خدا خوش رکھے۔ خدا آپ کے بیٹے کو سلامت رکھے۔"

بابا مراد کو اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ قدرت یوں جانے بوجھے بغیر بیس روپے کی رقم دے سکتی ہے۔ وہ باقی ہار بیچنے بھول گیا۔ چند منٹ منڈیر پر بیٹھا رہا پھر اٹھا بیٹھا اور موٹر گاڑی والے ڈرائیوروں سے اس بیگم کا پتہ پوچھنے لگا جو چند دنوں سے اس کے شعور میں دھیرے دھیرے جذب ہوتی چلی جا رہی تھی۔

آج رات پھر گندی بستی بھرپور اتنی گنجان تھی کہ تنگ مکان میں گھر کے تمام افراد بابا مراد سے حالیہ واقعہ کو بار بار سننا چاہتے تھے اور وہ بار بار سنانا چاہتا تھا کہ بیگم کی آنکھوں میں کس طرح ہمدردی تھی کہ اس نے پوچھے بنا بیس روپے نکال کر اس طرح دے دیئے جیسے دعا سے مراد مل جاتی ہو۔ مراد کی بیوی بولی:

"دنیا میں خدا ترس لوگ ابھی موجود ہیں۔"

بے آباد بیٹی فرشتہ سیرت بیگم کے لیے جھولی پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگنے لگی اور منہ زور تاریخ کے چہرے پر تشکر کے جذبات اس طرح آشکارا ہونے لگے جیسے وہ بیگم کی ذات کی اہمیت اور اثر انگیزی کے حلقے میں اپنے آپ کو مبتلا کر دینے میں خوشی اور آسائش محسوس کر رہے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ان بیس روپوں سے بچے کے لیے ٹیکے خرید لیے جائیں، پھر چند دنوں میں بیگم کی کوٹھی پر جا کر مراد بابا کو بیس روپے واپس کر دینے چاہئیں۔

بابے نے بارہ روپے پچاس پیسے جمع کر کے باپ کو دے دیئے۔ مراد نے ساڑھے سات روپے اپنی پونجی اس میں ڈالی اور پتہ پوچھتا ہوا سلطان محمود صاحب کی کوٹھی پر جا پہنچا جو بیگم کے میاں کا نام تھا جو ڈرائیوروں سے معلوم ہوا تھا۔ ملازم کے ذریعہ اندر اطلاع کرائی کہ "پھول بیچنے والا آیا ہے۔"

بیگم مسکراتی ہوئی برآمدے میں آئی اور بولی۔ "بابا جی آپ کس طرح آن پہنچے؟"

مراد مٹھی میں پکڑی ہوئی رقم مؤدبانہ انداز میں بڑھاتے ہوئے بولا: "بیگم صاحب اس روز پھولوں کی قیمت آپ نے بہت زیادہ دی تھی۔ واپس کرنے آیا ہوں۔"

وہ بولی۔ "پھولوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی بابا جی۔ واپس لے جاؤ۔"

گندے محلے پر چھائے ماحول میں رہنے والے افراد آج پھر اس واقعہ پر حیران، مخمور اور مسرور تھے کہ دنیا میں کیسے ہمدرد، خدا ترس ہوتے

ہر بانٹ لینے والے لوگ موجود ہیں۔ بیگم برآمدے میں آئی تو کیا بولی۔ بابا مُراد کی بیوی پوچھتی اور پھر مُراد بار بار دہراتا۔ یہ بار مُراد کی بیٹی بڑے دھیان سے سنتی۔ بابا مُراد کہتا: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بیگم جب چلتی ہے تو زندگی کی خوشیاں اس کے ساتھ چلتی ہیں۔ جب بولتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں۔ وہ آپ ایک شگفتہ اور تر و تازہ پھول ہے۔ اس کا چہرہ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے:

بابا مُراد کی مجذوب بیٹی کی آواز پھڑ پھڑائی: ہائے میں کس طرح بیگم کو دیکھوں۔ میرا بڑا جی چاہتا ہے اُسے دیکھنے کو: اس کے خیال میں بیگم دُکھ اور سکھ، درد اور راحت کا ایک ایسا رشتہ تھا جو پوری کائنات سے ہے اور وہ اس کائنات کو لمحہ بھر کے لیے دیکھنا چاہتی تھی بلکہ خود اس میں سما کر فنا ہو جانا چاہتی تھی۔

فیصلہ یہ ہوا کہ اگلے اتوار بابا مُراد فیروز دین گلفروش سے موتیے کی کلیاں لے کر آئے گا اور اس کی بیوی اور بیٹی ہار گوندھ کر گیلی ململ میں لپیٹ کر بابا مُراد کے ہاتھ بیگم کو تحفہ بھیجیں اور پھر کسی روز دونوں اسے سلام کرنے جائیں۔

اتوار سے دو روز پہلے جب بابا مُراد جمعہ کی نماز پڑھنے گیا تو بیوی نے اُسے فیروز دین کو پھولوں کی یاد دہانی کرانے کو کہا۔ بازار سے دھاگے کی نئی گولی منگائی۔ ہار گوندھنے کے لیے بالا باریک سوئیاں خرید لایا۔ مُراد نے بیوی کو بتایا کہ کس طرح ہر روز تڑکے تڑکے کیاریوں سے پھول توڑے جاتے ہیں اور گل فروشوں کے گھر چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں پھولوں سے بھر جاتی ہیں اور فیروز دین نے اتوار کو صبح صبح اپنے گھر آ کر اسے پھول لے جانے کو کہا ہے۔

ہفتہ کی شام کو جب بیگم سلطان حبیب نے بابا مُراد سے چار گجرے اور دس ہار خریدے تو وہ گھر جا کر بولا "مجھے آج معلوم ہوا کہ بیگم مجھ سے جو اتنے گجرے اور ہار خریدتی ہے وہ جا کر اپنی ملنے والیوں کو تحفہ دیتی ہے۔ کتنا اچھا طریقہ ہے۔ آج بیگم کے میاں نے جو کہا کہ فلاں فلاں کے لیے بھی لے لو تو جب مجھے معلوم ہوا۔

مُراد کی بیوی بولی: اچھی بات ہے۔ بیگم کی طفیل ہمارے ہار کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں کس وقت پھول لینے جاؤ گے؟

بابا مُراد نے جواب دیا۔ نماز پڑھ کر نکل جاؤں گا۔ صبح کے وقت رکشے بہت ہوتے ہیں کسی پر بیٹھ جاؤں گا:

بابا مُراد اگلے روز اذان سنتے ہی نماز کے لیے مسجد کی طرف چل دیا اور اس کی بیوی تغارہ اٹھا کر گوبر ڈھونڈنے اور اکٹھا کرنے چل دی۔ مُراد کی بیٹی نے چولہا جلا کر روٹیاں پکائیں۔ چولہے پر سے چائے کی پتیلی اتاری۔ اپنے بھائیوں کو پلائی۔ معذور ابا کے آگے جو موڑھے کی پیڑھی پر جڑا بیٹھا تھا۔ روٹی اور چائے کا پیالہ رکھا۔ بالا صبح صبح سبزی منڈی جا چکا تھا۔ جہاں وہ کچھ اپنے معمول کے مطابق کما لیتا تھا۔ وہ ابھی فارغ ہوئی تھی کہ اس کی ماں آن پہنچی۔ تغارہ رکھ کر بولی: بیٹی میں آج زیادہ دور نہیں گئی۔ مجھے بھی چائے دے دو پھر ہم دونوں کو ہار گوندھنے ہیں۔ تیسرا ابا آتا ہی ہو گا:

دیکھتے دیکھتے جب کافی دن نکل آیا تو مُراد دروازے کا ٹاٹ اٹھا کر اندر داخل ہوا اور بولا: فیروز دین نے مجھ سے پھولوں کا روپیہ تو نہیں لیا اور کلیاں بھی دو دیں کہ دیکھا کر دو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کلیوں کا لفافہ چنگیر میں الٹ دیا۔ اس کی بیوی کلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی: یہ بازاری ہاروں کی طرح چھوٹے چھوٹے نہیں۔ ان سے تو لمبے لمبے ہار پروؤں گی:

جون کا مہینہ۔ بیٹی نے ململ کی گیلی صافی میں ہار لپیٹ کر دیئے۔ بیگم کی کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے دن نکل گئے۔ صافی کا کپڑا سوکھ گیا۔ وہ

بشیرہ بیگم بولی:

"بابا کیا حال ہے؟ آج تمہارا چہرہ اتنا اترا ہوا کیوں ہے؟"

مراد بولا اور ڈاکٹری نسخہ آگے کرتے ہوئے بولا:

"بیگم صاحب میرا پوتا سخت بیمار ہے۔ میری لڑکی بے آسرا بیٹھی ہے۔ مانگتا نہیں۔ آپ آج سارے بارے میں سب کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔" بیگم نے بابا کی طرف ہمدردی سے دیکھا اور بولی: "کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

اس نے سر کھجاتے ہوئے دو چار روپے بتائے۔ پھر اس نے دو دس دس روپے کے نوٹ نکال کر بولی:

"میں سمجھتی ہوں ان سے کام ہو جائے گا۔"

"خدا زیادہ دے۔ خدا خوش رکھے۔ خدا آپ کے بیٹے کو سلامت رکھے۔"

بابا مراد کو امید نہیں تھی کہ وہ یوں بیان کیے بغیر اتنی بڑی رقم دے سکتی ہے۔ وہ بڑی بار ... بھول گیا۔ چند منٹ ... پر بیٹھا رہا اور پھر گھر چلا گیا۔ ... بیگم کا چہرہ ... اس کے شعور میں دھیرے دھیرے ... ہوتی چلی جا رہی تھی۔

آج رات ... ساری کہانی ... گھر کے تمام افراد بابا مراد سے حالیہ واقعہ کو بار بار سننا چاہتے تھے اور وہ بار بار سنانا چاہتا تھا۔ بیگم کی آنکھیں ... اس نے پوچھے بغیر بیس روپے ... اس طرح دے دیئے جیسے دعا دے رہی ہو ... ساتھی ہو۔ مراد کی بیوی بولی:

"دنیا ... ابھی موجود ہیں۔"

... بیگم نے ... پھول ... میں اٹھنے لگی اور منصور صاحب کے چہرے پر شکر گزاری کے جذبات سے ... اس میں وہ بیگم کی ذات کی اہمیت ... کے متعلق اپنے آپ ... میں خوشی اور آسائش محسوس کر رہے تھے۔ فیصلہ ... کہ ... بیگم کی کوٹھی پر جا کر مراد بابا کو بیس روپے واپس کرنے ہیں۔

... نے ... روپے ... کر کے باپ کو ... مراد نے ... سات روپے اپنی ... میں ڈالی اور ... سلطان ... بیگم سے ملنا ... ہے ... ملازم کے ذریعہ اندر اطلاع کرائی کہ ... بیگم صاحب آیا ہے۔

بیگم مسکراتی ہوئی برآمدے میں آئی اور بولی: "بابا جی آپ ... آئی تھی۔"

وہ ... ہوئی ... بیگم صاحب اس روز پھولوں کی قیمت آپ نے بہت زیادہ دی تھی۔ واپس دینے آیا ہوں۔"

وہ بولی: "پھول کی کوئی قیمت نہیں ہوتی بابا جی۔ واپس لے جاؤ۔"

گھنٹے ... پر ... والے ... اور آج ... اس واقعہ پر حیران ... اور ... کہ دنیا میں کیسے ہمدرد، خدا ترس ...

رانٹ پینے والے لوگ موجود ہیں۔ بیگم برآمدے میں آئی تو کیا بولی۔ بابا مراد کی بیوی پوچھتی اور پھر مراد بار بار دہراتا۔ ہر بار مراد کی بیٹی بڑے دھیان سے سنتی۔ بابا مراد کہتا: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بیگم جب چلتی ہے تو زندگی کی خوشیاں اس کے ساتھ چلتی ہیں۔ جب بولتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں۔ وہ آپ ایک شگفتہ اور تر و تازہ پھول ہے۔ اس کا چہرہ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔

بابا مراد کی خوردہ بیٹی کی آواز پھر چہچہائی۔ ماں میں کس طرح سے تم کو دیکھوں۔ میرا بھی جی چاہتا ہے اُسے دیکھنے کو۔ اس کے خیال میں بیگم دُکھ اور سکھ اور راحت کا ایک پیارا رشتہ تھا جو پوری کائنات سے ہے اور وہ اس کائنات کو لمحہ بھر کے لیے دیکھنا چاہتی تھی بلکہ خود اس میں سما کر منہا ہو جانا چاہتی تھی۔

فیصلہ یہ ہوا کہ اگلے اتوار بابا مراد فیروز دین گلفروش سے موتیے کی کلیاں لے کر آئے گا اور اس کی بیوی اور بیٹی ہار گوندھ کر گیلی ململ میں لپیٹ کر بابا مراد کے ہاتھ بیگم کو تحفہ بھیجیں اور پھر کسی روز دونوں اُسے سلام کرنے جائیں۔

اتوار سے دو روز پہلے جب بابا مراد جمعہ کی نماز پڑھنے گیا تو بیوی نے اُسے فیروز دین کو پھولوں کی یاد دہانی کرانے کو کہا۔ بازار سے دھاگے کی نئی نلکی۔ ہار گوندھنے کے لیے بالا باریک سوئیاں خرید لایا۔ مراد نے بیوی کو بتایا کہ کس طرح ہر روز تڑکے تڑکے کیاریوں سے پھول توڑے جاتے ہیں اور گل فروشوں کے گھر چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں پھولوں سے بھر جاتی ہیں اور فیروز دین نے اتوار کو صبح صبح اپنے گھر آ کر اسے پھول لے جانے کو کہا ہے۔

ہفتہ کی شام کو جب بیگم سلطان حبیب نے بابا مراد سے چار گجرے اور دس ہار خریدے تو وہ گھر جا کر بولا: مجھے آج معلوم ہوا کہ بیگم مجھ سے جو اتنے گجرے اور ہار خریدتی ہے وہ جا کر اپنی ملنے والیوں کو تحفہ دیتی ہے۔ کتنا اچھا طریقہ ہے۔ آج بیگم کے میاں نے جو کہا رفعاں خالہ کے لیے ہیں یہ تو تب مجھے معلوم ہوا۔

مراد کی بیوی بولی: اچھی بات ہے۔ بیگم کی طفیل ہمارے ہار کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ کس وقت پھول لینے جاؤ گے؟

بابا مراد نے جواب دیا: نماز پڑھ کر نکل جاؤں گا۔ صبح کے وقت رکشے بہت ہوتے ہیں کسی پر بیٹھ جاؤں گا۔

بابا مراد اگلے روز اذان سنتے ہی نماز کے لیے مسجد کی طرف چل دیا اور اس کی بیوی تغارہ اٹھا کر گوبر ڈھونڈنے اور اکٹھا کرنے چل دی۔ اور بیٹی نے چولہا جلا کر روٹیاں پکائیں۔ چولہے پر سے چائے کی پتیلی اتاری۔ اپنے بچوں کو جگایا۔ منہ دھو کر تابے کے آگے جو مونج کی پیڑھی پر جھکا بیٹھا تھا۔ روٹی اور چائے کا پیالہ رکھا۔ بالا صبح صبح سبزی منڈی جا چکا تھا۔ جہاں وہ کچھ اپنے معمول کے مطابق کھا پی لیتا تھا۔ وہ ابھی فارغ ہوئی تھی کہ اس کی ماں آن پہنچی۔ تغارہ رکھ کر بولی: بیٹی میں آج زیادہ دور نہیں گئی۔ مجھے بھی چائے دے دو پھر ہم دونوں کو ہار گوندھنے ہیں۔ تیرا ابا آتا ہی ہوگا۔

دیکھتے دیکھتے جب کافی دن نکل آیا تو مراد دروازے کا ٹاٹ اٹھا کر اندر داخل ہوا اور بولا: فیروز دین نے مجھ سے پھولوں کا ذرہ بھر تو نہ لیا اور کلیاں بھی وہ دیں کہ دیکھا کرو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کلیوں کا لفافہ چنگیر میں الٹ دیا۔ اس کی بیوی کلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی یہ بازاری اطلس کی طرح چھوٹے چھوٹے نہیں۔ ان سے تو بڑے لمبے ہار پروئیں گی۔

جون کا مہینہ: بیٹی نے ململ کی گیلی صافی میں ہار لپیٹ کر دیئے۔ بیگم کی کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے دن نکل گئے۔ سائیں کا پنڈا اسے دیکھ کر بولا۔ وہ

سوچتے تھے۔ اور دیکھتے ہوئے بھی [illegible] آپ نے ایسے خاص طور پر بنائے ہوا ہوں۔ کتنے بھلے ہیں۔ بازاروں اور محلوں کی طرف
چھوٹے چھوٹے تھے۔ پھر وہ سوچتا بیگم خود [illegible] جہاں سے [illegible] نوشوں کے ہاتھوں کے نہیں۔ مگر بستیوں کے بنے ہوئے ہیں۔ کبھی
تھے باہر ہو [illegible] گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کو دیکھ کر وہ [illegible] خواہ مخواہ چھپانے لگا اور گاڑیوں کی اوٹ میں سے ہوتا ہوا صدر دروازے
میں سے داخل ہو گیا۔ اندر سناٹا خاموشی کا عالم تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر چپ چاپ کھڑے تھے۔ [illegible] دیوار کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔

ایک سے پوچھا: کیا ہوا؟

بولا: بیگم فوت ہو گئیں۔

کب؟

رات، دماغ کی رگ پھٹ گئی۔

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ وہ وہیں [illegible] دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ماں باپ پہنچ گئے ہیں۔
[illegible] اس نے دیکھا [illegible] بیگم کا میاں اپنے سر کو ہاتھوں میں پکڑے گم سم بیٹھا ہے۔ بیگم کی
نعش [illegible] کے درمیان رکھا ہوا تھا [illegible] سامنے [illegible]
[illegible] کا خوف [illegible]
[illegible] اس نے دیکھا
[illegible] جس کے
[illegible] نعش کے پاس
[illegible] موت کی
[illegible] نعش کی طرف دیکھتیں اور بے اختیار
[illegible] سلطان [illegible] کا باپ اور ماں صدر دروازے سے داخل
ہوئے [illegible] میری بیٹی تو نے امانت کہا تھا۔ کہاں ہے میری امانت
میری امانت مجھے واپس [illegible] سلطان جیب اپنی ماں کے گلے [illegible]
[illegible] اپنے بال نوچنے لگی۔

[illegible] جس نے [illegible]
[illegible] ہاتھوں [illegible]
[illegible]

وہ [illegible] بیٹھ گیا اور چاروں طرف [illegible] دیکھنے لگا اتنے میں مردہ نہلانے والی آن پہنچی۔ [illegible]
[illegible] وہ وہاں سے اٹھ کر صدر دروازے کے [illegible] آن بیٹھا اور سوچنے لگا [illegible] چلا جاؤں [illegible]

دن۔ میرا اس گھر میں کوئی واقف نہیں۔ شوق سے پھول خریدنے والی آج خود مرجھا چکی۔ اس کا میاں مجھے نہیں پہچان سکتا۔ مجھے کوئی نہیں جانتا جو جاتی تھی گئے ہیں سہارا۔ میں کس کے لیے رُکوں۔ مگر وہ بیٹھا رہا جیسے کسی انجان طاقت نے اسے جکڑے رکھا۔

اندر سے ایک دم چیخ پکار اٹھی۔ عورتوں کی آہ و بکا سنائی دی۔ کسی نے کہا کلمہ شہادت۔ اس نے دیکھا عزیز و اقارب کندھوں پر جنازہ اٹھائے کوٹھی سے باہر نکل رہے ہیں۔ وہ بھی کندھا دینے کو اٹھا اور پھر ہجوم کے ساتھ ساتھ ایک اجنبی بنا قبرستان کی طرف روانہ ہوا، جہاں وہ صرف قبر پر مٹی دینے کے لیے اٹھا اور پھر آ کر وہیں ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس بیری کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

جب سب جا چکے اور چھڑکاؤ کی ہوئی تازہ قبر کے پاس دو حافظوں نے قرآن خوانی شروع کر دی تو بابا مراد اٹھا۔ قبر کے قریب آیا۔ قبر پر پھولوں کی چادر پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس نے اپنی ٹمل کی صافی کھولی۔ پھولوں کے ہار نکالے۔ منہ سے اللہ اکبر نکلا اور اس نے وہ تمام ہار قبر پر ڈال دیئے۔ یہ دیکھ کر اس کا دل رو گیا کہ یہ ہار اتنے ہی لمبے تھے جتنی قبر۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مغفرت کے لیے دعا مانگی اور جتنی اسے یاد تھیں پڑھ ڈالیں۔

تھکا ہارا بوڑھا پیاسا نانا شاہ اٹھا کر اندر داخل ہوا تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ کوٹھڑی کی دہلیز پر بابا جی تانا بیٹھا تھا۔ "بڑی دیر کر دی بابا جی"

تانے کی آواز سن کر گھر کے باقی افراد بھی آ گئے۔ مراد نے کوٹھی پر پہنچنے سے لے کر قبرستان اور قبرستان سے گھر تک سب کچھ کہہ سنایا جس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں کبھی آنا نہ ہو جانی۔ سب اداس غمگین اور اداس ہو کر خاموش بیٹھ گئے۔ جس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔ وہ خالی نظروں سے دیوار کی طرف ہی دیکھتا چلا گیا جو زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ زمین کی طرف ہی دیکھنے لگا۔ ان کے جذبات حزیں ایسے تھے جیسے ان کا دم گیا ہو۔ اسے پچھلے زمانے مُفلس گھر میں بیگم کا ذکر بیگم کی بات ہوتی تو ہر فرد بار بار پوچھتا اور بابا مراد خوشی سے بار بار دہراتا۔ آج کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ جیسے سب باتیں ختم ہو گئیں۔ سب ذکر جاتے رہے۔ سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔

مرنے والی کے میکے و سسرال کے رشتے دار جب بھی قبرستان کی اس سڑک پر سے گزرتے رک جاتے اور قبر پر جا کر فاتحہ ضرور پڑھتے۔ ہو رہی کو ہمیشہ قبر پختہ تھی۔ پختہ قبر اور گرد ہمیشہ کسی نے جھاڑو دیا ہوا ملتا۔ قبر میں بھی ہوئی ہو یا پڑی ہوتی۔ کبھی تازہ کبھی مرجھایا ہوا ہار پڑا ہوتا۔ ... ہوتے ہی ہیں مگر پھولوں کے گجرے کون ڈال جاتا۔

مراد بابا نے اپنا معمول نہ بدلا۔ ہفتے میں کم از کم دو بار تو ضرور قبر پر ہار اور گجرے چڑھا آتا۔ فاتحہ پڑھتا۔ جھاڑو دیتا۔

وہ ایک دن اپنی بیوی زینب اور بیٹی کو قبرستان لے گیا۔ اس کی بیوی اور بیٹی جب تک تسبیح پڑھتی رہیں وہ اردگرد رہا ہے۔ پہرہ ... سے قبر پر ... اس کے بعد قبرستان والوں سے مراد کی وابستگی ... بڑی ... سڑک کے کنارے پر جہاں سے قبرستان کے تین راستے تینوں سمتوں میں نکلتے تھے۔ ایک پھولوں کی کوٹھڑی اور رنگسازی تھی ... رہنے والی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ بچوں کا باپ ... ایک دن وہ رنگ ... والے کے گھر جا نکلا۔ اپنے متعلق تعارف کرایا ... ہوں۔ میری ایک درخواست ہے۔ ... تمہارے آنگن میں باہر جو درخت ہے اس کے نیچے پھولوں کی ایک ٹوکری رکھ لیا ... قبرستان کی تین پگڈنڈیاں نکلتی ہیں۔ ... ضرورت پڑتی ہے۔ میرا ایک عزیز مر چکا ہے جس کی ... ہے۔ اس کو صبح یہاں لا کر بٹھا دیا کروں گا۔ شام کو لے جایا کروں گا۔ درخت کے نیچے سایہ ہے بیٹھا رہا کرے گا۔ پھولوں کی جو بکری ہو گی،

آدھی تمہاری آدھی اس کی۔

وہ بولا۔ بابا جی پھولوں سے کیا بکری ہوئی۔ تم چھابا لگانا چاہتے ہو لگاؤ؟

اگلے روز مراد نے ایک روپے کی گلاب کی پتیاں چھابے میں ڈال کر تابے کو وہاں بٹھا دیا جس نے شام کو دو روپے بنا لیے۔ بابا مراد اگلے روز پھول والے سے پتیاں زیادہ لے آیا سب بک گئیں جمعرات کو اور بھی زیادہ بکری ہوئی۔

اب کسی ہفتے بکری کم ہوتی کسی ہفتے زیادہ۔ جو پتیاں بچ جاتیں۔ بابا مراد بیگم کی قبر پہ رکھ آتا۔ اس دوران ریڑھے والے نور نے محسوس کیا کہ تابا معذور رہتے ہوئے بھی کام چور نہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح کام میں ہاتھ بٹا دیتا تھا۔ جھونپڑی کو جھاڑنے پر بٹھا دیا جاتا تو تابا چپ چاپ لگا رہتا۔ نکلا ہوا وہ مکھیاں اڑاتا رہتا تھا۔ ہر وقت تیار۔ آیا اور لگ جاتا۔ نور بھی شام کو آتا تو بیری کے درخت کے نیچے تابے کے پاس بیٹھ کر حقہ پیتا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا۔ صبح جانے لگتا تو گھوڑے کا مسالہ بنانے رکھ جاتا۔ مسید[illegible] نور تابا اس سے جھاڑ کر نور کے گھوڑے کے لیے عام نرخ سے سستا گھاس لے آتا۔ تابا کی چھوٹی سی بیٹی تابے سے مانوس ہو گئی۔ اس کی گود میں پڑی رہتی اور تابا بابا کی پٹڑی پہ بندھا جاگا بیٹھا رہتا۔ تابا جب میں پہنچی ہوئی اپنی منڈی سے سیدھی پٹ ساتھ لے آتا۔ شام کو اس کا بھائی بابا بائیسکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر لے جاتا۔ مگر اب تو کبھی نور اسے منڈی کا بھی پرچہ لینا اسے یہاں سے جانے کا احساس بھی نہ دیں۔

ایک دن گاؤں سے نور کی ساس کی بیماری کی اطلاع آئی۔ اس کی بیوی بچوں کو لے کر گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ نور نے کہا وہ ملتے دن روٹی بازار سے کھا لے گا۔ تابا بولا بھائی نور تم کو چنے کی بہت تکلیف ہو گی۔ تم بازار سے کیوں کھانے لگے ہو۔ میں روٹی پکا لیا کروں گا سارا دن میں بیکار ہی تو بیٹھا رہتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو جانے کا، میں پکا دوں گا۔

بابا جب آیا تو تابے نے بتایا اور کہا بھئی وہ خفا ہوئے تو فکر نہیں ہونی بابا گاؤں سے نہیں آ جاتی۔ یہ سن کر اگلے روز بابا مراد آ گیا۔ بیری سے نیچے پھولوں کا چھابا اس نے پرے رکھا تھا۔ تابا بیچنے کے سامنے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ مراد نے دیکھا قبروں کے لیے کوئی پھول لینے آتا تو تابا بولتا۔ پاس سے بیٹھا بیٹھا بولتا۔ گنتے نہ چاہیں۔ بار نے کے آنے سے بھی آپ ہی لے لیں پیسے وہیں رکھ دیں۔ بوری کے نیچے میں بابا کو تنگ کرنے جاتے نہیں یہ سب۔ جاتا نے لے لیں۔ پھول کی کوئی قیمت نہیں ہوتی جی؟

یہ سن کر بابا مراد نے سوچا یہ تو وہی بات ہے جو اس نے کہی تھی جب اس نے کہا تھا وہ مٹی کے نیچے پڑی تھی۔ مرنے والی کی جب بھی یاد آتی تو اسے اپنی بیگم کی ہنسی اور مسکراہٹ کا خیال آتا۔ اس کی مسرت اسی میں تھی جس کا پھول بن کر کھلنا کھلنا جاری رہتی۔ اب معذور اور بانا چھوڑ کر گاؤں سے ساتھ چھپا ہوا تھا۔ وہ جو خیال تابا کے دماغ میں کس طرح محفوظ رہ گیا۔ اس کے سینے میں چھپا ہوا تھا کہ آپ ہی آپ زبان پر آ گیا۔ جب تک تابا بیٹھا سبزی بناتا رہا، بابا مراد آتا رہا۔ آتا تو بیٹھا رہا۔ ادھر قبر کے پاس بیٹھا سوچتا رہا۔ حقہ گڑگڑاتا رہا اور قبر پر جانے والوں کے پاس پھول بیچ کر پیسے بوری کے نیچے رکھتا رہا۔

جب اس کا جانے کا وقت ہوا۔ پہلے کی طرح آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔ اگلے روز آیا تو تابا پہلے کی طرح چولہے کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور بات بات پر پھول بیچ رہا تھا۔ بابا مراد نے سوال کھول کر پڑھا ہوا ایک تختی نکالی اور اسے چھابے میں رکھ دیا۔ لکڑی کی تختی پر لکھا تھا۔ پھول کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

لے بوتا جا اب بیشک وہیں سے۔ کوئی پڑھا ہوا بابو آ گیا تو آپ ہی پڑھ لے گا۔"

"کل کی آمدن بھی اتنی رہی جتنی میسکر وہاں تھڑے پر بیٹھنے سے تھی۔ آمدن میں کوئی فرق نہیں پڑا بابا۔"

"میرا خیال تھا کہ کم پڑ جائے گی، جبھی میں یہ لکھوا لایا۔ تمہاری ماں پوچھتی تھی تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں۔"

تاجا بولا: "کونسی تکلیف۔ نور نے تو کھلا گھر مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔ میں معذور اپاہج کہاں بھاگ سکتا ہوں۔"

مراد نے کہا: "ایسا نہ کہہ بیٹا۔ تو تو کئیوں سے اچھا ہے۔ دو ڈھائی کی کار کر لیتا ہے۔"

بابامراد اور تاجا بیٹھے یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک ریڑھے والے نے سڑک پر ریڑھا کھڑا کیا اور راہگذائی سے سیدھا چوہے کی طرف آ کر بولا: "نور کی بیوی فیروزاں کہاں ہے؟"

"گاؤں گئی ہوئی ہے۔ اُس کی ماں بیمار تھی۔"

"اُسے اطلاع کر دو کہ نور کی ٹرک سے ٹکر ہو گئی ہے۔ گھوڑا مر گیا ہے۔ وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔"

"ہمیں ہسپتال لے چلو۔"

وہ بابامراد اور تاجے کو اپنے ریڑھے پر بٹھا کر ہسپتال پہنچا۔ نور کے سر پر پٹیاں بندھی تھیں وہ بالکل بیہوش پڑا تھا۔ بابامراد نے اس کے کسی ملنے والے کا پتہ کر کے نور کی بیوی کو حادثہ کی اطلاع پہنچائی۔ جب وہ واپس آئے تو ٹوکری کے پھول آدھے ختم ہو چکے تھے۔ تختے کے نیچے سے جتنے بارہ آنے پڑے تھے۔ بوری اٹھائی تو اس کے نیچے سے ایک روپیہ ستر پیسے ملے۔

یہ دو روپے چھ آنے کے پھول ان کی غیر حاضری میں بکے تھے۔

بابامراد نے رات ہسپتال میں نور کے سرہانے گزاری جو بالکل بیہوش پڑا رہا۔ صبح روتی چلاتی اس کی بیوی ہسپتال پہنچی اور شام کو نور نے دم دے دیا۔ وہ بھی اسی قبرستان میں دفن ہوا۔

جب نور کی بیوی کو اس کی ماں چند روز کے لیے اپنے ساتھ لے گئی تو تاجا گھر کی نگہداشت کرتا رہا۔ دن کے وقت بابامراد اس کے پاس آ بیٹھتا۔ سہ پہر کو چلا جاتا۔ نور کی بیوی آئی تو تاجا دھاڑیں مار مار کر رو دیا۔ بولا: "نور بنا میں سخت اداس ہو گیا ہوں۔"

فیروزاں زار زار رو دی اور بولی: "کیا مجھ سے زیادہ اداس ہو گئے ہو۔ ان بچوں سے بھی زیادہ اداس ہو گئے ہو؟" تاجے نے چھوٹی کو اپنی گود میں بٹھا کر پیار کیا اور اپنی صندوقی سے بیس روپے نکال کر فیروزاں کو دیتے ہوئے بولا: "یہ اپنے پاس رکھو۔" پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور بولا:

"مرنے والا میرا دوست تھا۔ میں معذور ہوں مگر پھول بیچ کر ان بچوں کا گزارہ چلاؤں گا۔"

چند روز گزرے تھے کہ بابامراد کو باری کا بخار آنے لگا۔

ایک روز پھولوں کی کچھ مرجھائی پتیاں چھابے میں بچی پڑی تھیں۔ تاجے نے فیروزاں سے کہا: "یہ لے جا کچھ نور کی قبر پر ڈال آ کچھ اس نیلی کی قبر پر جہاں بابا جایا کرتا ہے۔ کتنے دنوں سے وہاں جھاڑو بھی نہیں دیا ہوگا۔ وہ بھی دے آنا۔"

فیروزاں واپس آئی تو تھر تھر کانپ رہی تھی، جیسے بخار چڑھ رہا ہو۔ بولی: "میرے اوپر کوئی موٹا کپڑا ڈال دو۔"

تکمیل:

"میں لمحہ بھر قبر پر پھول ڈال کر لوٹی ہی تھی کہ پیچھے سے ایک بابا قبر پر فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ سبز چغہ ہاتھ میں تسبیح۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس نے مجھے پھر وہ میرے قریب سے گزرتا ہوا چلا گیا۔ میں نے پھول قبر پر رکھے اور جھاڑو دیا۔ جب جھاڑو کونے میں رکھنے لگی تو دیکھتی ہوں وہی بزرگ ایک سرخ شال پیچھے کھڑا مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ یہی غائب ہو گیا۔ میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔"

بابا خبر گیری بھی کرتا رہا۔ بچوں کو بھی سنبھالتا رہا۔ روٹی ہانڈی بھی کرتا رہا۔ پھول بھی بھیجتا رہا۔ رات پڑتی تو چھابے کو پیڑی کے نیچے رکھ دیتا۔ صبح ہوتی تو چھابا گلاب کی پتیوں سے بھرا ہوتا۔ پہلے دن اس نے سوچا بابا بیمار ہے۔ اس کو خیال آیا ہوگا۔ اس نے پھول صبح صبح بابے کے ہاتھ بھجوا دیئے ہوں گے۔ اگلے روز پھر ایسے ہی۔ تیسرے روز پھر بھی۔ چوتھے روز فیروزاں کا ماتھا ٹھنکا۔ بولی "تمہارا بابا بیمار تھا۔ پھول کون لا رہا؟"

تو اس نے جواب دیا۔ "صبح صبح بابا لے جاتا تھا۔"

پچھلے دنوں بعد بیماری کے اٹھ کر جب بابا مراد آیا تو بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ فیروزاں نے لا کر اس کے آگے گرم گرم چائے رکھی۔ شاد ہو کے دعائیں دیں۔ بابا نے ٹکا ہی تھیں، "اچھی خبر سناؤں۔ ہماری بہن کی اپنے خاوند سے صلح ہو گئی ہے۔ اور وہ نئے گھر چلی گئی۔ تمہاری ماں نے خوشی میں تمہارے لیے بھینس بھیجی ہے۔"

اس نے جھیرو مالی لڑکی کو ہاتھ میں پکڑا آہستہ سے کہا "بابا اتنے دن تم نے تو مجھے پھول نہیں بھیجے۔"

"نہیں تو۔"

"فیروزاں تم مجھے ہر رات ہی بتا ۔ بابا لے جاتا تھا۔"

"یہ اتنی دلداری کیوں؟"

"میں رات کو خالی چھابا پیڑھی کے نیچے رکھ دیتا تھا۔ صبح گلاب کی پتیوں سے بھرا ہوتا تھا۔ فیروزاں نے ایک دن پوچھا تو میں نے کہا صبح صبح بابا آ کے دے جاتا تھا۔"

بابا اداس آہستہ سے بولا "بس یہ بات ہم دونوں میں رہے کسی تیسرے تک نہ پہنچے۔"

"مجھے نے میرا راز داری سے کہا۔ ہمارے درمیان ایک اور بات بھی رہے۔ فیروزاں نے مجھ سے نکاح پڑھوا لیا ہے۔"

گو یہ بات ایک سال پرانی ہے۔ اب تو اس مزار پر بڑا میلہ لگتا ہے۔ درخت کے نیچے جہاں گلاب کی پتیوں کا چھابا پڑا ہے اور پھول کسی نادر کاریگر کے ہنر کا آپ ہی آپ بنتے ہیں۔ ایک المانزہ کھڑا ہے جہاں لوگ شکرانہ کرتے ہیں اور نانگوں سے ایک معذور شخص انہیں بڑی توجہ سے گزرتا، کھائی دیتا ہے۔

نو طرف کے آگے بندھی بھینس کا دودھ دوہتی ایک عورت نظر آتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ ان دونوں کا رشتہ کس طاقت نے چھپایا تھا۔

گزرتے لمحوں کی چاپ

رام لعل

لاہور پہنچ کر میرے پروگرام میں سب سے پہلے اپنے انکل سے ملنا شامل تھا۔ اپنی آنٹی کی موت کا افسوس ظاہر کرنے کے لئے۔ میں لندن میں تھی جب ہی اُن کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ تب سے میں نہیں جا سکی تھی۔ جانا بہت مشکل تھا۔ ایک ڈاکٹر کے لئے اپنے شہر میں ہی اپنے پیشے کے علاوہ کسی اور کام کے لئے جانا ناممکن ہوتا ہے۔ اتفاق سے مجھے ہندوستانی میڈیکل کا بلاوا کے مختلف سیمیناروں میں شرکت کی آفر مل گئی۔ روپے کی لاٹری بھی یقیناً تھی۔ لیکن میں ایک بار ہندوستان ضرور جانا چاہتی تھی۔ صدیق سے ملنے کے لئے۔ اُسے میں چودہ سال سے نہیں ملی تھی۔ جب سے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلی گئی تھی۔ سب سے پہلے اُسی سے کیوں نہ ملوں؟

صدیق عثمانی کتنا عجیب آدمی تھا! اب تو زمانہ بیت گیا۔ آج اتوار ہے یقیناً گھر پہ ہوگا۔ میں اُس کا فون نمبر ڈھونڈنے لگی۔

"میں صدیق صاحب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہیلو شیبا!"

"صدیق تمہیں کیسے معلوم ہوا کیا یہ میں ہوں؟"

"شیبا! یہ آواز تو میں ہر جگہ پہچان سکتا ہوں! کسی بھی وقت!"

"تم کہاں کے آدمی ہو! معلوم ہے آج میں نے چودہ سال کے بعد تمہیں فون کیا ہے!"

"ہاں ہاں چودہ سال پہلے۔ نو فروری کو انیس سو پچپن میں نا!"

"اوہ خدا! اس غضب کا حافظہ رکھتے ہو! اچھا سنو! ناراض مت ہونا آنے سے پہلے تمہیں اطلاع نہیں دی۔ بات یہ ہے کہ ڈاکٹری زندگی کہ! آج تم مجھ سے مل سکتے ہو؟ لیکن تمہارے گھر نہیں آؤں گی! اس کی وجہ بھی مت پوچھو۔"

"اچھا! میری کوئی انگیجمنٹ نہیں ہے آج!"

"بہت عمدہ! اب پروگرام بنائیں۔ اس وقت بارہ بجے ہیں۔ ایک بجے کیسا رہے گا! — کہاں ملیں؟ —— تم سول لائنز میں ہو؟ میں اس وقت کنٹونمنٹ میں ہوں۔ میرے میزبان کے پاس جیپ ہے۔ اُس نے آفر کر رکھی ہے۔ میں کوارٹر پہنچ سکتی ہوں یا جیسی بھی دوسری جگہ!"

"کوارٹر ٹھیک رہے گا۔ میں ابھی روانہ ہو جاؤں گا!"

"گڈ! میں بھی آدھ گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی!"

"اپ سیٹ مت ہو جانا کبھی!"

"نہیں ہوں گی!"

ایک بڑی مصیبت سے بچ گئی۔ کسی اور جگہ پتہ نہیں کیا ہو جاتی تھی۔ انکل کے یہاں جاتی تو وہاں پھنس جاتی۔ ایک ویٹر نے میرے پہنچنے سے پہلے میرے میزبان کا نام بک کر رکھا تھا۔ فون پہ فون کئے تھے اُس نے۔ اچھا ہوا اس نے میری طرف سے نیو ائیر کی دعوت قبول نہیں کر لی تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔ کسی اجنبی کے ساتھ نہیں اپنے صدیق کے ساتھ کھانا کھاؤں گی!

صدیق مجھے چودہ سال کے بعد ملے گا۔ اتنا عرصہ میں کیا کیا کرتی رہی! کہاں کہاں رہی! اُسے کیسے بتاؤں گی! تب میں گئی تھی تم سیالکوٹ! اندازاً اب میں کتنی مختلف تھی! دنیا کے گرد چکر کاٹتی پھرتی تھی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں۔ دوسرے سے تیسرے میں۔ اس زمانے میں ایک مرد میرے ساتھ تھا، جو نیا نیا ادھر سے مل گیا تھا۔ صدیق اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ کبھی جان بھی نہیں پائے گا! کیا زمانہ تھا وہ بھی! محبتیں! اشارے! خوشامدیں! شوخیاں! اور حسد اور سازشیں! میں صدیق کو اب بھی پہچان رہی ہوں۔ چھوٹے قد کا، دو سال عمر میں کم، اتنا معصوم! ہمیشہ ونشٹ ابھی نیا نیا ٹیلیگرافکس ڈیپارٹمنٹ میں نوکر ہوا تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ پروا نہیں! اب ہم گھنٹے ہنسے ملاقاتوں میں دیتے تھے۔ ہونہار!

اُس کا گھر! میرا گھر! بہت خوبصورت وہ مکان تھا۔ اُس کو ایک کمرہ سب لٹ کر دیا گیا تھا۔ اس مکان کی بو اب بھی یاد آتی ہے۔ مکان کی مالکن بھی یاد آتی ہے۔ ہر وقت کپڑے بدلتی رہنے سے ہر روز سنوارا کرتی تھی۔ وہاں کے کچھ دوست کیا کہنے! بھی یاد آتے ہیں۔ میزبانیاں۔ میرے ساتھ پڑھتی تھی جمشید کمینہ! ایک فوجی کی بیوی۔ اپنے شوہر کا ہمیشہ انتظار کیا کرتی تھی، دوسری عالمی جنگ میں جو گم ہو گیا تھا! اسے کبھی یقین نہیں آتا تھا وہ مر چکا ہوگا۔

یہ سب لوگ مجھے ہمیشہ یاد رہے۔ نئے سال کی مبارک باد کے کارڈ بھیجا کرتے تھے۔ صدیق نے تو کوئی سال خالی نہیں جانے دیا۔ اُس کے کارڈ مجھے ہر جگہ ملتے رہے۔ پاکستان۔ فرانس۔ اسپین۔ روم۔ آسٹریا میں ان کے اوپر چھپی ہوئی بڑی بڑی تصویریں دیکھتی رہتی لیکن کبھی جواب نہ دیتی۔ آخری کارڈ مجھے لندن میں پہنچا تھا۔ وہ ابھی تک میرے پاس تھا۔ میرے ساتھ کسی سوٹ کیس میں۔

میں نے بہت ہی جلدی باہر جانے کے لئے کپڑے تبدیل کئے۔ ایک بج گیا تھا۔

وہ خدا! کتنی خاموش سڑکیں ہیں! وہاں پر بھی ایسی سڑکیں پڑتی ہوں گی۔ اور پھر بھی ایسی جگہ کا لندن میں بیٹھ کر کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ لوگوں سے بھری ہوئی سڑکوں پر سے تیز رفتاری سے ڈرائیور کیسے نکال کر لے جاتے ہیں! میری جیپ کا ڈرائیور اتنا کم عمر تھا جیسے لڑکا ہے۔ ایسے کراچی پہنچانے سے پہلے کوئی حادثہ نہ کر دے! ستائیس سال کی عمر میں کس قدر متاثر ہو گئی ہوں! چودہ سال پہلے تک انہی سڑکوں پر میں خود کتنی تیزی سے سائیکل دوڑایا کرتی تھی! نینا اگروال اور میں اور صدیق! جب ہم پکنک منانے نکلتے تھے۔ سڑکوں پر سائیکل ریس سی شروع ہو جاتی تھی۔ اب مجھے سائیکل چلانی پڑ جائے تو شاید چند گز بھی نہ جا سکوں! پہلا راستہ بھی سائیکل تھا نہ رستہ، پیدل ہی جانا پڑے گا! میں اب اس قسم کی شوخی اور تیزی سے سائیکلنگ نہیں کر سکوں گی! ناممکن!

"ڈرائیور۔ وہاں روک دو! سامنے!"

سڑک کے پار کوانٹی کے دروازے کے پاس یقیناً وہی کھڑا ہے۔ مسکرا رہا ہے۔ اُس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے۔ اُس کا سانولا مرجھایا ہوا چہرہ! ابھرا ہوا ماتھا! بکھرے ہوئے سفید بال! خاص طرح کے دانت!

"ہیلو صدیق! تم ابھی تک ویسے کے ویسے ہی ہو! ذرا نہیں بدلے!"

"ثریا! یہ تم ہو! ٹھیک ہے تم بھی تو بہت زیادہ نہیں بدلیں!"

اُسے دیکھ کر میں ایک دم نروس ہونے لگی ہوں۔ کیوں! اُس کے سامنے پہنچ کر یکایک مجھے کیا ہوتے جا رہا ہے! وہ میرے آگے آگے چل پڑا ہے۔ میں اُس کی پیٹھ دیکھ سکتی ہوں۔ چھوٹے قد کے آدمی کی پیٹھ بھی کس قدر مردانہ رہتی ہے! وہ اب بھی پُرکشش ہے! کیا ہم سیدھے کھانے کی میز پر ہی جا کر بیٹھ جائیں گے! کھانے پر جُٹ جائیں گے!

"ثریا، ہمارے پاس باتیں کرنے کے لئے بہت وقت ہے! ہمیں باتیں بھی بہت سی کرنی ہیں! کرنی ہیں نا؟ اچھا یہ بتاؤ یورپ میں تو عورتیں ڈرنک بھی کرتی ہیں۔ تم کھانے سے پہلے تھوڑا کچھ لے لو گی!"

"اوہ نو! صدیق، وہاں تو سب چلتا ہے۔ مجھے ساتھ دینا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں تو سب لوگ دوسری طرح کے ہیں نا! سب مجھے گھورنے لگیں گے! میں تو بے ہوش ہو جاؤں گی!"

"گھبراؤ مت! یہاں اور بھی کئی عورتیں ہوں گی! یہ یہاں کا بہت ہی موڈرن قسم کا بار ہے! یہاں آ کر عورتیں ذرا نہیں گھبراتیں! نہیں پیتیں وہ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کوکا کولا پی لیتی ہیں۔"

"صدیق، مجھے دیکھ کر تم خوش ہوئے؟"

"ثریا، مجھے یقین ہی نہیں آتا۔ یہ تم ہو۔"

"اوہ، ابھی تم نے کہا تھا میں ذرا بھی نہیں بدلی!"

"تم واقعی نہیں بدلیں ثریا! لیکن جب کوئی بہت عرصے کے بعد دکھائی دے جاتا ہے تو آدمی بالکل اچنبھے میں پڑ جاتا ہے! ذرا اس میز پر بیٹھیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے وہاں نزدیک کی دو میزوں پر عورتیں اور بھی ہیں! کم سے کم اس بار کو دیکھ کر تو کہا جا سکتا ہے کان پور ایک موڈرن سٹی ہے! دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح!"

"بس یہی ایک کونہ دیکھ کر اسے موڈرن کیسے کہا جا سکتا ہے؟ وہی چند لوگ روز ہی یہاں آتے ہیں جنہیں دیکھتے دیکھتے نسر خوانی ... جی اُوب لیا ہے!"

"صدیق تم ابھی تک اسی طرح ہو! ذرا نہیں بدلے! اتنے اچھے لوگوں کے بارے میں تم ایسی رائے کیوں دے رہے ہو؟ کیا وہ واقعی دلچسپ اور خوبصورت نہیں ہیں؟"

"ان کے بارے میں کوئی بات مت چھیڑو ثریا! ہمیں اپنی بہت سی باتیں کرنی ہیں! پہلے یہ بتاؤ تم کیا لو گی؟ بیئر، وسکی!"

"سائیڈ منگاؤ!"

"اچھا تمہارے لئے سادہ پانی، اور اپنے لئے اورنج سکواش، بیرا!"

صدیق نے بیرے کو آرڈر دیا اور اپنا سگریٹ کا پیکٹ کھول کر میری طرف پھینک دیا۔ میں نے بھی ایک سگریٹ لے لی۔

"صدیق، ہم پھر اکٹھے ہوئے ہیں، کتنا عجیب لگ رہا ہے! کیا تمہیں یقین ہے تم مجھے مل کر خوش ہوئے ہو، صدیق؟ بتاؤ، تم ان چودہ برسوں میں کیا کرتے رہے ہو؟ مسکراؤ نا صدیق! میں نے تمہیں مسکراتے ہوئے ایک بہت مدت سے نہیں دیکھا! شاید یہ زندگی کا تیسرا حصہ ان اندھیروں میں گذر گیا۔ پھر نہ جانے کب تمہیں مسکراتا ہوا دیکھ سکوں گی! تمہیں یاد ہے نا صدیق میں تب صرف بیس سال کی تھی! کتنی چھوٹی ہوتی تھی اور یقیناً بہت احمق بھی! بتاؤ نا صدیق کیا میں واقعی بہت بدل گئی ہوں! تب میں تم سے کتنی مختلف لگتی تھی! اپنے ننھے منے صدیق سے، جو ایک ایک انچ ہندوستانی تھا، ہر معاملے میں! خیالات، عقیدے اور رنگ کے معاملے میں بالکل بالکل! کیا میں اب بھی تم سے مختلف لگتی ہوں!" میں دھیرے سے ہنس پڑی۔

یہ بالکل سچ تھا۔ حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ ثریا بیٹی! یورپ کی ممتاز ڈاکٹر، مانیٹر، لیکچرر، ٹی وی نیوز میں سپیشلسٹ! ہوتی رہوں یہی ہو! اپنے بچپن کے گزرے پیار سے سابق محبوب کے ساتھ باتیں کر رہی تھی!

"تو پھر تمہیں بتاؤں میں کیا کرتا رہا ہوں، او خدا! یہ سب بتاتے بتاتے تو پھر ایک عرصہ گزر جائے گا!"

"صدیق!"

"ہوں ثریا!"

"تم زیادہ خوش نظر نہیں آتے ہو! کیا تم خوش ہو صدیق؟"

"اس سوال کا جواب دینا اتنا آسان نہیں ہے ثریا! 'خوشی' کا لفظ میں آج کل استعمال ہی نہیں کرتا ہوں!"

"یہ کیا کہہ رہے ہو صدیق! بات کیا ہے؟"

"ثریا تم جانتی ہو ہمارے ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی! اس میں میرے تین قریبی دوست مارے گئے۔ وہ جنگ بہت خونیں تھی۔ اگرچہ اتنی بڑی بھی نہیں تھی لیکن اس کے اثرات گہرے ہیں۔ ابھی تک محسوس ہوتے ہیں۔ ہر سطح پر، ثقافتی تہذیبی اور سیاسی سطح پر تو ضعیف رہ گئی ہے!"

"دیکھو اب تو امن ہے! کوئی جنگ نہیں ہو رہی ہے نا صدیق! پاکستان بھی اپنے زخموں کو بھلا چکا ہے اور ہندوستان بھی! یہ جنگ ہم نے پاکستان سے تھوڑی لڑی تھی! ہمارے مقابل نہ وہ ہوتے تھے! پاکستانی! لیکن دراصل ہم امریکہ اور چین سے لڑ رہے تھے، کیونکہ سارا منصوبہ انہی نے بنایا تھا۔ ہتھیار بھی انہوں نے ہی دیئے تھے۔ وہی چاہتے تھے کہ جنگ ہو تاکہ دونوں ملک جل کر رہ جائیں! اس میں کتنے ہندوستانی اور پاکستانی بے قصور مارے گئے!"

"کیا اسی وجہ سے تم افسردہ ہو، صدیق!"

"افسردہ ہونے کے لئے ہی کوئی وجہ نہیں ہے! لیکن میں نے یہ کب کہا میں افسردہ ہوں؟ ثریا تم خود یہاں جا کر دیکھو اور پھر کہو میں افسردہ ہوں! او خدایا! جب سے تم مجھے چھوڑ کر گئی ہو سارے حالات خود مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنے پڑے

...ادمی ہی ہندوستان میں رہ کر سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکے گا! یہ سب کس قدر بھیانک تھا! لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے میں سوچتا ہوں ثریا! اگر میں ہندوستانی ہوں اور تم پاکستانی ہو!"

"جسم سے تو ہم دونوں ہندوستانی ہی ہیں! لیکن میرا خیال ہے یہ کتنا ہی خطرناک ہو گا! صدیق یہ قومیت ہی ہمارے زمانے کی سب سے خطرناک بیماری ہے۔ میرا یقین ہے اگر ہم خود کو ساری دنیا کے شہری محسوس کر سکیں تو یہ کرۂ ارض زندگی گزارنے کے لئے سب سے اچھی صحت افزا جگہ ہو سکتی ہے!"

"ثریا تم کافی بدل گئی ہو!"

"یقین جی نہیں ہوتا کہ کوئی کبھی بدل بھی نہیں سکتا! اور ویسے یہ اچھی بات بھی نہیں ہے!"

"تم ویسی پاکستانی نہیں ہو جیسی شروع شروع میں نظر آتی تھیں!"

"تمہارا مطلب ہے میں اتنی نابالغ اب نہیں ہوں! اور اتنی احمق بھی نہیں!"

"پتہ نہیں میں دراصل کیا کہنا چاہتا تھا!"

"اچھا اب تھوڑی دیر کے لئے مسکرا دو! صدیق میں تمہیں مسکراتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں!"

"بیا! وہی سب ایک بار پھر سے آؤ! جلدی!"

"تمہیں یاد ہے زیادہ پینے سے میں تمہیں پہلے بھی منع کرتی رہتی تھی!"

"تمہاری نصیحت ابھی تک میرے دماغ میں گونجا کرتی ہے ثریا! لیکن اسے اب کتنا عرصہ ہو گیا ہے! لیکن میں اعتراف کر سکتا ہوں اس میں تمہارا بہت سا پیار بھی شامل تھا! اسے میں آج بھی محسوس کرتا ہوں! لیکن تم آج کچھ مت کہنا! ڈاکٹر ثریا!"

"لیکن صدیق ہم پھر تو نہیں مل سکیں گے! جب تک میں یہاں ہوں!"

"کیا مطلب؟"

"صدیق!"

"کہو!"

"اچھا تو اب ہم اپنے اپنے مستقبل کے نام پر پئیں!"

"نہیں تمہارے نام پر اور ہندوستان کے نام پر! چیرز!"

"ہندوستان کے نام پر؟"

"کیوں نہیں! اسی ملک کے درد تشدد اور ان کے نظریات کے ساتھ ساری دنیا کا مستقبل وابستہ ہے! آخری تبدیلیاں!"

"لیکن صدیق! آج کیا ہم یہی باتیں کرتے رہیں گے؟"

"نہیں۔ لیکن موضوع بدلنے سے پہلے ڈاکٹر ثریا! میں ایک بات کہہ دوں! تم جو پاکستانی ہو نا:"

"میں پاکستانی نہیں ہوں صدیق!"

"لیکن تم یہاں سے پاکستان ہی گئی تھیں اور وہاں کئی سال تک رہتی رہی ہو!"

"ہاں دس سال، لیکن میں وہاں کی شہری نہیں ہوں!"

"کیا مطلب؟"

"نہیں! اس بات کو کوئی بھی نہیں جانتا، کسی اور کو بتانا بھی نہیں، صدیق! میں اب انگلینڈ کی شہری ہوں۔ لیکن چونکہ میں یہاں پیدا ہوئی تھی۔ ابھی یہیں جاتی ہوں! صدیق میری طرف اس طرح مت دیکھو!"

"آئی ایم سوری ثریا! لیکن یہ سب مذاق لگتا ہے۔ تم ہمیشہ سے شریر رہی ہو! اچھا یہ بتاؤ تم اخبارات پڑھتی رہتی ہو؟"

"ہاں، بالکل، کتابیں بھی۔ میں ایک لائبریری کی ممبر بھی ہوں۔ روزانہ شام کو ٹی وی بھی دیکھ لیتی ہوں۔ اور کبھی کبھی یونیورسٹی کے ڈرامے اور تھیٹر میں بھی چلی جاتی ہوں۔ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے صدیق!"

"اپنے ماضی کی ایک شریر لڑکی!"

صدیق! اب مسکراؤ۔ وہی اچھا لگے گا۔ لیکن تمہارا ہاتھ ٹھنڈا کیوں ہے! تم میرے ساتھ بیٹھ کر بھی نروس نہیں ہوتے جیسا کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے خود کو محسوس کیا تھا! میں تم سے اب اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ جتنا کچھ سوچ رکھا تھا! صدیق! اپنے متعلق بتاؤ۔ ہمیں پرسنل پر گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ کم سے کم آج تو نہیں۔ اچھا یہ بتاؤ تمہاری بیوی کیسی ہے! کیا میں اسے پسند کر سکوں گی؟ کیا وہ تم سے لمبی ہے یا گوری بھی ہے! ہندوستانی عورتوں کی طرح دلکش بھی! تم نے شادی کب کی صدیق۔

"میں نے شادی نہیں کی ابھی تک ثریا! میں جانتا تھا۔ یہ سن کر تم حیران ضرور ہو جاؤ گی! اسی وجہ سے تم میرے گھر بھی نہیں جاتی تھیں۔ مجھ سے ملنے کے لئے اس جگہ کا انتخاب کیا ہے! اپنے بارے میں کچھ بتاؤ! تم نے شادی کر لی! وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

"صدیق چھ سال ہوئے ہم نے شادی کی ہے۔ ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پانچ سال کا۔ اس کا نام ایشو ہے! حیران کیوں ہو رہے ہو! کیا یہ سب تمہیں معلوم نہیں تھا!"

"نہیں مجھے بالکل معلوم نہیں تھا ثریا!"

"دراصل ہم نے ایک مدت سے خط و کتابت بھی تو نہیں کی ہے!"

"ہاں یہ بات سچ ہے۔ تمہارا آخری خط مجھے پیرس سے ملا تھا۔ جون میں۔ دس سال پہلے!"

"تم سب کچھ یاد رکھتے ہو صدیق! تاریخ تک بتا دیتے ہو؟"

"یقیناً! میرے پاس تمہارے سارے خط موجود ہیں ثریا، وہ دیکھو! ان کی عبارت بھی مجھے زبانی یاد ہے۔ وہ بہت پیارے خط ہیں! انہیں پڑھ کر میں سوچا کرتا تھا تم رائٹر بنو گی!"

"اچھا! میں خود تو رائٹر نہیں بنی لیکن ایک آرٹسٹ سے شادی ضرور کر لی ہے! وہ ساؤتھ انڈین ہے۔ آکسفورڈ میں میں نے انہیں دیکھا تھا!"

"تم نے صرف یہ لکھا تھا میں آئندہ تمہیں خط لکھنا بند کر دوں! کیونکہ تم آئندہ مجھے جواب نہیں دے پاؤ گی۔ حالانکہ تم مجھے کبھی جھوٹ

ہوئی! اور تم بھولی بھی نہیں سچ مچ! کیوں ثریا!"

جب اُس نے مجھے آخری خط لکھا تھا تو میں سوچتی تھی اس کے ساتھ یہ سلسلہ بھی کیسے توڑ دوں؟ میں اب اُس کے لئے کیا ہوں! لیکن صدیق کو اب اور نہیں جینا چاہئے مجھے معلوم نہیں تھا وہ اس قدر یاد آ جائے گا!

"ہاں صدیق میں واقعی تمہیں نہیں بھلا سکی! ایسا کر بھی کیسے سکتی تھی؟"

"ثریا! تمہارے منہ سے یہ بات سن کر کتنی خوشی ہو رہی ہے مجھے! میرے قریب آ جاؤ! لیکن یہ تم نے اپنی آنکھوں کو یہ نقصان پہنچا لیا! ایسی عینک تو تم نے کبھی نہیں لگائی تھی! تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت تھیں!"

"مجھے یاد ہے تم پہلے بھی یہی کہا کرتے تھے! لیکن صدیق!"

"کہو ثریا!"

"کچھ نہیں!"

"ثریا یاد ہے ہم ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے! تم مجھے کِس کرنے کی اجازت بھی دے دیتی تھیں! گالوں پر بھی ہونٹوں پر بھی!"

مجھے سب یاد ہے۔ لیکن اُسے اب دُہرانا نامناسب ہوگا! ایسا کبھی ہو تب بھی تو نامناسب ہی ہوگا! یہ کیسی محبت ہے مجھے! خدایا! پتہ نہیں وہ کیا کیا کیے جا رہا ہے!

"ثریا! آج میرے ہونٹ اتنے زیادہ خشک کیوں ہیں!"

"یہ پیاس تمہیں کہاں سے مل گئی صدیق! ازلی پیاس ہے یہ تو!"

"تم مجھے باتوں میں ٹال رہی ہو! خوبصورت باتوں میں!"

"نہیں ہرگز نہیں!"

"یہ پیاس تم ہی نے مجھے دی ہے! بے شک تم ہی نے تو!"

"یہ سنتے ہوئے کتنا اچھا لگتا ہے! بے حد رومینٹک!"

"تم دنیا کی سب سے اچھی لڑکی تھیں! ہمیشہ اچھی رہی ہو! اب بھی اچھی ہو!"

"لیکن اب تم پینا بند کر دو صدیق! دیکھو میں نے سب ختم کر لی!"

"لیکن ابھی تو میری باقی ہے۔ ذرا میری سگریٹ سلگا دو! خود ہی سلگا کر میرے ہونٹوں میں دے دو!"

"اچھا سلگا دیتی ہوں لیکن تم اب اٹھارہ سال کے بچے تو نہیں ہو! پھر مجھ کو کسی بات کے سلسلے میں ذمہ دار نہیں ہوں گی!"

"تم فکر مت کرو ثریا! میرا خیال ہے میں نے زندگی بھر خود ہی اپنا خیال رکھا ہے اور کسی نے بھی نہیں! آئندہ بھی کر سکتا ہوں!"

"لیکن تم ہمیشہ تو اس قدر نہیں پیا کرتے تھے! صدیق تم دیکھنے میں ایسے نہیں لگے کہ ہمیشہ زیادہ پیا کرتے تھے!"

"میں ہمیشہ تو وارڈ ثریا منیر کے ساتھ پٹنہ یہاں نہیں آتا ہوں! تمہیں یاد ہے ثریا، ہم نے آخری بار لنچ کہاں کھایا تھا؟ یاد کرو ـــ وہ عمر خیام ریسٹوران تھا! اتنے اچھے تھے اور کچھ خوشگوار سی تھی اور ـــ ہمارے ساتھ تمہاری فرینڈ بینا اگروال بھی تو تھی، کتنا اچھا گاتی تھی وہ! مجھے آج بھی اس کے گائے ہوئے گیت یاد ہیں ـــ

سب راہیں تیری جانب جائیں، میں جاؤں کس اور
چاندنی رات ترا ہی مکھ ہے، ترا ہی روپ ہے بھور

"صدیق! ڈیئر صدیق! اس قدر اداس کیوں ہو؟ میں نہیں! ابھی باہر نکال دیا جائے گا!"
اف میں کیا کروں! یہاں میڈیکل کالج کے پروفیسر یا اسٹوڈنٹ بھی تو موجود ہوں!

تو لندن کی اوس میں ڈوبی کر مجھ سے شام ڈھلے
چندا کے زینے سے اترے آدھی رات کا چور

"ثریا ـــ میں کا بھی سنتا ہوں اسے!"

تو سورج کی آنکھ سے جھٹکے پل پل دور کرے
میں اک بیری کی گھال چھایا، میرے اکیس ہو نور!

(ڈائنہ مدینہ قا)

"یاد کرو ثریا! تم اور بینا، جانسے کہری روڈ کے بوسیدہ کوارٹر اور کبھی کبھی کار و ونٹک ایک اور دوں سے چپ! ہم کہاں کہاں نہیں جا کرتے تھے! اس قدر غریب تھے کہ ہم نئی کار نہیں دیکھ سکتے تھے! اچھے اچھے ریستورانوں میں نہیں جا سکتے تھے! موتی محل کا کھانا ہی اکثر میسر آتا تھا ہمیں، ہم چل لیتیں تو بس امرت وان کیوں جاتا رہا۔ تمہیں پکارنے کے لیے! پھر میں نے یہ راستہ دیکھ لیا۔"

صدیق کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے! اس کی ننھی ننھی مونچھوں میں آ رکے۔

"ثریا، تمہارے چلے جانے کے بعد بینا میرا ساتھ دیتی تھی۔ بینا جس نے دراصل تمہاری محبت میرے دل میں گہری کی تھی۔ باتیں سنا سنا کر! تمہارے پیغام دے کر! ہم اس کی موجودگی میں بھی تو محبت کیا کرتے تھے! اس نے کبھی بھی حسد نہیں دکھائی تھی۔ وہ اتنی اچھی لڑکی تھی! پھر وہی میری ہمراز بھی بنی! ہم نے بہت سا وقت ساتھ گزارا! تمہارے چلے جانے کے بعد کئی سال تک ہم یاد کرتے ہوئے! اس میں وہ کتنی خوش تھی، کتنی معصوم! تمہیں کیسے بتاؤں، تم اندازہ نہیں کر سکو گی! اب وہ بھی زندہ نہیں ہے! شاید وہ بھی جا چکی ہے۔ تم تو واپس آ گئی ہو، لیکن وہ کبھی نہیں آئے گی! خدا اس کی روح کو سکون بخشے! وہ بہت اچھی لڑکی تھی! بہت ہی اچھی! تم پھر آ گئی ہو ثریا! میرے ساتھ بیٹھی ہو! چودہ برس کے بعد میرے ہاتھ میں پھر تمہارا ہاتھ ہے! ان لمحات کا انتظار میں نے ہمیشہ کیا ہے۔ بیوی کی میت اٹھا کر! آؤ ایک جام بینا کے نام پر پئیں! بینا اگروال کی یاد میں! خدا اس کی روح کو سکون بخشے!"

معلوم ہوتا ہے انہوں نے بہت اچھا وقت گزارا ہے۔ لیکن میں ابھی کبھی اتنی ہوں جو لڑکی مر چکی ہے اس کے بارے میں ہی نے

...ہ محسوس کر بیٹھی ہوں۔ صدیق کو اب اور نہیں پینی چاہیئے۔ اُسے اب کھانا کھا لینا چاہیئے۔ نہیں تو کچھ ہی دیر بعد وہ میز
کے نیچے لڑھک جائے گا!

"صدیق! ایک بات مانو گے؟"

"ہر بات مانوں گا! کہو ثریا!"

"اب کچھ کھا لو۔ سوا دو ڈھائی بجنے والے ہیں۔ اور مجھے ایک گھنٹے کے بعد میڈیکل کالج بھی پہنچنا ہے!"

"ثریا تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی! آج اتوار ہے ثریا! میں نے گھر پر بھی ایک بوتل رکھی ہوئی ہے۔ میں نے تمہارا فون ملنے
کے بعد ہی سوچا تھا تمہیں گھر لے جاؤں گا۔ وہیں باتیں کریں گے۔ بہت اطمینان سے۔ تنہائی میں۔ وہاں مسز گورونام ہیں۔ اُن
کے بچے ہیں! وہ سب تمہاری منتظر ہوں گی! اس تمام عرصے میں وہ تمہارا انتظار کرتی رہی ہیں۔ میں تب سے انہی کے گھر میں رہ رہا ہوں۔
مسز گورونام کے پاس ایک کیمرہ بھی ہے۔ وہ میرے لئے تمہاری ایک تصویر بھی کھینچیں گی!"

"اوہ خدا!"

"وہ بہت اچھی ہے ثریا! مسز گورونام میرے لئے ایک ماں سے بڑھ کر ہے۔ تم بھی اُسے پسند کرو گی! تمہارے چلے جانے
کے بعد میں اسی قسم کی عورت کے گھر میں سکون پا سکتا تھا۔ وہ تمہارے بارے میں ہر بات جانتی ہے۔ اُس کے سامنے بچے اور بچیاں
بھی ناچتی ہیں۔ ثریا تمہیں معلوم ہے آج مسز گورونام اور ستیندر اور ہیمنت اور من جیت نے کیا کیا؟ تمہیں نہیں بتانا چاہیئے؟ لیکن بتائے
بغیر رہ بھی نہیں سکتا! انہوں نے مجھے سنبھال لیا جب میں تمہاری کال کے بعد مدہوش سا ہو گیا تھا! خوشی سے بالکل پاگل ہی!
اور مجھے پکڑ کر سیڑھیوں سے نیچے لے آئے اور ٹیکسی میں لا کر بٹھا دیا۔ میں اس قدر مدہوش تھا مجھ سے چلنا ہی مشکل ہو گیا تھا، ثریا!"

صدیق خاموش ہوا تو اُسے پھر دورہ پڑ جائے گا! اوہ خدا!

"صدیق! چینی کری کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کچھ بھی منگا لیں؟ اور ہاں یہ بھی! اس کے بعد تم مجھے سب بتانا! تم میرے
بعد بیمار رہتے رہے؟ سیکرٹریٹ میں اب تک کام کیا؟"

"ہاں ابھی تک وہیں ہوں ثریا!"

"ابھی تک!"

"ہاں سترہ سال سے وہیں ہوں۔ اب تو خاصی تنخواہ مل جاتی ہے۔ سات آٹھ سو اب! انہوں نے مجھے افسر بنا ہی دیا ہے!"

"ٹھیک کہا! یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے! لیکن اب تم ذرا میز پر بھی توجہ دو! صدیق! اب زیادہ وقت نہیں ہے ڈیئر!"

"تمہارے پاس کچھ رقم ہے نا ثریا؟"

"ہاں بہت ہے! اس کی فکر مت کرو!"

"اچھا تب میں ایک بہت اچھی چیز کا آرڈر دے دیتا ہوں۔ اس بار میں امپورٹڈ وسکی منگا رہا ہوں۔ میرا [illegible]
[illegible]"

"نہیں نہیں میرے لئے ہرگز نہیں!"

"اچھا اچھا! دونوں میرے لئے ہی بیٹھے رہو! آج میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا دن منا رہا ہوں!"

"میں خاموش کیسے ہو سکتی ہوں! ڈاکٹر ثریا میمن بور ہو رہی ہیں! کچھ نہ کچھ کہتی رہو!"

"اچھا صدیقی بتاؤ، تم شام کو دفتر سے چھٹنے کے بعد کیا کرتے ہو؟"

"کتنا احمقانہ سوال ہے!"

"شام کو ثریا میمن! میں ساڑھے پانچ بجے تک کام کرتا ہوں۔ خوب جم کر۔ دن بھر کاروباری لوگ میرا مغز چاٹا کرتے ہیں۔ اپنے اپنے جھگڑے لے کر میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ اپنے اپنے وکیلوں کو بھی ساتھ لے کر آتے ہیں۔ میں ان کی جواب کو خوب جانتا ہوں۔ ان سے نپٹنا میں خوب آتا ہے مجھے۔ ان کے پاس جھوٹ کتنا ہوتا ہے اور سچ کتنا! اپنے فیصلے لکھ کر میں سیدھے گھر آجاتا ہوں۔ نہاتا ہوں۔ کپڑے بدلتا ہوں۔ ساڑھے چھ سات تک مسز گورودنام اور اس کی بچیوں کے ساتھ گپ لڑاتا ہوں۔ اس کے بعد کلب، کافی ہاؤس یا کسی بار کا رخ کرتا ہوں۔ اس کے بعد نو بجے واپس آجاتا ہوں۔ کیونکہ میرا کھانا نو بجے ہی تیار کیا جاتا ہے۔ مسز گورودنام ایسی عورت ہے! اس نے مجھ سے دو بار اپنی بیٹی سیتا دیوی سے شادی کرنے کے لئے کہا ہے لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ تم سمجھتی ہو! یہ کس قدر مشکل ہے! دو دو تین مسلم گھرانوں سے بھی میرے لئے پیغام لے کر آئی! لیکن بے سود! رات کو میں کمرے میں کتابیں یا اخبار پڑھتا ہوں۔ کافی دیر تک۔ پھر سونے سے پہلے تمہیں یاد کرتا ہوں ثریا! سچ تم ہی کو! تا کہ مجھے نیند بھی آجائے اور خواب میں تم سے ملاقات بھی ہو جائے۔ صبح سات بجے میں پھر اٹھ جاتا ہوں ——!"

میں نے صدیقی کے آگے چکن کی پلیٹ بڑھا دی۔ "وہ اسے کھاتا کیوں نہیں؟"

"مسٹر صدیقی تم سیتا سے شادی کر کیوں نہیں لیتے، جیسا کہ مسز گورودنام کہتی ہیں! دوسرے مذہب میں شادی کرنے سے زندگی میں ایک نئی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی دوسری دنیا میں داخل ہو جائے! میں ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔ دوسرے دین کے کسی آدمی کے ایٹی ٹیوڈ کو اس کے اپنے دین کی جن کے سنسکاروں کی روشنی میں سمجھنا ایک عجیب سا تجربہ ہوتا ہے!"

"اے ثریا! میرے سامنے مذہب کی کوئی دیوار نہیں ہے! لیکن تم مجھے شادی کے لئے اصرار مت کرو۔ آئی ایم سوری۔ میں اب شادی کبھی نہیں کروں گا ثریا! میرے پاس تمہارے کم سات پیغام آ چکے ہیں۔ لیکن یہ بھی مت سوچو کہ میں شادی کر نہیں سکتا! میں سات بار شادی کر سکتا تھا۔ سات بار۔ تم ذرا سوچو! مینا اگروال اور ستیندر کور کے علاوہ مس گرہ کی ڈاکٹر نے مجھے کئی خط لکھے ہیں۔ سال بھر کے بیچ میں دو دو خط! لیکن ان میں کسی کو اب میں اپنے اتنے قریب پھٹکنے نہیں دوں گا کہ مجھے بھی سکھ! میں جانتا ہوں مجھے کیا چاہیے! میں گزشتہ چودہ برس سے اس حقیقت کو جانتا ہوں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اسی لئے اسی لئے ثریا، میں شادی نہیں کروں گا! کبھی نہیں!"

"ہاہا! تم تو مجھ پر ڈورے ڈالنے لگے!"

"ثریا میمن! میں تمہارا دل ہی تو دکھانا چاہتا ہوں! چودہ سال سے اسی کوشش میں تھا۔ ایک دن تمہارا دل ضرور دکھاؤں

جو تم یہاں ہو۔ میرے پاس! اوہ! کاش میں ایسا کر سکتا!"

"صدیق یہ چھری ہاتھ سے رکھ دو!"

ثریا یقین ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے تاکہ آدمی کو اس قدر بے رحم بھی بن جانا پڑتا ہے! اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ جاتا!

"مجھے افسوس ہے ثریا! ثریا! میرے ہونٹ کس قدر خشک ہو گئے پھر! میرے قریب آؤ!"

"ایسے بُرے تو نہ بنو صدیق! تم تو بہت اچھے تھے!"

"میں اپنی زندگی میں کبھی بُرا بن کر نہیں رہا ہوں۔ ثریا یقین کرو! اچھا بننے کے لئے کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا ہے!

اچھا بننے کے لئے کچھ بھی نہیں خرچ کرنا پڑتا! ایسی باتیں جاننے کے لئے آدمی کو کم سے کم ڈاکٹر بننے کی ضرورت

نہیں ہوتی ہے!

"ڈیئر صدیق! لاؤ تمہارا ہاتھ تھام لوں! اس کے بعد میں تمہیں بہت ہی ناقابلِ برداشت بات بتاؤں گی۔ دیکھو صدیق!

میں صرف ایک شادی شدہ عورت ہوں بلکہ ایک بچے کی ماں بھی! لیکن میری زندگی بھی ایک بار نہیں بلکہ دو بار بڑی سخت قسم کی

غلطیوں کا شکار ہو چکی ہے۔ میں موجودہ عمر میں —— جس قسم کے حالات میں رہ رہی ہوں اب کسی کے لئے بھی کوئی اور خطرہ مول

نہیں لے سکتی۔ تمہارے لئے بھی نہیں! پھر سے اپنا سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دوں! یہ نہیں ہو سکتا۔ صدیق سنو! اگر مجھے

دوری کا وہم نہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ گھر ضرور جاتی۔ اب جانا ٹھیک بھی نہیں ہوگا! مجھے ناکامی ہمیشہ آتی ہے! اس کے بعد پھر

ایک اور کل! اور ہم دونوں! افسوس ہے۔ انسان ہی تو ہیں!"

"میں جانتا ہوں ثریا! ایک ہفتہ یا مہینہ بھر کی ملاقاتیں بھی ہمیں مطمئن نہیں کر سکیں گی!"

اوہ خدا!

"ثریا، ثریا میری ڈارلنگ! میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں!"

"ڈاکٹر جو بیماروں کا علاج کرتی ہے اُس کے پاس جواب دینے کے لئے کچھ بھی تو نہیں ہے!

"اب میں کس اور کے لئے زندہ بھی نہیں رہنا چاہتا ہوں ثریا!"

ڈاکٹر جو زخموں کو اچھا کر سکتی ہے، درد کو دور کر سکتی ہے اور مرنے والے کو چپ بھی کرا سکتی ہے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی!

"آج ہم نے کتنا اچھا وقت گزارا ہے! کیوں ثریا!"

"واقعی بہت اچھا وقت گزرا ہے صدیق! لیکن میں تمہارے بارے میں فکر مند ہوں اور میں اپنے وقت کے بارے میں

بھی۔ ڈیئر صدیق، ساڑھے نو بج چکے ہیں!

"ثریا! مجھ پر ایک احسان کرو! میرے ساتھ ایک جام اور پی لو۔ اپنی سائیڈ کار تک ہی! جانے سے پہلے ایک ایک اور ہو جائے!

ویسے ہم پہلے بھی کبھی اسی قسم کا ہلکا پھلکا ڈرنک لیا کرتے تھے! ہم تعداد میں بہت زیادہ نہیں پیتے تھے! صرف ایک ہی تو! تم بھلا

بھولی ہو! لیکن وہی دن اور راتیں میری زندگی کا جزو بن گئے ہیں۔ بہترین یادگاریں! لیکن وہی اب مجھے کتنے دور معلوم ہوتے ہیں!

میوں ٹھیک ! میں حیران رہ جاتا ہوں ——"

" ڈیئر ! ایک سانیٹ کی بات !"

" میری سمجھ میں نہیں آتا میرے دن کس طرح گزر گئے ! میرے پاس زندہ رہنے کے لئے بہی کچھ تھا۔ میں جی سکتا تھا۔ میں نے سخت محنت کی ہے ! نوکری کی ہے اور پیسہ کمایا ہے بینک میں میرے پچیس ہزار جمع ہو چکے ہیں۔ میں نے سوچا تھا اتنے روپے میں ہم کچھ بھی کر سکیں گے ! میں نے ہمیشہ چاہا ہمارے تین بچے ہوں گے ! صرف تین ! میں بچوں سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تم بھی کرتی ہو میں جانتا ہوں۔ یہ بات تم ہی مجھ سے کہا کرتی تھیں ! صرف تین بچے ہی اچھے لوگ سمجھتے ہیں ! تم نے ہمیشہ کہا تھا۔ میں خوش قسمت تھا۔ بیٹے ! میں نے تمہارے بارے میں اس وقت اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا ! اگرچہ اب کام کرنے کے دوران میں ہر لمحے یاد کرتے ہوئے گزارتا ہوں۔ اور میں نے تمہارے علاوہ اور کسی کا خواب بھی نہیں دیکھا ہے ! لوگ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے ! [illegible] بات کس قدر [illegible] معلوم ہوتی ہے بلکہ کبھی شک بھی نہیں ہوا ہے جو چاہتا ہوں اسے حاصل بھی ضرور کروں گا ! میرا اعتقاد اس قدر پختہ تھا۔ میں نے ہر لڑکی کے ساتھ جس سے میں ملا ہوں تمہارا ہی موازنہ کیا ہے۔ دوسری سب بیوقوف ہی معلوم ہوئیں۔ ! وہ میگزین خاتون جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے وہ تو کچھ بھی نہیں ہے ! اس لئے میں نے کبھی صفحہ ہی نہیں دیکھا تب ایک بار میں نے ایک ڈاکٹروں کے میگزین میں تمہارا کوئی آرٹیکل دیکھا تھا۔ اس رسالے کو میں ہمیشہ منگاتا رہا ہوں۔ تب سے چند بھیجتا رہا ہوں۔ لیکن اس کے بعد پھر تمہارا کوئی آرٹیکل نہیں چھپا۔ بلکہ تمہارا آرٹیکل دیکھتے ہی میں نے یہ سمجھ لیا تھا جیسے تم میرے پاس پہنچ گئی ہو ! پھر سے واپس آگئی ہو ! جیسے کسی کبھی سال گزر جانے پر مجھ سے کہا کرتی تھیں ! ایک روز تم ضرور واپس آجاؤ گی ! میں یہاں کے میڈیکل کالج اور اسپتال کی ہر ایک بلڈنگ اور ڈاکٹروں کی طرف ہمیشہ دیکھتا تھا۔ مگر تمہیں کبھی نہیں ثریا ! کیونکہ مجھے یقین تھا میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان جاؤں گا ! میں تمہارا سراپا کبھی بھول نہیں سکتا ! ایک میں سے میں پہچان لوں گا ! اچھا کلاس اسٹاف ڈاکٹر ثریا صدیقی : یہ ہم دونوں کے ناموں کے نام ہے ! جسے ہم کبھی بھول نہیں سکتے ! اور یہ تمہارے مستقبل کے نام بھی ہے ! تم جو میری محبوبہ ہو !"

" میں جانتی ہوں صدیقی ! تم دنیا کے بہادر انسانوں میں سے ہو !"

" جب میری طرف کرو ! اس میں میں بھی اپنا حصہ ادا کروں گا۔ کیونکہ میں ہی سارا وقت انتظار کرتا رہا ہوں۔"

" نہیں صدیقی ! اب نہیں ہو سکتا۔ !"

" اچھا ثریا ! اب چلتے چلتے میں ایک اور بات کہوں ! بس آخری بات ! کہ اس کے بعد میں تمہارے بارے سوچتا ہوں۔ تمہیں یاد کرتا رہوں گا خدا حافظ ڈارلنگ ! مجھے یاد کرنا ! جب کسی تمہیں کوئی تکلیف پہنچے ! میری کبھی ضرورت پڑ جائے ! یا مجھ سے کوئی بات کرنا چاہو ! صدیقی صوفی تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہے گا۔ اور تمہاری کوئی بھی خدمت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہے گا :"

صدیقی ایسا لگ رہا ہے میں کچھ کھو بیٹھی ہوں !

" وہ میں ہی ہوں جسے تم کھو بیٹھی ہو ثریا ! لیکن میں خیریت سے ہوں۔ بھول جاؤ مجھے !

" کیا تم ! ٹھیک ہو ! میرا اندازہ ٹھیک ہو !

"بالکل نہیں! ایک ہندوستانی کا ہی تو ایک فخر ہو سکتا ہے!"
"تھینکس!!"
"اندر چلو صدیقی میں تمہیں راستے میں اتار دوں گی!"
"نہیں ثریا میں تمہارے راستے سے نہیں جا سکتا ہوں! مجھے کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ جلدی کبھی بھی نہیں ہوتی۔ لیکن تمہیں جلدی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ تم ڈاکٹر ثریا مینن ہو جسے مریض بھی دیکھنے ہیں اور کالج میں پیپر بھی پڑھنا ہے!"
"خدا حافظ ڈیئر صدیقی! خدا کے لئے اپنا خیال رکھا کرو!"
"خدا حافظ ثریا!"

گلدانی

اختر جمال

اس روز مینا بازار بہت خوبصورت بنا تھا۔ میدان میں ہر طرف خیموں میں اسٹال لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف کھیل تماشے ہو رہے تھے [illegible] جا سکتا ہے۔ دوسری طرف کشیدہ کاری اور دوسری دلچسپ چیزیں تھیں۔ بیچوں بیچ کھانے پینے کی چیزوں کے اسٹال تھے جن کے آس پاس [illegible] بچھی تھیں۔ ان کرسیوں پر [illegible] اور بچے کھا پی رہے تھے۔ فوجی اور سول افسروں کی بیگمات قیمتی ملبوسات میں خراماں خراماں [illegible] سب سے زیادہ [illegible] وہ [illegible] اور سب سے آخر میں پان کی دکان [illegible] کرتے۔

[illegible] پان کا اسٹال تھا [illegible] سال سے میں [illegible] مینا بازار میں پان کا اسٹال لگا رہی تھی۔ اسی اسٹال پر پان کے علاوہ [illegible] سگریٹ [illegible] سامنے [illegible] ملاقات [illegible] میں جیسے چاٹ [illegible] کے ساتھ [illegible] اسٹال [illegible] کی دکان [illegible] اتفاق سے [illegible] کام کرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتے ـــ اس [illegible] خوبصورت مینا بازار [illegible] خوشحال مست [illegible] کا نام ہوتا۔

[illegible] سامنے ایک [illegible] پر [illegible] پرچ تھا [illegible] کے بڑے بڑے [illegible] پان بنا کر رکھ لیے تھے۔ ایک طرف سادے پان تھے۔ دوسری طرف میٹھے پان تھے خوشبو [illegible] سامنے رکھی تھیں [illegible] ــــ حساب کتاب [illegible] آ کر پان کھاتے تھے اور جب وہ آ کر پان کھاتے تو بڑی خوشی ہوتی [illegible] اسٹال ہے [illegible] ایک چھوٹا سا خوبصورت ہاتھ [illegible] میں سے آگے بڑھا۔ [illegible] کسی دلہن کا ہاتھ تھا میں نے چونک کر [illegible] سیاہ نقاب [illegible] ڈال رکھا تھا۔ [illegible] سرخ سرخ ہونٹ نظر آئے [illegible] اور خوشبوؤں کے [illegible] ایک خوشبو [illegible] چہرہ [illegible] میں نے سوچا [illegible] شاگرد [illegible]

...زلم بیری شاگردہ کی ایسی شخصیت نہیں ہونا چاہیے جو ایک لمحہ کو چکرا دے۔ ایک موٹا سا ادھیڑ عمر کا آدمی اس کے ساتھ تھا۔ گنجا سر کہیں کہیں سفید بال — اس کا چہرہ انتہائی درشت تھا۔ میں نے سوچا اپنی بیاہی بیٹی کو غالباً سیر کرانے لایا ہے۔ ان دونوں کو پان دے کر میں نے ساتھ مڑے ہوئے کینڈٹ کو اشارہ کیا کہ پیسے لے لو۔ اس نے پرس کھولا اور پھر کینڈٹ کی جانب سو کا نوٹ بڑھایا۔ چار آنے کے پان لیے اور سو کا نوٹ! ...ذرا رنت ہوئی۔ اس نے نقاب الٹ دی اور مسکرا کر بولی "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" میں حیران رہ گئی۔ وہ واقعی بہت خوب صورت نظر آ ...تی کینڈٹ بھی متعجب ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ "ارے کلو الی — تم — تم —" اس نے مہندی لگا ہوا ہاتھ بڑے ادب سے اٹھا کر سلام کیا اور پھر مصافحہ کے لیے آگے بڑھایا۔ میں نے حیرانگی کے عالم میں اس کا ننھا سا نرم ہاتھ تھام لیا۔ جو برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا قصہ ہے؟" کلو الی نے میری بات کے جواب میں بڑے فخر سے سو کا نوٹ دوبارہ میری آنکھوں کے سامنے کیا کہ میں اچھی طرح اس ...ٹ سے ریشن کروں۔

کلو الی جسے ابھی پندرہ دن ہوئے میں نے ترس کھا کر کچھ روپے اور پرانے کپڑے دئیے تھے، مجھے بتا رہی تھی کہ میرے پاس بٹوے میں سب ...ٹ سو سو کے ہی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا "یہ پان میری طرف سے کھاؤ تمہارے پانوں کے پیسے تو مجھے خود ہی دینا چاہیے تھے۔"

...ی حیرت دور کرنے کے لیے وہ بولی،

"بیگم صاحب ابھی چند روز ہوئے میری شادی ہو گئی۔"

"ہاں یہ تو میں بھی سوچ رہی ہوں — مگر —" اس نے ساتھ کھڑے ہوئے گنجے موٹے ادھیڑ آدمی کی طرف اشارہ کیا "یہ میرے میاں ...ں" میری حیرت کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس آدمی نے اپنے سخت اور بے انتہا درشت چہرے پر کوئی تاثر پیدا کیے بغیر عجیب طرح ...بہت ہی آواز نکالی۔ "السلام علیکم" — اور پھر جب اس نے دیکھا کہ بہت سے جوان خوبصورت اور منچلے چہرے بڑی دلچسپی سے اس کی نو عمر ...خوبصورت دلہن کو دیکھ رہے ہیں تو اس کی مالکانہ خود غرضی نے درشتی سے پکارا "کلو اب چلو"

شاید وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کا موقع نہ تھا۔

آہستہ سے میرے کان کے پاس چہرہ لا کر بولی "بیگم صاحب کسی دن آؤں گی سب کچھ بتاؤں گی۔"

میں نے صرف یہ پوچھا "خوش ہو —؟"

"ہاں بہت خوش ہوں" میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور سوچا میرے اللہ یہ لڑکی مجھے دریائے حیرت میں غرق کرنے آئی ہے! اس نے ...کندھے سے ہٹایا جلدی سے برقعہ اتار کے اپنے کپڑے دکھائے "یہ کپڑے — یہ زیور — سب انہوں نے دئیے ہیں۔ میں خوش ہوں — بہت ...خوش" اور وہ سلام کر کے چل دی۔

میں پھر پان بنانے لگی اور سوچنے لگی کہ یہ زندگی کی کامیابی ہے یا ٹریجڈی کہ وہ خوش ہے بہت خوش — ! — مجھے وہ دن یاد آیا جب ...دفعہ میرے پاس آئی تھی۔ پھٹے پرانے کپڑے سرسوں کے تیل سے چکڑا ہوا سر۔ کانوں میں پیتل کی بالیاں اور پیر میں ٹوٹی چپل ...پہنی تھی۔ میں دھوپ میں بیٹھی اون کے گولے بنا رہی تھی۔ وہ سامنے کھڑے ہو کر مجھے سلام کیا اور پھر برآمدے میں آ کر زمین پر بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ

اور سے گرد بنائی گئی۔ سارے وقت۔ صبح سے بیٹھی رہی۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ گندمی رنگ۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں جن میں عجیب سا اور درد کا شدید احساس تھا۔ چہرے کے نقوش بہت خوبصورت تھے۔ وہ مجھے اچھی لگی۔ میں نے دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ اتنی پیاری سی لڑکی کی مجھے ضرور مدد کرنی چاہیے۔

گلابی کے بارے میں میں عرصے سے سن رہی تھی۔ اس کی نانی میرے پاس سال بھر سے ملازم تھی۔ وہ کئی دفعہ شروع سے آخر تک اس کی داستان سنا چکی تھی اور ہر دفعہ شاید کوئی نئی بات کہتی۔ گاؤں کے کسی چھوٹے سے اسکول میں استانی کروا دوں اور اسی مقصد کے لیے وہ گلابی کو لائی تھی۔

گلابی کی نانی کو ہم سب مائی کہتے تھے۔ اس کی اسّی سال کی عمر تھی۔ کام کاج تو اس سے ہو نہیں سکتا تھا۔ بس اس کا یہی کام تھا کہ لان میں جب بچے کھیلیں تو اس کی نگرانی کرے کہ وہ سڑک پر نہ نکل جائیں۔ بچے سارے کام مجھے خود ہی کرنے ہوتے تھے مگر اس کے باوجود مائی میرے بڑی ڈھارس تھی۔ یہ بڑی غنیمت تھی کہ وہ پہلے جیسے بچپن میں کولیا نہ چھوڑتی تھی اور اسی لیے میں اسے کو پسند کرتی تھی اور اس کی ساری باتیں برداشت کرتی تھی۔ شاید کو سوچ کر دیتی ہو وہ یہ کہ کر کے لحاف سے کر دب جاتی کہ بچی کی چوٹ لگ گئی ہے۔ بات کا کھانا ہو تو وہ جاتا تھا۔ اسے خود لکھتے ہیں پیسے پڑے جائیں وہ ہمیشہ بیٹھے حال نظر آتی اور جب پوچھو کیسے کیا ہوا تو جواب دیتی کہ بڑھاپے میں۔ :

مائی کے کئی بیٹے تھے جو سب کے سب بڑا ہو کے کٹ گئے۔ اب جو ان کی تنخواہ پر سب جھگڑتے تھے۔ وہ اس سے بچھڑ رہے تھے۔ گلابی اس کی اکلوتی مرحومہ بیٹی کی ایک ہی نشانی تھی۔ اس بچی سے بڑی بیٹی تھی۔ اس نے نوکریاں کر کے گلابی کو پانچ جماعتیں تو خود پڑھایا۔ چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں بہت کم لڑکیاں پڑھا کرتی تھیں۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ گلابی کو کسی نہ کسی دن بڑی ماسٹرنی بنائے گی۔ گاؤں میں بڑی ماسٹرنی کی عزت اور شان دیکھ کر سب سے بڑی یہی معلوم ہوتی تھی کہ گلابی اس منصب تک پہنچ جائے۔ لیکن اس گاؤں کی بڑی ماسٹرنی کے گھر خود بھی نوکری کی تھی۔ مگر اب بڑھاپے میں کام کاج نہ ہو سکتا تھا اس لیے مدت ہوئی وہاں سے نکال دی گئی تھی۔

گلابی جب تک زمین دار کے یہاں رہی گاؤں کے اس چھوٹے سے اسکول میں وہ پڑھی۔ وہ بڑی محنتی تھی۔ سب استانیاں بہت پسند کرتی تھیں۔ کپڑے لتے اور خرچ کے لیے پیسے دیا کرتی تھیں۔ اس وقت کی بات ہے جب وہ چھٹی میں پڑھ رہی تھی کہ ہیڈ مسٹریس نے کہا کہ وہ ان کے گھر رہا کرے اور پڑھائی میں بھی مدد کریں گی اور سب خرچ اٹھائیں گی۔ اس کے بدلے گلابی کو اسکول کے بعد ان کے گھر کا کام کرنا ہوگا۔ گلابی اپنے ماموں پر بوجھ بنی ہوئی تھی گھر جاتی تو سوتیلی ماں چین نہ لینے دیتی۔ نانی اپنی نوکری پر ہوتی اس لیے ہیڈ مسٹریس کی پیشکش اس کے [redacted] کا حل بن گئی اور وہ خوشی خوشی ان کے گھر کام کرنے لگی۔

گلابی دو سال ان کے پاس رہی۔ ان کے کپڑوں پر استری کرتی۔ کھانا پکاتی۔ برتن صاف کرتی۔ گھر کی صفائی اس نے نہیں دو سرے کے ذمے ... محسوس نہ ہونے دی اور ساتھ ہی ساتھ وہ پڑھتی بھی رہی۔ استانی جی کی لڑکیاں اس کے برابر کی تھیں وہ اپنے پرانے کپڑے پہننے کو دیتیں، پرانی کتابیں پڑھنے کو ——— اس طرح وہ آٹھویں جماعت میں آ گئی۔ ہیڈ مسٹریس بیوہ تھیں۔ ان کے گھر میں کوئی بڑا مرد نہ تھا۔ دو لڑکیاں اور دو چھوٹے لڑکے جو گلابی کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔

امتحان قریب آیا تو گلابی کی بدقسمتی بھی سر اٹھائے ساتھ ہوئی۔ ہیڈ مسٹرس کے دیور شہر سے گاؤں آئے۔ وہ لمبے تڑنگے موٹے تازے
تھے گلابی کے ماموؤں کی طرح کرتے پتلون پہنتے تھے، سگریٹ پیتے تھے اور اخبار پڑھتے تھے —— اور جب گلابی وہاں ہوتی تو
وہ بانکے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا کرتے۔ نازک سی دبلی پتلی گلابی انہیں سچ مچ کی ایک خوبصورت گڑیا معلوم ہوتی جسے وہ شہر لے جا کر
سجانے کے خواب دیکھنے لگے۔ گلابی کو آپا جی کے گھر کے سب ہی لوگ اچھے لگتے تھے وہ بھی اچھے لگے۔

ایک دن آپا جی نے شام کو اپنے دیور کے اعزاز میں چند لوگوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ کام بہت تھا اس لیے اس روز گلابی کو اسکول نہیں
بھیجا۔ سب چلے گئے اور وہ باورچی خانے میں کام کرتی رہی — اس روز شہر سے آئے ہوئے صاحب کو اخبار پڑھتے ہوئے اس غریب لڑکی پر بہت
ترس آیا۔ انہوں نے کہا کہ برتن مانجھ مانجھ کر تمہارے خوبصورت ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔ گلابی شرما گئی۔ پھر انہوں نے اخبار رکھ دیا اور اسے
کمرے میں بلایا۔ اس نے راکھ سے بھرے ہوئے ہاتھ بھی اچھی طرح نہ دھوئے اور تیزی سے حکم کی تعمیل میں دوڑی —— کمرے کا دروازہ بند
ہوا اور ایک گلابی چھن سے ٹوٹ گئی۔

جب آپا جی اسکول سے آئیں تو اس نے آپا جی کو رو رو کر داستان سنائی۔ وہ یوں چپ چاپ کھڑی رہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور ان
کے دیور نے کہا کہ وہ گلابی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ آپا جی کے میاں نے بھی اللہ بخشے کئی نکاح کیے تھے۔ یہ ان کا خاندانی دستور تھا۔ اس بے
زبان بچی نہ بول سکی۔ اسی روز اس کی نانی کو بلوا کر کہا کہ دیور سے نکاح کر دو۔ نانی نے رو رو کر کہا کہ وہ تو بال بچوں والے آدمی ہیں اور پھر گلابی ابھی چھوٹی
ہے اور وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ آپا جی یہ بات پی گئیں۔ وہ بال بچوں والے ہیں تو کیا ہوا، ایک بیوی شہر میں رہتی ہے ایک گاؤں
میں رہے گی۔ خرچ دیں گے۔ نانی کی بات پیچھے رہ گئی وہ گلابی کو ساتھ لے کر آ گئی۔ آٹھویں جماعت کا امتحان قریب تھا۔ آپا جی کو خطرہ تھا کہ اسکول
میں معلوم نہ ہو۔ اس لیے گلابی نے امتحان نہیں دیا اور گھر بیٹھ رہی۔

ان ہی دنوں یہ خوبصورت سی آٹھویں میں پڑھنے والی لڑکی گاؤں بھر کا موضوع بن گئی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ نانی نے سوچا کہ
اب اس کی شادی ہی کر دینی چاہیے۔ ان کے رشتہ داروں میں ایک لڑکا تھا۔ بھولا بھالا سا گبرو جوان۔ اس کا رویہ نانی کا اچھا ہو گیا تھا۔ گلابی نے
بھی اسے دور سے دیکھ کر پسند کر لیا تھا۔ اور اس کی بہنوں کی باتوں کو بات کہا کرنے لگی تھی۔ ایک دفعہ ہل چلاتے چلاتے تھک کر جب وہ گلابی کے
گھر پانی پینے آیا تو اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے، گریبان کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس کے
ہونٹوں اور آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ اور گلابی نے پانی کی بجائے جلدی سے لسی کا کٹورا بھر کر اسے دیا تھا۔ اس بات پر بعد میں نانی بہت خفا ہوئی
تھی اور اس نے چلا چلا کر کہا تھا کہ سوتیلی ماں کے کتنے ظالم ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ گھر پر نہیں رکھتی یہ گھر کی بربادی کی دشمن ہے۔ اس روز نانی بھی گھر پر
نہیں تھی گلابی صحن میں شکر اطمینان سے مسکراتی رہی اسے معلوم تھا نانی کی موجودگی میں اس کی پٹائی نہیں ہوگی —— یہ بات سلمان کو سب گھر
والوں نے پسند کر لیا۔ گلابی کا بیاہ ہو گیا اور وہ سسرال چلی گئی۔

سال بھی نہ گزرا تھا کہ گلابی گھر لوٹ آئی۔ اس نے کہا کہ اس کی ساس تو سوتیلی ماں سے بھی زیادہ ظالم ہے اور اس کے علاوہ سب سے بڑا رنج
اس بات کا تھا کہ وہ تو آٹھ جماعتیں پڑھی ہوئی ہے اور اس کا میاں اپنا نام لکھنا بھی نہیں جانتا۔ وہ تو بس ایک سیدھا سادھا سا انسان تھا۔ جسے اپنی
فصل اور مویشیوں کے علاوہ دنیا کی کوئی بات بھی نہیں معلوم۔ ایک دفعہ گلابی نے اسے مرعوب کرنے کے لیے اپنی ساتویں جماعت کی تاریخ کی کتاب

میں سے نورجہاں کا قصہ سنانا شروع کیا، تو اس نے چپ سادھ کر جز بز ہو کر رو دیا اور کہا جھوٹ بات ہے نورجہاں اس کی گلابی سے زیادہ خوبصورت اور سمجھدار نہیں ہو سکتی تھی؟ اس عمر تو گلابی نرمیس آگئی۔ مگر رفتہ رفتہ اسے یقین ہو گیا کہ سلمان شاید سچ ہی کہتا ہے۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس سے بہت اونچی ہے بہت زیادہ جانتی ہے۔ وہ اسے دن بدن بیوقوف معلوم ہونے لگا اور برا لگنے لگا۔ آٹھ جماعتیں پڑھ کر اس کا دماغ خراب ہو گیا۔ جب ساس اسے ککڑیاں کاٹ کر دینے کو کہتی تو وہ آگ بگولا ہو جاتی۔ آٹھ جماعتیں پڑھ کر میری قسمت میں ککڑیاں کاٹنا ہی لکھا ہے … اس بات پر اس قدر ساس بہو میں جھگڑا ہوتا کہ ساس مارتی اور کوستی۔ اور گلابی چلا چلا کر روتی۔

سلمان شام کو جب مال مویشی سے گھر آتا تو گلابی منہ بسورے ایک طرف پڑی ہوتی۔ آخر ککڑیاں کاٹنا اور پانی بھرنا یہ کونسا برا کام ہے سب ہی گاؤں کی عورتیں پانی بھرتی ہیں اور ککڑیاں تو مرد بھی کاٹتے ہیں۔ عورتوں کو تو گھر کا کام لازمی پڑتا ہے۔ ماں اتنی بوڑھی ہے گھٹنوں کے درد سے اٹھا نہیں جاتا ہے سامنے ہی تو چارپائی ہے ——— اور پنگھٹ بھی گھر سے زیادہ دور نہیں۔ بڑی نواب زادی بنتی ہے۔ ماں کا ہاتھ نہ بٹانے پر سلمان بھی بگڑتا ہوا … روز روز کی روٹی لسی اور ساگ پر بھی وہ چڑ جاتی اور کہتی مجھے سکول میں کھانا پکانا بھی سکھایا گیا ہے میں کوئی حلوہ۔ قورمہ اور زردہ سب کچھ پکانا جانتی ہوں مگر تیرے گھر نہ کچھ کھانے کو ہے نہ پکانے کو۔ میں آپا جی کے گھر کتنے مزے مزے کی چیزیں پکایا کرتی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ مجھ کو اپنی بیٹیوں کی طرح … مجھے بھی دیا۔ مگر اب میرے نصیب میں دونوں وقت یہ روز کی روٹی اور ساگ ہی ہے۔

ایک دفعہ سلمان کو بہت غصہ آ گیا اس نے خوب مار پیٹ کی اور گلابی نے خوب زبان چلائی اور اس روز سلمان کا بھی ہاتھ اٹھ گیا اس نے گلابی کو خوب مارا۔ گلابی بہت دیر تک روتی پیٹتی رہی پھر اپنے کپڑوں کی پوٹلی جوڑے اور آٹھویں جماعت کی کتابوں کی ایک پوٹلی باندھ اور سسر سے بغیر کچھ کہے سنے گھر چلی گئی۔

دوسرے روز … شام کو جب وہ کھیت سے لوٹا تو … گلابی کے بغیر گھر بہت سونا لگا۔ اس نے ایک نوالا بھی … جلا ہوا … ہمیشہ کا اجالا … بغیر سلمان کو ہر طرف اندھیرا نظر آنے لگا … جیسے … نورجہاں کھو … !

گلابی نے … اپنا سامان کھول دیا اور ماں باپ نے … کبھی ایک کے گھر رہتی کبھی دوسری کے … بھی اس غریب کو … ان گھر والوں کی خاطر سب … مگر اس کے دکھوں کا علاج کوئی نہ تھا۔

سلمان کئی دفعہ گلابی کے گھر آیا وہ ہر بار آکر رو دیا۔ مگر گلابی نے صاف کہہ دیا کہ میں آٹھ جماعتیں پڑھی ہوئی ہوں۔ میرا اس گاؤں میں نباہ نہیں ہے۔ اب میں اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔ مال مویشی … ککڑیاں کاٹنا اور پانی بھرنا میرے بس کا روگ نہیں۔

سلمان نے رو رو کر کہا کہ آئندہ وہ اس سے کوئی کام نہیں کرائے گا خود سارے کام کرے گا مگر گلابی جب دور دراز … یاد کرتی جہاں اس کا سسرال کا گھر تھا تو اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ اپنی ساس کی بک بک جھک جھک اور سلمان کی بیوقوفی کی باتیں … آپا جی کے … بہت سے لوگوں کو دیکھا تھا کوٹ پتلون پہنے اخبار پڑھتے ہوئے سگریٹ پیتے ہوئے۔ انگریزی بولتے ہوئے

شوہر کا تصور ہمیشہ اسی روپ میں اس کے سامنے آیا تھا۔ مگر سلمان — ! مال مویشی — فصل کے علاوہ اس کے پاس کوئی بات نہیں تھی۔ گاؤں کی دو لڑکیاں نویں پاس کر کے پرائمری میں استانیاں بن گئی تھیں۔ گلابی نے سوچا کہ وہ بھی کسی نہ کسی طرح استانی بنے گی امتحان نہیں دیا تو کیا ہوا۔ آٹھ پڑھی تو پوری آٹھ جماعتیں ہیں۔ وہ ہرگز سلمان کے گھر نہیں جائے گی اور اس نے نانی سے فریاد کی کہ وہ اسے طلاق دلوا دے — ! نانی طلاق کے خلاف تھی مگر نانی جب بستر پر وہ واپس آئی تو گلابی نے رو دھو کر اپنے باپ کو راضی کر لیا اور اس نے سلمان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا — اور طلاق کا مطالبہ کیا — بہت لمبے چوڑے جھگڑے قصے چلتے رہے — آخر اسے طلاق ہو گئی !

اس کی نانی کا کہنا تھا کہ جس روز سلمان نے طلاق کا کاغذ ہاتھ میں دیا وہ سر جھکائے دیر تک ان کے دروازے کے آگے روتا رہا —— مگر مغرور اور سنگدل گلابی کا ذرا بھی دل نہ پسیجا۔ !

یہ تمام قصہ سن کر جانے کیوں مجھے گلابی سے زیادہ ہمدردی سلمان کے ساتھ ہوئی مجھے گلابی پر سخت غصہ آیا۔ خواہ مخواہ یہ گاؤں میں اسکول کھولے جا رہے ہیں اور لڑکیوں کو پڑھایا جا رہا ہے یہ ادھر کی رہیں گی نہ اُدھر کی — وہی مثل دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ — ! آٹھ جماعتیں پڑھ لیں تو آخر کیا تیر مار لیا؟ گاؤں کی زندگی کیسی اچھی ہوتی ہے فلموں میں کیسی خوش خوش لڑکیاں پانی بھر کر لاتی ہیں۔ گاتی ناچتی رنگ برنگے کپڑے پہنے گھڑے کاندھے اور سر پہ رکھے — زیادہ تر گاؤں سے متعلق فلمیں شروع ہی پنگھٹ سے ہوتی ہیں۔ سارے عشق پنگھٹ پر ہوتے ہیں اور یہ دیوانی لڑکی اسے گھڑا ہاتھ میں لینا عار معلوم ہوا۔ مال مویشی چرانے میں اس کی ہتک ہے۔ آپا جی کے گھر کا کام کاج کرنے اور ان کے برتن مانجھنے سے تو ایک محنتی اور محبت کرنے والے آدمی کی بیوی بن کر رہنا لاکھ درجے اچھا تھا۔ پھر بڑھیا ساس آخر کہاں تک جیتی۔ اگر وہ زہری تھی تو گزارا کر لیتی۔ اس کی بیٹیا جب اس کی زبانی سنی تب بھی مجھے اس سے کوئی خاص ہمدردی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا 'کاش تم طلاق کرانے سے پہلے میرے پاس آتیں تو میں اس پاگل لڑکی کو سمجھاتی اب میں کیا کر سکتی ہوں' میں نے اس لڑکی سے کہا کہ 'دیوانی اتنی محبت کرنے والا شوہر تو بیانہ ضروری ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں پھر مل جائے؟ تو نے بہت غلطی کی — آخر گاؤں کی سب ہی لڑکیاں یہ کام کرتی ہیں۔ تمہیں بھی کرنا چاہیے تھا۔

گلابی میرے سامنے اون کے گولے بنا رہی تھی — وہ میری بات کے جواب میں پھر بولی 'بیگم صاحب اُسے اپنا نام لکھنا بھی نہیں آتا تھا ہم نے سکھایا ہوتا — جو کچھ اُسے نہ آتا تھا انہیں آتا تھا۔ اس لیے ہنسی خوشی مل جل کر زندگی گزار رہی تھی۔

گلابی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ 'اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب آپ مجھے کسی چھوٹے سے اسکول میں استانی کرا دیں — یا پھر چپراسن ہی رکھ لیجیے —' وہ رونے لگی۔

کئی جگہ درخواستیں دی ہیں کچھ بھی نہ ہوا سب یہی کہتے ہیں کہ آٹھویں کا سرٹیفکیٹ لاؤ — میں نے امتحان نہیں دیا تھا۔ میں نے اُسے سادہ سا ایک کاغذ اور قلم دیا کہ اردو میں صاف ستھری اچھی سی درخواست لکھ کر دو اس نے درخواست لکھی — بڑی دیر میں — ! میں نے جب درخواست دیکھی تو اس میں املا کی بے شمار غلطیاں تھیں اور اس کا خط بہت ہی برا تھا کہ پڑھنا بھی مشکل تھا۔ مجھے صدمہ سا ہوا اس پڑھائی پہ پڑھائی کا حال اتنا خراب ہو گیا — میں نے بہر حال مدد کا وعدہ کر کے اسے رخصت کیا۔

پھر وہ اکثر تیسرے چوتھے روز میرے پاس آتی میں نے اس کی ملازمت کی ادھر اُدھر کوشش بھی کی مگر مشکل یہ تھی کہ سرٹیفکیٹ بھی نہ تھا

کسی پرائیویٹ اسکول میں جگہ ملنی مشکل تھی۔ چپراسن کی جگہ کسی اسکول یا کالج میں خالی نہ تھی۔ بہت دور کے کسی پہاڑی علاقے میں تن تنہا جاکر رہنا اس کے لیے مشکل تھا۔ مجھے اس کے مسئلے کا ایک ہی حل نظر آیا کہ پھر کسی غریب لیکن شریف لڑکے سے اس کا بیاہ ہو جائے —! مگر وہ رو رو کر کہتی۔ مجھے تو بچپن سے اسکول میں استانی بننے کا شوق تھا اور آپا بھی مجھے استانی بنا دیکھتیں — کوئی ڈھنگ کا رشتہ نظر میں بھی نہ تھا۔ سوتیلی ماں کو پیٹ کے لیے بیٹی اور سوتیلی بہنیں، اسے پاس رکھنا چاہتی تھیں۔ بیچاری نے اپنی دنیا خود تباہ کر لی تھی —! اور اب کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں نے بیگم سے کہا کہ یکہ و تنہا ساتھ کہاں گئی تھی کہنا تھا کہ گاؤں کی بات آپ نہیں جانتے یہاں کی بڑی اونچی اونچی ذاتیں ہوتی ہیں وہاں سب باتیں کی باتیں ہیں جائیں گی پھر مشہور ہو گئی اب سوتے ہوئے سب پیچھے کے مد کے اور کوئی مدد نہیں کی جا سکتی تھی —!

میں کیا نہ سمجھا۔ بات اس کی دوستی کا سا تھا اس میں نے اپنی سب جاننے والیوں کے ذریعہ کوشش کی مگر اس کے لیے کوئی بہتر ... اور ان دنوں کسی نے کہا تھا کہ آج کل کی زیادہ سے سے زنانہ پولیس کے محکمہ میں جگہ مل سکتی ہے۔ یہ کام بھی اس کے لیے مجھے خوب تھا کیونکہ اس میں بھی کسی دور دراز دیہات جا کر تنہا رہ کر کام کرنا تھا :

ان دنوں میں اس کے لیے ادھر ادھر کوشش کر رہی تھی کہ وہ مجھے مینا بازار میں مل گئی —! اور اب وہ خوش ہے۔ اس نے اس بڑے گھر سونے آدمی کو جو کوٹ پتلون پہنتا ہے، اخبار پڑھتا ہے سلمان پر ترجیح دی ہے۔ اس لیے کہ اس نے اسے اچھے کپڑے زیور اور آرائش سب چیزیں مہیا کر دی ہیں۔ اس گیہوے ہوئے وحشت چہرے والے آدمی کے خیال سے ہی مجھے کوفت ہوتی تھی — اور میرا بس چلتا تو اسی وقت گاڑی میں دلہن کے سارے میسے بند کرا دیتی کم بخت ان زیوروں سے تو اس آدمی کی مار ہی اچھی تھی۔

مینا بازار سے واپسی پر جب میں نے گھر والی کو ملی کو اس کے متعلق بتایا تو وہ حیران اور پریشان اسی وقت چھٹی لے کر گاؤں گئی اور دوسرے دن صبح سویرے روتی ہوئی واپس آئی۔ اس نے اماں کو خوب گالیاں سنائیں۔ پانچ سو سا پڑھوایا لکھوایا تو نانی نے اور باپ نے چپکے سے دو سو ساٹھ میں اس کا سودا کر لیا۔ سوتیلی ماں بڑی چالاک ہے۔ اور بچاری وہ اسے بھی بہلا پھسلا رہی —— اور سلمان کو یاد کرتی رہی "کیسا سونا کھرا جوان تھا" کا خدا ملا کر دیا تو ہوتے آتے سارے دو ہزار کی مد کا تار یا — نئے خاوند سے متعلق اس نے سنا تھا کسی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ بڑی تنخواہ ہے ان سب باتوں کے باوجود اس کی ہمدردیاں ہی سلمان کے ساتھ تھیں :

کئی ماہ گزر گئے ایک شادی کی تقریب میں اتفاق سے پھر گلوری نظر پڑی۔ خوب بھڑکیلے کپڑے —— پوری دلہن بنی ہوئی چہکتی پھرتی لپ اسٹک، عطر ایسے والی خوشبو۔ اس کے ساتھ ایک بے ہیبا دار والی دبلی پتلی ادھیڑ عمر کی خاتون بھی تھیں۔ انہوں نے سیدھے سادے کپڑے پہنے تھے۔ کوئی زیور نہ تھا۔ ہونٹوں پر البتہ ہلکی سی لپ اسٹک تھی۔ وہ بہت کمزور دبلی اور زرد رنگ کی تھیں۔ چہرے پر روحانی اذیت کی چھاپ تھی۔ گلوری آگے بڑھ کر سلام کرکے ہنسی پھر بولی: بیگم صاحب یہ میری آپا ہیں —— میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا قصہ ہے وہ بولی میرے پاس ہی بیٹھ گئیں گلوری غائب ہو گئی۔ میری بہت تعریف کر رہی تھی۔ اس بیچاری کا خلوص تھا ورنہ میں تو اس کے لیے کچھ نہ کر سکی تھی اب خواہ مخواہ جب وہ بہت ہنستی ہے تو میں اس کے دل کی حالت میں جانتی ہوں۔ میرا بس نہیں چل رہا کہ ایک بار اس کی اور طلاق کرا کے سے نکاح پڑھوا دوں۔ خاتون نے بات کی ابھی بڑی دنیا ہے رنگا رنگ لوگ ہیں۔ ان کے قصے کو نہ کیسے بدل سکتے ہیں —! بس گزرتی ہے گلوری واپس دیکھنے وہ سب کہہ دیں ... تو میں چونکی کہ ادھیڑ خاتون اپنے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ان کے بچے ہیں، شوہر کسی نرس کے چکر میں تھے وہ

چلبلی اور چالاک ہے۔ اس لیے اس کے چکر سے نکالنے کے لیے انہوں نے سوچا کہ کسی غریب سیدھی سادھی لڑکی سے ان کی شادی کرا دوں۔ ان کی یہ سکیم کامیاب ہو گئی۔ اس لڑکی کو پا کر وہ اس نرس کو بھول گئے ہیں۔ اگر اس نرس سے شادی کر لیتے تو وہ تو ایسی تھی کہ انہیں اور بچوں کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتی۔ یہ سیدھی سادھی لڑکی ہے۔ سوچا بڑھاپے میں اب اس سے زیادہ کی ہوس کیا کریں گے —— اس لڑکی کے باپ نے دو سو روپے لیے ہیں چلو اچھا ہے یہ لڑکی خدمت گزار معلوم ہوتی ہے —— دن گزر جائیں گے۔" وہ جب سب کچھ سنا چکیں تو میں نے کہا "لیکن آخر آپ کی اور بچوں کی موجودگی میں آپ کے شوہر کو کیا سوجھی ——؟" وہ بڑی سلجھی ہوئی خاتون تھیں اور بہت مخلص اور صاف گو کہنے لگیں کہ "وہ ہمیشہ سے رنگین مزاج رہے ہیں۔ جوں جوں ایسا مرد بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس کی ہوس بڑھتی جاتی ہے اور میری صحت اب اس قابل نہیں رہی کہ انہیں خوش رکھوں۔ اس سوکھے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے میں اب کیا رکھا ہے۔" ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ مجھے ان پر بہت ترس آیا۔ بیچاری نے شوہر کی بد چلنی کا علاج گاؤں کی سیدھی سادھی لڑکی سے بیاہ کر کے کیا ہے۔

اس خوبصورت پہاڑی مقام سے ہمارا تبادلہ ہو گیا۔ دو برس گزر چکے تھے۔ میں گلدانی اور اس کی نانی دونوں کو تقریباً بھول چکی تھی ایک دن راجہ بازار میں خرید و فروخت کر رہی تھی کہ ایک سفید بالوں والی سنجیدہ سی خاتون نے مجھے متوجہ کر لیا۔ وہ دکان دار کو گھر پر بنائے ہوئے کروشیا کے میز پوش وغیرہ دے رہی تھیں اور دکاندار ان کے لیے دھاگا تول رہا تھا کچھ آرڈر سمجھا رہا تھا۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ بھی مجھے پہچان گئیں۔

"آپ —— ؟" میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر ان کے میاں کمپنی میں اچھے خاصے عہدے پر تھے کمپنی کی موٹر بھی ملی ہوئی تھی اور اب اس حال میں —— وہ میری حیرت دیکھ کر آہستہ سے بولیں: "گلدانی نے خدا جانے میرے میاں پر کیا جادو کر دیا ہے۔ انہوں نے ہم سب کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اب میں یہاں اپنے بھائی کے گھر رہتی ہوں۔ آج کل مہنگائی کا زمانہ ہے بھائی بھی بال بچوں والے آدمی ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ گزر بسر کتنی مشکل ہے۔ بشارت تو کالج میں پڑھتا ہے۔ دن میں ملازمت کرتا ہے معمولی سی تنخواہ ہے۔ لڑکیاں کروشیا کا کام کر لیتی ہیں —— اب میں اپنی داستان کیا سناؤں" پانی کے بہت سے قطرے آنکھوں سے ایک ساتھ چھلکے اور کروشیا کے میز پوش میں جذب ہو گئے۔ نقاب سے آنسو پونچھ کر بولیں "گلدانی کو تو اب آپ پہچان بھی نہ سکیں گی۔ وہ بالکل بدل گئی ہے۔ وہ نرس جس کے سائے سے میں اپنے میاں کو بچا رہی تھی۔ گلدانی نے اس نرس سے خوب دوستی گانٹھی ہے۔ اس سے انگریزی بولنا سیکھتی ہے۔ انگریزی ناچ بھی سیکھ رہی ہے —— گلدانی نے اپنے بال کٹا لیے ہیں۔ بغیر آستین کا بلاؤز پہنتی ہے ساڑھی باندھتی ہے اور کلب بھی جاتی ہے —— دو بچے ہیں ان کے لیے آیا رکھی ہے اور وہ دونوں میاں بیوی بڑے فخر سے لیے پھرتے ہیں۔ میاں کو تو اس موئی نرس کے ساتھ تاش میں لگا دیتی ہے اور خود نوجوان افسروں کے ساتھ ناچتی ہے اس کی ایک مٹھی میں میرے میاں ہیں اور دوسری مٹھی میں وہ نرس ——!

"اوہ —" میں گم سم ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسی وقت دکان میں بہت سی عورتیں آ گئیں میں نے کچھ بولنا چاہا مگر عورتوں کے آتے ہی وہ خاتون نقاب گرا کر خاموشی سے دکان سے نکل گئیں۔

وہ گلدانی جس کے متعلق میں سوچا کرتی تھی کہ ان کے میاں سے طلاق دلوا کر کسی مسلمان سے شادی کر دی جائے ! اب خوب اونچی

اُف یہ بے بسی، نہ جانے ابھی اس کی قسمت میں کیا کیا لکھا ہے!

شاید وہ دوسری دفعہ جاپانی سے کرائے۔ جب شادی کرے گی تو کسی نوجوان اور خوبصورت افسر سے کرے گی جس کے ساتھ نباہ اسے پسند ہو گا۔

اس واقعہ کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک دن اخبار کے ایک حصہ پر نظر پڑی تو سہم کر رہ گئیں۔

تبدیلی نام کا ایک اشتہار تھا: میں نے اپنا پرانا نام گلدانی تبدیل کر کے نور جہاں بیگم رکھ لیا ہے۔ آئندہ سے یہی میرا اصلی اور قانونی نام ہے: سابق گلدانی حال نور جہاں بیگم۔

پیوند

نوید انجم

ماں جی نے کمرے کے ادھ کھلے پٹ کی طرف دیکھا تو بوڑھی آنکھوں میں کچھ اور بڑھاپا تیر گیا۔ سفید موتی پلکوں کی چھاؤں تلے دو ننھے سے آنسو تھوڑی دیر کے لیے رکے اور پھر موتیوں کی طرح لڑھک کر نیچے گر گئے۔

وہ کمرہ اب خالی تھا!

وہ بھرا بھرا کمرہ جو سامان سے پٹا تھا اب بالکل خالی تھا۔ ماں جی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا، فرش پر دھول تھی جس پہ بہت سے نشان سر اٹھا اٹھا کر انھیں تکنے لگے، چھوٹے بڑے ٹیڑھے میڑھے۔ آڑے ترچھے پیروں کے نشان جو ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ ماں جی کے دل میں کلبلاتی ہوئی یادوں کی طرح ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے قدموں کے نشان۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کمرے میں یہ سر اٹھاتے ہوئے نشان نہ تھے۔ یہاں تو سامان ہی سامان تھا لیکن اب یہاں سے آ کر جانے والوں کے قدموں کے سوا یہاں اور کچھ نہ تھا اور یہ نشان بھی باقی نہ رہتے اگر یہاں دھول نہ پڑی ہوتی۔۔

سامنے دیواروں پہ الماریوں پہ ہر جگہ پہ دھول تھی، مکڑیوں کے جالے تھے اور ماں جی کا دل بھی ویران تھا۔ نڈھال ہو کر وہ وہیں دہلیز پہ بیٹھ گئی۔ سر جھکا کر اس نے پلو سے اپنی ویران آنکھوں کو پونچھا۔

ماں جی کی آنکھوں کے کونوں میں جھریوں کا جال سا بچھ رہا تھا۔ آنکھوں میں سے آنسو چہرے کی چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں سے ہو کر بہنے لگے تھے اور وہ بار بار اپنے نچلے ہونٹ کو سامنے کے ٹوٹے ہوئے دانت سے دبا کر رہ جاتی تھی۔

ماں جی نے ایک بار سر اٹھا کر برآمدے کی طرف دیکھا دھوپ دیوار تک پھیل ہوئی تھی اور پھر نظریں صحن کی طرف اٹھ گئیں جہاں ڈیوڑھی کے بائیں طرف دیوار کے پاس سفید گلاب کی ایک بیل اوپر چڑھ رہی تھی۔ اس بیل پہ اب کوئی پھول نہ تھا اور پتے پیلے پیلے مرجھے تھے۔

سر جھکا کر ماں جی نے ایک آہ بھری اور فرش پر ایک چھوٹی سی لکیر کھینچی۔ پھر ایک ذرا بڑی اور پھر تیسری لکیر جو ان دونوں لکیروں سے بڑی تھی اور صاف تھی۔ ڈبڈبائی نظروں سے ان لکیروں کو دیکھا تو جیسے وہ تینوں جاگ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور مسل باندھے انھیں گھورنے لگیں۔ وہ تینوں لکیریں جیسے اپنے چھوٹے چھوٹے سر اٹھا کر انھیں تکے جا رہی تھیں۔ ایک دو تین!

ماں جی نے زیر لب انھیں گنا — وہ جو تین پھنکارتے ہوئے پھن ان کی طرف بڑھ رہے تھے!!

انھوں نے جلدی سے پھر اپنی آنکھوں کو پونچھا اور وہ پھر دھول میں کھینچی گئی تینوں لکیروں کا روپ دھار گئیں۔

تو یہ بھرا بھرا کمرہ بھی خالی ہو گیا۔ اس نے پلکیں جھپک کر سوچا، اور اب رونے کا فائدہ؟ باقی کیا رہ گیا ہے سوائے

اس دھول کے اور دھول پر تو کتنے ہی پیروں کے نشان ہیں — ایسے کتنے ہی یادوں کے سلسلے اس کے بوڑھے دل پر تھرتھرا رہے ہیں۔ سردی میں دھوپ کی کرنیں کتنی کمزور اور کانپتی ہوئی لگتی ہیں لیکن دل کے سرد ویرانے میں یادوں کی یہ دھوپ تو بڑی تیز ہے —— یہ کمزور کہاں ہے! وہ خود کو ان ماتمی یادوں کے شکنجے میں محسوس کر کے کانپی —— وہ تنہا رہ گئی ہے اور اپنی یادوں کی زد میں ہے وہ ان سے بچ کر کہاں جا سکتی ہے!

وہ اٹھ کر کمرے کے اندر آ گئی۔ سامنے دیواروں پہ لگے جالوں میں ابھی تک مکڑیاں اپنے شکار کی تاک میں لگی ہیں۔ کتنے جالے ٹوٹ کر لٹک رہے ہیں اور کتنی ایک کو مکڑیاں چھوڑ چلی گئی ہیں پر ابھی تک ان کے شکار کے ادھ کھائے جسم اور پر تاروں میں الجھے پھنسے پڑے ہیں۔ اس نے سامنے دیوار پر لگی الماری کے پٹ پر ہولے سے پھونک ماری دھول اڑ کر اس کے چہرے پر آ لگی اور جھریوں میں موجود نمی میں جذب ہو گئی۔ الماری کھول کر اس نے دیکھا۔ خالی ہی تو ہے کچھ بھی تو نہیں سوائے ردی کاغذوں اور گردے کے۔ اس نے طاق پر سے ردی کھینچ کر نیچے فرش پر ڈال دی اور پھر لکڑی کا ایک ٹکڑا نیچے گرا۔ جھک کر اس نے اسے اٹھایا —— یہ —— یہ کیا ہے —— اور پھر سوچنے کے ساتھ ہی یادیں جیسے کلبلا سی اٹھیں۔ پانی کی سطح پر چھپاکا تو لہریں پھیلتی ہیں۔ اس نے تھرتھراتے ہاتھوں سے اپنے دوپٹے سے اسے صاف کیا ——

یہ لکڑی کا ایک کھلونا تھا۔ لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی سی چڑیا جس کے رنگ مٹ رہے تھے۔ یہ چڑیا جب نئی تھی تو کتنی خوبصورت نظر آتی تھی۔ رنگ برنگی چڑیا۔ یہ کھلونا جب منی کے ہاتھ میں آیا تھا تو وہ اچھل اچھل کر چیختی پھری تھی۔ "آپا جی میری چڑیا کتنی سوہنی ہے کتنی اچھی ہے!!"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے پیار سے کھلونے پر سے مٹی پھونک مار مار کر اڑائی، ہر پھونک کے ساتھ تھوڑی سی مٹی اڑ جاتی۔ یادوں پر بھی جو وقت کی گرد جمی تو دھیرے دھیرے اترتی ہے!

بھیگی آنکھیں پونچھ کر اس نے دیوار میں لگی دوسری الماری کے پٹ کھولے تو پھر گرد کی دھمک سی اٹھ کر اس پر آ پڑی۔ پٹ کھلے تو دیکھی یہ کیا اوپر کے خانے میں ایک ڈبہ پڑا ہے —— "یہ سفید ڈبہ رہ گیا!" اس کے منہ سے آہستہ سے نکلا اور جلدی سے اسے اٹھا لیا۔

پھونک مار کر اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اسے پونچھا اور کھولا۔ تو وہ اسے یہیں چھوڑ گئے، بھول گئے ہیں — کتنے پیلے سینڈل ہیں اور کتنے ارمانوں کے ساتھ خریدے گئے تھے۔

دونوں کے چمڑے پر جگہ جگہ پھپھوندی اور بھی گہری ہو گئی تھیں۔ الماری کے پٹ کھلے چھوڑ کر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے میں سے نکل کر برآمدے میں پڑی چارپائی پر آ بیٹھی۔ سینڈل ایک طرف رکھ کر چڑیا کو اپنے دوپٹے کے ایک کونے سے صاف کرنے لگی۔ غور سے دیکھنے لگی۔ چونچ ٹوٹ چکی تھی اور اصل رنگ کوشش کے باوجود یاد نہ آ سکتے تھے۔

لیکن منی تو اپنے آپ یاد آ رہی تھی۔ اتنی بڑی بڑی آنکھیں تھیں کہ جو دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ اللہ بخشے آپا صفیہ تو کہا کرتی تھیں: "خیر سے سارے خاندان میں اتنی خوبصورت آنکھیں کسی کی نہیں۔"

سارے برآمدے میں وہ اپنے کھلونوں میں کھلونا بنی شور مچاتی پھرتی تھی ننھی منی ، بڑی بڑی آنکھوں والی اور ماں باپ کی آنکھوں کی تارا ، پیاری سی گڑیا! وہ دفتر سے تھکے ہارے گھر آتے تو ان سے چمٹ جاتی ۔

"ابو میری چیجی لائے نہیں ؟"

"ارے ذرا آرام تو کرنے دیا کرو" وہ جان بوجھ کر منہ بنائیں اور میاں کی طرف شوخ نظروں سے تکتیں ۔

"بھئی میں مٹھائی لایا ہوں اپنی گڑیا کے لئے" وہ تو بس اپنی ننھی کے ابو تھے۔ کسی اور کی فکر ہو نہ ہو اس کی فرمائش کیسے بھول جاتے ؟

وہ جھپٹ کر مٹھائی کا ڈبہ لیتی اور پھر گھنٹیوں کی سی آواز میں ہنستی بڑی بڑی آنکھیں مٹکاتی مٹھائی کھانے لگتی۔

"اسے میں کہوں زیادہ میٹھا کھانے کو نہ دیا کرو" تنبیہہ سی کرتیں ننھی کے ابو ہنس دیتے ۔

"میں کہوں لڑکی ذات ہے اتنا لاڈ پیار بھی اچھا نہیں" انھیں سچ مچ غصہ آ جاتا۔

"تم بڑی ظالم ہو" وہ زور سے بولتے "کئی بار کہا ہے ننھی کے معاملے میں تم بالکل دخل نہ دیا کرو!"

وہ ضبط کر جاتیں اونہہ ظالم! اتنی ساری دعاؤں کے بعد اللہ نے ان کی سنی تھی اور آنگن میں بہار آئی تھی ورنہ خالی کوکھ تو مٹی رہ رہ کر ڈسے جاتی۔ وہ پودا ہی کیا جس پر پھول نہ کھلیں پھول نہ ہوں تو خاک بہار آئے۔ خالی گود بھی کوئی گود ہے۔ سونا سونا آنگن ہو تو سارا گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے اور ادھر تو شادی کے کئی برس بعد اللہ نے سنی تھی!

اور جس روز وہ لکڑی کی بنی ہوئی چڑیا لائے اس دن ننھی بڑی خوش ہوئی۔ کئی دن ہو گئے تھے سامنے دیوار پر ایک کالے نیلے رنگ کی چڑیا آ بیٹھتی تھی اور اسے دیکھ کر وہ ضد کرنے لگتی "ہم چڑی کو پکڑنا ہے۔"

اس کے اس جملے پر وہ کھلکھلا کر ہنستے "چڑیا پکڑنی ہے"

"نہیں چڑی کو پکڑنا ہے" وہ اڑ گئی ۔

"ارے اڑتے جانور کو قید کرنا اچھا نہیں۔ اللہ میاں خفا ہو جاتے ہیں" وہ لاکھ سمجھا سمجھا کر تھک گئیں

"نہیں نہیں خفا ہوتے" وہ مچل اٹھی ۔

"میں نے کہا سنتے ہو — یہ تمھاری لاڈلی تو باؤلی ہوئی جاتی ہے کچھ سنتی ہی نہیں"

"بچی ہی تو ہے! ایک چڑیا لا دیں گے"

ماں جی نے آہ بھر کر پھر کھلونے کو دیکھا۔ کوشش کے باوجود اب رنگ یاد نہیں آتے۔ ننھی سی چڑیا رنگ برنگی اور وہ بڑی بڑی آنکھوں والی رنگ برنگ فراک پہننے والی — دونوں کھلونے سے تو تھے اور کھلونے سنبھال کر رکھنے پڑتے ہیں — سنبھال کر نہ رکھیں تو —

تو وہ بڑی بڑی آنکھیں ایک دن بند ہو گئیں — !

ذرا سی بات تھی پر کیا سے کیا ہو گیا۔ اک ذرا سے خواب نے کیا دکھ دیا! شام کو بیٹھی کھیل رہی تھی۔ گھر میں مہمان

آنے والے تھے گڈی کو دیکھ کر کیا کہیں گے۔ بس یہی سوچ کر ماں جی نے نہلایا اور اجلے کپڑے پہنائے۔ رات جیسے جیسے بھاری
تو آنے نہیں پائی۔ نیند سے آ لیا۔ جلدی جلدی دعا پڑھنے لگے۔ جوں توں وہ لاڈلی بھی تھکی بڑی بڑی آنکھیں تھک گئی تھیں بند ہو
گئیں اور ایسی بند ہوئیں کہ ماں جی تڑپتیں رہ گئیں چیخیں۔ منتیں کیں وہ کھلنی تھیں نہ کھلیں۔

اور پھر وہ اسے لے گئے! ماں جی کی گود سے چھین کر وہ اسے لے گئے وہ حیران ویران آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی وہ جو اس ننھی کے ابو تھے کس بے دردی سے وہ اسے لے جانے کے لیے ہاتھ پھیلا رہے تھے انہوں نے ماں جی کی حالت کا بھی خیال نہ کیا۔ ان کے بکھرے الجھے اور پریشان بالوں پر بھی نظر نہ کی وہ ان کی پتھرائی ہوئی نظروں کو بھی نہ دیکھ سکے —

دیکھتے بھی کیسے آنسوؤں سے تو خود ان کی اپنی آنکھیں بھری پڑی تھیں۔

اور پھر وہ اس ننھی کی جان کو ہمیشہ کے لیے لے گئے۔

ماں جی ضبط نہ کر سکیں۔ وہ ڈیوڑھی میں سے باہر گلی میں نکلے تو لپک کر سیڑھیاں چڑھتی چھت پہ منڈیر پر سے نیچے جھانک کر دیکھنے لگیں۔

گلی میں دھول تھی اور۔ وہ دھول پہ جہاں قدم دھرتے غبار اٹھ کر ان کے سر پہ شانوں پہ اور کپڑوں پہ پڑنے لگتا ڈھیر ہو۔ [illegible] نے ان کے سائے کو ان سے الگ کیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ جا رہے تھے کانپتے قدموں کے ساتھ۔ ان کا ابھرا ہوا تھا بال بکھرے ہوئے تھے اور دھول پیچھے اڑ کر آہستہ آہستہ بیٹھ رہی تھی بھاری بھاری فضا میں ہر طرف اک سوگوار خاموشی تھی اور ماں جی نے چھت پر سے نیچے دیکھتے ہوئے اپنا جگر پکڑ لیا!

ماں جی کے سینے میں اک ٹیس اٹھی۔ جیسے میں اب بھی درد ہوتا ہے! انہوں نے سامنے صحن کی دیوار پر چڑھتی بیل کو دیکھا جس پہ دھوپ کی سنہری کرنیں دھیرے دھیرے سرک رہی تھیں اور مکڑی کے گھونسلے کو ڈبے کے پاس ہی پانی پر رکھ دیا۔ پھر سوچ میں ڈوب گئیں۔

ننھی کے بعد تو اس گھر میں ویرانیوں نے قدم جما لیے۔ وہ جو ننھی کے ابو تھے بات بات پر لڑتے بات بات پہ ہنستے جیسے ماں جی ہی تو سردار تھی ننھی کے منہ موڑ لیتے تھے۔ صبح دفتر جاتے تو پھر جیسے لوٹ کر گھر ہی جاتے شام ڈھلتی اور یہ اکیلی کی راہ تکا کرتی۔ وہ جب بھی آتا آتے اور پوچھنے پر بات ٹال جاتے کہتے: تمہیں کیا مطلب میں جس وقت چاہوں گا آؤں گا۔

ماں جی کب تک صبر کرتیں۔ روز روز کے جھگڑوں نے وہ طول پکڑا کہ اک بار جو گئے جب سے تو پھر نہ آنے کی قسم پھر تو [illegible] باہر کا تھا [illegible] سو گئے [illegible] اس طرح منایا کہ ماں جی کو آنا ہی پڑا

اور ماں جی جب اس گھر میں دوبارہ آئیں تو بہت کچھ دیر کے بعد ویران گھر کو ہنسانے یاد کر لیا ایک اور ننھی سی ماں جی کی گود میں ہمکنے لگی —

ایک اور بھی پیاری سی — پیاری سی۔

ماں جی کے سوکھے ہونٹوں پہ لمحہ بھر کے لیے اپنے آپ مسکراہٹ آئی اور پھر جیسے یہ مسکراہٹ جم گئی! ڈیوڑھی کا دروازہ

ے کھٹکنے کی آواز آئی ماں جی نے سر پر چوڑے لیا۔ ڈیوڑھی میں سے بکھرے سفید بالوں والا وہ شخص اندر داخل ہوا جسے ننھی ابو کہتی
۔ اور جسے گڑیا سی بے بی نے بھی ابو کہا تھا!

"بڑا تھک گیا ہوں۔"

ماں جی نے غور سے دیکھا۔ آج سر کے بال کچھ زیادہ ہی سفید نظر آتے تھے اور چہرے پر پھیلی ہوئی جھریوں کا جال کچھ زیادہ
ـہ ہو رہا تھا۔ "آ گئے۔" آہستہ سے وہ بولی۔

"کچھ رہ تو نہیں گیا۔" وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

ماں جی نے سر ہلایا۔ "یہ سفید ڈبا۔"

"اچھا۔" اس نے سر ہلایا۔ "میں لے جاؤں گا۔"

پھر اس کی نظر ٹوٹی ہوئی چونچ والی چڑیا پر پڑی۔ "یہ — یہ!" وہ ہولے سے بولا۔ "یہ؟"

ماں جی نے لمبا سانس کھینچا۔ "ہاں تم لائے تھے ننھی کے لئے۔"

ـس نے آنکھیں میچ لیں اس کی پلکوں کا رنگ بھی سفید ہو رہا تھا۔

"میں کہتی ہوں سارا کیا دھرا تمہارا ہے۔" ماں جی کو ایک دم جیسے کچھ یاد آیا۔

"میرا۔" اس نے زیر لب دہرایا۔ "میرا یا تمہارا؟"

"تمہیں تو پرانی عادت ہے میرے سر پہ ڈالنے کی۔" ماں جی کا پارہ چڑھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چارپائی پر ٹانگیں اٹھا کر بیٹھ گیا اور آستین سے منہ پونچھنے لگا۔

"ہاں ہاں میں ہی قصور وار ہوں۔" ماں جی نے روہانسی ہو کر پلو سے آنکھیں پونچھیں۔ "ننھی کے مرنے پہ بھی میں ہی قصور وار
ـری پھر بے بی کی بیمی میں ہی مجرم اور ......" وہ اٹک کر رہ گئیں۔

اس نے جھلا کر پہلو بدلا اور منہ سے کچھ نہ کہا۔

ماں جی نے سامنے دیوار پر چڑھتی بیل کی طرف دیکھا۔ کوئی پھول نہیں کوئی کلی نہیں اور پھر انہیں بے بی یاد آ گئی۔
ـ نے ابھی ابو کہنا سیکھا ہی تھا کہ پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ جانے ماں جی سے کون سا ایسا قصور ہوا کہ بے بی کو بھی
ـہ نے ننھی کے پاس بلا لیا۔

بے بی کے مرنے پر ماں جی بالکل نہ روئی، آنکھوں میں کوئی آنسو نہ آیا بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے ننھے سے بلبلاتے
ـو دیکھا اور تب تک ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی جب تک وہ اسے نہلا کر نہ لے گئے۔ بے بی کے مرنے پر کتنے لوگ آئے تھے
ـ ڑ بی —

اور پھر اس گھر میں سناٹا چھا گیا۔

ماں جی نے سناٹے سے گھبرا کر میاں کو دیکھا۔ وہ اب چارپائی پر لیٹ چکا تھا اور آنکھیں ٹکٹکی ہوئی تھیں گلے کی نسیں

ابھری اور آنکھوں کے کونوں پر جھریاں گہری تھیں۔ وقت مہین مہین لکیروں کے نقش چھوڑتے جا رہا تھا اور ماتھے پر تفکر اور پریشانی نے تین گہری لکیریں ڈال دی تھیں۔

ماں جی کو وہ بے انتہا کمزور اور بوڑھا نظر آیا! دل میں بے انتہا دکھ نے کروٹ بدلی یہی تو وہ شخص تھا جو اس کا شوہر تھا اور اس کے تین بچوں کا باپ!

دھیرے سے کھینچی گئی تین لکیروں نے پھر سر اٹھایا اور سال بیت گئے تو بدن میں ایک سرد سی دوڑ گئی تو پھر تیسری بچی پیدا ہوئی وہ بچی جس کی پیدائش سے پہلے وہ دونوں میاں بیوی اداس اداس اور اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے رہتے تھے ——

تو جب ساجدہ پیدا ہوئی، وہ خوش نہ تھے!

ہر لمحہ خیال رہتا وہ بھی نجمی کی طرح — بے بی کی طرح کچھ دیر پیار جتا کر منہ نہ موڑ لے لیکن ساجدہ تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ لمبی ہو گئی!! ابھی ابھی تو چھوٹی تھی اور اسے تو ابھی وہ ماں کی گود سے چپکی تھی دیکھا ہی! لانبا قد جوبن، آنکھیں، سیاہ گھنگھریالے بال اور پیارے سے ہونٹ!

ماں جی کو اکثر میاں چھیڑ جاتے: "بھئی اگر تمہاری کوئی فوٹو ہوتی تو ساجدہ یہی سمجھتی کہ اس کی تصویر ہے!"

"بیٹی ماں کا نقش نہ ہو گی کیا؟" وہ تنک سے منہ چڑاتیں۔

"اللہ اللہ اتنا لاڈ پیار — میں کہوں کب ہے کسی بیٹی نے باپ سے اتنے لاڈ کروائے ہوں گے۔"

"تم تو ساجدہ کی جلتی رہتی ہو۔"

"میں کہوں کچھ اور بھی فکر ہے کہ نہیں؟"

"کیسا فکر؟"

"سب ہے آخر لڑکی اپنے گھر جائے گی۔ کیا دے کر رخصت کرو گے؟"

"جو ہے سب اسی کا تو ہے۔"

پہلے ہی تھیں کہ جو چیز تھی وہ علاحدہ سینت کر رکھے جا رہی تھیں۔ میاں کراچی دورے پر گئے وہاں سے ریشمی کپڑا لائے تو ساجدہ کے لئے رکھ دیا کہ اس کے کام آئے گا۔ آپا صفیہ نے عید پر جوڑا بھیجا جو ملائی ہونے کے ناطے ان کے سسرال سے آیا تھا تو وہ بھی رکھ دیا گیا۔ ماں جی کو اب اپنے تئیں بیٹی کے لئے چیزیں جمع کرنے کا جنون ہو رہا تھا۔

اور میاں تھے کہ بات بے بات بیٹی پر قربان ہوئے جاتے تھے۔

یوں ساجدہ کے دو ہرے جو اپنے پچھلے تھے اتنے لاڈ پیار کے باوجود اچھی بیل گزر رہی تھی۔ کتنے سارے رشتے آئے تھے اور وہ تھے کہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتے۔ کوئی انہیں پسند آتا تو ماں جی کو نہ آتا۔ ابھی ادھیڑبن میں ایک وہ جانے کیا ہوا ساجدہ بازار خرید و فروخت کے لئے گئی اور شام ہونے کو آئی پر وہ نہ پہنچی۔

"اسے میں کہوں کہ طرح ساجدہ۔" وہ بولو بولا کر پوچھنے لگی۔

"کب کی گئی ہوئی ہے؟" وہ خود پریشان تھے۔

"اتنی دیر تو پہلے کبھی نہ لگائی۔" ماں جی کا فکر کے مارے بُرا حال تھا۔

"کسی سہیلی کے ہاں تو نہیں چلی گئی؟"

"پوچھے بغیر؟" ماں جی نے الٹا سوال کیا

رات آگئی اور وہ جاگ کر گزری——

اور پھر ساجدہ نہیں آئی——!!

"ساجدہ!" ماں جی نے زیرِ لب دہرایا۔ "تُو نے تو اپنی بہنوں سے بڑھ کر دکھ دیا۔ جانے تیرا دل اتنا سخت کیسے ہو گیا؟"

وہ چونکے۔ بند آنکھیں کھولیں اور ماں جی کی طرف دیکھا۔ "کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔" ماں جی نے بدرنگ چڑیا کے گھونسلے کی طرف دیکھا اور پھر سامنے دیوار پر دیکھنے لگیں۔ دھوپ سارے میں پھیل رہی تھی اور دو چڑے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ گتھم گتھا ہو کر دونوں دیوار پر سے نیچے گرے اور پھر اڑ کر دیوار پر جا بیٹھے۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹھونگیں مار رہے تھے اور چڑیوں کا ایک غول شور مچا رہا تھا۔

اس دوپہر اس گھر میں قیامت برپا تھی۔ وہ بار بار ہاتھ ملتے تھے۔ "میں تو پہلے ہی کہتا تھا ساجدہ کی ماں!"

"اجی رہنے دو۔" ماں جی دھاڑیں۔ "سارا کیا دھرا تمہارا ہے۔ بیٹی کو لاڈ پیار میں ناس کر دیا۔"

"تربیت تو ماں کی ہوتی ہے۔"

"ماں؟—— ماں کو کون پوچھتا ہے۔" ماں جی چلائی۔ "میں تو کہتے کہتے تھک گئی یوں بیٹیوں کو آزادی نہیں دینی چاہیے۔"

"جو بھی رشتہ آیا تم نے نامنظور کر دیا۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں کہتے۔

"ہاں تم تو مجھی کو الزام دو گی۔"

"سیں بُرا نہ تھا، پہلے ہی مان گئے ہوتے تو یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔"

"بس!" ماں جی نے چیخ کر کہا۔ "میرے سامنے اس کا نام بھی نہ لینا مردود کا —— ہائے! ہائے ساجدہ!" ماں جی نے سینہ پیٹا۔ "تو مر گئی ہوتی تو اچھا تھا۔"

"ساجدہ بھی مر گئی!" وہ آہستہ سے بولے۔

"یہ ساری تمہاری کرنی ہے۔" وہ پھر جوش سے بولی۔ "باپ نے تو اپنا رعب ہی نہ رکھا لڑکی پر۔"

"اب کیا ہو گا؟" وہ افسوس سے ہاتھ ملتے۔

کئی روز دفتر نہ گئے۔ وقت تھا کہ جیسے ساکت ہو کر رہ گیا تھا اور ہر طرف سے شور سنائی دیتا تھا۔ ساجدہ، ساجدہ، ساجدہ منڈیر پر چڑیوں نے یکسر شور مچا کر ساجدہ ساجدہ پکارا اور پھر چوں چوں چوں چوں تو جیسے طنز تھی۔ ماں جی دل تھام کر رہ جاتیں۔

پھر وہ برآمدے میں چوکی پر سر جھکائے بیٹھی تھیں کہ وہ دفتر سے آئے۔ ڈیوڑھی میں سائیکل رکھنے کی آواز آئی، پھر ہلکی ہلکی چاپ

پر ماں جی تو اپنے ہی خیالوں میں بیٹھی تھی سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

"یہ — یہ لو۔"

آواز سن کر ماں جی نے سر اٹھایا۔ میاں ایک کاغذ سامنے کیے کھڑے تھے۔ "پڑھ لو۔"

"کس کا ہے؟"

"اس کا —" وہ تیزی سے بولے۔ "معافی مانگتی ہے۔"

"ساجدہ معافی مانگتی ہے۔" ماں جی نے بڑبڑا کر ذرے کہا۔ "مجھے خط لکھا ہے؟"

پھر خط پر نظریں دوڑیں اور ماں جی کا عتاب پر تناؤ آ گیا۔ "ہاں میں تو ظالم ہوں — مجھ سے کاہے کو معافی مانگتی۔ خط لکھا تو بس باپ کو — جس کے لاڈ پیار نے یہ دن دکھایا۔" وہ رو دی۔

"نیک بخت!" وہ اور کچھ نہ بولے۔

"تمہیں ہی وہ سیل کمبخت پسند تھا۔ تمہاری لاڈلی کو کیوں نہ ہوتا — لیکن میں کبھی معاف نہیں کر سکتی — میں اُسے اپنا دودھ بھی نہیں بخشوں گی۔" ماں جی کا پارہ چڑھ گیا۔

"اب جو ہونا تھا ہو گیا۔" وہ آہستہ سے بولے۔ "تمہاری ضد نے سب کام خراب کیا۔"

"تم تو یہی کہو گے!" ماں جی دھاڑی۔

"وہ معافی مانگتی ہے۔"

باپ سے معافی مانگتی ہے باپ معاف کر دے گا پر میں!" ماں جی نے اپنی مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "میں کبھی معاف نہیں کر سکتی!"

وہ چپ چاپ اپنی بیوی کو تکتے رہے تھے۔

ماں جی نے مضبوطی سے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ہمارے لئے وہ مر گئی ہے۔ اب ہم اس کی شکل نہیں دیکھیں گے — وعدہ کرو!"

ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو وہ سر جھکائے اندر چلے گئے۔

ماں جی برآمدے میں رہ گئی تنہا اپنے دل میں امڈتے ہوئے جذبات کے ساتھ جو طوفان سے کم نہیں تھے۔ اور اب ماں جی کے دل میں پھر وہی طوفان۔ اٹھا سب نے لہریں جیسے ساحل پر آ کر سر ٹکراتی ہیں ماں جی کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی، جوں جوں سوچتی تھی توں توں لگے کہ سینہ ابھرتی اور سانس کی تیزی میں شدت آ رہی تھی۔

کھانستے ہوئے میاں نے پہلو بدلا۔ "کیا سوچ رہی ہو نیک بخت؟"

چونک کر اس نے شوہر کو دیکھا اور منہ سے کچھ نہ بولی۔

دیوار پر ایک مینا آ کر شور مچا رہی تھی اور کالا کوا اس سے اپنا بچہ چھڑانے کو بار بار ٹھونگیں مار رہا تھا پھر تنگ آ کر

وہ دیوار پر چڑھتی بیل میں چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ بیل کے ہلنے سے کتنے سارے پیلے پیلے پتے جھڑ کر نیچے فرش پر گر گئے۔
سوکھے پتے اور پیلے پتے۔

ماں جی کی آنکھیں بھی پیلی پیلی ہو رہی تھیں۔

ایسی ہی زرد آنکھوں سے اس نے میاں کو دیکھا تھا جب کچھ دنوں بعد وہ پھر ایک کاغذ لا کر اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔

"ایک اور خط.....؟" وہ زیرِ لب بولی۔

"ہاں۔"

ماں جی کا دل چاہا پڑھے بغیر پھاڑ کر پھینک دے مگر بولی: "کیا لکھا ہے؟"

اس نے جذبات سے عاری آواز میں پڑھا: "میرے پیارے ابا مجھے معاف....."

"پیارے ابا": ماں جی نے دانت کچکچا کر کہا۔

"معاف کر دیں...."

ماں جی زور سے بولی: "ابا معاف کر دیں!" اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"نیک بخت روتی کیوں ہو؟"

"میں — میں اس کی کیا لگتی ہوں؟ ہوہو — ہو ہونا۔" وہ سسک دی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"میں، جس نے راتوں کو جاگ جاگ کر اسے سلایا، جس نے اپنا ہر ارمان اپنی ہر آرزو اس پر قربان کر دی۔
— میں!" وہ بلک بلک کر روئی۔

ماں جی نے جب اپنی آنکھیں پونچھیں تو میاں کے بھیگے ہوئے گال دیکھ کر منہ پھیر لیا: "سنتے ہو تم اس سے نہیں ملو گے — نہیں ملو گے۔"

میاں نے سر جھکایا اور ماں جی نے کانپتے ہاتھوں سے خط لے کر پھاڑنا چاہا پر وہ کاغذ شاید ان کمزور ہاتھوں سے پھٹنے والا نہیں تھا۔

پھر وہ دفتر سے گھر آتے تو ماں جی تیز تیز نظروں سے انہیں گھورتیں اور پھر کچھ دیر کے بعد اطمینان کا سانس لیتی لیکن یہ اطمینان بھی کیسا تھا کہ پھانس سی سینے میں اٹکی محسوس ہوتی۔

اور اس روز وہ ذرا دیر سے گھر آئے۔

ماں جی نے غور سے شوہر کو دیکھا۔ چہرے پر بڑھاپے کا جال پھیل رہا تھا۔

"تم — تم" ماں جی نے کہنا چاہا۔

انہوں نے سر ہلایا منہ سے کچھ نہ بولے۔

ماں جی کے لہجے میں خوف سا چھپا: "تم وہاں سے آ رہے ہو؟"

کچھ دیر کے لئے بڑا خوفناک سناٹا چھایا۔

"تم اس سے مل کر آئے ہو —" ماں جی نے سسک کر کہا اور پھر بے اختیار بولی: "کیسی ہے اچھی تو ہے؟"

"کمزور ہو رہی ہے مجھے دیکھ کر بہت روئی۔"

"بہت روئی!" ماں جی نے ہولے سے دہرایا۔

"ہاں" وہ ذرا سا اٹکے — "تمہیں بھی یاد کر کے روتی تھی۔"

ماں جی نے غور سے دیکھا۔ "مجھے یاد کر کے روتی تھی؟" اور پھر جیسے دیوانگی کا دورہ سا پڑا۔ "تم وہاں کیوں گئے — کیوں گئے — نہیں — تمہیں شرم نہ آئی۔"

جھائی پڑے ہوئے جھریوں والے چہرے پر کرب اور تکلیف سے کتنی سلوٹیں سی ابھریں آئیں اور گئیں مگر منہ سے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔

ماں جی کے بوڑھے بدن نے سسک سسک کر کانپ کانپ کر اور کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکے اور شام ڈھل گئی۔

اور شام ڈھل رہی ہوتی تو وہ اب دفتر سے آتے۔ ماں جی کی آنکھوں کی تاب لائے بغیر وہ چپکے سے اندر چلے جاتے اور ماں جی اپنے گھٹنے پر ہاتھ رکھے برآمدے میں پیڑھی پر بیٹھی سامنے کے کمرے کے بند پٹ دیکھا کرتیں اس کمرے کے پٹ ہمیشہ بند رہے!

لیکن اس صبح دفتر جانے سے پہلے وہ کوٹ پہنتے ہوئے ماں جی کے قریب آئے اور دھیرے سے بولے۔ "اسکا علاج ہو سکتا ہے۔"

"نہیں۔" ماں جی کے حلق میں چیخ گھٹ گئی۔

"اسے سخت ضرورت ہے۔" وہ آہستہ سے بولے۔ "آخر اسی کے لئے ہی تو تم نے اکٹھی کی تھیں۔"

"نہیں نہیں۔" ماں جی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

میاں نے غور سے بیوی کی طرف دیکھا۔

وہ بوڑھی عورت تن کر کھڑی ہو گئی۔ برآمدے کے اس سرے والے بند دروازے کے پاس جا کر اس نے کو اڑوں کو چھوا اور پھر سختی سے بولی: "یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔"

وہ خاموشی سے دفتر چلے گئے۔

پھر وہ رات کے وقت واپس آئے اور ماں جی ان کے آنے تک بند دروازے کے باہر پیڑھی پر بیٹھی سامنے صحن کی دیوار پر چڑھتی بیل کو گھورتی رہی۔

اس رات ماں جی کو میاں بے انتہا کمزور اور بوڑھے نظر آئے۔

اور جب بھی چارپائی پر پہلو بدل بدل کر کھانستے ہوئے میاں بے انتہا کمزور نظر آ رہے تھے۔ ماں جی نے ایک لمبا سانس

...ر۔ نہیں دیکھا۔ قمیص کے کالر میٹ رہے تھے۔ چارپائی کے نیچے جو جوتے پڑے تھے ان پر ڈھیروں گرد جمی تھی، پرانے بھی تو بہت
...پے تھے، گھس رہے تھے اور کئی جگہ سے سلائی ادھڑ رہی تھی۔
اور اس صبح ماں جی یونہی بیٹھی بے خیالی میں کرو شیے سے کی گئی سلائی ادھیڑ رہی تھی جب دفتر جاتے وقت انہوں نے
...: تو آج وہ لینے آئیں گے۔"
ماں جی کا دم جیسے گھٹ گیا۔ "کون؟"
"مزدور" انہوں نے مختصراً جواب دیا۔
ماں جی نے غور سے دیکھا اور منہ سے کچھ نہ بولی۔
پھر وہ لوگ آئے۔ ماں جی کانپ کر بند دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ بند کواڑ چھو کر اس نے ان کی طرف
...یا جن کے کپڑے میلے تھے، پھٹے ہوئے تھے اور پاؤں ننگے تھے۔ جن کی جلد کھردری، بال بکھرے ہوئے اور چہرے ستے ہوئے تھے۔
اور پھر ماں جی نے دروازہ کھول دیا۔
یہ وہ سامان تھا جو ایک ماں نے سینت سینت کر رکھا تھا۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں سامان بھرا ہوا تھا اور سامان پر
...ھول جم رہی تھی۔
وہ لوگ ایک ایک کر کے تمام چیزیں نکالتے چلے گئے وہ جو میلے کپڑے پہنے تھے جن کے کپڑے پھٹے تھے اور پاؤں ننگے
تھے۔ وہ جو غریب تھے اور محنت کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے، جو بے انتہا کمزور تھے نحیف تھے اور وہ جو اپنی طاقت سے
...نا آشنا خود اپنی قوت سے بے خبر تھے اور وقت کے تیز دھارے کے آگے خود کو بے بس سمجھ کر سر جھکاتے چلے آتے تھے۔
کمرہ خالی ہو گیا اور فرش پر پڑی دھول پر بے شمار قدموں کے نشان باقی رہ گئے۔ ان قدموں کے نشان جو
...ٹے تھے، چھوٹے بڑے درمیانے طرح طرح کے پاؤں کے نشان اور کمرے میں دھول اور دیواروں پہ مکڑی کے جالے رہ گئے!
ماں جی نے چارپائی پہ بیٹھے بیٹھے کمرے کے کھلے پٹ کی طرف دیکھا اور پھر میاں کے پیروں کی طرف دیکھنے لگی
بوڑھے آدمی کے پیروں پہ بھی لاتعداد چھوٹی چھوٹی لکیریں بن جاتی ہیں اور نیلی نیلی نسیں ابھر آتی ہیں۔
"بس یہ ڈبا رہ گیا ہے۔" ماں جی نے ہولے سے جیسے خود سے کہا۔
کھانستے ہوئے بوڑھے نے اپنی بوڑھی بیوی کی طرف دیکھا: "میں بڑا تھک گیا ہوں۔"
ماں جی نے سر ہلایا: "پھر بیچ دینا۔"
"نہیں — میں لے جاؤں گا۔" اس نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔
دوپہر ڈھل رہی تھی سامنے دیوار پر چڑھتی بیل پر سے دھوپ ہولے ہولے سرک کر اوپر کو جا رہی تھی
سورج ڈوبنے کے وقت دھوپ صرف منڈیر پر رہ جایا کرتی تھی اور اب دھوپ منڈیر کے قریب ہی تھی۔
سانجھ چڑیاں مل کر شور مچا رہی تھیں کوا بھاگ چکا تھا اور مینا خاموش بیٹھی اپنے پروں میں چونچ پھیر رہی تھی۔

ماں جی نے چڑیا کے کھلونے کی طرف دیکھا جو پنجہ ٹوٹنے سے عجیب سی لگتی تھی۔ ماں جی نے ایک بار پھر غور کر کے یاد کرنا چاہا کہ اس کے رنگ کیا تھے۔

"اچھا تو میں اب آؤں؟" اس نے سفید ڈبا ہاتھ میں لیا اور چارپائی پر سے اتر کر جوتے پہننے لگا۔ ماں جی نے پھر یاد کرنا چاہا اس کھلونے کے رنگ کیسے تھے۔

"جلدی آجاؤں گا" میاں نے آہستہ سے کہا اور برآمدے سے گلی میں چلے گئے۔

منڈیر پر بیٹھی شور مچاتی سانولی چڑیاں ایک دم خاموش ہو گئیں۔

ماں جی نے دکھ بھری نظروں سے انھیں ڈیوڑھی میں سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ ضبط نہ کر سکی اور لپک کر زینہ چڑھتی چھت پر سے نیچے جھانک کر دیکھنے لگی۔

گلی میں دھول تھی اور وہ دھول پر جہاں قدم دھرتے غبار اڑ کر ان کے سر پر شانوں پر اور کپڑوں پر پڑنے لگتا۔ ڈوبتے سورج نے ان کے سائے کو ان سے آگے دھکیل رکھا تھا اور وہ آہستہ آہستہ جا رہے تھے کانپتے قدموں کے ساتھ۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور دھول پیچھے اڑ اڑ کر آہستہ آہستہ بیٹھ رہی تھی۔ ہوا میں فضا میں ہر طرف ایک سوگوار خاموشی تھی اور ماں جی نے چھت پر سے نیچے دیکھتے ہوئے اپنا کلیجہ پکڑ لیا۔

اک ہوک سی جیسے دل کو چیر گئی اور ماں جی نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا!

آدم کی تلاش

احمد شریف

وہ بھاگ کر آخری زینہ دھم سے اُتری۔ اس کے اندر چکنے فرش پر بلوری کنچے تھوڑی دور تک لڑھکے اور پھر سہم کر رک گئے۔ ایسے میں بھابی پ.. کر اس کا دوپٹہ اس کے سینے پر پھیلا دیا کرتی تھی اور اس کے اندر چڑیوں کا پھڑپھڑاتا غول آناً فاناً کہیں گم ہو جایا کرتا تھا۔ وہ بے بسی سے بھابی کی طرف دیکھتی اور اندر ہی اندر تڑپ کر رہ جاتی — اس نے باورچی خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھابی کے سینت کر رکھے ہوئے برتنوں کی طرف دیکھا۔ ہر چیز اپنے آپ میں سمٹی ہوئی تھی۔ کیا مجال کہ دو برتن کبھی بھولے سے بھی آپس میں ٹکرا جاتے۔ وہ نفرت سے پھنکاری۔

"ہونہہ"

اور دالان میں آکر کھڑکی کے پاس کرسی میں ڈھیر ہو گئی۔

ان کے گھر کی کھڑکیاں گلی کی طرف کھلتی تھیں، ایک طرف بازار اور دوسری طرف سڑک تھی۔ اس پر بھی وہاں سناٹا بھائیں بھائیں کرتا رہتا۔ در و دیوار سادھو کر پڑے رہتے — اس نے سر کرسی کی پشت پر ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس وقت اُسے ان لوگوں کی کہانی یاد آنے لگی جنھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور پتھرا گئے تھے۔

اس کی بھابی اور بھیا، خالہ کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے حصے بخرے کرنے لائل پور گئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دن اور ایک رات کے لیے گھر میں اکیلی تھی۔ وہ ڈرتی بھی کہ ایک دن اور ایک رات میں اگر کوئی انہونی بات نہ ہوئی تو وہ بھی ان لوگوں کی طرح پتھرا جائے گی۔ اس نے سوچا۔ ... میں کارنس پر سجی ہوئی چینی کی ساری پلیٹیں پکے فرش پر آ رہیں تو شاید اس گھر پر مسلط سناٹے کے تاریک سینے میں روشنی کا تیر سا پیوست ہو جائے — لیکن اندھیرے کے حلقے لمحہ بہ لمحہ اس کے گرد تنگ ہونے لگے اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ کھڑکی کے سامنے والی چھت پر دیوار سے لگا کھڑا رہتا۔

وہ ایک عرصے سے وہاں مقیم تھا۔ اس دوران میں ان کا کئی بار آمنا سامنا ہوا تھا، مگر وہ ہمیشہ نظریں چرا کر دیوار کی اوٹ میں ہو جاتا اور نہ جانے حادثے سے دوچار ہوتے ہوتے رہ جاتی — اگر کبھی بھولے سے وہ اس کے سامنے مردانہ وار کھڑا ہو کر آنکھیں چار کر لیتا اور اس سے جذبات کا ایک سمندر سا جاگ اٹھتا تو وہ اس کے لیے کھلی کتاب بن جاتی۔

اُسے بزدلوں سے نفرت تھی۔

اس نے حقارت سے اس چھت کی طرف دیکھا۔ خلافِ توقع وہ حیران کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کرسی پر تن کر بیٹھ گئی۔ پھر جلدی جلدی سینہ پھیلانے لگی۔ اس پر بھی وہ مبہوت کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر جب سر کے اشارے سے اس نے اسے گلی میں بلایا تو اس کے اندر ایک لہر سی اٹھی اور ساحل سے ٹکرا کر چکنا چور ہونے کے لیے بے تاب ہو گئی۔

وہ گلی میں آگئی۔

وہ لڑکا جس کا نام جاننے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی تھی بڑی ڈیوڑھی کے محراب والے دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کو سنبھا[لے] اس کی طرف بڑھی۔ اس کا خیال تھا کہ جونہی وہ اس کے قریب سے گزرے گی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈیوڑھی کے اندر لے جائے گا۔ پھر کسی بھینی بھینی خوشبو کے درمیان ڈیوڑھی کی محراب پر کبوتروں کے غٹرغوں کرنے کی آواز سنائی دے گی اور جب وہ پسینے سے شرابور مسکراتے ہوئے باہر نکلیں گے تو ڈیوڑھی کا مصلوب سناٹا دم توڑ رہا ہوگا!

وہ دانستہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھی۔ جب وہ اس کے قریب پہنچی تو اس لڑکے نے ایک چلتی ہوئی نگاہ اس کے سرخ گال اور پھر سر جھکا کر گلی کے فرش کو تکنے لگا۔ وہ آگ بگولہ ہو گئی۔ اس کا جی چاہا وہ اس کا گریبان پکڑ کر اس کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ مارے جب اس کے ذہن میں چنگاریاں سی اڑنے لگیں تو وہ اس کے ساتھ مصافحہ کر کے گھر لوٹ جائے۔

سنسان اور ویران گھر کا خیال آیا تو وہ دائیں سی ہو کر ہسپتال کے برابر والی تنگ گلی کی طرف ہولی۔

تنگ گلی کی ایک دکان میں غالباً کسی دلہن کا پلنگ ٹھونکا جا رہا تھا۔ برابر میں چھاپے خانے کی مشین کھڑم کھڑم چل رہی تھی۔ اتنے سامنے سڑک پر ایک کار ہارن بجاتی ہوئی گزر گئی — اس نے لمحہ بھر کے لیے رک کر چاروں طرف پھیلی ہوئی آوازوں پر کان دھرے لیکن ان آوازوں کا کوئی مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ گلی سے گزر کر ہسپتال روڈ پر آگئی۔

وہ اپنے خیالوں میں گم ہسپتال کے پھاٹک کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ رکشے میں بیٹھے ایک گداگر نے لپک کر اس کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگا

"لنگڑے فقیر کو روٹی کھلا دے۔ تیری مراد پوری ہوگی"

وہ ٹھٹھک سی گئی۔ اتنے میں ہسپتال کے برآمدے سے ایک بھاری بھرکم آدمی چلایا۔

"ابے او لنگڑے"

لنگڑے نے گھبرا کر اس کے پاؤں چھوڑ دیے۔ وہ بھاری بھرکم آدمی تیزی سے باہر آیا اور رکشے کو زور سے ٹھوکر مار کر چلایا۔

"چل اٹھ۔ ماں کا خصم"

رکشا والا کے خصم سمیت ہنستا ہوا اور رکشہ چلا گیا۔ اچانک رکشے کے پہیے کے اندر کے وہ پیچھے ہسپتال کی دیوار سے متصل نالے میں دھلک گئے۔ لنگڑے نے لپک کر تنومند درخت کا تنا پکڑ لیا۔ پھر گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر سنبھلا اور چھوٹے بازار کی طرف بگٹٹ بھاگ کھڑا ہوا۔

لنگڑے کو دونوں ٹانگوں پر بھاگتے دیکھ کر اس کے دل میں آئی وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی ہو کر زور زور سے ہنسے۔ لیکن وہ پیچھے بریکوں کی چیخ سن کر سہم گئی۔ وہ سڑک کے درمیان اینٹوں سے لدے ہوئے ٹرک کے سامنے کھڑی تھی۔ دھچکا لگنے سے ایک اینٹ ٹرک پر گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ وہ نادم سی ہو کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ٹرک اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔

اس نے بنک روڈ سے گزرتے ہوئے سوچا۔ آوازوں پر ضرور کوئی کائی جمتی آ رہی ہے۔ جبھی تو بریکوں کی ہولناک چیخ کے

رہود سانے کا دروازہ کپڑے کی تھیلی کے منہ کی طرح بند تھا۔ شاید آوازیں اُلٹے رُخ سفر کر رہی تھیں۔ اور پھر وہ کشمیر روڈ کی ہجوم سے لبالب بھری گرد میں گم ہو گئی۔

لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے سرگوشیاں کرتے گزر رہے تھے۔ عورتیں ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی جا رہی تھیں۔ ٹریفک کی ریل پیل کے باوجود دو رویہ دکانوں میں بڑی چہل پہل تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑی ہو کر بڑی محویت سے ہجوم کو دیکھنے لگی، وہاں کوئی بھی ننگے پاؤں نہیں تھا، اس پر بھی سب یوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے جیسے اُن کے راستے میں کرچیں بکھری ہوئی ہوں، وہ دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ سب اس سے کنی کترا کر گزرتے رہے۔ شاید کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس سے نظریں ملا سکتا۔ یا شاید اس کو کسی نے زبردستی سلیمانی ٹوپی اوڑھا دی تھی۔ اس نے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اس کا دوپٹہ اس کے شانوں پر آ رہا۔

اپنے شہر پہ اُسے داستانوں کے شہر خموشاں کا گمان ہونے لگا۔

اس لمحے نہ جانے کہاں سے سناٹے کا پیر تسمہ پا اس کے کندھوں پر آ سوار ہوا اور اس کی گردن کے گرد سوکھی سڑی ٹانگوں کی قینچی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کے متعفن بدن سے سڑاند کا بھبکا سا اس کی ناک میں گھسا اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ٹریفک کی بتیاں میں گیٹ لو ہتی چوک یوں گزر گئے جیسے وہ ہنڈولے میں بیٹھی ہو۔

اور جب وہ ڈاکٹر کی دکان میں داخل ہوئی تو بُری طرح ہانپ رہی تھی، اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان ڈاکٹر سے کہا۔

"میں بیمار ہوں"

ڈاکٹر نے ایک نگاہ اس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر ڈالی اور بے یقینی سے پوچھا۔

"واقعی!"

"ہاں ہاں ڈاکٹر" وہ روہانسی ہو کر بولی "آپ معائنہ کر کے دیکھ لیں"

"آپ بیٹھیں، میں دیکھتا ہوں۔"

ڈاکٹر کرسی کی طرف اشارہ کر کے دوسرے مریضوں کی طرف متوجہ ہو گیا، وہ بے دلی سے کرسی میں دھنس کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں دواؤں سے بوجھل فضا میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل ڈوب رہا ہو۔ وہ گھبرائی۔ وہ یوں نہیں مرنا چاہتی تھی ز ہوا رش بھر کر چکنے سے وفاداری جتاتی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور ڈاکٹر سے کہنے لگی۔

"آپ گھر آ کر معائنہ نہیں کر سکتے۔؟"

ڈاکٹر بولا۔

"گھر آیا تو فیس دینی پڑے گی"

"میں دے دوں گی" وہ جلدی سے بولی۔ "سامنے گلی میں چند قدم پر چوراہا ہے۔ چوراہے سے آگے چبوترے والا گھر ہمارا ہے۔ آپ وہاں آ جائیں"

وہ اپنا آپ بچاتی گھر کی طرف ہولی۔

گھر پہنچی تو وہ تھکن سے چور چور ہو چکی تھی۔ وہ پلنگ پر گر کر بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔ اس گھر میں اس کی جوانی نے اب تک کوئی بچہ نہیں جنا تھا۔ وہ خود کنواری تھی۔ پھر نہ جانے کیسے بیٹھے بٹھائے وہ دردِ زہ کی اذیت میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس شہر میں جس شہر پر داستانوں کے شہر خموشاں کا گمان ہوتا تھا اس کی گواہی دینے والا کوئی نہ تھا۔ اس وقت اچانک اسے خیال آیا کہ جس جلد وہ قول کی تلاش کرتی پھر رہی تھی وہ ہنگامہ اس کے گھر میں بپا ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے آ رہا تھا!

وہ بھاری پلنگ سے اتری۔ اس کے آہستہ بچھے فرش پر بکھرے کچھ رسالے اور لڑھکتے چلے گئے۔ اس نے کارنس پر رکھی ہوئی پلیٹوں کی قطار کے قریب سے گزرتے ہوئے سرے والی پلیٹ پر ہاتھ مارا۔ پلیٹیں یکے بعد دیگرے فرش پر گر کر ٹوٹنے لگیں اور وہ چھناکوں کے جھنجھناتی ہوئی غسل خانے میں جا گھسی۔

اس نے نل کے نیچے کھڑی ہو کر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی جسم پر ڈالا تو اس کے بدن سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھنے لگی۔ اس کا جسم پہلے ہی روشنی میں پڑے گوندھے ہوئے میدے کی مانند تھا۔ مل مل کر نہانے سے اور بھی سرخ ہو گیا۔ وہ دیر تک غسل خانے کے آئینے پر چھینٹے ڈال کر اپنے آپ سے کھیلتی رہی۔ پھر شروع سردیوں کی ہلکی ہلکی خنکی کے باوجود وہ ریشمی چادر اوڑھ کر کھڑکی کے پاس کرسی پر آ بیٹھی۔

اس کا رواں رواں جاگ رہا تھا۔ شانوں پر پڑے بھیگے سنہری بال پیٹھ پر گدگدی کر رہے تھے۔ ریشمی چادر سانس لے رہی تھی۔ وہ دیر تک تصورات کی دنیا میں گم رہی۔ پھر مسکرائی اور گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند کر کے گٹھڑی کی سی بن کر کرسی میں دبک گئی۔

اتنے میں گھڑی نے پانچ بجائے۔ وہ گھڑی کسی آوارہ عورت کی طرح قابلِ اعتبار تو نہ تھی، لیکن جب اس نے چونک کر صحن کی طرف دیکھا تو ڈھلتے سایوں کو شام کے شکنجے سے آنکھ مچولی کھیلتے پا کر اداس ہو گئی۔ دن کی نبضیں چھوٹ رہی تھیں اور ڈاکٹر ابھی تک نہیں آیا تھا۔

وہ نہیں آئے گا۔ اس کے دل نے کہا۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کے باوجود شاید پچھواڑا اس کا مقدر بن چکا تھا۔ اس نے سوچا۔ تو نوکروں کی نظریں آنے سے قریب تر ہیں جب وہ اپنے جسم کو تیل میں جلتی ہوئی شمع کی مانند جلتے اور گھڑی بھر کے لیے چاہتی پیدا کرتے جسم ہوتے۔ اس خیال سے اسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سا ملا اور جب باہر دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ساحل سے آ لگی۔

وہ پاگلوں کی طرح ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ صحن میں آئی تو چادر سے الجھ الجھ کر گرتے گرتے بچی۔ پھر سنبھلی اور آنے والے کی آہٹ لیے بغیر ڈیوڑھی کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ باہر اندھا اور بہرا سناٹا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس لمحے اس کے دل نے کئی ڈبکیاں لیں۔ اس نے پڑوسیوں کے دروازے پر دستک سمجھ کر دروازہ بند کر لیا اور ہانپنے لگی۔

وہ یونہی خوف زدہ نہیں تھی۔ اندھا اور بہرا سناٹا ہر جگہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ بھاگی اور زینے کے چلتے چلتے تھم جانے لگی۔ اس کے پاؤں سرد ہو گئے۔ پنڈلیوں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس وقت مایوسیوں کے گھپ اندھیرے میں ایک خیال کوندے کی طرح لہرایا۔ وہ خود سر سے پیر تک جیتا جاگتا بلاوا تھی۔ وہ چاہے تو اس کے گھر کی طرف آنے والی گلیوں اور بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس نے چبوترے کا بلب روشن کیا۔ ریشمی چادر اتار کر ڈیوڑھی کے فرش پر ڈالی اور دروازہ کھول کر روشن بلب کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔

وہ پہاڑی پکھڑی ہو کر جاں نثاروں کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے کانوں میں بے آواز ڈھنڈورچی رہا تھا۔ گلی گلی منادی ہو رہی تھی۔ وہ
ر رہنے سوچنے لگی کہ جب لوگ جوق در جوق اس کے گھر پر ٹوٹ پڑیں گے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دے گی تو ہاتھ اٹھا کر ان
ں — تم میں سے جو شخص اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں بھر کر اپنا خون دیا ہے، میرا گدرایا ہوا کنوارا اور ننگا جسم اس کا ہے — اس نے
دو ہاتھوں کے خون سے بھرے ہوئے کٹورے دیکھ کر آنکھیں کھول دیں۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ مدھم روشنی شرمسار ہو کر اندھیرے
ئی تھیں۔ اس نے سسکی لی اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

پھر جب چوراہے کے قریب کسی کے قدموں کی مدھم سی چاپ سنائی دی تو اس نے جلدی سے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا لیے۔
کا سوداگر بوڑھا انگریز اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ جنگلے کے ساتھ لگ کر اور بھی نمایاں ہو کر کھڑی ہو گئی۔ بوڑھا انگریز اپنے ہی خیالوں
اس کے قریب آیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بے حجابی سے اسے پکارا

"انکل"

بوڑھے نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ زیر لب کہا۔

"بلو بے بی"

اور یوں اپنے راستے پر ہو لیا جیسے وہ چبوترے پر اپنے جسم کی نمائش لگائے نہ کھڑی ہو بلکہ خارش زدہ کتیا منہ چھپانے پڑی ہو۔
ن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ چیخی۔

"حرامزادے نکتے"

اور بھاگتی ہوئی ڈیوڑھی میں آ گئی۔ اس نے دروازہ دھڑام سے اپنے پیچھے بند کیا اور پھر دروازے سے کمر لگا کر پھوٹ پھوٹ
ی۔

ریشمی چادر ابھی تک ڈیوڑھی کے فرش پر پڑی تھی۔

وہ اپنا دوپٹہ سنبھالتی گھر کی طرف ہولی۔

گھر پہنچی تو وہ خوف سے چور چور ہو چکی تھی۔ وہ پلنگ پر گر کر بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔ اس گھر میں اس کی بھابی تنہا تھی کوئی بچہ نہیں جنا تھا۔ وہ خود کنواری تھی۔ پھر نہ جانے کیسے بیٹھے بٹھائے وہ درد زہ کی اذیت میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس شبہ پر جس شبہ پر داستانوں کے شہر لوگوں کا گمان ہوتا تھا اس کی گواہی دینے والا کوئی نہ تھا۔ اس وقت اچانک اسے خیال آیا کہ جس جنگل وہ گلی گلی طواف کرتی پھر رہی تھی۔ وہ ہنگامہ اس کے گھر میں بپا ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے آ رہا تھا!

وہ جھپٹ کر پلنگ سے اتری۔ اس کے آہستہ سے قدم فرش پر لرزتے کچھ ڈگمگاتے اور لڑکھڑاتے چلے گئے۔ اس نے کارنس پر رکھی ہوئی پیشوں دان گلدان کے قریب سے گزرتے ہوئے سرے والی چیز پر ہاتھ مارا۔ چیزیں یکے بعد دیگرے فرش پر گر کر ٹوٹنے لگیں اور وہ چھناکوں کے بیچ بھنتی ہوئی غسل خانے میں جا گھسی۔

اس نے نل کے نیچے کھڑی ہو کر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی جسم پر ڈالا تو اس کے بدن سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھنے لگی۔ اس کا جسم پہلے ہی زرد روشنی میں پیتل کے منہ بولتے مجسمے کی مانند تھا۔ مل مل کر نہانے سے اور بھی سرخ ہو گیا۔ وہ دیر تک غسل خانے کے آئینے پر چھینٹے اڑا اڑا کر اپنے آپ سے کھیلتی رہی۔ پھر شروع سردیوں کی بھیگی بھیگی خنکی کے باوجود وہ ریشمی چادر سا اوڑھ کر کھڑکی کے پاس کرسی پر آ بیٹھی۔

اس کا روم روم جاگ رہا تھا۔ شانوں پر پھیلے سنہری بال ہنستی ہنستی گنگنا کر رہے تھے۔ ریشمی چادر سانس لے رہی تھی وہ دیر تک تصورات کی دنیا میں کھو رہی۔ پھر مسکرائی اور گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند کر کے گنگنا کر کاہی ہو کر کرسی میں دھنس گئی۔

اتنے میں گھڑی نے ساڑھے نو بجائے۔ وہ گھڑی کسی آوارہ عورت کی طرح قابل اعتبار تو نہ تھی، لیکن جب اس نے مڑ کر کرسی کی طرف دیکھا تو لمبے سایوں کو شاہد کے تعجب سے آنکھ مچولی کھیلتے پا کر مایوس ہو گئی۔ دل کی دھڑکنیں چھوٹ رہی تھیں اور ڈاکٹر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ نہیں آئے گا۔ اس کے دل نے کہا۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کے باوجود شاید پتھرا جانا اس کا مقدر بن چکا تھا۔ اس نے سوچا۔ تو کیا ٹھوکروں کی نذر ہو جانے سے تو بہتر ہے وہ اپنے جسم کو تیل میں بھگو کر شمع کی مانند جلے اور گھڑی بھر کے لیے اجالا پیدا کر کے بھسم ہو جائے۔ اس خیال سے اسے ڈوبتے تنکے کا سہارا سا ملا اور جب باہر دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ساحل سے آ لگی۔

وہ پاگلوں کی طرح ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ صحن میں آئی تو چادر سے الجھ کر گرتے گرتے بچی۔ پھر سنبھلی اور آنے والے کو کوئی آہٹ دیے بغیر ڈیوڑھی کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ باہر اندھیرا اور بے تکا سناٹا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس لمحے اس کے دل نے کئی ڈبکیاں لیں۔ اس نے پڑوسیوں کے دروازے پر دستک سی کر دروازہ بند کر لیا اور ہانپنے لگی۔

وہ پہلی خوفزدہ نہیں تھی۔ اندھیرا اور بے تکا سناٹا ہر جگہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ بھابی اور بھیا کے لوٹنے سے پہلے پہلے تھم جانے گی۔ اس کے پاؤں سرد ہو گئے۔ پنڈلیوں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس وقت مایوسیوں کے گھپ اندھیرے میں ایک خیال کوندے کی طرح لہرایا۔ وہ خود سر سے پیر تک جیتا جاگتا بلاوا تھی۔ وہ چاہے تو اس کے گھر کی طرف آنے والی گلیوں اور بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس نے چبوترے کا بلب روشن کیا۔ ریشمی چادر اتار کر ڈیوڑھی کے فرش پر ڈالی اور دروازہ کھول کر روشن بلب کے نیچے پاگلوں سی ہو گئی۔

وہ پہاڑن پکڑی ہو کر جاں نثاروں کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے کانوں میں بے آواز ڈنکا بج رہا تھا۔ گلی گلی منادی ہو رہی تھی۔ وہ
بند کر کے سوچنے لگی کہ جب لوگ جوق در جوق اس کے گھر پر ٹوٹ پڑیں گے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دے گی تو ہاتھ اٹھا کر ان
گی۔ تم میں سے جو شخص اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں بھر کر اپنا خون لایا ہے، میرا گدرایا ہوا گورا اور ننگا جسم اس کا ہے — اس نے
ر ہاتھوں کے خون سے بھرے ہوئے کٹورے دیکھ کر آنکھیں کھول دیں۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ مدھم روشنی شرمسار ہو کر اندھیرے
ئی تھیں۔ اس نے سسکی لی اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

پھر جب چبوترے کے قریب کسی کے قدموں کی مدھم سی چاپ سنائی دی تو اس نے جلدی سے چہرے پر سے ہاتھ اٹھا لیے۔
کا سوداگر بوڑھا انگریز اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر اور بھی نمایاں ہو کر کھڑی ہو گئی۔ بوڑھا انگریز اپنے ہی خیالوں
اس کے قریب آیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بے حجابی سے اسے پکارا

"انکل"

بوڑھے نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ زیر لب کہا۔

"بو بے بی"

اور یوں اپنے راستے پر ہو لیا جیسے وہ چبوترے پر اپنے جسم کی نمائش لگائے نہ کھڑی ہو بلکہ خارش زدہ کتیا منہ چھپائے پڑی ہو۔
ے بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ چیخی۔

"حرامزادے کتے"

اور بھاگتی ہوئی ڈیوڑھی میں آگئی۔ اس نے دروازہ دھڑام سے اپنے پیچھے بند کیا اور پھر دروازے سے کمر لگا کر پھوٹ پھوٹ
ی۔

ریشمی چادر ابھی تک ڈیوڑھی کے فرش پر پڑی تھی۔

اجنبی چہرے

عفری بخاری

یاسین ساکت و جامد کھڑا تھا.

وہ گھٹی گھٹی سی چیخ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ حالانکہ اب بہت دیر ہو چکی تھی ساتھ والے مکان سے چیخ بھی پھوٹ گئی تھی اب وہاں کچھ نہیں تھا سوائے اندھیرے اور سناٹے کے.

مگر اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ہمیشہ چپ رہنے والا سناٹا بھی اب تک چیخ رہا تھا ——

اسے ابھی کچھ دیر میں چلے جانا تھا اس کا ایک دوست ٹیکسی لینے گیا تھا اور وہ بندھے سامان کو کمرے سے باہر نکال رہا تھا جب اس نے یہ چیخ سنی اور وہ کمرے کا کھڑا رہ گیا اور بغور اس چھوٹے سے روشندان کو دیکھ رہا تھا جس میں اس نے ایک چھوٹی سی بے ضرر خواہش کی تھی مگر یہ خواہش پوری ہوگی اسے معلوم نہیں تھا، اور اب وہ پشیمان سا ہو رہا تھا جیسے وہی مجرم ہو حالانکہ اس نے کیا کیا تھا.

وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔ وہ کسی سے رشتہ نہیں کر سکتا۔ وہ خود کو پچھلے کئی برسوں سے اس بات پر آمادہ نہیں کر سکا تھا جب بھی وہ خاندان کے بارے میں سوچتا اُس کی نگاہوں کے سامنے کئی چہرے گھوم جاتے.

"آخر وہ کس کے انتظار میں تھے ——"

غصے اور کوفت میں وہ جھنجھلا جاتا، وہ گھر سے جلا جلا کر باہر رہتا، پھر بھی اُسے قرار نہیں تھا۔ وہ خود کو کسی انجانے شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کرتا تھا۔ بہت صبر والا ہے کبھی کبھی اسے اپنی بے بسی پر غصہ آ جاتا۔ وہ اپنے آپ پر ترس کھاتا۔ مگر کسی وقت اسے یہ بے بسی ایک ڈھونگ سا لگنے لگتی یا محض ذرا کی صورت تھی۔ وہ خوب صورت تھا ذہین تھا تعلیم یافتہ تھا اچھی خاصی نوکری میں تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس خود ساختہ ضابطہ کو توڑ سکتا تھا۔ مگر وہ بڑا حساس اور جذباتی تھا سگریٹ پیتے ہوئے وہ ہمیشہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ اس کے دوست اسے سنجیدہ اور بُردبار قسم کا آدمی سمجھتے تھے۔ وہ اُس کا احترام کرتے کیونکہ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش بلکہ ایک سحر انگیز جذبہ تھا۔ وہ خود کو ان سے بہت الگ سمجھتا تھا اور وہ دل میں ان پر رشک کرتا تھا وہ کیسے بے فکر تھے جو کسی وقت بھی بے شمار لمحات حاصل کر لیتے اور چھوٹی چھوٹی معصوم باتوں میں پناہ ڈھونڈ لیتے تھے۔ وہ ہنستے تھے مسکراتے تھے قہقہے لگاتے تھے —— وہ محسوس کرتا مگر ہچکچاہٹ کی طرح۔ وہ ان نوجوانوں کے درمیان کسی بزرگ کی طرح خاموش بیٹھا سگریٹ پیتا رہتا۔ کبھی کوئی بہت ہی ضروری بات ہو تو بول پڑتا مگر ہمیشہ گفتگو کا رخ فوراً بدل دیتا یا منقطع کر دی جاتی اور ایسے موقع پر اسے ہمیشہ محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی مجرم ہے ——

اس کے دوست اکثر اسے چھیڑتے.

"یار کب تک تنہا رہو گے شادی کر لو، یہی تو عمر ہوتی ہے۔ چند سال بعد کوئی لڑکی اس منہ نہ لگائے گی"

وہ مسکرا کر رہ جاتا اور گھر آ کر اپنے مختصر خطوں کے بارے میں سوچتا.

وہ خیریت سے تھے۔ وہ بھلا بخیریت تھا۔ وہ مطمئن تھے وہ بھی مطمئن تھا۔ کسی کو کسی کی ضرورت نہ تھی۔ معاملہ برابر تھا۔
زندگی ایک خاص ڈگر پر چل رہی تھی۔ وہ اس ڈگر پر پہنچ کے قدم اٹھا رہا تھا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ۔ وہ سوچتا ـــ
وہ کیا شادی کے بعد تنہا نہیں رہے گا ـــ ؟ یا وہ کچھ اور بھی تنہا ہو جائے گا۔ زندگی کچھ اور بھی الجھ کر پریشان ہو جائے
یوں اپنے ہی خول میں سماٹا سمٹایا اس کا وجود زیادہ محفوظ تھا۔ اسے محفوظ ہی رہنا چاہیے اپنے لیے۔ دوسروں کے لیے۔ اسی میں نجات تھی۔
ن لڑکی کے بارے میں کیوں سوچنے لگا تھا جو صبح سویرے اسی گھر کے دوسرے دروازے سے باہر نکلتی تھی۔ بیگ اٹھائے۔ سر کو دوپٹے سے
ں جھکائے۔ وہ عجیب تھکے تھکے انداز سے چلتی بس سٹاپ پر جاتی تھی۔ وہاں جانے کب تک کھڑی رہتی تھی۔ پھر جانے کس طرح بھی تا بس میں
تی ـــ
وہ کب سے یوں چل رہی تھی اور اسے کب تک یوں چلنا تھا۔ کبھی بلا وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھک جاتا، رُک جاتا۔ پہچان کا ایک مبہم سا احساس
بیدار ابھرتا۔ مگر پھر فوراً ہی وہ سنبھل جاتا۔
دبلی پتلی زرد رو لڑکی جب کبھی اتفاقیہ اس کی طرف دیکھ لیتی تو وہ کانپ جاتا۔ اس کا دل چاہتا آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھ ڈالے ـــ مگر وہ
نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ جب وہ ابھی بھیگی بھیگی اداس بھری نظروں سے اس طرف دیکھ کر نظر مانگتی تو وہ اپنا سکوڑ
یب کھڑا کر دیتا ـــ وہ ایک زمانے کے ساتھ اس کے قریب سے گزر جاتا جیسے وہ نظروں کی زبان نہ سمجھتا ہو۔ لیکن جب وہ کمرے میں
چھوٹے روشندان کو دیکھ کر وہ یہ بے ضرری خواہش ضرور کرتا کہ کاش وہ اس لڑکی کی آواز سن سکتا۔ جانے مکان کے دوسرے حصے میں کیسے
تے۔ اس نے تو دوسری طرف سے کبھی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ مگر وہ ان کے بارے میں کیوں فکرمند تھا اور اس لڑکی کے متعلق کیوں سوچتا تھا۔
ے محبت کرتا تھا۔ ہرگز نہیں وہ عشق فرمانے والوں سے کوسوں دور تھا۔
پھر آخر وہ لڑکی اس کے اعصاب پر کیوں سوار ہو گئی تھی۔ ان دنوں اُسے دفتر کا وقت جانے کا بھی خبط ہو گیا تھا۔
ایک دن ایک دوست نے اسے ٹوکا۔
"کیا کسی سے وقت مقرر کیا ہوا ہے تم نے ـــ ؟" وہ چونک گیا تھا۔
"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔
اس غیرارادی حرکت کی ضرور کوئی وجہ تھی۔ اور اس دن تو حد ہو گئی جب اس نے ساتھ والا دروازہ بلاوجہ کھٹکھٹا دیا تھا۔
دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ایک ستا ہوا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ وہ بوکھلا گیا اور اسے یاد آیا۔ ایک ایسا ہی چہرہ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا
ے محسوس ہوا کہ وہ ان کے راز کو جانتا ہے۔
اس دن اس نے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کیا اور رات کو بڑے جذباتی موڈ میں ایک مفصل خط لکھا۔ مگر پھر وہ خود بھی پریشان خیال
یا اور دو راتیں اس نے اتنے سگریٹ پیئے کہ وہ بیچ بیچ بیمار ہو گیا۔ آخر اس نے ایک دوسرا جنرل لیٹر لکھنے کا فیصلہ کیا۔
مگر ابھی تو اس کو اس کے اپنا ہی جواب آ پہنچا۔ وہ اس وقت دھوپ میں بیٹھا ہوا مصروف سوچ رہا تھا۔ سامنے ہی کھلا ہوا ملا کیا دیکھا میں نے پھرے
اس کی بیوی غسل خانے میں کپڑے دھو رہی تھی۔

اچانک اس نے ان سے پوچھا۔

"چراغ دین تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"دس بچے ہیں سرکار۔"

"ایک لڑکے اور تین لڑکیوں کا بیاہ کر دیا ہے۔"

"باقی ابھی چھوٹے ہیں۔"

"کتنی تنخواہ ملتی ہے؟"

"وظیفہ سو روپے سرکاری تنخواہ ہے۔ کچھ پرائیویٹ کام کر لیتا ہوں۔ مگر کتنی کٹ ہے ان کاموں میں؟"

"پھر نرسری میں بھی کھپا کرتے ہو گے؟"

"آپ کے بچے جیسی یہ کام بھی نہیں کیا سرکار۔"

"تم اتنے بچے کیسے پال رہے ہو۔ اور چاروں کی شادیاں کیسے کیں؟"

"آپ کے بچے جیسی غریب آدمی ہیں خوشی میں سب کچھ جھگتا لیتے ہیں۔"

"تم اچھے آدمی ہو چراغ دین۔" اس نے بے ساختہ کہا تھا۔

"دعا ہے سرکار آپ کے بچے جیسی کوئی چار آرٹ ہو تو اسے دیکھئے گا۔ معلوم ہوتا ہے اس دلی یا بہت پہنچے گا۔"

"سب دوں گا۔" اس نے بڑے [illegible] کہ اس کی نگاہوں کے سامنے اس وقت کئی چہرے گھوم رہے تھے۔ بوڑھے ہوتے جوان ہوتے معصوم و محروم۔ سنتے ہوتے شاداب اداس مدقوق۔ اس کے ذہن میں غبار سا اٹھا۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ اس نے کئی بار سوچا تھا بہت سا روپیہ جمع کرے بہت سا اپنی سلری کی ساری تنخواہ جمع کر رکھے۔ مگر پھر اسے خیال آیا لیکن تو روپیہ سالہا سال میں جمع ہو گا۔ اور اس کا یہ عمل ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی سمندر پاٹنے کو ریت کا ایک ذرہ اس میں پھینک دے۔ وہ دل برداشتہ ہو گیا تھا اور اپنی پوری تنخواہ کچھ ماہ پہ [illegible] اپنے دوستوں پر اڑا دیتا تھا۔ اس طرح اسے سکون ملتا تھا۔ آخر روپیہ کیوں جمع کیا جائے۔ اس کی نظریں ابھی تک ان پر جمی تھیں [illegible] خط کا مضمون جل چکا تھا۔ تبھی کہ ابا جی پہنچے۔

"یہ لو اپنا بیہودہ خط۔" انہوں نے خط اس کے سامنے ڈال دیا تھا۔

"تمہیں ایسا خط نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ میں نے سب پتہ کر لیا ہے۔ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ تمہارا بیاہ وہاں نہیں ہو سکتا۔"

"میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"یہی کہ ابھی شادی نہیں کروں گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ وہ جگہ اچھی نہیں۔ ہم خود تمہارے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں [illegible] کر رہے آگے تو کوئی اعلیٰ [illegible] تمہاری عادت ہے۔ ہم نے تمہاری تنخواہ پر [illegible] سال [illegible] کوئی شجرہ نسب

کے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا کہ اباجی کے پاس ہے۔ کہہ گئے:

"سمجھ گیا ہوں مگر ایسے بہت یہاں بھیجنے کی ضرورت نہیں میں فی الحال شادی نہیں کروں گا۔"

"کیوں؟ — پیسہ دھیلا نہ ہوگا؟"

"کہاں سے کھاؤ گے بے چارے کر —"

"روپے پیسے کی میرے سامنے کوئی حقیقت نہیں، ابھی پیسے اُٹھا دیتا ہوں۔"

"یوں تمہارا بیاہ کسی اونچے گھرانے میں نہ ہو سکے گا؟"

"نہ ہو۔ مجھے پرواہ نہیں۔ میں کسی غریب لڑکی سے شادی کروں گا —"

"اور میں نے خون پسینہ ایک کرکے اپنی ساکھ بنائی ہے —"

"ایسی جھوٹی ساکھ پر لعنت ہے جو انسان کو زندہ درگور کر دے۔"

پھر اچانک وہ اداس ہو گیا تھا۔

"اباجی ہمیں پڑھا لکھا کر آپ کو ساکھ بنانے کی فکر کیوں لاحق ہو گئی تھی۔ اگر ہم وہی معمولی آدمی رہتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ ہم ہر لحاظ سے آسودہ اور مطمئن ہوتے۔ کیسی متوازن اور نارمل زندگی ہوتی۔ اباجی آپ نے کبھی سوچا، آپ کیا کر رہے ہیں — آپ کن شہزادوں کے انتظار میں ہیں آپ کس سمت میں ہیں اور ہم کہاں ہیں۔ ہمارے پاس کھڑے رہنے کو زمین نہیں۔ اباجی ہم خلا میں معلق ہیں خلا میں۔"

"مجھے فلسفہ نہ پڑھاؤ۔ میں خود بہتر جانتا ہوں۔ اس وقت تم سب باعزت ہو، اپنے پاؤں پر کھڑے ہو۔ مجھے کوئی فکر نہیں۔"

"پھر آپ کچھ نہیں جانتے۔ کچھ نہیں۔ یہ جھوٹا وقار، جھوٹی ساکھ۔ محرومیوں اور بے اطمینانیوں کی لمبی داستان۔"

اس کے اباجی چائے پی کر رخصت ہو گئے۔

اگلے دن اس نے اسے دیکھا وہی پھیکا اور اداس چہرہ —

وہ حیران ہوا یہ بے رونق چہرے ہر جگہ موجود تھے۔ ہر شہر، ہر محلے، ہر گلی، ہر مکان میں۔ لیکن بہت سے خوش اور مسرور چہرے بھی تھے اصلی، نارمل۔ اس کا دل بجھ سا گیا۔

وہ کہاں تک ہمدردی جتلائے گا۔ کس کس کے لیے ایثار کرے گا۔ پھر اس میں کوئی خصوصیت بھی تو نہ تھی وہ لڑکی جانے کب سے کس کس راہ کو بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اسے کب سے منزل مل جانے کا انتظار تھا، اور اسے کب تک یہ انتظار کرنا تھا۔ اس نے سوچا اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

جس دن اسے تبادلے کے آرڈر ملے وہ بڑا خوش تھا۔ وہ اس جگہ سے بھی اکتا گیا تھا۔ جونہی وہ گھر میں داخل ہوتا اس کا دم گھٹ سا جاتا۔

مگر اب وہ مطمئن اور خوش تھا۔ وہ جا رہا تھا۔

وہاں بھولی بستیوں کا جگمگاتا نکھار تھا۔ حسن، ذوق اور شعور۔ وہ ان چھوٹے رشتہ داروں کو قطعی بھول چکا تھا — جو مکان کے دوسرے

صحن میں کھلتا تھا مگر اب وہ انہی روشندانوں کو دیکھ رہا تھا۔

جہاں سے کچھ دیر پہلے اس نے ایک آواز سنی تھی جو ایک گھٹی گھٹی غیر انسانی چیخ کی صورت میں اس تک پہنچی تھی۔

"میں مر جاؤں گی۔۔۔ ہم نہیں مرے۔۔۔ میں۔ مر۔۔ جاؤں گی۔۔۔ ہم سب زندہ ہیں۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی"

پورا محلہ اس دھماکے پر پراگندہ ہوا تھا۔

"کیا تماشا بات ہوگئی" "کیا شور ہے" ۔کس کی چیخیں ہیں۔ "بس کیسا دورہ" ۔ہسٹریا کا دورہ۔۔ ہسٹریا۔ ہسٹریا۔ ہسٹریا۔

مختلف قسم کے سوال اور جواب باہر گردش کر رہے تھے۔

اور وہ اپنے بندھے ہوئے سامان کے درمیان بیٹھا اس چھوٹے روشندان کی طرف دیکھ رہا تھا کسی بے تعلق اجنبی کی طرح ——

مارا پانی

رگندر پال

ہم سب بہت خوش ہیں کہ وہ مر گیا ہے ۔ ہماری کبھی کبھی روحیں ماتمی بشاشت سے جی اٹھی ہیں اور ہم سارے کے سارے
۔ آگے پیچھے، آس پاس، ہر جانب اتنے انسانی سر نظر آ رہے ہیں کہ کسی خاص شخص کی پہچان غیر اہم معلوم ہوتی ہے
۔ اُس کے جنازے کے ساتھ جا رہے ہیں، نہیں، جا نہیں رہے ہیں، بہہ رہے ہیں کہ ہمارے جانے میں ہماری
د کو دخل نہیں، ہم از خود چلے جا رہے ہیں، جیسے پانیوں میں سیلاب آ گیا ہو اور وہ اپنی بے رضا مسرت سے جھوم جھوم
نار وں سے باہر آ رہے ہوں اور اُن کے کندھوں پر لاش ہو ۔ اور کندھوں پر لاش نہ ہو تو اُن کی اس خالی خولی
م اجسام کو دیکھ دیکھ کر ہمارے ذہن میں سب سے پہلے یہی لاش ابھرے (اور صوری تصویریں اس لیے زیادہ مکمل ہوتی
کہ سب سے پہلے اُن میں وہی نظر آتا ہے جو موجود نہ ہو ۔)

ہم انبوہ کے انبوہ بہہ رہے ہیں اور یہ فراوانی اپنے آپ سے بھر بھر کر ساگر کا غیر آباد سماں پیش کر رہی ہے اور
ساسات کی اس طغیانی میں کسی ایک احساس کی پہچان بھی ممکن نہیں ۔

کوئی ایک بوند پانی دے دو خدارا!

نہیں، ہمت ہے تو سارا ساگر پی جاؤ۔

کاش، ہم مچھلیاں ہوتے اور رنگین جذبوں کے پہاڑ کے پہاڑ پیتے رہتے!

پر کیا ہم مچھلیاں نہیں ہیں؟

کاش ہم انسان ہوتے!

تو ہم واقعی مچھلیاں ہی ہیں اور سارے ساگر میں صرف ہم ہی ہم ہیں، کوئی ایک بھی انسان نہیں ۔

ہماری آبادی بے شمار ہے اور چلتے پھرتے ہم اپنے بچے جنتے رہتے ہیں اور بچے زخمی رہے ہوں تو ان کے جننے
ے اسباب کرتے رہتے ہیں اور ہمارا ہجوم آنا پڑا ہے کہ ویرانی ہی ویرانی کا منظر پیش کرتا ہے ۔

ؤ مچھلیو، اُس کا آخری دیدار کر لو ۔ ہمارے بہادر نے ہمارے لیے اپنی جان قربان کر دی ہے ۔ کیا تم پسند نہ کرو گی
ہم کہ تمہیں اس شہید کا ایک بال ہی مل جائے، یا ناخن، یا کچھ اور، جسے تم اور تمہارے بچے سنبھال کر رکھیں ۔ ۔؟

آگے بڑھو اور جسے بھی بنے اس کے پیکر پر زور پر ہاتھ مارو، ایسے موقعے روز روز نہیں آتے ــــ بڑی عقیدت سے ان
ے کچھ اور نوچ کر ہڑپ کر جاؤ اور اپنے پیٹ میں محفوظ کر لو ۔ ایسے نوجوان شہید کی یادگار پیٹ میں محفوظ ہو تو بڑی ..

نصیب ہوتی ہے۔

——— تو پھر!

تو پھر یہ ہوا کہ ہمارے ہیرو نے آناً فاناً دشمن کے دس کے دس جہاز گرا دیئے مگر دشمن (؟) کے گیارہویں ہوائی جہاز نے

—اگر گیارہواں نہ ہوتا تو بارہواں ہوتا ——— اُسے ———

تو کیا وہ اسی وقت چل بسا؟

ہاں۔

(وہ اگر اُسی وقت چل بسا تھا تو اب ہم کس کے ساتھ جا رہے ہیں؟ ——— اپنے ہی ساتھ!)

یہ جو ملا ہے نا؟ — یہ ہماری خاطر مرا ہے اور ہم رو رہے ہیں اور رو رو کر ہمیں بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے

——— یہ ہمارا کون تھا؟ بھائی، شوہر، محبوب، دوست؟ یا صرف واقف کار؟ کون تھا؟ نامعلوم کون تھا۔ تھا بھی

بھی نہ تھا۔ ہم اس سے کبھی نہیں ملے، کبھی اسے گلے نہیں لگایا، کبھی جھگڑا نہیں کیا، ہماری کبھی اس سے بات بھی نہیں ہوئی

——— شاید ہم میں سے کسی نے کبھی اسے لین دین میں دیکھا ہو۔ بعض نے غور سے دیکھا ہو تو اسے صاف پتہ معلوم ہوا ہو کہ یہ

فلائیٹ لیفٹیننٹ ہے۔

کون فلائیٹ لیفٹیننٹ؟

جان مسیح، جاوید، جسونت، ل دھر،

کون؟

ہمارے پڑوس کے ان دو ننھے منے بچوں کا مرحوم باپ، جو گذشتہ سال فرض پر کام آ گیا تھا؟ مرحوم کے نام اس کے

معصوم بچے ہر سوموار کی صبح کو اسکول جاتے ہوئے ایک ننھی منی چٹھی پوسٹ کرتے ہیں جسے انہوں نے اپنی ماں کی مدد سے اتوار کو

لکھا ہوتا ہے، ڈیڈی، ہم دونوں اب دوسری اور تیسری کلاس میں آ گئے ہیں ——— آپ واپس آ جائیے، اب مزہ نہیں آتا

——— امرو سے دیکھ بہادر ہوں، ان کے بس میں کیا ہوتا ہے؟ ہمارا اجیتی آجکل بڑا چڑچڑا ہو گیا ہے۔ ہر وقت بھونک بھونک

کر ان میں کتا رہتا ہے، ڈیڈی کہاں ہو ———

اور ان بچوں کی ماں خود ہی ان کی چٹھی کا جواب لکھ کر ہر منگل کی سہ پہر کو پہلے خود انہیں پڑھ کر سناتی ہے اور پھر ان

سے کہتی ہے، لو اب تم پڑھ کے مجھے سناؤ ———

آج اتوار ہے۔ وہ دونوں بچے اپنی ماں کی لکھائی ہوئی رف چٹھی کو فیئر کر رہے ہوں گے۔ اگر وہ بھی اس بھیڑ

میں موجود ہوتے تو یہ جم غفیر، نجانے بے صبری میں ان معصوموں کو روند دیتا۔

سنبھل کے چلو!

ایک زرد عورت اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کو بڑی دقت سے بچا بچا کر چل رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر بے اختیار اس

مل سی لڑکی کا خیال آنے لگتا ہے جس کے دولہا کو شادی کی رات کے اگلے ہی دن محاذ پر جانے کا حکم ہو گیا۔

تم کہاں جا رہے ہو؟ صبح کرشن دلہن نے پوچھا۔ میری تو کسی سے لڑائی نہیں۔

اطمینان رکھو، ڈارلنگ۔ بس دو ہی ماہ میں لڑائی ختم کر کے لوٹ آؤں گا۔

دو ماہ! وہ حیران تھی کہ کوئی دو مہینے لگاتار کیسے لڑائی کئے جا سکتا ہے۔ بس غصہ آیا، گیا، مگر ہماری لڑائیاں غصے سے بغیر لڑی جاتی ہیں۔

اطمینان رکھو ڈارلنگ، صرف دو مہینے —

اور اطمینان رکھ رکھ کر ڈارلنگ کا پیٹ اب اپنے شوہر کے بچے سے پھٹنے کو آ رہا ہے، مگر اُس کا شوہر لاپتہ ہے۔ بیدا پتو دلہن کی کوکھ میں آچھپا ہو کہ نیک شوہر بننا نصیب نہیں ہوا، نہ سہی، اپنی بھولی دلہن کا کھلونا ہی بن جاؤں۔

لیکن سبھی شہید اپنے اپنے سماج کے کھلونے ہی ہوتے ہیں، کبھی ایسے کھلونے، کبھی ویسے۔ آجکل تو بڑے امن پسند ملکوں میں بھی فوجی کھلونوں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔

دیکھا؟ ایسے لڑا جاتا ہے! شاباش، یوں! مار دو! جاؤ ست مار دو! نہیں تو دشمن (؟) تمہیں مار دے گا۔ شاباش! — اب صابن سے ہاتھ صاف کر آؤ۔ شاباش!

ٹھہ — ٹھہ — ٹھہ!

ٹھہ!

کھلونے کی چابی ختم ہو چکی ہے مگر بچہ لوگ بدستور خوشی سے تالیاں پیٹ رہے ہیں۔

چابی دو بیٹا! اور چابی دو، اور، اور —

اور اس قدر چابی سے کھلونے کی ساری کی ساری کل ٹوٹ جاتی ہے۔

کتنا پیارا کھلونا تھا!

ہمیں بڑا افسوس ہو رہا ہے۔ ہم تقریباً رو دیئے ہیں۔

نہ رو، بچو! وہ دیکھو چندا — وہ دیکھو! آؤ تمہیں موٹر میں سیر کروا لائیں — آئس کریم کھاؤ گے یا فروٹ سیل؟

ہم اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرف بڑے افسوس سے دیکھ رہے ہیں، اُسے دیکھ دیکھ کر بڑی معصومیت سے افسوس کرنا بھول گئے ہیں۔ ہم افسوس کر رہے ہیں۔ مگر ہمیں افسوس نہیں ہو رہا ہے۔ اور ہم بڑے مطمئن ہیں کہ ہم افسوس کر رہے ہیں۔

ہمیں اپنی قوم کے اس سپوت پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔ ہمارے اس سپوت کا باپ کہاں ہے؟ چھوڑو، ایک باپ کا کیا؟ ہم سب جو یہاں موجود ہیں۔ ہمارے سپوت کی جرأت کی روداد سنہری حرفوں میں لکھی جائے گی (کالے حرفوں میں کیوں نہیں؟ سنہری حرفوں کو پڑھ پڑھ کر نظر کو نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا؟)

ڈر کے مارے کانپتے ہو؟ — کیا — کیا —؟

نہیں، ہمیں اپنی قوم کے اس دیر بیٹے پر ناز ہے۔
قوم کا باپ بھی ہمارے ماتمی جلوس میں موجود ہے۔
مقدس باپ، آپ تھک گئے ہوں گے۔
نہیں بیٹی، میں تا دمِ آخر جلوس میں رہوں گا۔
آپ آرام کیجیے مقدس باپ۔ جلوس میں رہ کر آپ کیا کریں گے؟
میں! پھر کیا کر سکتا ہوں بیٹی، اب کیا ہو سکتا ہے؟
——— زندہ باد!

خودکار کھلونوں میں جان نہیں ہوتی، اس لیے اُن کے مر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کھلونے غیر فانی ہوتے ہیں۔
لیفٹ رائیٹ لیفٹ ——— لیف ——— لیفٹ ——— لیف ——— ل ———!
ار ... ! رک جاؤ! دو دیکھو دو قدم پر پہاڑ کا عمودی کنارا ہے ———
خودکشی مت کرو! دیکھو ——— ٹھہرو ——— ٹھ ———!
لیفٹ رائیٹ لیفٹ ——— لیف ——— لیف ———!
ناقابلِ یقین!

ہم نے آج صبح کے اخبار میں اپنے وار ہیرو کی تصویر دیکھی تھی۔ سب وار ہیرو ایک ہی جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے خوبصورت۔ انہیں دیکھ کر پہلے تو یہ خیال آتا ہے کہ وہ ہمارے ہی ہیں اور پھر یہ کہ وہ ہم سے چھن گئے ہیں۔

ہم سب ناشتہ کر رہے تھے اور میری نظر ناشتے کی میز پر سب لوازمات پر لگی ہوئی تھی۔ وہاں رکھے ہوئے تازہ اخبار کے پہلے صفحے پر اس کا فل سائز فوٹو دیکھ کر مجھے بریک فاسٹ بڑا اچھا لگنے لگا اور منہ سے چائے کا کپ لگائے میں اپنی آنکھوں سے گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگی۔ چائے کا پیالہ خالی ہو گیا مگر میں اُسے بدستور منہ سے لگائے رکھی۔ اُس کی تصویر کو دیکھتی رہی گویا وہ زندہ بیٹھا ہو، چائے کے خالی پیالے سے بدستور بھاپ اُٹھ رہی ہو۔

ہر وار ہیرو مجھے اپنا عاشق معلوم ہوتا ہے۔ میں دُنیا ہوں؟ اور وہ اس لیے لڑتا ہے کہ کسی طرح میرا دل جیت لے اور مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میرے عشق میں اس نے جان کی بازی لگا دی ہے۔ میں دنیا ہی ہوں۔ اور خوشی سے سرشار ہو ہو کر میری آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں۔

اس ماتمی جلوس میں ہم سب کی بھری بھری آنکھوں میں ہماری شاہراہوں کے جھنڈ کے جھنڈ بال ڈے سوم کے لیے اترتے ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ ان ان گنت لوگوں کی آنکھیں ان سے دو چند نہیں۔ سب کی صرف ایک آنکھ ہے، ایک سمندر ہے، اور اس سمندر میں بے حساب چھوٹی بڑی مچھلیاں تیر رہی ہیں اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنی خوشی سے بڑی بڑی خوشیوں کے منہ کی خوراک بن کر چلی آ رہی ہیں۔ وہ انسے کہ مگھی ہے اور وہ ... وہ ——— وہ ——— اور سمندر جوں کا توں آباد ہے، جوں کا توں

بھرا ہے، اتنے پانی میں آنسو کی ایک بوند بھی نہیں۔
رؤ سمندر، تم اتنے خشک کیوں ہو؟
میں جنازے کے قریب چلی آئی ہوں۔

ارے! یہ وہ تو نہیں جس کا فوٹو میں نے آج صبح اخبار میں دیکھا تھا ——— یہ کوئی اور ہے۔ کوئی اور ہے تو کیا؟ یہ بھی کوئی شہید ہے۔ سب شہید ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لاشوں کی پہچان صرف یہی ہے کہ وہ لاشیں ہیں۔ الگ الگ پہچان تو زندہ لوگوں کی ہوتی ہے، اور زندہ لوگ اس قابل ہی کہاں ہوتے ہیں کہ انھیں پہچاننے کی خواہش کی جائے۔ زندوں کی جانب میری نظر نہیں اٹھتی۔ اس لیے میرے عاشق ہنستے کھیلتے جان دے دیتے ہیں اور پھر میں بڑی محبت اور مسرت سے اُن پر اپنی آبدیدہ نگاہیں جمائے بیٹھی ہوں (میں بیٹھی ہوں)۔

میں نے اپنے وجود کے سارے پیار کو اپنی بینائی میں سمیٹ کر جنازے کی طرف دیکھا ہے۔ اب یہاں کوئی اور ہی نظر آ رہا ہے! (لاشوں کو اس لیے فوراً دبا دیا جاتا ہے کہ اُن کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں) یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس شہید کو جنازے سے ……کر ماضی کے سبھی شہید اس کے اعزاز میں اپنی جانیں شرکت کے لیے باری باری آسمانوں سے اتر رہے ہوں ——— مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے! آسمان تو خلاؤں کا نام ہے۔ ہمارے خلا بازوں نے تو کبھی یہ رپورٹ نہیں دی کہ وہاں انھوں یا بزرگوں کی روحوں نے اُن کا استقبال کیا، یا انھیں دیکھ کر کہیں چھپ جانے کی کوشش کی۔ یا کم سے کم انھیں وہاں روحوں کی موجودگی کا شک ہی گزرا ——— نہیں، اصل بات یہی ہے کہ میں دنیا ہوں اور اپنے ایک عاشق کو دار پر دیکھ کر خوش ہو ہو کر مجھے بے اختیار یہ چاہ ہوتی ہے کہ ذرا نظر اٹھا کر باری باری ——— نہیں، بیک وقت سبھی کو دیکھ لوں۔ ان عاشقوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے اپنے یقین پر یقین آ جاتا ہے کہ میرا حسن لازوال ہے۔ آپ کو شک ہو تو بتائیے میری شہادت کے لیے تاریخ کی جلدوں میں اضافہ کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ دیکھیے اور میرے عاشقوں کو اک فدائی کر ہی دکھا دیجیے۔ آپ کو مان جاؤں گی۔

میرے عاشق میرے لیے جاں بحق جان دے دیتے ہیں تو مجھے بہت مسرت ہوتی ہے مگر مجھے تعجب بھی ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں (میں لافانی ہوں اس لیے فانی لوگوں کی نفسیات سمجھنے میں مجھے بہت دقت ہوتی ہے)۔

آپ آج کے لوگ ہیں آپ کو شاید پتہ نہ ہوگا کہ بربریت کے دور میں بھی کوئی جوان کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر دیوانہ وار اسے ناچنے لگتا اور ناچ ناچ کر پہاڑوں سے کود جاتا، ندیوں میں چھلانگ لگا دیتا، اپنے آپ کو خونخوار جانوروں کے آگے ڈال دیتا ——— آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ کیا محبت کا دم بھرنے کی یہی ایک ادا ہے؟ ——— مگر آپ مجھے غلط نہیں سمجھیں گے۔ مجھے اپنے پاگلوں کی یہ ادا دراصل بہت پسند ہے، اسی لیے میرے عاشقوں کو بھی مر مٹنا اس قدر پسند ہے۔ عشق میں مر مٹنا یہ سب محاورہ ہے، یہ کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ عاشق مر مٹ کر بھی زندہ رہے۔ نہیں جی، میں محاوروں کے خودکار تدبر کا قائل نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کوئی مر بھی جائے اور پھر بھی زندہ بھی رہے۔ اگر ایسا ہونا ممکن نہیں تو ان بے چاروں نے زندگی کا مطلب موت سے کیونکر اخذ کر لیا ہے؟ ——— اس بات کا مجھے بڑا دکھ ہے کہ میرے سبھی عاشق بے حد احمق واقع ہوئے ہیں اور جو کچھ

نہیں وہ مجھ سے عشق نہیں کرتے۔ مجھے داشتہ بنا کر گھر میں ڈال سکتے ہیں۔

(میں دُنیا ہوں۔)

زندہ باد!

بے وقوفو! تم نے کس میں باندھ کر کیا اس لیے ناچتے ہو کہ وہ سدا زندہ رہے گا۔ مگر [illegible] ہم کو اتنا گرم ہے جو پا کر ہم نے بار بار کر دینا چاہا ہے کہ وہ زندہ ہے اور خوش ہوں کہ وہ مر گیا ہے۔

میں ساری کائنات ہوں اور ساری کی ساری اپنے محبوب ہیرو کے اس ماتمی جلوس میں جا رہی ہوں۔

ساری کی ساری؟

ہاں، ساری کی ساری یہاں بھی ہوں —— صرف ایک میں یہاں نہیں ہوں۔

آپ ——؟

ہاں میں۔۔ جنے والے سے شادی کئے ابھی مجھے پورے تین ماہ بھی نہیں ہوئے۔

ویری ساری میڈم! ویری ساری ان ڈیڈ! —— (شہیدوں کی موت پر افسوس کے اظہار سے کسے مسرت نہیں ہوتی!)

—— آپ کا غم ہم سب کا غم ہے میڈم!

آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟ میں —— میں تو یہاں نہیں ہوں۔ یہاں کھڑی ہوں لیکن کہیں نہیں ہوں —— میرا وہ نہیں رہا تو میں بھی نہیں رہی!

(تو آپ اگلے نسل کی شاندار تقریب پر ملک کا سب سے بڑا اعزاز کسے پیش کیا جائے گا؟)

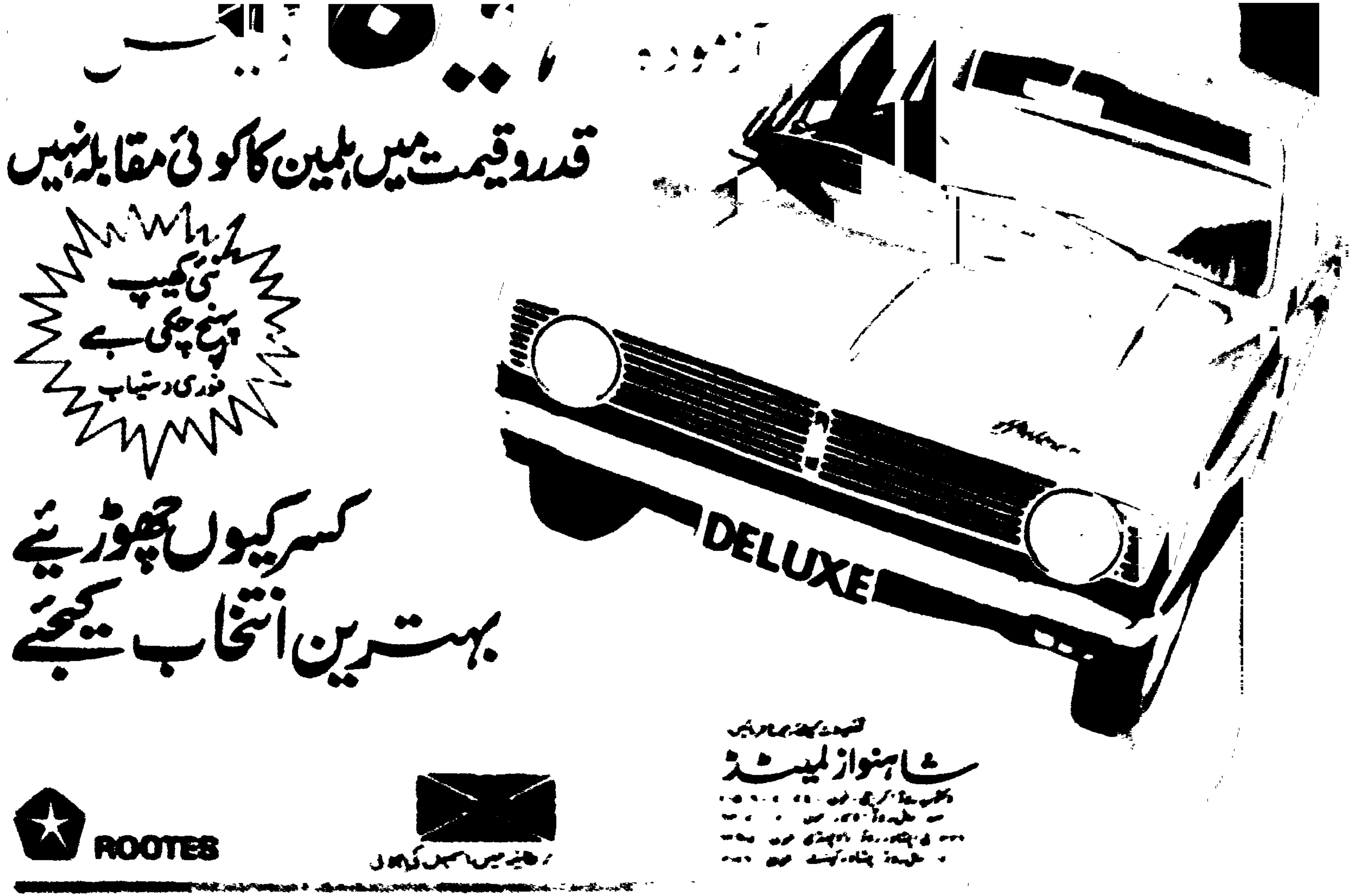
اے لوگو! الجھاؤ نہیں، میں نہیں رہی: میں تو ہوں۔ (میں دُنیا ہوں، میں ہمیشہ رہ جاتی ہوں!

کم از کم یہ تسلی، تمہارے آنے میں ذرا سی دیر بھی ہو جاتی تو میں خودکشی کر لیتی۔


برما شیل اب پاکستانی کمپنی بن گئی ہے
PBS
خدمت کا نشان
پاکستان برما شیل


مزے کی کیا بات ہے میرے سگریٹ میں
Woodbine
یہ نہ زیادہ تیز ہے نہ بہت ہلکا
اسی لیے میں وڈبائن پیتا ہوں۔ یہ بہترین تمباکو کا لاجواب بلینڈ ہے
ہمیشہ تازہ۔ اس کا مزہ کبھی نہیں بدلتا۔ آپ بھی وڈبائن پی کر دیکھیے
وڈبائن
بہترین تمباکو کا لاجواب بلینڈ




قدر و قیمت میں ہلمین کا کوئی مقابلہ نہیں
نئی کھیپ
پہنچ چکی ہے
فوری دستیاب
کسر کیوں چھوڑیئے
بہترین انتخاب کیجئے
DELUXE
شاہنواز لمیٹڈ
ROOTES

نظمیں غزلیں

چشم بستہ بیداری

جوش ملیح آبادی

کل، جو، پچھلے پہر، اُڑی بجلی
شمع، ہم نے جلائی، دیے کی
اور جلا کر، جھکا دیا پھر اُسے
گرم قطرے، پلیٹ پر ٹپکے
نور کا اِک منارہ پھر بن کر
جم گئی شمع۔ اپنے اشکوں پر
دیدنی تھا، وہ شمع کا عالم
شعلہ بر فرق و اشک، زیرِ قدم
ذرا برس کے، جل گئی بتی
دو گھڑی میں، پگھل گئی بتی
اے انجامِ نور افشانی
آگ سی چیز۔ بن گئی پانی

(۲)

یونہی، جلتے رہے ہیں، جوشؔ، مُدام
نوعِ اِنساں کے مُحسنانِ کرام
آتشِ غم کا قہر، جانوں پر
آبِ حرفِ نکو، زبانوں پر
بخشتے ہیں نفوس کو قندیل
شاعران و مُفکرانِ جلیل
اپنی قندیلِ جاں بُجھاتے ہیں
دوسروں کے دیے جَلاتے ہیں
جو۔ چراغاں، دلوں میں کرتے ہیں
جل کر، اپنی لَوؤں پہ مرتے ہیں
بحرِ ماتم میں، ناؤ کھیتے ہیں
نغمہ کاری کا دَرس دیتے ہیں
جو، خدمت میں غرق ہوتے ہیں
دوسروں کو، جگا کے سوتے ہیں
موت سے بھاگتی ہے اُن کی نیند
تا اَبد جاگتی ہے اُن کی نیند

مفرداتِ ذات

حفیظ جالندھری

صورتِ شمعِ انجمن تنہا
کون ہے -؟ میں ہوں ایک تو تنہا

میں کہ اب دَر بہ دَرِ میکدہ و میکدہ ہوں
اہلِ مسجد کا ستایا ہُوا۔ آفت زدہ ہوں

ہر نفس گمرہی کی راہوں میں ——— گم گشتہ گنی گناہوں میں

نہ پوچھو کہ انسان کیا چاہتا ہے
سمجھ لو۔ کہ شیطاں کیا چاہتا ہے

کچھ مزا آنے لگا اب دوستو ——— ہاں مسلسل نیشِ عقرب دوستو

سنتا ہوں جہنم کی سزا میرے لیے ہے
میں ایسا گنہ گار —! یہ کیا میرے لیے ہے

کیا خاکسار ہم سے سوا مل گیا تمہیں
ہم کو ملا کے خاک میں کیا مل گیا تمہیں

بازارِ حُسن کی صبح

جوش ملیح آبادی

خورشید طلوع ہو رہا ہے
بازارِ جمال سو رہا ہے

جھونکوں میں رواں دواں ہے مہکا
نیندوں سے پٹا پڑا ہے بازار

کوٹھوں کی شمیمِ زُلفِ پیچاں
اُمواجِ نسیم میں ہے غلطاں

بام و در میں بحسن و خوبی
خوابیدہ ہے گونج تالیوں کی

قدموں سے تپاں تھے جن کے سینے
آسودۂ خواب ہیں وہ زینے

سیلی سی مہک ہے رہ گزر میں
سونی سی کھنک ہے بام و در میں

سر پر جلووں کی بارگاہیں
جن سے جھپکتی ہوئی نگاہیں

غلطیدہ خیال میں بصد ناز
بجتی ہوئی چوڑیوں کی آواز

آتی ہوئی بام و در سے ہر بار
اُترے ہوئے گھنگروؤں کی جھنکار

ڈوبے ہوئے نغمہ داں کے تارے
سوئے ہوئے یار کے اشارے

ٹوٹے ہوئے جام اور پیالے
ذرات پہ گردنوں کے مالے

بالائے فضا سے نیم تاباں
نغموں کے خطوط ہیں درخشاں

پھندوں کے بنے ہوئے نگارات
گل بار ہیں راہ کے مسامات

اُلٹے ہوئے رہ گزر میں گھونگھٹ
"سا رے گا ما" کی تھرتھراہٹ

پگھلی ہوئی شب کی ساعتوں کے / تا دُور لگے ہوئے ہیں تودے
تا حدِ نظر، بچرخِ گرداں / پرچھائیاں بھاؤ کی ہیں رقصاں
جھونکوں میں گُندھی ہوئی ہیں تانیں / بانہوں کی ہوا پہ ہیں، کمانیں
گیتوں کے پُرے رواں دواں ہیں / بولوں کے کشا و پرفشاں ہیں
محراب میں کیفِ شب کی باتیں / چھجوں سے ٹپک رہی ہیں راتیں
کیا طُرفہ طلوع کا سماں ہے / بازار پہ رات کا دُھواں ہے
اک لرزہ ہے قدسیوں پہ طاری / بستر پہ ہے کسنا وگاری
ظلمت بھاری ہے، نور ہلکا / کرنوں میں لگا ہے یوں دُھندلکا
صبحِ شب بستر رو رہی ہے / جاگی ہوئی رات سو رہی ہے
خورشید سے لَو نکل رہی ہے / اور رات کی نبض چل رہی ہے

کیا چشمۂ سحر اُبل رہا ہے
بجھ کر بھی چراغ جل رہا ہے

سیّد عابد علی عابد

○

اُٹھے تو منزلِ رسن و دار دیکھ کر
بیٹھے تو ان کا سایۂ دیوار دیکھ کر

قیمت متاعِ حسن کی تھی جنس آرزو
دل بڑھ گیا تھا مصر کا بازار دیکھ کر

پاؤں میں آبلوں کے جواہر جڑے ہوئے
آیا ہوں عاشقی کا چمن زار دیکھ کر

چکر نہ دے رہا ہو ہمیں راہ بر کہیں
رہبر سے ہوشیار! خبردار! دیکھ کر!

کرتا ہوں نذر ہدیہ جاں باصد اشتیاق
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

دن کو تو میں کراہ بھی لیتا تھا گاہ گاہ
چُپ ہو گیا ہوں رات کے آثار دیکھ کر

رگہائے جاں میں چبھتی ہیں ٹیسیں جھکی ہوئی
گم ہوں طلسمِ ناز کے اسرار دیکھ کر

کچھ ناگ کا بھی زہر تھا جامِ شراب میں
لہرا رہا ہوں خود کو سرِ دار دیکھ کر

منزل کا کچھ سراغ نہ عابد ہمیں ملا
بڑھتے گئے نشانِ رہِ یار دیکھ کر

ہَوا

احمد ندیم قاسمی

یوں تو دھرتی پر ازل سے سایہ افگن ہے ہوا
خاک سے دامن کشاں ہے کتنی پُرفن ہے ہوا
اس کا منصب یوں تو ہے مشاطۂ گلزار کا
جب سرِ صحرا پہنچتی ہے تو جوگن ہے ہوا
یہ عناصر کا وہ مظہر ہے کہ جس کے لاکھ روپ
چیخ ہے، نغمہ ہے، سرگوشی ہے، شیون ہے ہوا
یہ سمیٹے جا رہی ہے کتنے قدموں کے نقوش
کتنی رہزن، پھر بھی کتنی پاک دامن ہے ہوا
زرد پتے شاخ سے گرتے ہیں جب روتے ہوئے
سوچتا ہوں — کتنی آوازوں کا مدفن ہے ہوا
جب ہوا چلتی ہے یادوں سے مہک اٹھتا ہے ذہن
نکہتیں جتنی بھی ہیں ان کا نشیمن ہے ہوا
کھل گئے ہیں ایک جھونکے سے کئی چہروں کے پھول
آج کی شب چاند نکلا ہے کہ روشن ہے ہوا
اس نے انسانوں سے کچھ سیکھا تو کیا سیکھا ندیمؔ
پربتوں کی دوست ہے آنگنوں کی دشمن ہے ہوا

احمد ندیم قاسمی

○

یوں تو کہنے کو ہے بدن بھی یہی
پیرہن بھی یہی، کفن بھی یہی

انتظار، ایک دردِ بے انجام
ہے محبت کا بانکپن بھی یہی

شہر کا حسن ہے چمن کی مثال
گھر میں جا بیٹھیے تو بن بھی یہی

دشت میں کس قدر مگن ہے غزال
آج سے ہے مرا وطن بھی یہی

گمرہی، اک ادائے معصومی
سادگی بھی یہی، چھبن بھی یہی

یہی رحمت، جو ہے خزاں کی دعا
دامنِ گل میں شعلہ زن بھی یہی

بات دل سے نکل کے دل میں بسے
زندگی بھی یہی ہے، فن بھی یہی

احسان دانش

چلمن کی دھوپ راہگزر تک پہنچ گئی
جلووں کی چھوٹ اہلِ نظر تک پہنچ گئی

نغموں کا فیض تھا کہ نشیمن رہا بحال
سَو بار برق شاخِ شجر تک پہنچ گئی

سَو سَو طرح کے رنگ بکھیرے گی صبحِ نو!
پہلی کرن تو دیدۂ تر تک پہنچ گئی

توڑے ہیں موسموں کے اثر نے کئی قفس
پرواز خاکِ بامِ قمر تک پہنچ گئی

کس نرخ پر نہ جانے متاعِ نظر بکے
یاروں کی آنکھ جنسِ ہنر تک پہنچ گئی

تعبیر ہو رہے ہیں جنونِ وفا کے خواب
موجِ سراب لعل و گہر تک پہنچ گئی

اب تک یہ کیوں نجومِ شبِ غم نہیں بجھے
بادِ سحر، چراغِ سحر تک پہنچ گئی

اللہ برقرار رکھے نظمِ کارواں
سب کی نظر مآلِ سفر تک پہنچ گئی

دانش چھپا سکو گے کہاں تک جنوں کے راز
اب تو یہ بات اہلِ خبر تک پہنچ گئی

معین احسن جذبی

○

حریفِ شب تو رہا دل عُروج ہو کہ زوال
نشاط میں مرے کامل فسردگی میں ہلال

وہی ہیں دشت و بیاباں وہی ہیں دیوانے
وہی ہے خواب سی منزل وہی ہے گردِ ملال

چھُٹے قفس سے تو لشکرِ چمن نے آگھیرا
قدم قدم پہ ہزاروں اُمید و بیم کے خیال

نہ جانے کون سی منزل ہے وہ کہ دل کہہ لے
تمام سُرخ و سیہ منزلیں فریبِ خیال

بڑی عجیب فضا ہے گھٹی گھٹی بوجھل
یہاں تو سانس کا لینا بھی ایک کارِ محال

عدم

○

سماں جوان ہو ۔ گیسو کھلیں ۔ شراب چلے
جنوں سلام کرے ۔ رقص ہو ۔ رُباب چلے

طلوعِ حشر کی ہمت ہے یہ ؟ کہ چار قدم
ترے خروشِ جوانی کے ۔ ہم رکاب چلے

فسانہ خواں ۔ جہاں چھوڑی تھی داستاں کل شب
وہیں سے آ کے ۔ کوئی جاں گداز باب چلے

تُو آدمی نہیں یارب کہ دل ہو تنگ ترا
تُو کبریا ہے ۔ ترے ساتھ تو حساب چلے

چلے تھے صحنِ حرم تک ۔ جو رہبری کرتے
وہ لوگ ہم سے سیاست بہت خراب چلے

وہ لوگ بھی ۔ ذرا خلق آشنا تو ہو جائیں
اگر حرم میں ۔ خرابات کا نصاب چلے

تری بھنویں نہ اگر کچھ مدد کریں اُن کی
نہ ماہتاب رواں ہو ۔ نہ آفتاب چلے

قسم خدا کی ۔ قیامت کا رنگ اُڑ جائے
کوئی حسین اُلٹ کر اگر نقاب چلے

چلا میں شہرِ عدم کو ۔ تو زندگی بولی
یہی جناب کی منزل تھی ؟ بس جناب چلے

عدم

○

کبھی تو ایسا بھی دستورِ خوشگوار چلے
فقیر تن کے چلے۔ جھک کے شہریار چلے

طبیعتیں ہی حسینوں کی جب ہوں شاہانہ
بتاؤ۔ کیسے فقیروں کا کاروبار چلے

غریبِ شہر سہی — یہ نہیں مگر ممکن
کہ مجھ پہ دبدبۂ حکمِ شہریار چلے

اگرچہ دار پہ چڑھنا پڑا عوض اُس کے؟
حریمِ یار میں اِک رات تو گزار چلے

مَیں تیری زُلفِ پریشاں میں ٹانک دوں اُس کو
اگر بہار پہ — میرا کچھ اِختیار چلے

پرائے شہر کے لوگوں سے قرض کیا لینا؟
جو لے کے آئے تھے گھر سے عدم — وہ ہار چلے

مجروح سلطانپوری

○

سوئے مقتل کہ پئے سیرِ چمن جاتے ہیں
اہلِ دل جام بکف سر بہ کفن جاتے ہیں

اس کو دیکھا نہیں تم نے کہ یہی کوچہ و راہ
شاخِ گل شوخیِ رفتار سے بن جاتے ہیں

آگئی فصلِ جنوں کچھ تو کرو دیوانو!
ابر صحرا کی طرف سایہ فگن جاتے ہیں

لٹ گیا قافلۂ اہلِ جنوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لیے تارِ رسن جاتے ہیں

جو ٹھہرتی تو ذرا چلتے صبا کے ہمراہ
یوں بھی ہم روز کہاں سوئے چمن جاتے ہیں

بلبلو اپنی نوا فیض ہے اُن آنکھوں کا
جن سے ہم سیکھنے اندازِ سخن جاتے ہیں

روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیواروں سے چھن جاتے ہیں

قتیل شفائی

○

سجا کے اپنی ہی آنکھیں ہزار چہروں پر
کیا ہے میں نے سدا اعتبار چہروں پر

سحر ہوئی تو مَیں بھیگتی نظر آئیں
پڑی تھی رات کو غم کی پھوار چہروں پر

تجھے بھی ڈر ہے کسی کا تو دُور سے پڑھ لے
لکھی ہوئی ہے دلوں کی پکار چہروں پر

سیاہیاں یہ کہاں سے اُمڈ پڑیں آخر
یہ کیسے داغ ہیں پروردگار چہروں پر

میں تیری بزم میں کس کس کی دُشمنی لیتا
لکھا تھا نام ترا بے شمار چہروں پر

خدا نے دی ہے کشش یا نظر کا دھوکا ہے
کہ جو بھی دیکھے اُسے آئے پیار چہروں پہ

لگی ہے آگ یہ کیسی وفا کے جنگل میں
جلا کے رکھ دیے کس نے چنار چہروں پر

نظر اُٹھے تو گریباں پہ ہاتھ پڑتا ہے
قتیل آئی یہ کیسی بہار چہروں پہ

میکش اکبرآبادی

○

مجھے قسم ہے تری اس حسین "کملا" کی
جو تیری گود کے گلشن میں ہے کلی کی طرح

کچھ اور دل میں تمنا نہیں سوا اس کے
کہ زندگی مری کٹ جائے زندگی کی طرح

کھٹکنے لگتی ہے اِک پھانس سی مرے دل میں
تری نگاہِ تمنا کی بےکسی کی طرح

اگر کہوں تو مجھے آدمی کہیں گے بُرا
کہ مجھ کو تجھ سے محبت ہے آدمی کی طرح

○

تمام شوق و تمنا، تمام عہدِ وفا
لکھے تھے تم نے محبت سے کتنے سارے خط
یہ دن بھی دیکھا مری اشکبار آنکھوں نے
جلا دیے مرے ہاتھوں نے سب تمھارے خط

صاحبِ عرفاںؒ

مجید امجد

میں نے اُس کے ارادوں کا یہ سفر دیکھا ہے،
ابھی ابھی وہ اِس پُر نور حویلی میں تھا
جس کے گرد سنہرے گلابوں کے تختے تھے
اور، اب وہ اُس مٹی کے تابوت میں جا لیٹا ہے!

میں نے دیکھا،
اس نے اپنی اِس اِک عمر میں جتنی زندگیاں پائی تھیں
آج اُس کی میّت کے ساتھ نہیں تھیں
وہ تو اَب بھی، سب کی سب، اِس دنیا میں ہیں،
جو بھی چاہے اُن کو چُن لے اور آنکھوں سے لگا لے!

ایکسیڈنٹ

مجید امجد

مجھ سے روز یہی کہتا ہے، پکی سڑک پر وہ کالا سا داغ، جو کچھ دن پہلے
سرخ لہو کا تھا اک چھینٹا، چکنا، گیلا، چمکیلا چمکیلا
مٹی اس پہ گری، اور میلی سی اک پپڑی اس پر سے اتری، اور پھر سینڈھوری سا اک خاکہ ابھرا
جو اب پکی سڑک پر کالا سا دھبہ ہے
پسی ہوئی بجری میں جذب اور جامد — ان مٹ۔

مجھ سے روز یہی کہتا ہے، پکی سڑک پر، مسلا ہوا وہ داغ لہو کا:
"میں نے تو پہلی بار، اس دن
اپنی رنگ برنگی قاشوں والی گیند کے پیچھے،
یونہی ذرا اک جست بھری تھی،
ابھی تو میرا روغن بھی کچا تھا،
کس نے انڈیل دیا یوں مجھ کو، اس مٹی پر۔
اوں، اوں، میں نہیں مٹتا! میں تو ہوں، اب بھی ہوں.... !"

میں یہ سن کر ڈر جاتا ہوں.....
کالی بجری کے روغن میں جینے والے اس معصوم لہو کی کون سنے گا؟
منصف بک بھی چکے ہیں چند ٹکوں میں.....،
قانون آنکھیں میچے ہوئے ہے.....
قاتل چھٹتے سب بے پہرا ہیں.....

ایک صبح ...... سٹیڈیم ہوٹل میں

مجید امجد

یُوں تو اِس چوکور تپائی کی اِس سادہ سی بیٹھک میں کیا رکھا ہے،
لکڑی کی اک عام سی شے ہے، پڑی ہے، ....
یوں تو اس پہ رکھے ہُوئے گلدان میں کیا رکھا ہے ......
پیلے پیلے سے کچھ تازہ پھول ضرور ہیں اِس میں .....
پھول تو گلدانوں میں ہوتے ہی ہیں ......
اور پھر اس چوکور تپائی پہ گرنے والا، ہوا کا ترچھا جھرنا،
جس میں دھوپ کی نازک سی جھلکی سونے کا رنگ بکھیر گئی ہے .....
خیر، یہ دُھوپ کی رنگت بھی تو جگہ جگہ ہے، .....

لیکن یہ سب چیزیں، اور یہ چاروں خالی کرسیاں، اور یہ سب کچھ، مل کر،
ایک عجب آسودہ سی ترتیب ہے، ساکت ساکت،
میرا ذہن کچھ اتنا اُلجھا ہُوا ہے، مجھ کو چیزوں کی ترتیب اچھی لگتی ہے،
جانے کون یہاں آکر بیٹھے گا ......
سب کچھ اک آنے والے اچھے سمے کا اَن ہونا پن ہے!

کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ، مدد دے!

مصطفیٰ زیدی

لٹ گئی دولتِ ایمان و متاعِ عرفاں
کعبۂ منبر و محراب و کلیسا مدد دے
آج اولاد پہ ہے قحطِ ضمیر و جرأت
خونِ اجداد رسد! عزّتِ آبا مدد دے
میں اکیلا نکل آیا ہوں ستاروں کی طرف
کرۂ ارض کی اے مجلسِ شوریٰ مدد دے
سامری سانپ مری سمت بڑھے آتے ہیں
زورِ عصائے کلیم و یدِ بیضا مدد دے
لحن و آہنگ کے شہروں میں اُتر آیا ہے
اجنبی خوف کا پھیلا ہوا صحرا مدد دے
آج گم گشتۂ منزل ہیں روایاتِ خضر
آج بیمار ہے صدیوں کا مسیحا مدد دے

پیاس ایسی کہ زباں منھ سے نکل آئی ہے

کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ مدد دے

برفباری مرے کمرے میں اُتر آئی ہے

تابشِ زمزمہ و حدتِ صہبا مدد دے

ایک بزدل مرے سینے میں بڑی دیر سے ہے

جرأت خودکشی و قتلِ اعزا مدد دے

میں تو دونوں ہی کی دوری سے بہل جاؤں گا

قربتِ ساحل و گہوارۂ دریا مدد دے

کوئی آیا ہے مجھے آگ لگانے کے لیے

صحنِ بے چارگیٔ مسجدِ اقصیٰ مدد دے

کس طرف سجدہ کروں کس سے دعائیں مانگوں

اے مرے شش جہت قبلہ و کعبہ مدد دے

حلقِ اصغر کی طرف ایک کمان اور کھنچی

اے ہواؤں کے تشنج اے گردشِ صحرا اٹھے

اِک رسن اور بڑھی سوئے سکینہ ہشیار

دارِ صلیب اور ہوئی درپئے عیسیٰ مدد دے

ایک اک چہرۂ گلرنگ بجھا جاتا ہے   صورتِ جلوۂ آئینۂ فردا مدد دے

سید ضمیر جعفری

○

دل والوں کی بات چلی ہے
زخموں کی بارات چلی ہے

رات نہیں بن کاٹے کٹتی
بات چلی تو رات چلی ہے

گرم لہو میں کھلتی کلیاں
موسم کی سوغات چلی ہے

لفظ بجھے تو معنی چمکے
سانس رُکی تو بات چلی ہے

تُو ہی اے دل تھم گیا، ورنہ
دُنیا تیرے ساتھ چلی ہے

قطرے دریا بن گئے آخر
بوندوں سے برسات چلی ہے

کتنی پیاری اور میٹھی تھی
بات کہ ساری رات چلی ہے

فضل احمد کریم فضلی

○

ثبت کیا ہے نقشِ حیات — ہم نے دی ہے موت کو مات
تیرے کرم کے وہ دن رات — جیسے ہو یہ کل کی بات
اندھی راہ، اندھیری رات — دے دے پیارے ہاتھ میں ہاتھ
کھل نہ سکی یہ عشق میں بات — کس نے کھائی کس سے مات
دل میں جتنے تھے خدشات — ان سے کم نکلے خطرات
اُن کو بھلانے جب بھی چلے — یاد آئی ہے اِک اک بات
آنکھیں تو ہیں خشک، مگر — دل میں رہتی ہے برسات
اُن تک پہنچوں میں کیسے — بیچ میں حائل میری ذات
مرتے رہیے ساری عمر — پیتے رہیے زہرِ حیات
اُن کے خلافِ حکم چلے — یہ ہے کس کے بس کی بات
اُن سے ہمیں کہتے ہی بنی — "سچ ہیں سارے الزامات"
اُن کو ناخوش کرنا کیا — کہہ بھی دینا دن کو رات
اہلِ جنوں تک سوچ میں ہیں — ایسے بدلے ہیں حالات
شعر میں بھی تو ڈھل نہ سکے — دل کے نازک احساسات

اپنے آپ سے کیوں ہو خفا
یہ بھی ہے، فضلی کوئی بات؟

فضل احمد کریم فضلی

○

جسے دیکھا وہ رنجیدہ ہو جیسے　　تمہارا ہی ستم دیدہ ہو جیسے
طبیعت ہے کہ گرتی جا رہی ہے　　کوئی دیوار بوسیدہ ہو جیسے
مرا یہ حال ہوتا جا رہا ہے　　کوئی برگ خزاں دیدہ ہو جیسے
شبِ غم یہ صدا آتی ہے کیسی　　کسی کا دل خراشیدہ ہو جیسے
خوشی کے وقت بھی لگتا ہے ایسا　　مرا دل سخت رنجیدہ ہو جیسے
ہر اک صورت بنائی ہے خدا نے　　ہر اک صورت پسندیدہ ہو جیسے
انہیں اس طرح دیکھے جا رہا ہوں　　یہ تسکینِ دل و دیدہ ہو جیسے
مرا کہنا نہیں سنتا مرا دل　　تمہارا ہی یہ گرویدہ ہو جیسے
سمجھتا ہوں یہ سچے عذر کو بھی　　کوئی حیلہ تراشیدہ ہو جیسے

یہ فضلی کس طرح کرتا ہے باتیں
بڑا کوئی جہاں دیدہ ہو جیسے

فضل احمد کریم فضلی

○

میں ہو گیا اِک آن کے اندر ہی اگر ہیچ
پھر کیوں نہ ہر اک چیز مجھے آئے نظر ہیچ

غم ہیچ، خوشی ہیچ، خطر ہیچ، خبر ہیچ
ان سب کا ہے کیا ذکر کہ جب خود ہے بشر ہیچ

بازیچۂ اطفال یہ دنیا تو ہے لیکن
بازیچہ یہ خود ہیچ ہے، بازیچہ نگر ہیچ

کیا کیا نہیں اپنے کو سمجھتا ہے ہر اک انساں
ہر چند کہ دنیا میں ہے ہر فردِ بشر ہیچ

صد شکر کہ اللہ نے سب کچھ ہی دیا ہے
سب کچھ مجھے حاصل تو ہے سب کچھ ہے مگر ہیچ

بے مایہ ہی ہونے سے گرانمایہ ہے دنیا
ہوتی نہ یہ رونق بھی نہ ہوتی یہ اگر ہیچ

درپیش قیامت کا سفر ہے تمہیں فضلی
یہ اور قیامت ہے کہ ہے زادِ سفر ہیچ

صریرِ قلم

عبد العزیز خالد

(۱)

مانگی تھی دعا میں نے، تمنا کی تھی
ہو یارِ جدا ماندہ سے مُنھ بھیڑ کبھی
بیگانۂ لب ولہجہ، نگہ نامحرم
اب کس سے توقع کریں دلداری کی؟

(۲)

وہ عشق کہاں! وہ عہد و میثاق کہاں!
اس نام کو بھی بھول چکی اب تو زباں
چڑیا کی طرح دل آدمی کا ہے
دشوار ہے اسرارِ محبت کا بیاں

(۳)

یہ کہتی تھی: "لا لقاءَ لنا فیما بعد
آئے گا نہ پھر وصل کا یہ لمحۂ سعد!"
یکجا ہیں دو قالب آج کل غیر سے ہے
وہ حسرتِ شہزادہ، وہ غیرتِ دَعد

(۴)

دل جنتِ دُنیا سے کبھی سیر ہُوا؟
لیتا ہے یہ مر مر کے بھی جینے کا مزہ
ترکِ ہوس و وداعِ خواہشِ مشکل
لبریز ہوا ہے کاسۂ دستِ دعا

(۵)

اَفکار میں اِرتقا ہے پَل پَل چھِن چھِن
رُک جائے اگر قلم نہیں ہو سا کِن
اے منکرِ برتریتِ اَعداد و حروف!
سُن : رُبَّ قَوَلٍ اَنفذُ مِنْ صَولٍ

(۶)

دیکھا ہے کبھی سَرُوپ چِت شَکتی کا؟
رکھ اپنے عیُوب پر نظر، مَت اِترا
لے لطفِ حکایات و مَلاہی، لیکن
سِرّاً جَہراً ـــ لَا تَقُلْ اِلّاَ حَقّاً!

(۷)

آیا ہے سپہرِ ہفتمیں سے یہ پیام
ہر عظمتِ آدم ہے خدا کا انعام
مَا النَّصْرُ اِلاَّ مِنْ عِندِ اللهِ
کا فرہے جو اس قول میں کرتا ہے کلام

(۸)

جاتی رہی یکسر کھرے کھوٹے کی پرکھ
مورکھ پن کی بھینٹ چڑھی آن ا نکھ
کلجگ سے ہوئے بڑا اَبھِماسِتیہ
پڑھ پڑھ کے گرنتھ اشلوک، حکایت [illegible]

(۹)

رہتا ہوں ہجومِ رنگ و بو میں بھی اداس
سودائی مزاج ہوں، ہے غم ہی مجھے راس
دمساز، ندیمانِ جنیدیہ کی طرح
دو یارِ وفادار — کتاب و قرطاس

(۱۰)

اے نخوتِ نمرود و کنوزِ قارون!
ہے باغِ ارم مجھ کو خراباتِ جنوں
فریادیِ دردِ دل بوصیری کی طرح
حافظ کی طرح مستِ طرب رہتا ہوں

(۱۱)

یہ گنجِ گہر ترا نہیں ہے بخدا
پھر قبضۂ غاصبانہ اس پہ کیسا؟
کر صرف اسے راہِ خدا میں، خالد!
ہے مِلکِ مُشاع، علم و ادراک ترا

(۱۲)

ہے گرچہ زمانے زیرِ نگیں تو ابھی
پھر بھی ہے ترے لیے کسی شے کی کمی
اے شاعرِ خالد النشید ——— خالد
ہے تیری زباں تو عربی، دل عجمی

ظہور نظر

○

ہتھیلیوں پہ لیے اپنے سر گئے ہیں لوگ
سفر پہ اب کے برنگِ دگر گئے ہیں لوگ

ترے ستم کا گلہ یوں بھی کر گئے ہیں لوگ
کہ اور کچھ نہ چلا بس تو مر گئے ہیں لوگ

گرا ہے شہر تو صحرا میں گھر بنانے کو
اُٹھا کے دوش پہ دیوار و در گئے ہیں لوگ

دنوں کے تیرہ گھروں پر ترے جمال کی دھوپ
جو آ پڑی ہے تو کیا کیا سنور گئے ہیں لوگ

ہوا ہے یوں بھی کہ اپنی طلب کے صحرا میں
مثالِ موجۂ جوئے سفر گئے ہیں لوگ

بڑھی ہے تشنہ لبی زندگی کی جب حد سے
تو اپنی ذات کے ساغر میں بھر گئے ہیں لوگ

اُڑے ہیں رہگزاروں میں گردِ جاں بن کر
سفر کے شوق میں کیا کچھ نہ کر گئے ہیں لوگ

اُفق گواہ رہے، قتلِ آفتاب کے بعد
شفق لُٹی ہے تو پھر اپنے گھر گئے ہیں لوگ

علَم اُٹھے کہ ہر اک در ہوا کے چلتے ہی
قفس میں صورتِ رقصِ شرر گئے ہیں لوگ

کہیں پہ کچھ تو ہوا ہے کہ آج زنداں میں
گئے ہیں اور بہت بے خطر گئے ہیں لوگ

اب اُن کے لوٹ نہ سکنے کا غم تجھے کیوں ہو
کہ سمتِ دار نئے حکم پر گئے ہیں لوگ

نہ کوئی سایہ نہ آہٹ یہ شہر کیسا ہے
کہاں چھپی ہیں صدائیں کدھر گئے ہیں لوگ

یہ سیلِ خواب تھا یا خواب سیل تھا، کیا تھا
کہ چڑھ کے صورتِ دریا اُتر گئے ہیں لوگ

دلوں میں صورتیں کیا کیا ہیں خوفِ پنہاں کی
بڑھا ہے اپنا ہی سایہ تو ڈر گئے ہیں لوگ

میں خود گیا تو کھلا سارا شہر قید میں تھا
خبر یہ تھی کہ بہت مختصر گئے ہیں لوگ

طلوعِ مہر کو اب کون روک سکتا ہے
گھروں میں ہمرہِ نجمِ سحر گئے ہیں لوگ

اُمیدِ آمدِ یاراں گزشتہ ہے نظرؔ
کفن بدوش سرِ رہگزر گئے ہیں لوگ

ظہور نظر

خود کو پانے کی طلب میں آرزو اُس کی بھی تھی / میں جو مل جاتا تو اس میں آبرو اُس کی بھی تھی

زندگی اک دوسرے کو ڈھونڈنے میں کٹ گئی / جستجو میری بھی دشمن تھی، عدو اس کی بھی تھی

میری باتوں میں بھی تلخی تھی سمِ تنہائی کی / زہرِ تنہائی میں ڈوبی گفتگو اس کی بھی تھی

وہ گیا تو کروٹیں لے لے کے پہلو تھک گئے / کس طرح سوتا مرے سانسوں میں بُو اُس کی بھی تھی

رات بھر آنکھوں میں اُس کا مرمریں پیکر رہا / چاندنی کے جھلملانے میں نمو اُس کی بھی تھی

گھر سے اُس کا بھی نکلنا ہو گیا آخر محال / میری رسوائی سے شہرت کو بکو اُس کی بھی تھی

میں ہُوا خائف تو اُس کے بھی اُڑے ہوش و حواس / میری جو صورت ہُوئی وہ ہو بہو اُس کی بھی تھی

کچھ مجھے بھی سیدھے سادھے راستوں سے بیر ہے / کچھ بھٹک جانے کا باعث جستجو اُس کی بھی تھی

وہ جسے سارے زمانے نے کہا میرا رقیب / میں نے اُس کو ہمسفر جانا کہ تُو اُس کی بھی تھی

دشتِ فرقت کا سفر بھی آخرش طے ہو گیا / اور کچھ دن ساتھ رہتا، آرزو اُس کی بھی تھی

بات بڑھنے کو تو بڑھ جاتی بہت لیکن نظرؔ
میں بھی کچھ کم گو تھا چپ رہنے کی خُو اُس کی بھی تھی

ظہور نظر

○

آرزوؤں کا محیطِ بے کراں آنکھوں میں تھا — جسم و جاں کی ہر تمنا کا جہاں آنکھوں میں تھا
دل سفینے کی طرح تھا قلزمِ غم میں رواں — دھڑکنوں کا سیل مثلِ بادباں آنکھوں میں تھا
خواہشوں کی سیپیوں میں رشکِ مروارید تھے — لذتوں کا نیلگوں پانی جواں آنکھوں میں تھا
میرے قدموں میں پڑی تھی گردشِ ہفت آسماں — میری مٹھی میں زمیں تھی لامکاں آنکھوں میں تھا
چاہے جانے کا نشہ تھا، چاہنے کا زعم تھا — کیسے کیسے وہم تھے کیا کیا گماں آنکھوں میں تھا
کیسی کیسی ساعتیں گذری ہیں مجھ پر عشق میں — آگ سینے میں فروزاں تھی دھواں آنکھوں میں تھا
پھول بھی تھے خار بھی تھے رنگ بھی خوشبو بھی تھی — کیا نہ تھا جب وہ سراپا گلستاں آنکھوں میں تھا
رات بھر میں اُس کے جانے کی صدا سنتا رہا — صبح تک اُس کے بچھڑنے کا سماں آنکھوں میں تھا
تاکِ جاں میں تیرگی بیٹھی تھی پلکوں سے لگی — انتظارِ خواب کا کوہِ گراں آنکھوں میں تھا
کیسی کیسی صورتوں کی ریت چمکی روح میں — رات بھر سیلِ سرابِ رفتگاں آنکھوں میں تھا
پتلیوں میں اُس کا سایا سا تھا لیکن غور سے — آئینہ دیکھا تو میں خود ہی نہاں آنکھوں میں تھا
کون دیتا اُس کی مرگ آشام نظروں کا جواب — میری اپنی زندگی کا امتحاں آنکھوں میں تھا
درد کی یہ شکل پہلے تو نہ دیکھی تھی کبھی — خوف کا آسیب تھا یا خوں فشاں آنکھوں میں تھا
کوئی صورت روبرو اُس کی رہی ہر حال میں — وہ نہ تھا جب اُس کے ہونے کا گماں آنکھوں میں تھا

اِک نظر سے مان جاتے تھے صنم رُوٹھے ہُوئے
ہائے وہ گھڑیاں کہ یہ زورِ بیاں آنکھوں میں تھا

شفقت کاظمی

○

جانے کب وہ بہار آئی تھی   جب کلی دل کی مسکرائی تھی
اُن پہ کر دی فدا بہر صورت   جان اپنی تھی یا پرائی تھی
یا مرا ذکرِ غم تھا بے تاثیر   یا زمانے کو نیند آئی تھی
اُن گلوں سے بھی فیض پا نہ سکا   جن گلوں تک مری رسائی تھی
ہم تو راضی تھے ختم کرنے پر   بات یاروں نے خود بڑھائی تھی
اب وہ اگلے تعلقات کہاں   اُن سے دو دن کی آشنائی تھی
لب پہ آئی تھی جو فغاں بن کر   وہ ترے نام کی دُہائی تھی
تھے کچھ ایسے بھی غم زمانے کے   زندگی جن سے بر نہ آئی تھی
ساتھ بھی کچھ سفر میں دینا تھا   میری ہمت جہاں بڑھائی تھی

ہو گئے اشکبار کیوں شفقت
کونسی بات یاد آئی تھی

شاعر لکھنوی

⊙

خوشبو ہوں نہ میں کوئی ہوا ہوں
کیوں تیرا طواف کر رہا ہوں

میں جس سے کبھی نہیں ملا ہوں
اک عمر سے اس کو جانتا ہوں

کس کس کا ہدف نہیں مری ذات
اچھا ہوں تو اور بھی بُرا ہوں

گُل بھی ہیں مجھے عزیز لیکن
کانٹوں کے لیے برہنہ پا ہوں

یہ ربط بھی کم نہیں کہ اُس سے
خوشبو کی طرح میں آشنا ہوں

اِک عمر کا فاصلہ ہے لیکن
میں اُس کے قریب ہی کھڑا ہوں

چاہت بھی اگر ہے جرم کوئی
اچھا تو میں تم کو چاہتا ہوں

زخموں کو حروف میں بدل کر
تاریخِ حیات لکھ رہا ہوں

دُنیا مجھے سُن رہی ہے شاعر
میں اپنے سکوت کی صدا ہوں

شاعر لکھنوی

○

مدتوں آ نہ سکے چشمِ خریدار میں ہم
یوں سجائے گئے تخلیق کے بازار میں ہم

دھوپ تھی شہرِ نگاراں کی سہانی کتنی
تھک کے بیٹھے نہ کسی سایۂ دیوار میں ہم

اس طرح اُن کو صدا دی کہ بڑی دیر تلک
گم رہے اپنی ہی آواز کی جھنکار میں ہم

شہرِ خوباں میں جلا کر قد و گیسو کے چراغ
لوٹ آتے ہیں دیارِ رسن و دار میں ہم

ایک لمحے کے لیے وہ اگر آئے بھی قریب
کھو گئے مرحلۂ فرصتِ اظہار میں ہم

تازیانہ ہے نفس، جسم ہے زنداں کی طرح
قید ہیں اپنے ہی گھر کے در و دیوار میں ہم

پھول زخموں کے نظر آتے ہیں تا حدِ نظر
کیا خبر دشت میں بیٹھے ہیں کہ گلزار میں ہم

پیار کی ایک نظر دے کے خریدو ہم کو
جنسِ نایاب نہیں وقت کے بازار میں ہم

نہ ملی ایک بھی تعبیرِ تمنا شاعر
خواب کی طرح رہے دیدۂ بیدار میں ہم

جمیل ملک

جمیلؔ چاند میں مستور جتنے جوہر ہیں
اُنہیں میں ڈھونڈھ رہا ہوں وہ میرے اندر ہیں

قریب و دور یہاں چاندنی کے پیکر ہیں
مری نگاہ میں کیا کیا حسین منظر ہیں!

ہزار بار مَیں ڈوبا ہوں تیری آنکھوں میں
ازل سے راہ میں حائل یہ دو سمندر ہیں

وہ فرقِ خالق و تخلیق مٹ گیا آخر
یہاں تو جتنے صنم ہیں، تمام آذر ہیں

وہ جن سے مجھ کو شکایت تھی سنگباری کی
جو دیکھتا ہوں تو اب اُن کے ہاتھ پتھر ہیں

ہے رنگ رنگ میں خوشبو بہارِ فردا کی
یہ پھول ہیں کہ مہکتے ہوئے پیمبر ہیں!

مجھی سے میرا پتہ پوچھنے چلے ہیں جمیلؔ
جو جانتے نہیں کچھ بھی، وہ کتنے کافر ہیں!

ابد

جمیل ملک

آسماں ہر طرف بادلوں کے پھریرے اُڑاتا رہے گا
ستاروں کی بارات، شبنم میں گھُل کر
گُل و یاسمن پر بکھرتی رہے گی
کھُلے پانیوں کے رواں آئینوں پر
سفینوں کی بستی اُبھرتی رہے گی
مہ و مہر کی روشنی سے
شب و روز کے آنگنوں میں
مسرت کی برکھا اُترتی رہے گی
مگر مَیں
زمیں کے تلے
چادرِ خاک سے جسم و جاں کو لپیٹے ہُوئے
خوابِ ہستی کے ڈوروں سے مسحور
چُپ چاپ سوتا رہوں گا

بہاریں زمیں پر اُترتی رہیں گی
مگر میرے اُوپر سے صدیاں گزرتی رہیں گی

نور بجنوری

○

تم گلشن گلشن ہنستے رہو ہم شبنم شبنم رو دیں گے
احساس کے جلتے زخموں کو یادوں کی شفق سے دھوئیں گے

تم سیج پہ زلفیں بکھرائے لمحوں کا خمار، گیت سنو
ہم زہرِ وفا کے نشے میں کانٹوں سے لپٹ کر سوئیں گے

تم اپنے حنائی ہاتھوں کو چمکاؤ گلابی آنچل میں
ہم شعر کی فصلیں کاٹیں گے ہم درد کے دانے بوئیں گے

تم نازک نازک قدموں سے پامال کرو ہر خوابِ حسیں
ہم کرچیاں ساری چن چن کر اس تارِ نظر میں پروئیں گے

پل بھر کا ملن جگ جگ کی جدائی افسوس ہمیں معلوم نہ تھا
بچھڑیں گے تو تم سے بچھڑیں گے کھوئیں گے تو سب کچھ کھوئیں گے

کب بارش کے چھینٹوں سے سرسبز ہوا ویرانۂ دل
یہ آگ تو یونہی بھڑکے گی ہم دامن لاکھ بھگوئیں گے

اُکھڑتے خیموں کا درد

مظہر امام

کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے
نہ روشنی میں، نہ تیرگی میں
نہ زندگی میں، نہ خودکشی میں

جنہیں زخموں سے چُور پیہم کراہتے ہیں
یقین کی سانس اُکھڑ چلی ہے
حسین خوابوں کے عارضوں سے لہو کے شعلے اُبل رہے ہیں

عزیز قدروں پہ جانکنی کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے

پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کو قریب کرتے تھے آدمی سے
دلوں میں قوسِ قزح کی انگڑائیاں جن سے ٹوٹتی تھیں
نہ فرد ہی کا مکاں سلامت
نہ اجتماعی وجود ہی زیرِ سائباں ہے
کوئی خدا ہے تو وہ کہاں ہے؟
کوئی خدا تھا تو وہ کہاں ہے؟

مہیب طوفاں مہیب تر ہے
پہاڑ مثلِ ریت کی طرح اُڑ رہے ہیں
بس ایک آواز گونجتی ہے:
"مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ"
(مگر کہیں بھی اماں نہیں ہے)

جو اپنی کشتی پہ بچ رہے گا
وہی علیہ السلام ہوگا۔

مظہر امام

○

خشک پتے بھی نہیں، یاسمن تر بھی نہیں
پسِ منظر بھی نہیں ہے کوئی منظر بھی نہیں

تم نے اچھا ہی کیا توڑ دیں ساری سڑکیں
کوئی رہرو بھی نہیں ہے کوئی رہبر بھی نہیں

آج کے دور کی تصویر دکھائی دے گی
آ کے دیکھو یہ مکاں چھت بھی نہیں، در بھی نہیں

بھیک مانگے کہ نہ مانگے یہ طلب گار تو ہے
دل، جو مفلس بھی نہیں اور تونگر بھی نہیں

کسی تالاب میں لہریں ہی بناتے، گھنٹے
وہ تہی دست ہیں ہم، ہاتھ میں کنکر بھی نہیں

تم پہ یہ وقت پڑا ہو تو بتاؤ یارو!
دل کے اندر بھی نہیں ہے کوئی باہر بھی نہیں

فضا ابن فیضی

○

دانش ور کہلاتے ہیں اب فکر و نظر سے عاری لوگ
اپنے دور کی اس پستی پر چپ ہیں کیوں معیاری لوگ

سیکھ گئے زخموں میں رہ کر کچھ رسمِ گل کاری لوگ
دامن دامن سجا رہے ہیں کانٹوں کی پھلواری لوگ

ساغر ساغر پیاس پیاس کے شعلے، مرہم مرہم زخم کی آنچ
ہم جیسے معصوموں سے بھی کر گئے دنیا داری لوگ

ان کے وقار و وزن کے آگے خود میزان پشیماں ہے
ظرف کے کتنے ہلکے نکلے، پتھر جیسے بھاری لوگ

اپنے ہی پہلو میں آخر نشتر بن کر تیسہ سے گئے
کب تک جیتے کرتے زخمی خوابوں کی دلداری لوگ

اس کے من کا ہنستا سورج درد ہمارا جانے ہے
ہم چمکیلی دھوپ کے گاہک سائے کے بیوپاری لوگ

گونگے بہرے کنکر پتھر ہیروں کے مسجود ہیں اب
دفن کر آئے کس مٹی میں جیون کی خودداری لوگ

دیکھیں درد کی شبنم بن کر مژدہ مژدہ یہ کب بکھرے
پی تو گئے ہیں پھول سمجھ کر شعلے کی چنگاری لوگ

کب ملبوس کا چرم خرام اس کی عریانی کو ڈھانپ سکا
کر نہ سکے اب تک زخم تہذیب کی پردہ داری لوگ

پتھر پتھر ڈھونڈ رہے ہیں اپنے گم شدہ چہروں کو
آ گئے تیشے کی منزل تک عقل و خرد کے پجاری لوگ

غالب و بیدل کے افسوں میں غرق ہیں سر سے پاؤں تک
کیا سمجھیں گے سادہ سادہ لفظوں کی فنکاری لوگ

فکر و فن کا ورثہ بھی ہے مستقل اک آزار فضا
سونپ رہے ہیں مجھ کو عذابِ آگہی و ہشیاری لوگ

فضا ابن فیضی

○

اُٹھی نہ تہمتِ شعر و نوا سلیقے سے
میں اپنی بات بھی کب کہہ سکا سلیقے سے

یہ بانکپن تو قبا کی تراش میں بھی نہیں
ہوئی ہے چاک جنوں کی قبا سلیقے سے

حریمِ فکر و نظر میں ابھی اندھیرا ہے
جلا فروغِ ہنر کا دیا سلیقے سے

پھرے ہے پھول کی خوشبو کے پیچھے آوارہ
کبھی تو باغ میں رہتی صبا سلیقے سے

کہیں فغاں، کہیں نغمہ، کہیں شفق، کہیں چھاؤں
مرا وجود بکھرتا رہا سلیقے سے

قدم قدم پہ وہی رسمِ سنگِ طفلاں کیا
دکھا جنوں کو ذرا آئنا سلیقے سے

کسی سے مانگنے پھر کیوں وہ اِک خدا ہی سہی
کبھی نہ آئی لبوں تک دعا سلیقے سے

اسی کے ساتھ ترا جسم بھی نہ جل جائے
یہی ہے شوق تو دامن جلا سلیقے سے

رہِ جنوں میں چراغاں کیے زمانہ ہوا
سجاؤ ہمسفرو نقشِ پا سلیقے سے

اسے سمجھ نہ فقط کار و بارِ چند نفس
یہ زندگی ہے اسے آزما سلیقے سے

یہ رہ گزارِ وفا ہے دیارِ دل کی طرح
مرے رفیقو! چلو راستا سلیقے سے

یہی شعور ہے بنیادِ اعتبارِ نظر
کہ میں چراغ نہ تھا اور جلا سلیقے سے

کبھی تو ٹوٹے گا آخر بدن کا سناٹا
حریمِ جاں میں دیے جا صدا سلیقے سے

کوئی ستارہ ہی ٹوٹا نہ کوئی شمع بجھی
شکستِ دل کا ہوا حادثہ سلیقے سے

فضاؔ زبان و قلم مصلحت گزیدہ سہی
جو بات کہنا تھی میں کہہ گیا سلیقے سے

رفعت سلطان

○

جب کوئی مائلِ گفتار ہُوا — سرفرازِ رسن و دار ہُوا
تُو جہاں بھی نظر آیا مجھ کو — میں وہیں نقش بہ دیوار ہُوا
تلخ فریادِ جرسِ حق، لیکن — خواب سے کوئی نہ بیدار ہُوا
پوچھنے آیا ہے تو بھی مجھ سے — کون رُسوا سرِ بازار ہُوا
وہ تری محفلِ عشرت تھی کہ میں — آہ بھر کر بھی گنہگار ہُوا
تیرے ماتھے پہ شکن کیوں پڑتی — میں ہی افسوس نہ زردار ہُوا
اہلِ دُنیا کو شکایت ہے کہ میں — کیوں مسرت کا طلبگار ہُوا
تجھ کو ہوگا نہ زمانے سے گلہ — جب بھی تو محرمِ اسرار ہُوا
زندگی ہوگئی دشوار اُس پر — جو بھی اس دَور میں خوددار ہُوا
دل کہ پابندِ خمِ زلف نہ تھا — دامِ دُنیا میں گرفتار ہُوا
جسم بے رُوح سا لگتا ہے مجھے — جب سے ملنا ترا دشوار ہُوا
تیری تقلید کرے گی دُنیا — تُو اگر صاحبِ کردار ہُوا

مر نہیں سکتا وہ شاعر رفعتؔ
جس کا اک شعر بھی شہکار ہُوا

کسریٰ منہاس

○

جنونِ عشق کی راہیں بتا کے ہم دل کو
یہ حال ہے کہ لئے پھر رہے ہیں منزل کو

میسّر آئے ہیں کیسے تازہ ولولے دل کو
کہ لَو لگائے ہوئے جا رہے ہیں منزل کو

ملے جو دل تو جدا کر سکے نہ پھر دل کو
ہم اہلِ دل ہیں سمجھتے ہیں ربطِ کامل کو

ہزاروں بزمِ تمنّا کے بجھ چکے ہیں چراغ
نہ دیکھا جائے گا اب ہم سے رنگِ محفل کو

یہ راہبر ہیں کہ ہیں راہزن خدا سمجھے
قدم قدم پہ بدلتے ہیں راہِ منزل کو

بھنور کے خوف سے رُکتے کہاں ہیں دل والے
دعائیں دیتے ہوئے جا رہے ہیں ساحل کو

مقامِ دل کا، کوئی بے شعور کیا جانے؟
سمجھنے والے سمجھتے ہیں عظمتِ دل کو

نہا چکے ہیں لہو میں ہزار ہا کشتے
مگر ہوا نہیں احساس تیغِ قاتل کو

حجاب اُٹھتے ہیں اُن کی نظر سے اے کسریٰ
قدم قدم پہ جو سمجھے نشانِ منزل کو

یوسف جمال انصاری

○

میں تو سمجھا تھا ترے فیضِ نظر سے زندگی
موجِ نغمہ، بوئے گل، سلکِ گہر ہو جائے گی

تیرے ہر احساس پہ جیسے تڑپ اُٹھتا ہوں میں
آہ میں کھینچوں گا اور تجھ کو خبر ہو جائے گی

تو جو اپنی ناوک اندازی پہ ہو گی شرمسار
اور دُونی لذتِ زخمِ جگر ہو جائے گی

رفتہ رفتہ رنگ لائے گا دعاؤں کا اثر
ہوتے ہوتے مجھ سے تو نزدیک تر ہو جائے گی

ہاتھ میرا تو نے تھاما تھا تو یہ سمجھا تھا میں
تو رہِ ہستی میں میری ہمسفر ہو جائے گی

بے اماں تیری نظر، نغمہ مرا عہد آفریں
ٹوٹ جائے گا طلسمِ شب، سحر ہو جائے گی

تیشۂ فرہاد لائے گا نویدِ انقلاب
ہر ادائے حُسنِ شیریں معتبر ہو جائے گی

عالمِ نو جلوہ گر ہو گا نئے ارماں لیے
اور یہ کہنہ سرا زیر و زبر ہو جائے گی

وہ بھی اِک رسمِ مروت تھی تو اچھا الوداع
تیرے دیوانے کی تو یوں بھی بسر ہو جائے گی

یہ سیہ خانے میں آہوں کا دھواں گھٹتا ہوا
یوں بھی شب کٹ جائے گی یوں بھی سحر ہو جائے گی

رشید قیصرانی

○

کون کہتا ہے ترے دل میں اُتر جاؤں گا
میں تو لمحہ ہوں تجھے چھُو کے گزر جاؤں گا

شب کے چہرے میں کوئی رنگ تو بھر جاؤں گا
چل پڑا ہوں تو میں اب تا بہ سحر جاؤں گا

آسمانوں کی صفیں کاٹ کے پہنچا تھا یہاں
اب تری آنکھ سے ٹوٹا تو کدھر جاؤں گا

اپنی نظروں کا کوئی دائرہ بن کے میرے گرد
ورنہ ان تیز ہواؤں میں بکھر جاؤں گا

میں نے کاغذ پہ سجائے ہیں جو تابوت نہ کھول
جی اُٹھے لفظ میں تو خوف سے مر جاؤں گا

کون خوشبو سے ہواؤں کا بدن چھینتا ہے
تو مرے ساتھ رہے گا میں جدھر جاؤں گا

ریگِ ساحل سے رہی اپنی شناسائی تو پھر
ایک دن گہرے سمندر میں اُتر جاؤں گا

چاند تاروں کی طرح میں بھی ہوں گردش میں رشید
ہاں اگر تو نے پکارا تو ٹھہر جاؤں گا

رشید قیصرانی

○

آیا اُفق کی سیج تک آ کر پلٹ گیا
لیکن عروسِ شب کا وہ گھونگھٹ اُلٹ گیا

ہائے وہ اشکِ خوں کہ جو تھامے نہ تھم سکا
آنکھوں میں میری ورنہ سمندر سمٹ گیا

میں چل رہا ہوں خول بدن کا اُتار کر
اب میرے راستے کا یہ پتھر بھی ہٹ گیا

کب تک بچھائے رکھو گے پلکوں کی جھولیاں
آیا تھا جو اُمڈ کے وہ بادل تو چھٹ گیا

اِک شخص لوٹتے ہُوئے کل تیرے شہر سے
رو رو کے اپنے نقشِ قدم سے لپٹ گیا

دل میں بسی ہیں کتنی ترے بعد بستیاں
دریا تھا خشک ہو کے جزیروں میں بٹ گیا

وحشت نظر سے اتنے بگولے اُٹھے رشیدؔ
اِک مسکراتے چاند کا چہرہ بھی اَٹ گیا

حفیظ تائب

۱

راز اب کوئی راز بھی تو نہیں
خامشی کا جواز بھی تو نہیں
درد ٹھہرے تو کس طرح ٹھہرے
وقفۂ شب دراز بھی تو نہیں
ذہن ہو ہمزبانِ دل کیسے
وقتِ سوز و گداز بھی تو نہیں
جاں سرافراز ہو تو کیونکر ہو
گردِ راہِ مجاز بھی تو نہیں
رونقِ دل بحال ہو کیسے
نغمہ زن غم کا ساز بھی تو نہیں
ختم کیا بحرِ غم ہو، رَو میں ابھی
ہمتوں کے جہاز بھی تو نہیں
جہل و دانش میں، نور و ظلمت میں
اب کوئی امتیاز بھی تو نہیں
پستیوں کا گِلہ ہو کیا تائبؔ
آرزوئے فراز بھی تو نہیں

منظر ایوبی

ہر اک خلوص کا پیکر ہو، آشناؤں میں
نہ ڈھونڈ ایسی صفت سارے دیوتاؤں میں

وہ اک صدا جو نمایاں تھی سب صداؤں میں
بلند ہوتے ہی گم ہو گئی فضاؤں میں

بہار آ نہ سکے گی ہمارے خوں کے بغیر
وہ لاکھ رنگ بھریں پھول کی قباؤں میں

گلی گلی میں گھٹن ہے، مکاں مکاں میں گھٹن
کلام کیجیے آ کر کھلی فضاؤں میں

بکھر نہ جاؤں کہیں برگِ خشک کی مانند
بلا کا زور ہے اِن موسمی ہواؤں میں

نہ جانے کس نے اچانک یہ زہر گھول دیا
بڑا سکون تھا ترے شہر کی فضاؤں میں

غرورِ عشق میں گھر سے نکل تو آیا ہوں
میں کیا کروں گا اگر گھر گیا بلاؤں میں

بھٹک رہے ہیں تمناؤں کے سراب میں ہم
پڑی ہے پیار کی زنجیر جب سے پاؤں میں

نظر اُٹھا کہ ابھی تک مری وفا کے گلاب
مہک رہے ہیں ترے دیس کی فضاؤں میں

عجب نہیں کہ اُلٹ دیں ہمیں بساطِ سکوت
شمار کیجیے ہم کو نہ بے نواؤں میں

مرے خلوص پہ کس طرح آنچ آئے گی
وہ شخص خود بھی تو شامل ہے بے وفاؤں میں

تری نگاہ نے بخشا ہے حوصلہ جن کو
بسا رہے ہیں نئی بستیاں خلاؤں میں

پڑی ہے جب سے مرے کان میں تری آواز
میں خود کو ڈھونڈ رہا ہوں نئی صداؤں میں

مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ خود بھی کھو نہ جائے کہیں
جو مجھ کو ڈھونڈنے نکلا ہے ان گھٹاؤں میں

زمیں کی مانگ سجا لیں تو پھر چلیں منظرؔ
رکھا ہی کیا ہے ابھی چاند کی فضاؤں میں


نفع اور منفعت بخش
آئیڈیل لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ


جوشاندی
نزلہ زکام کھانسی کی زود اثر دوا
صدیوں کے آزمودہ جوشاندے کی ترقی یافتہ شکل
جس میں جوشاندے کے تمام فوائد موجود ہیں
جوشاندی سالہا سال سے نزلہ زکام کے
مریضوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔
جوش دینے کی قباحت، چھاننے کی زحمت
صرف ایک پیالی تیز گرم پانی میں
دو ٹکیاں ملا کر استعمال کریں
ہر موسم میں استعمال ہوتی ہے
ہر جگہ ملتی ہے
اجمل
کراچی راولپنڈی ڈھاکہ
دواخانہ حکیم اجمل خان لاہور

مقالے

غروبِ عظمت

منظور الٰہی

اے صبا نکہتے از کوئے فلانے بمن آر
زار و بیمار غمم راحت جانے بمن آر

چراغ کے مدام ایک جگہ جلنے سے دیوار پر دھوئیں کی دبیز سیاہ محراب بن گئی تھی۔ ڈیوڑھی کا بھاری کواڑ کھلنے سے [illegible] اور ایک [illegible] دیوار پہ پھیل جاتا۔ یہ پچاس برس اُدھر کی بات ہے [illegible] کے کنارے آباد اس پرانے شہر میں بجلی نہیں آئی تھی۔ گھر میں دولت کی [illegible] تو نہ تھی [illegible] بڑی زمینداری بھی نہ تھی لیکن یہ ایک خوشحال گھرانا [illegible] وہ چیزیں کمی نہ تھیں جن سے صحیح خوشی [illegible] دودھ پوت کی [illegible] لوگ [illegible] کہ میرے ذہن پر تصویر نقش ہے [illegible] دودھ پوت [illegible] اور اس خاندان سے کچھ افراد [illegible] بھی زندہ ہوں۔

میرے [illegible] نے دو سال [illegible] شہر کے لوگ جوق در جوق اپنے [illegible] کے لئے میرے ددھیال کو [illegible] مانتے [illegible] اس حلقے کی نشست کے لئے امیدوار اس خاندان کی تائید حاصل کرنے میں پہل کرتے۔

نقش [illegible] ایمانی تو باشد　　　[illegible] تو باشد

[illegible] اشارے [illegible] شہر اور نواح [illegible] کے [illegible] محفوظ ہیں۔ یہ علاقہ جو [illegible] تھا۔ جہاں غیر مسلم اکثریت [illegible] تھے۔ [illegible] قریب بیس برس میونسپل کمیٹی کے [illegible] پریذیڈنٹ رہے [illegible] کئی موقع پر [illegible] نے فساد برپا کیا اور [illegible] میں مرشد آباد [illegible] مسلمانوں نے [illegible] کیا تو [illegible] خاندان نے کہ ہمیشہ یہ فکر رہتی کہ دینی حمیت پہ آنچ نہ آنے پائے۔ بیکسوں اور بیواؤں کی دیکھ بھال [illegible] ان لوگوں کا شعار تھا۔ والد مرحوم کی وفات پر [illegible] نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا [illegible] دینی غیرت کا نشان تھا۔

واقعات کی [illegible] شخصیت [illegible] نظروں کے سامنے ہے [illegible] ریشم کا [illegible] کی طرح دکھائی [illegible] سفید [illegible] آنکھیں [illegible] جنھوں نے وفات سے [illegible]

[illegible] مرحوم [illegible] مغفور

...ر برس پیشتر علائق دنیا سے قطع تعلق کر لیا تھا اور اُس سرائے میں آ گئے تھے جو انہوں نے مسافروں کے لئے وقف کر دی تھی، ...نے حجرے کے عین سامنے انہوں نے ایک خوبصورت کشادہ مسجد تعمیر کروائی تھی، فجر کی نماز کے بعد وہاں جھوم جھوم کے ...آن کریم کی تلاوت کرتے تھے

ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ می دارم

...یع المشرب ایسے کہ پیش امام کبھی اہلحدیث مسلک کے ہوتے کبھی دیو بند کے دو فرق روا نہ رکھتے تھے۔

دادا جان اور مسافروں کا کھانا گھر سے آتا، عشاء کی نماز کے بعد انبالہ سے آخری گاڑی آتی، مسافروں کے لئے کھانا ...ہو جاتا تو اپنا کھانا دے دیتے خود دودھ کا گلاس پی کے سو رہتے۔ مولوی قادر بخش چند برس اس مسجد میں پیش امام رہے، ...ن کا کہنا تھا کہ میں اصرار کرتا کہ آپ اپنی صحت کا خیال کریں کھانا گھر سے منگوا لیں تو جواب دیتے نہیں بیبیاں آرام کر رہی ...وں گی، انہیں تکلیف ہو گی، اس بات کو ایک زمانہ گزر چکا تھا۔ لیکن جب بھی مولوی صاحب نے دادا جان کا ذکر آتا تو آبدیدہ ہو جاتے۔

دادا جان نمود و نمائش سے کوسوں دور تھے۔ دو تین دفعہ ایسا ہوا کہ چند کپڑے سمیٹے اور کسی کو بتلائے بغیر حج کو چلے گئے۔ بیٹوں کو جب پتہ چلتا تو ... ...کا رخ کرتے تاکہ حاجی کیمپ میں ہی زیارت ہو جائے۔

(۲)

اس صدی کے آغاز میں روپڑ میں ہائی سکول نہ تھا، کھرڑ کا قصبہ چند میل کے فاصلے پر تھا ابا جان وہاں مشنری سکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ سکول کا ہیڈ ماسٹر ایک انگریز پادری تھا۔ اس نے بھانپ لیا کہ جوہر قابل ہے۔ اسی نے گھر والوں کو آمادہ کیا کہ انہیں میٹرک سے پہلے انگلستان بھیج دیا جائے۔ دادا جان بخوشی رضامند نہ ہوتے تھے لیکن دیا...مید کی محبت انہیں ...عنفوان شباب میں انگلستان بھیج دیئے گئے۔ ...۱۹۱۵ء تک یا زمانہ وہاں گزرا۔ ... پنشن ... ...ل ساد ... کا ... لیکن پاکستان بننے کے بعد جب مولانا صدرالدین سے میرا تعارف ہوا تو فرمانے لگے: میں نے محبوب الٰہی ...یسا صالح نوجوان آج تک نہیں دیکھا، انہوں نے انگلستان میں صوم و صلوٰۃ کی پابندی کی باتوں میں ایک دفعہ الحمد پڑھنے پر ذکر ...کیا تھا کہ ... دودھ ... ...کے وقت انہوں نے کھا لیا تھا۔ انہیں اس بات پر ناز تھا کہ تسلسل ... ... کا کوئی روزہ قضا نہ ہوا تھا۔ انہیں آخری عمر میں بیماری کے باعث روزہ ...کرنے کا ملال تھا۔ تزکیہ نفس کے باوصف ان کے مختلف فنون مشغلے تھے۔ دو برسوں ... دیکھتے رہتے۔ ایک اچھی ... کا ... ...شوق او... ...شغف انگلستان سے شروع ہوا اور ... رہا۔ ایک دفعہ ایک عمدہ ... ... میں سے نکال ... ...زمانے لگے: یہ ان دونوں انگلستان میں ... ...

۱؎ ... شیخ محبوب الٰہی ... ... رہے۔

درمیان تفریق کی کوئی دیوار حائل تھی، وہ اشرف کی رعنائیوں سے تھے اُن کی نعمتوں سے بھرپور طور پہ لطف اندوز ہوتے لیکن انہیں اس سے قطعاً دلچسپی نہ تھی کہ بیچ دیوار کیا بنائے ہیں۔

۱۹۲۰ء کا فیروزپور مجھے خواب کی طرح یاد ہے، میری عمر سات آٹھ برس کی ہوگی، وسیع و عریض کوٹھی جس میں پھلدار درختوں کی بہتات تھی، چند کھیتوں میں جانور۔ دن کے سمے چارہ بو دیا جاتا، چند قطعے سبزی کے لئے مخصوص تھے، گائے بھینس گھوڑے نیز بھیڑ بکریاں مرغیوں کے ڈربے اور گیا ہے، ابا جان سپرنٹنڈنٹ گرے کنال تھے۔ تقسیم ہند پاکستان کے انعقاد سے پہلے اس علاقے کو دس غیر مستقل نہریں سیراب کرتی تھیں۔ وہ کبھی گھوڑے اور کبھی موٹر پہ لیکن بالعموم گھوڑے پہ دورہ کرتے۔ بڑے اہتمام کے ساتھ سفر کرتے۔ قیام و طعام کا سامان اور ہر طرح کا ساز و سامان ساتھ ہوتا یعنی نوکر، سائیس، باورچی ...... وہ گھوڑ سواری میں انتہائی مشہور تھے۔ انہوں نے بتلایا تھا کہ ایک دفعہ بیس روز سے مسلسل آٹھ ساڑھے آٹھ گھنٹے گھوڑے پہ سوار ہوا اور ظہر کی نماز کے لئے اڑھائی بجے اترا۔ ہمراہ سمت خاص کہتے تھے "شیخ صاحب کی کمر میں سیسہ بھرا ہے جو تھکتے نہیں۔" اُس روز اُن کا کھانا ایک بڑے زمیندار نے تیار کیا تھا لیکن اس کا جھگڑا چند لوگوں سے تھا جو مقابلتاً غریب تھے۔ ابا جان نے وہ دعوت قبول نہ کیا اور کہلوا بھیجا "دوسرے فریق کو گمان ہوگا کہ میں اُن کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں گا۔"

ابا جان نے کہا "اس پر تکلف دعوت کی بجائے میں نے تو باسی سبزی کو ترجیح دی۔ تاروں بھری رات تھی، جنگلوں کی ٹھنڈی ہوا، دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔ بستر پہ لیٹتے ہی نیند آ گئی۔"

ابا کا عہد شباب تھا، لانبا قد، سرخ و سفید رنگ، دوہرا بدن، متناسب اعضاء گھوڑے کی مسلسل سواری کی وجہ سے چاک و چوبند، آپ کی شخصیت میں اُن دنوں بہت جلال تھا۔ یہ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے کہ ایک انگریز لفٹیننٹ نے اُن کو فرسٹ کلاس میں سفر کرنے پر ٹوکا کیونکہ وہاں وہ اور اُس کی بیوی پہلے سے بیٹھے تھے تو اس بید کی چھڑی سے جو ہمیشہ ہاتھ میں رہتی تھی اسے اس بُری طرح پیٹا کہ اُس نے سفر نہ کرنے میں خیریت سمجھی اور فیروزپور ریلوے سٹیشن پر اپنا سامان گاڑی سے اُتروا لیا، لیکن بچوں کے ساتھ شفقت و محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک اجنبی اسسٹنٹ انجینئر کا سامان اُس کی عدم موجودگی میں ریسٹ ہاؤس سے اٹھوا لائے۔ یہ نوجوان یو پی میں نو وارد تھے اور یہ اُن کی پہلی پوسٹنگ تھی کہ ... بعد غلام اعظم خان نے جو ۱۹۶۰ء میں مشرقی پاکستان میں واپڈا کے سربراہ تھے میری موجودگی میں یہ قصہ ایک دوست کو سنایا۔

"میں اُن کے ابا کے ہاں چھ ماہ مہمان رہا۔ تعجب کی بات ہے کہ ہم پہلے کبھی نہ ملے تھے، نہ ہی ہمارے بزرگوں کی باہم شناسائی تھی۔"

ابا کی ملازمت کا زمانہ بحیثیت اسسٹنٹ انجینئر ٹھیکرگڑھ، قیام دکن کی یادگار ——— قبلہ مرحوم کے نام مہاراجہ سرکشن پرشاد کے خطوط نہ صرف نثر نگاری کا نادر نمونہ تھے بلکہ مضمون کے لحاظ سے بھی اُن میں ایک انوکھا پن تھا، یہ خطوط ہمارے پاس محفوظ تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں سب ضائع ہو گئے۔ ہر خط کا القاب کچھ ایسا تھا "محبوب شاد" "شاد نواز" اکثر خطوط میں قبلہ کے دیانت کردار اور پابندیٔ دین کی جانب رجوع کے تذکرے تھے۔ افسوس مگر کہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے

داستان عشق کا تذکرہ۔ والد مرحوم کی عمر اُس وقت پچیس برس کی ہوگی۔ نوعمری اور عہدہ کے پیش نظر وزیر اعظم سے ذاتی مراسم اُن کی غیر معمولی شخصیت سے ہی منسوب کیے جا سکتے ہیں۔ وطن سے دوری کے باعث جب پنجاب میں سروس کرنے کا خیال پیدا ہوا تو مہاراجہ سر کشن پرشاد نے ایک تعارفی خط اُس وقت کے لفٹیننٹ گورنر پنجاب کے نام دیا۔ والد مرحوم کا کہنا تھا کہ لفٹیننٹ گورنر اُس وقت شملہ میں قیام رکھتے تھے۔ میں وہ خط دینے کے لئے گیا۔ رات گئے تک گورنمنٹ ہاؤس کے خدام مجھے ڈھونڈتے رہے کہ وہ شخص کہاں ہے جو مہاراجہ کشن پرشاد کا خط لایا تھا۔

ابا سرکاری ملازمت میں تھے لیکن غیر منقسم پنجاب کا کوئی بھی سربرآوردہ خاندان یا عظیم شخصیت ہوگی جس سے اُن کے ذاتی مراسم نہ ہوں۔ اس کے باوجود وہ بے حد غیور اور حساس تھے۔ خودداری کی نگہبانی ہر شے پر مقدم تھی۔

ایک بڑے زمیندار اُن کے پرانے شناسا تھے۔ ۱۹۳۰ء میں دو تین دفعہ لائل پور میں ہمارے مہمان ہوئے۔ مجھے اُن کا لٹھے کا تہمد اور سفید ململ کا صافہ یاد ہے۔ یونینسٹ پارٹی کی تشکیل پر انہیں بڑا عروج نصیب ہوا۔ والد مرحوم نے دو ایک دفعہ کوئی کام کہا لیکن انہوں نے توجہ نہ دی۔ والد مرحوم نے قطع تعلق کی حد تک خاموشی اختیار کر لی۔ چند برس بعد جب یونینسٹ پارٹی کی سپیشل ٹرین لائل پور سٹیشن پر پہنچی تو وزیر اعظم سر سکندر حیات خان کی پیشوائی کے لئے حکام ضلع پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ وہی صاحب نے نیم سنجیدگی سے ذرا جھک کر سلام کیا۔ والد مرحوم نے طنزاً کہا۔ "رعایا کا فرض ہے کہ اپنے حاکم کو جھک کے سلام کرے!" — اور انہیں نظر انداز کر کے کسی اور صاحب سے باتیں کرنے لگے۔

وہ چودھری سر شہاب الدین سے نہ صرف بے تکلفی برتتے بلکہ چوٹ بھی کر جاتے۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ یہ نوجوان کون ہے جو چودھری صاحب سے یوں بات کر سکتا ہے۔

ہم نے بارہا دیکھا کہ والد مرحوم کے پاس ممتاز شخصیتوں کا آنا جانا ہے۔ ایسے لوگ ملنے کے لئے آ جاتے یا کھانے اور چائے پر مدعو ہوتے۔ اُن میں سے چند ہمارے ہاں قیام بھی کرتے۔ بسا اوقات دنیاوی لحاظ سے وہ رتبے میں بلند ہوتے لیکن تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہتے۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی تعلق میں تملق یا خوشامد کا پہلو نکلتا ہو۔ وہ ہر کہ ومہ کے ساتھ ایک جیسا سلوک روا رکھتے۔ پیر ہو یا بڑا امیر، عزت اور اخلاص میں کمی نہ آتی۔ ایسے روزمرہ کے مشاہدات کا ہم نے غیر شعوری طور پر اثر قبول کیا، یوں بھی ایسا ردعمل ایک قدرتی چیز تھی۔ اس لحاظ سے یہ ہوس پیدا ہی نہیں ہوئی کہ بڑے لوگوں سے راہ و رسم پیدا کرنا بجائے خود ایک طغرہ امتیاز ہے۔

اے[1]۔ ڈی۔ یوسف صاحب نے تیس برس پہلے کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگے میں ۱۹۳۰ء میں کیمبرج سے ایم ایس سی کر کے لوٹا تھا۔ اُن دنوں ملازمت کا ملنا دشوار تھا۔ شیخ صاحب نے وزیر تعلیم کے پاس سفارش کی کہ ... ایگریکلچرل کالج میں لیکچرار کی جگہ خالی تھی۔ کسی وجہ سے وہ جگہ کسی اور صاحب کو مل گئی۔ میں نے شیخ صاحب سے ذکر کیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ اُن دنوں اسمبلی کا سیشن ہو رہا تھا اور وزیر موصوف اسمبلی بلڈنگ میں اپنے کمرے میں تھے۔ شیخ صاحب

---

[1] ڈین زراعتی یونیورسٹی لائل پور۔

نے کلاس لیتے ہوئے وزیر صاحب کا کان اس انداز سے اینٹھ دیا کہ کان سرخ ہو گیا اور چہرہ بھی تمتما اٹھا۔ مجھے یہ اعزاز کر دینا صاحب موصوف کے ساتھ ہمارے خاندان کے دیرینہ مراسم تھے بلکہ اسمبلی کی نشست کے لئے جس حلقے سے امیدوار اس میں ہمارا آبائی وطن شامل تھا

ابا کی وفات پر ایک دوست نے کہا تھا: "پاکستان بننے کے بعد تو سبھی مسلمان ہو گئے۔ آزادی سے پہلے مسلمان بن کے دکھانا کسی کسی کا کام تھا۔" یہ صحیح ہے کہ انگریز حاکم اور ہندوؤں ڈوگروں کی موجودگی میں مسلمانوں کو ان کا حق دلانے اور ان کے تحفظ کے لئے پامردی سے سینہ سپر ہونا بڑی جرات کا کام تھا تاہم متعدد ہندو اور سکھ ان کے مخلص ترین دوست تھے۔ ان شخصوں میں مشہور مزاح نگار اور ادب نواز ڈاکٹر متھرا داس سے ۱۹۲۴ء میں دوستانہ مراسم قائم ہوئے جو تک صحبت ۱۹۲۸ء میں والد مرحوم کی تبدیلی وہاں پر ہو گئی تو ہر ہفتہ وار ان سے اردو میں لکھا ہوا خیریت کا کارڈ باقاعدگی سے

"میرے پیارے شیخ جی ......"

قیام پاکستان پر جب ڈاکٹر متھرا داس اپنی بہت سی جائیداد وہاں چھوڑ کے دلی چلے گئے تو ان کے خاندان کے چیدہ افراد کو سر چھپانے کے لئے ٹھکانے میسر نہیں ہو گئے اور کچھ عرصہ حالات ناسازگار رہے۔ اس زمانے میں مرحوم اپنے دوست کی تکلیف کا ذکر کرتے تو ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔

سر جوگندر سنگھ سے ان کی دوستی کا یہ عالم تھا کہ کسی وقت بھی ان کے پاس چلے جاتے۔ سردار صاحب بے تکلف پیش آتے اور خاطر مدارات کرتے۔ سردار صاحب والد مرحوم کے محکمے کے وزیر بھی ہو گئے لیکن اس رویہ میں فرق نہ آیا تھا۔ سردار صاحب مجھے دیکھ کر مسکراتے اور کہتے: "شیخ صاحب نوٹ سے آئے ہو؟" میں جواب دیتا "جی ہاں سے آیا" جیب سے وہ پرزہ نکال دیتا جس پر بالعموم لوگوں کے کام لکھے ہوتے۔ سردار صاحب کہتے: "شیخ صاحب میں تو سمجھتا ہوں آپ کسی مسلمان وزیر کے پاس جائیں۔"

"جی نہیں یہ کام تو آپ ہی سے کروانے ہیں۔"

جس سے شکن گئی شکن گئی —— چودھری سر چھوٹو رام وزیر زراعت ہوئے تو ایک عشائیہ پر جانے چودھری کو کیا سوجھی کہ کہنے لگے: "مغلوں کے زمانے میں ہم ہندو جاٹوں پر بہت مظالم ہوئے۔" ابا فرمانے لگے: "جی ہاں سر دور بھی دلی کے گردونواح میں مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کے برابر ہے!" ابا نے بتلایا تھا کہ میرا جواب سن کے چودھری صاحب غصے کے کرسی سے اچھل پڑے۔ پھر کبھی ان کی صورت نہ دیکھی۔

چودھری صاحب کو علم نہ تھا کہ مغل بادشاہوں نے بھی لا اکراہ فی الدین کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ خیبر سے بنگال اور راس کماری تک اسلام کا پھیلنا محض صوفیائے کرام کے فیض نظر اور حسن سلوک کی برکت سے تھا بادشاہوں کا اس میں دخل نہ تھا۔

کوئی تیر چلا نہ شمشیر چلی — فقط دین مبین کی تنویر چلی

ابا ان ہستیوں میں سے تھے جنہیں اس بات کا یقین تھا کہ پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو کے رہے گا ۱۹۴۶ء

ے دوران اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ نے تنبیہ کی کہ اگر آپ نے الیکشن میں مسلم لیگ کی حمایت کی تو سرکار آپ کی پنشن ضبط کرلے گی
سین ایا تُس سے مس نہ ہوئے اور نتیجے سے بے نیاز ہو کر مسلم لیگ کی حمایت کی جب اُس کی پاداش میں پنشن کا چوتھا حصہ
ٹ لیا گیا تو اُن کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ پاکستان بننے کے بعد اُس کی بازیابی کی تحریک کریں۔ آپا کے انتقال پر اُن دنوں
و ذکر کرتے ہوئے نذیر نیازی صاحب نے لکھا تھا۔

"مجھے اُن سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ رہی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لاہور آئے ہوئے تھے تاکہ پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت
بن سکے۔ ہم مسلم لیگ کے چند دیوانے خبروں کے لئے بیقراری میں انبالے سے لاہور آ بیٹھے۔ چودھری محمد حسین لدھیانوی مرحوم
کے پاس قبلہ شیخ صاحب کی زیارت ہوئی اور بار بار بہ دن ملاقات رہی۔ اول اول اُن کی باخبری نے ہمیں اُن کا مشتاق بنایا
اور پھر مجھے تو اُن کی صاف ستھری دلیر اور بارونق شخصیت، اُن کی اسلام دوستی اور تندی اعصاب سے اُن کی محبت نے فوراً ہی موہ لیا۔
جب یونینسٹ نے کانگریس سے مل کر وزارت بنالی تو سخت مایوسی چھائی تھی لیکن شیخ صاحب لوگوں کی افسردگی کا مذاق اُڑاتے
رہے۔ میں بڑا تو خوش تھا کہ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو شہروں کی طرح ہیں اور مجھے اس پر فخر تھا کہ وہ میرے وطن میں پیدا ہوئے۔"
یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کے عروج کی نگہداشت انہیں سونپ رکھی تھی۔ زندگی بھر وہ ملت
کے ہر کام میں پیش پیش رہے۔ انجمن اسلامیہ فیروزپور سے اُن کی وابستگی تو بہت ہوش سے پہلے کی بات ہے۔ وہ کئی سال انجمن
حمایت اسلام لاہور اور انجمن ترقی تعلیم مسلمانان ہند امرتسر کے سرگرم ممبر رہے۔ لائلپور میں انجمن اسلامیہ کی صدارت ۱۹۲۵ء میں
اُن کے سپرد ہوئی اور دم واپسیں تک وہ اس کے صدر رہے۔ اس شہر کے تعلیمی اور رفاہی اداروں پر اُن کی بے لوث خدمت
کی مہر ثبت ہے۔ قومی کاموں میں اُن کا انہماک دیدنی ہوتا۔ یتیم خانے کی زمین کے لئے ڈپٹی کمشنر میکلڈ ان سے مل رہے ہیں۔
اب عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ قبرستان کی تربیت کے لئے کوشاں ہیں۔ اب جامع مسجد کے پہلے لاؤڈ سپیکر کے لئے جیسے وقع
پر سفید چادر کا ایک کونا تھامے نمازیوں سے چندہ مانگ رہے ہیں۔ روپیوں، چونیوں، اٹھنیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ پاکستان
بننے سے کچھ عرصہ پیشتر انہوں نے اسلامیہ کالج لائلپور کی بنیاد رکھی تھی۔ سٹاف کا انتخاب خود کیا اور اس احسن طریق سے چلایا
کہ مغربی پاکستان میں یونیورسٹی کمیشن نے جن دو پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے حسن انتظام کی تعریف کی اُن میں سے ایک یہی ادارہ
تھا۔ اتفاق سے اُن دنوں میں صوبائی حکومت میں سیکرٹری محکمہ تعلیمات تھا۔ چونکہ رپورٹ کے مطابق سرکاری کالج باعموم قابل
تعریف نہیں سمجھے گئے تھے، رپورٹ پڑھتے ہی والد مرحوم کے دیرینہ دوست میاں محمد افضل حسین نے مجھے فون کرنے میں
پہل کی:

"دیکھا ہمارا بھائی جیت گیا، بھتیجا ہار گیا!"

سالہا سال تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے کبھی انجمن کے متعدد اداروں سے متعلق کسی سب کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت

لہ سید نذیر نیازی علامہ اقبال کے بھتیجے ہیں۔

بزم ہو، جشن ہو، کے وہ خود صدر تھے۔ یتیم خانہ کمیٹی، قبرستان کمیٹی، کالج کمیٹی، ہائی سکول کمیٹی...... لاہور کی گرمی، مئی کا مہینہ، اس وقت ان کی عمر پینسٹھ برس کی ہو گی۔ سہ پہر کے ساڑھے چار بجے وہ سکول کمیٹی کی میٹنگ کے لئے پیدل روانہ ہو چلے تھے۔ ان سب کو وہ بے حد اہمیت دیتے۔ یہی حال پنجاب یونیورسٹی سینیٹ سنڈیکیٹ، زراعتی یونیورسٹی سنڈیکیٹ اور ان سے منسلک تمام سب کمیٹیوں کا تھا۔ وہ فراست اور سیادت کا حسین امتزاج تھے۔ جو ادارہ رفاہِ عامہ کے کام سے منسلک ہوتا وہ وہاں موجود ہوتے۔ میٹنگ کی تیاری میں ایجنڈا کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا پھر بحث میں بھرپور حصہ لینا اور اپنا نقطۂ نظر منوانا وہ اپنا فرض سمجھتے — ایک دفعہ مجھ سے فرمانے لگے: "جن ورکروں کے کام اٹک جاتے ہیں وہ کس کے پاس جائیں؟"

وہ برسوں صوبائی فروٹ ڈیویلپمنٹ بورڈ اور مغل کو اپریٹو سٹور کے نائب صدر رہے۔ پنجاب ٹرانسپورٹ اتھارٹی، ریویو ایڈوائزری کمیٹی، امپرومنٹ ٹرسٹ، میونسپل کمیٹی کی صدارت یا ممبری، ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ لائل پور، یہ سب اُن کی جولان گاہ تھے۔

علامہ اقبال کی ذات سے انھیں بے حد عقیدت تھی۔ ان کی نظم میں وہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے مجموعہ تھے۔ پورا با ترجمہ قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ کرتے رہے۔ انھیں اس شخص سے کیونکر محبت نہ ہوتی جس پر اس کا اپنا شعر صادق آتا ہے ؎

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش ۔ جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

وہ اس کمیٹی کے رکن تھے جس کی زیرِ نگرانی مزارِ اقبال کی تعمیر ہوئی۔ بعد تعمیر فنی پہلوؤں کی نگہداشت انھوں نے کی تھی۔ وہ ۱۹۲۸ء میں بزمِ اقبال کی ورکنگ کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے اور آخر دم تک رہے۔

"WHOLE MAN, MADE OF ALL MEN, WORTH ALL OF THEM ......"

آپ نے ایسی بھرپور زندگی بسر کی کہ یقین نہیں آتا کہ ان کی زندگی کا جام لبریز ہو چکا۔ صاحبزادہ صاحب کو شیخ محمد اکرام تعزیت کے لئے تشریف لائے تو فرمانے لگے کہ اگر آپ اس قسم کی دینی دستاویز مرتب کر سکیں جس سے پتہ چلے کہ شیخ صاحب نے کس کس طور قوم اور ملت کی خدمت کی تو موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے سبق ہو گا کہ انسان اس زندگی میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔

صوم و صلوٰۃ کی سختی سے پابندی کے باوجود زاہدِ خشک وہ کبھی نہ تھے۔ ان کی جوانی خوش خصال کو گرمائے رکھتی۔ دوستوں میں ظرافت کی چاشنی اور حاضر جوابی کے لئے مشہور تھے۔ ان کے احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ ایسے خاندان بھی تھے جہاں انھوں نے تین پشتوں تک تعلقات نبھائے۔

بے شک وہ ایک عظیم باپ تھے لیکن یوں بھی نہ تھا کہ ان کے حضور رعب سے زبان گنگ ہو جائے۔ جوانی میں ان کی طبیعت میں سختی ضرور تھی۔ وہ بچوں اور ملازموں کو سخت سست بھی کہہ دیتے لیکن جوں جوں عمر گزرتی گئی، جمالی پہلو غالب آ گیا حتیٰ کہ وہ ہمارے دوست بن گئے۔ وہ اچھی گفتگو سے خوش ہوتے۔ ہمیں باتوں پر اکساتے۔ ہم میں سے کوئی فقرہ چست کرتا تو وہ محظوظ ہوتے اور فیاضی سے داد دیتے۔

کبھی عمرِ گزشتہ صدائے بازگشت کی طرح لوٹ آتی اور وہ بھولی بسری یادوں میں کھو جاتے۔ سرگزشت کے لو



[illegible]

مزے مزے کی حکایتیں" جیتی کہانیاں تجسیم کا بادہ اوڑھ لیتیں، ماضی کا فانوس تن اور صداقت کی لو سے جگمگا اٹھتا۔
ے چٹکلے، پُرلطف باتوں کا سلسلہ رات آنکھوں میں کٹ جاتی، ہم لوگ گھنٹوں باتیں کیا کرتے لیکن جی نہ بھرتا ؎

زمانِ خوشدلی دریاب دریاب — کہ دائم در صدف گوہر نباشد

رمضان میں ایک مرتبہ وہ لاہور دورے پہ آئے ہوئے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد مجلس جم گئی اور سحری کے لئے ت بھی ادھر ہم اُٹھے۔ رات کا ایک ڈیڑھ بج جانا کوئی بات ہی نہ تھی۔ صحبت کا وہ خمار آج تک نہیں اترا ؏

بہ عمر باتو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما

دن پور - جڑانوالہ - لاہور روڈ ؏ پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں

جب ہم بھائی ابا کے شریک سفر ہوتے تو کار کی پچھلی سیٹ سے کھیتوں کے درمیان کچے مرقدوں کو دیکھتے، جہاں بھی نماز ت ہوتا اب سڑک یا مزار کچھ جاتی نماز ادا کی جاتی پھر کار میں بیٹھتے ہی دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود۔ جب سڑک ی کھلتی تو ہم جانچ لیتے کہ آدھا راستہ طے ہو چکا۔ اب شرقپور دور نہیں۔ وہاں میاں شیر محمد صاحبؒ کے مزار پہ فاتحہ کہتے ہم ے بڑھتے۔ سردی ہو یا گرمی، بارش ہو یا طوفان اس معمول میں فرق نہ آتا۔ ایک دفعہ ایک سینیئر افسر نے لاہور آنے کے لئے ت کی خواہش کی، ابا نے کہا چلے چلو لیکن شرقپور میں فاتحہ خوانی میرا معمول ہے کوئی آدھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ برادل صاحب ے سوچا ہوگا یہ سودا مہنگا پڑے گا اور ریل سے چلے گئے۔

بزرگانِ دین سے عقیدت قبلہ جدّ کو ورثے سے ودیعت ہوئی تھی۔ آزادی سے قبل جب کبھی سرہند شریف سے گزر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی درگاہ پہ حاضر ہوتے۔ بالخصوص عرس کے موقع پر ہمیشہ حاضری دیتے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی سالار قافلہ حیثیت سے دو مرتبہ وہاں گئے دفعات کے بعد ایک قریبی دوست نے مجھے بتایا تھا کہ روضہ مبارک پہ بجلی لگوانے کا کام قبلہ نے اپنے ذمے لیا تھا اور اپنی نگرانی میں مکمل کروایا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ قبلہ مرحوم کو امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے توسط ے دینی و دنیوی فیوض حاصل ہوئے۔ اسی طرح جب لاہور آتے جمعرات کو مغرب کی نماز داتا صاحبؒ کے مزار پہ ادا کرتے، صغیر میں شاید ہی کوئی بڑی درگاہ ہوگی جہاں انہوں نے حاضری نہ دی ہو وہ یہ سوچ کر کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے کہ جنت البقیع سلطان عبدالعزیز نے سب قبے مسمار کروا دیئے ہیں۔

دیگر مصروفیات کے علاوہ پنجاب اسمبلی پھر مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے اُن کا اکثر لاہور آنا ہوتا۔ میں نے چند دفعہ عرض کیا کہ وہ میرے ہاں قیام کریں لیکن جواب تھا: "مجھے لوگ ملنے آتے ہیں انہیں دور آنا پڑے گا تمہیں بھی تکلیف ہوگی" دراصل وہ خود دار اور آزاد منش تھے۔ ہم سے کوئی خدمت لینا گوارا نہ کرتے بلکہ ہمیں نوازتے

۱۹۵۹ء میں جب پہلی مرتبہ مجھے ضلع کا چارج ملا اور بھائی ترقی پا کر لیفٹیننٹ کرنل ہوئے تو ہم دونوں کو ابا کی طرف سے تحفہ ایک ایک کار تحفۃً ملی اور نیا گھر بسانے کے لئے پورا ساز و سامان۔ مجھے خوب یاد ہے اُن دنوں ابا کے پاس کار نہیں تھی۔

شفقت مجھ پہ ضرور تھی کہ جب بھی لاہور میں قیام ہوتا رات کا کھانا ہمارے ہاں کھاتے، وضعداری ایسی کہ جب لاہور آتے سب احباب کو مل کے جاتے۔ شادی بیاہ ہو یا مرگ کوشش کر کے شریک ہوتے، عمر کے آخری حصے میں اُن کی صحت اچھی نہیں

رہی تھی۔ تو بھی ساتھ نہیں دیتے تھے لیکن وہ اسے اپنا فرض سمجھتے اور سفر کی صعوبت بھی برداشت کر لیتے۔

چند سال ہوئے خواجہ عبدالرحیم کے ہاں چائے کا دور چل رہا تھا میز پر اُن کی اہلیہ اور بڑا بچہ موجود تھے دفعتاً خواجہ سے مخاطب ہو کے کہا،

"طارق! چچا کو دیکھتے ہو؟ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے مقدمے کے دوران اور اُس وقت جب بہت سے لوگ میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ تمہیں ضرورت ہوگی دس ہزار میرے پلے سے ڈال دیئے تھے۔"

ابا جھینپ سے گئے اور دوسری طرف تکنے لگے۔

"نہیں نہیں رحیم ایسی کیا بات تھی...... "

یہ دس بارہ برس اُدھر کی بات تھی لیکن میں اس بارے میں قطعی بے خبر تھا۔ انہوں نے کسی سے ذکر تک نہ کیا۔

عمر کا بیشتر حصہ ابا کو ایک عزیز سے بہت پیار رہا۔ پھر وہ کسی بات سے آزردہ ہو گئے اور ملنا جلنا ترک کر دیا۔ ہو گیا۔ بخار نے طول کھینچا اور وہ کافی عرصہ صاحبِ فراش رہے۔ ہفتہ میں دو دفعہ ابا اُن کی عیادت کے لئے جاتے۔ وہاں یہ عالم تھا کہ وہ دیکھتے ہی پہلو بدل لیتے اُن کے بھائی ابا سے باتیں کرنے لگتے۔ یہ ہفتوں بیمار پرسی کے لئے جاتے رہے، عدم توجہی کا حال دل پر نہ لائے۔

۱۹۵۰ء میں سنٹرل ایکسائز کے ایک انسپکٹر دِلّی پر تعینات ہوئے اور یو پی سے کسی پرانے دوست کے توسط سے آئے۔ چنانچہ سوٹ کیس اور بستر ایک کمرے میں رکھ دیا گیا۔ ہفتہ دس دن کے بعد حامدی صاحب نے ابا سے کہا: "تو شہر رہائش کے لئے خاطر خواہ مکان نہیں مل سکا۔"

ابا نے خوش مزاجی سے کہا: "ہم نے کب کہا ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔" وہ بچوں نے بھائیوں اور خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے رہنے لگے۔ چند ماہ بعد انہوں نے کرایہ کے مکان میں جانے کی اجازت مانگی، ہنس کے کہا: "اب ہم اجازت نہیں دیں گے۔" چنانچہ تبدیلی تک وہ تین سال ہمارے ہاں ہی رہے۔

حافظ صاحب مسلم ہائی سکول میں دینیات پڑھاتے تھے جو سلسلہ بچوں کی تعلیم سے شروع ہوا تھا ابا کے اور پھر دوستی پر منتج ہوا ابا کے ہاں اُن کا قیام دس سال رہا جب سکول سے ریٹائر ہوئے اپنا گھر منتقل کر کے گوبرا وہ کمرہ دو سال مقفل رہا۔ وفات سے چند ہفتے پیشتر ابا جان نے انہیں خط لکھا: "بیٹھے بیٹھے میری نگاہ آپ کے کمرے پر جا پڑتی ہے تو آپ کی یاد ستاتی ہے۔"

اُن کی طبیعت میں سادگی بدرجہ اتم موجود تھی اُن کا پُر درد دل سب کے لئے دھڑکتا تھا۔ وہ تمام عمر اجتماعی بہبود کے لئے کوشاں رہے، ہر شخص کی مدد کے لئے کمربستہ وہ لوگوں کے معاملات میں ذاتی دلچسپی لیتے تھے کام بھول بھی جاتا لیکن یہ نہ بھولتے، حتی الامکان کوشش کرتے کہ وہ کام ہو جائے۔ چونکہ اس کی بنیاد خلوص اور جذبہ خدمت پر تھی ہر کام میں تائید ایزدی حاصل رہی ہاتھوں نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا کامرانی نے اُن کے قدم چومے، لوگ جس کے [illegible]

راسخ الاعتقادی میں وہ سیسہ پلائی دیوار تھے۔ جب ۱۹۴۷ء میں خون آشام فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو ابا ہندوستان
[آئ]ین ساز کے رکن کی حیثیت سے دلی میں تھے اور مقبول بھائی کے پاس مقیم تھے بھائی اُس زمانے میں ریکروٹنگ آفیسر
[تھے۔ ج]ب فسادات کی آگ تیز ہو گئی تو متعدد دوست احباب اس مکان میں اُٹھ آئے۔ دروازے پہ پہرہ ہونے کی وجہ سے اس
[کو نس]بتاً محفوظ سمجھتے تھے۔ جب ہر طرف آگ لگ گئی اور مسلمان محلوں پہ منظم حملے ہونے لگے تو بھائی خود ملٹری ٹرک چلا کے گئے اور
[مسلما]نوں کو ان کے مکانوں سے نکال لائے۔ ہمارے عزیز دوست سید محمد نواز اور شکور احسن نے بھی مہاجر بن کے اسی مکان میں

شکور احسن کا کہنا ہے کہ ایک دن گولیاں چلنے کی آواز اتنی شدید تھی کہ ہم ہراساں ہو گئے۔ ہم نے ابا سے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟"
انہوں نے بجمعیتِ خاطر کہا: "ہوگا کیا؟ دیکھو سامنے پتے ہل رہے ہیں؟"
"جی ہاں۔"
"یہ کس کے حکم سے ہل رہے ہیں؟"
"اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔"
"تو سوچو جب اس کے حکم کے بغیر پتہ تک نہیں ہل سکتا تو تمہارا بال بیکا کون کر سکتا ہے؟ جو اس کی مشیت میں ہے ہو کے رہے گا۔"
وہی راسخ الاعتقادی تھی جو انہیں ان دنوں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لئے جامع مسجد تک پاپیادہ لے گئی تھی۔ سڑک کے دونوں
[...]ل پر مسلمانوں کی لاشیں پڑی تھیں لیکن اس مردِ خدا نے اپنے پھندنے والی ترکی ٹوپی کو سر سے اتارنا گوارا نہ کیا۔

ایک چابکدست صناع نے صفاتِ ستودہ کی مختلف النوع کڑیوں کو ایک دوسرے میں پرو کے ایک پیاری شخصیت کو جنم
[دیا]۔ ایک جاذب زوردار شخصیت جو بیک وقت عظیم بھی تھی اور محبوب بھی۔ اس کی آبیاری انہوں نے خود اعتمادی اور قوت
[ارادے] کی تھی اولوالعزم، غیر متزلزل۔ اس خود اعتمادی کی اساس وحدہٗ لاشریک پر تھی۔ انہوں نے مجھے بتلایا تھا کہ ملازمت
[...]یں تھے جب مجبر گر واٹر ورکس کی تکمیل انہوں نے کروائی تھی۔ اور میر محبوب علی خاں نظام دکن رسم افتتاح کے لئے آئے
[...]ان نے جلوس میں رکھے تھے اور وہاں کے آداب کے مطابق تین دفعہ جھک کے کورنش بجا لاتے۔ ابا نے کہا میں سیدھا
[کھڑا رہ]ا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کے سلام کیا۔ انہوں نے پوچھا یہ شخص کون ہے۔ مصاحبوں نے عرض کی کہ ایک پنجابی انجینئر ہے۔ سہ

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

انہیں اپنے خالق پر پورا بھروسہ تھا بلکہ بسا اوقات مجھے یہ احساس ہوا کہ انہیں اس رشتے پہ ناز تھا جو بندے اور
[خدا] کے بیچ قائم ہو گیا تھا۔

من دست بہ ہیچ دست گیری ندہم — کایں دست ہمہ فانی اندر پنجۂ تو نی

یہی وجہ تھی کہ ملازمت کے دوران اور بعد میں سیاسیات میں حق کی بات برملا کہہ دیتے۔ طاقتور عناصر کی طرف سے شدید مخالفت میں
[بھی ا]نہوں نے اُن کا دامن کبھی سازش اور ریشہ دوانی سے آلودہ نہ ہوا۔ انہیں باری تعالیٰ کی ذات پہ اس حد تک اعتماد تھا کہ وہ اسے
[اپنا آ]سرا سمجھتے تھے۔ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا (حق ظاہر کرنے کے لئے خدا ہی کافی ہے)

انھوں نے نماز کے بارے میں سے نظری میں یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے کبھی ترک نماز کی ہو۔ کردار خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو یہ انسانیت بس کی بات نہیں تو وہ اقبال کی جدتوں کی ستایش کا ادھ تھا یا تحت مذہ زندگی کا سایہ کہ وہ بہ توجہ ہوتے ہیں ان کے اقوال پر جو مہدی محمد حسن صاحب نے میرے لئے یہ نقل کیا۔ فرمانے لگے: اللہ میاں بھی اپنے ایسے بندوں کو ہی رکھتے ہیں جو اس کی اطاعت اور خلق خدا کی خدمت سے ضمن پڑ لیتے:

وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۔ احسان کرو بیشک احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

اپنے صحت و وقت کی طرف توجہ دیں یہیں دیکھ بھال کے لئے شفا کے تشریف لے جاتے۔ استغنی کی حق محویت اور سماجی کاموں کی کشش وقت اور توڑی دابہت کم حصہ ذاتی کاموں پر صرف ہوتا۔ وہ دنیاوی مسائل کے متعلق متفکر ہو جاتے کی کو اور خود اپنی صحت کے متعلق نظریہ یہ تھے کہ ایک نحیف روحی میں نے آخری دنوں میں ایک مرتبہ کہ دیا کہ دادا جان نے ترقی حیثیت سے بیٹھ کر دنیاوی کاموں سے ناطہ توڑ لیا تھا آپ کیوں اتنا فکر کرتے ہیں؟ وہ کچھ جواب ہو لے کہنے لگے "یوں مجھ سے میں اتنی مصروفیات میں ہیں اعصاب اتنے قوی نہیں۔

مجھے بعد میں احساس ہوا کہ پشیمانی ہوئی کیونکہ ان کا نقطۂ نظر صحیح تھا۔ دنیا میں رہ کر دنیاوی آلائشوں سے پاک رہنا بڑی بات ہے ؎

آشنایان رہ عشق دریں بحر عمیق ۔۔۔ غرقہ گشتند و نگشتند بآب آلودہ

جب نئے نئے پونے کے مسلے پر فرشتوں ایسی معصومیت جھلکتی ہے اور وہ مجھے کہتا ہے "ابو مجھے سلا دیں" تو میں پیار سے گالوں سہلاتے ہوئے کچھ اب تھپ تھپا کرتا ہوں، دوسرے لمحے اس کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور نیند کی پریاں اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں تو مجھے یاد آتا ہے کہ ابا بھی بچوں کی صحت کے متعلق فکر مند ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے کہنے لگے "جب تم پیدا ہوئے تھے تو پہلے کے متعلق تشویش کا ہر ایک لمحہ تھا۔ تم بچوں کے علاج کے لئے باہر جا رہے ہو" انھوں نے نہ صرف کہا بلکہ "مجھے سارا خیال رہتا ہے تم کسی اچھے اسپتال جا کر دونوں بچوں کا آپریشن کرا دو۔"

آج بھی وہ محبت بھری باتیں کانوں میں گونجتی ہیں "آج وہ پاس نہ ہوں تو جینا ہے۔" ہمیں بھی تو جینا ہے اور سکوں پر سال ہی سے سہی مکہ سے باہر جاؤ یا چھ ماہ کے لئے بیرونی ملکوں کو تو بیکل ہو جاتے:

انھوں نے کس اصرار سے اپنی گاڑی مجھے دی تھی "تم جلدی کیوں نہیں گاڑی کیوں نہیں لاتے" میں سامان باندھ کر آنے کے لئے تیار تھا، گاڑی جس ملازم کے سپرد کی تھی وہ غائب تھا۔ میں نے کہا بھی "ابا مجھے دیر ہو رہی ہے" جب تک ملازم گاڑی لے کر نہیں گیا یعنی ہونے کے باوجود ابا کار کے پاس کھڑے رہے۔

۳

دل کا دورہ پڑنے کے بعد وہ خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ صحت و وجاہت کی وہ تصویر جو میں نے کبھی دیکھی تھی دھندلی سی تھی۔ چہرے کے نقوش اس فریم کی مانند تھے جس نے کبھی ایک دلپذیر تصویر کو اپنے میں لیا تھا۔ جوکھم سے زندگی میں ملک مشہور رہے۔ وہ دکھوں کا صدمہ اپنے اندر ہی پینے لگے۔ تھکن کی وجہ سے بات بات پر سانس پھول جاتا۔

وہ کڑک دار آواز جس میں بادل کی گھن گرج تھی، اب ماند پڑ چکی تھی۔ قانونِ قدرت کے مطابق "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک" کا عمل جاری تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنا تبسم بجھنے نہ دیا۔ اس حالت میں بھی تازگی اور شگفتگی برقرار [illegible] لیکن دھیرے دھیرے زندگی سے شیفتگی کم ہونے لگی۔ آفتابِ شام کا جلال ستو لا گیا تھا۔ جب آخری عید پر ہم سب ان کے گرد جمع ہوئے تو کسے معلوم تھا کہ ہم ان کے مہمان نہیں، وہ ہمارے مہمان ہیں۔

ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک دن یہ گھر ان سے محروم ہو جائے گا۔ لیکن یہ چشم زدن میں ہو گیا۔ احساس اور تجسیم کی [illegible] "بابا" کا کھیل تھا۔ کل تک ان کی باتیں تھیں، مسکراتا ہوا چہرہ تھا، شفقت بھری نظر تھی، لیکن آج کچھ نہیں۔ بے رحم یادوں کے سوا کچھ نہیں۔ کیا یہی جسم و محبت کی معراج ہے؟ درد اور تاسف کی لہر اٹھتی ہے اور وہ دل کے کنارے سے ٹکرا کر بے کراں سمندر میں گم ہو جاتی ہے۔ درد فراق کا، تاسف اس بات کا کہ قرب و حضوری کے کتنے ہی مواقع کھو دیئے۔

میں نے کہیں کہا تھا۔ ہمیں موت سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔ ذہنی طور پر یہ دنیا چھوڑنے کے لیے تیار رہنا چاہیے یعنی موتوا قبل ان تموتوا (موت سے پہلے مر جاؤ) لیکن اب دیکھ رہا ہوں کہ ہم عزیز ہستیوں کی مفارقت سے سمجھوتہ نہیں کر پاتے۔ ہمارے استقلال کے عزائم دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

جسٹس یعقوب علی نے کہا [illegible] جب میں اپنے والد کو دفنا کے لوٹ رہا تھا۔ دنیا میری نظر میں اندھیر تھی۔ بعد مجھے یاد [illegible] والد مرحوم کی آخری بیماری میں مجھے ان کے ساتھ طویل نشستوں اور دل کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ اگر ان کی بیماری طول نہ پکڑتی تو مجھے وہ قرب نصیب نہ ہوتا۔ یہ بات خود مقامِ شکر تھا۔ اس خیال سے ڈھارس بندھی اور غم و اندوہ کچھ ہلکا ہوا۔ [illegible] کا کرم تھا کہ ہمیں بھی ابا کی مسلسل رفاقت کی سعادت نصیب ہوئی۔ یاد رہے رفاقت جتنی طویل ہو مفارقت اتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

کیسے باور کروں کہ وہ شخصیت جس سے مل کر زندگی پُرامید ہو جاتی تھی اب نہیں ہے۔ یہ جدائی عارضی ہے اور وصلِ دائم کی [illegible] بشارت ہے۔ الموتُ جسرٌ یُوصلُ الحبیبَ الی الحبیب (موت ایک پل ہے جو ایک دوست کو دوسرے دوست سے ملا دیتا ہے)۔

ابا جان نے جیتے ہوئے بھی [illegible] احترام وصول کیا۔ تاروں کے انبار، تعزیتی [illegible]، سوگواروں کا ہجوم، ان کی عظمت کا [illegible] احساس ان کی زندگی میں نہ ہوا تھا۔ [illegible] لوگ تعزیت کے لیے آئے تھے۔ رات کے [illegible] ہجوم [illegible] مہمان میں داخل تھے۔ [illegible] بادشاہوں کی طرح کا ذکر [illegible] ہے۔ [illegible] دربار لگا رہتا ہے۔ [illegible] قائم رہا۔ [illegible] ایک عظیم [illegible] کا [illegible] تھا۔ دور دراز علاقوں سے [illegible] عقیدت مند، مخلص دوست [illegible] جن میں چھوٹے بڑے سبھی شامل تھے۔ انتظامیہ اور عدلیہ کے سربراہ، مذہبی، سیاست داں!

چودھری ظفر اللہ نے [illegible] تم کیوں روتے ہو۔ تم اس باپ کے بیٹے ہو، جسے قائد اعظم نے [illegible] ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی [illegible] جو سب سے بڑے آدمی تھے۔ میرے ذہن میں جو ان کی تصویر ہے وہ سب [illegible]

خوش باش اور دبنگ!

سردار بہادر خان نے کہا: "محترم چچا! آپ اقدار و روایات کے علمبردار تھے۔ جن میں خلوص کی تابندگی اور ملک و ملت کی خدمت کے لئے سچی تڑپ تھی۔"

سوگواروں میں متعدد گمنام لوگ تھے جنہیں ہم بھائیوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ جو کہتے تھے وہ ہمارا بہت بڑا سہارا ہو گئے۔ جو ان کے احسانات یاد کر رہے تھے۔ نعیم محمد نے کہا: "میاں جی! آپ نے مجھے [illegible] میں کسی زمانے میں آپ کے ہاں ملازم تھا۔ کچھ سال پہلے کی بات تھی میں نے میاں صاحب کو آ کر کہا۔ میرے [illegible] آتا نہیں۔ انہوں نے بی۔ ڈی ممبر کے نام خط دیا کہ [illegible] ساتھ کچھ رقم دی اور کہا۔ آتا [illegible] پاس آنا۔"

ایک اور صاحب نے کہا: "مجھ سے ہمیشہ شفقت کا برتاؤ کرتے۔ ان کے احسان مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ [illegible] زمانے کے [illegible] سے کر دیا۔ جب میرے بیٹے نے بی۔ اے کیا تو اسے ملازمت دلائی اور جب شادی [illegible] مدد فرمائی۔"

کرم دین کی [illegible]۔ وہ کالج کے زمانے میں چند سال [illegible] تھا۔ پھر اس نے [illegible] کلرکی کے [illegible]۔ اب [illegible] ہے۔ [illegible] برکت [illegible]۔ اس [illegible] سے [illegible]۔ جس کی پرورش [illegible] میں مرحوم نے [illegible] فرمائی۔

انتقال کو چند ہفتے گزر چکے تھے۔ [illegible] جب کسی دیہات سے ایک [illegible] چار پائیاں [illegible]۔ اس نے اندر کہلوا بھیجا: "میں [illegible] صاحب کے افسوس کے لئے آیا ہوں۔" [illegible] نے یہ بات سنی تو دل بھر آیا۔ [illegible] اس [illegible] سے آیا تھا۔

چودھری عصمت اللہ خود زخم خوردہ تھے۔ [illegible] سال بیٹا [illegible] اس حادثے نے ان کی زندگی مشکل [illegible]۔ [illegible] شیخ صاحب کے پاس بیٹھ [illegible] تھا۔ ان کی باتوں نے [illegible] ڈھارس بندھی تھی۔ [illegible] کے رونے لگے۔

ہم نے [illegible] لیکن [illegible] سے منسوب [illegible] میں [illegible] ترقی [illegible] میں نے [illegible] کے کنارے اس کشادہ [illegible] میں [illegible] سے جھنڈا اور [illegible] میرے اردگرد [illegible] ہیں۔ یادوں کا [illegible] میرے [illegible] میں قیام [illegible] آزادی سے پہلے [illegible] کے جھنڈے [illegible] میں سوچتا ہوں [illegible]۔ میں وہی کچھ ہوں جو میں نے والدین سے ورثے میں پایا۔ جو میں نے اس ماحول سے حاصل کیا [illegible]

نشوونما ہوئی۔ کتابیں، اساتذہ کرام، اقربا، احباب وہ لوگ جنہوں نے میری زندگی کو متاثر کیا۔ وہ چیزیں جن سے محبت یا نفرت ہوئی۔ ان ماں باپ کا احسان میں کبھی نہ چکا سکوں گا۔ جب پلٹ کے دیکھتا ہوں تو پس منظر میں آپ دونوں کو میری آویزاں پاتا ہوں۔ حسبِ معمول امی کا چہرہ ہی درخشاں ہے۔ آپ کے باوقار اور پُر تمکنت چہرے پر دلفریب ملائمت ہی ہے۔ وہ پُر رعب شخصیت جس سے سبھی دبدبہ مترشح تھا، شفقت میں ڈھل گئی ہے۔ ایسے میں اگر طلسمات کی پری مجھ سے کہے کہ کوئی ایسی خواہش بتاؤ جو میں فوری طور پر پوری کر دوں تو میں سوچ میں پڑ جاتا کہ جواب میں کیا کہوں —— دل جذبۂ تشکر سے لبریز تھا۔ میں کہہ ہی کیا سکتا تھا!

ان کی وفات سے چند ماہ پیشتر پانچ سالہ ندیم نے اچانک سوال کیا تھا "ابو یہ دن کب ختم ہوں گے؟ صبح ہوتی ہے دن تمام ہو جاتا ہے۔ پھر رات آجاتی ہے۔ پھر صبح ہوتی ہے —— تو یہ دن ختم نہیں ہوں گے کیا؟"

میں ذرا بوکھلایا —— "بیٹے جب تک زندگی ہے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کے لئے یہ دن رات ختم ہو جاتے ہیں۔"

"امی کے لئے یا سب کے لئے؟"

"بیٹے صرف امی کے لئے۔"

ہم دونوں باغ میں بیٹھے تھے۔ ندیم چاند کی طرف تکنے لگا [illegible] چاندنی [illegible] رہی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکے درختوں کو ہلا رہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں [illegible] اس فلسفہ کا بوجھ برداشت نہ کر سکیں گی سلسلہ روز و شب نقش بر حادثات کے بیان کی تفسیر بیان کر رہا تھا کہ وہ ذات اقدس اس کا سر [illegible] دو رنگ ہے کیسے قبائے صفات بناتی ہے۔ دن اور رات کا جلال و جمال اور جبر و قدر کا [illegible] ایک ہی ذات میں ضم ہوتا ہے۔ [illegible] اسی سلسلہ روز و شب کا دروازہ [illegible] بند ہو گیا تھا۔

چند روز پیشتر ایک دیرینہ دوست اور [illegible] کے درمیان [illegible] باتوں [illegible] تھا [illegible] گیا ہے۔ ہم [illegible] ہے:

[illegible]

وہ [illegible] بارش کے [illegible]

[illegible] —— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہر چیز اپنی جگہ پر پھیلی تھی۔ کاغذات، تصویریں، خطوط، مختلف اداروں سے متعلق میٹنگ کا ایجنڈا، روئیداد، رپورٹ لیکن آج کمرے میں کوئی چیز نہ تھی۔ پرانا کارپٹ اور کیبنٹ تک اٹھا دیے گئے تھے۔ وہ عمر بھر خوش پوش رہے لیکن آج ان کا سفید چادر ان کی زینت تھی اور چہرے پر سکون جیسے کہ رہے ہوں ؎

سانوں تاڑی مار اُڈاؤ نہ باہو

اساں آپے اُڈن ہارے ہو

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰی — اے اطمینان پانے والی روح اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل
رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ○ — تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔

انسانی یادوں کی تمام گردش میں آج جان کی تصویر ازلی نور سے نقش ہے۔ ایک لفظی تغیر کے ساتھ میں نے یہ اضافہ ڈیوک آف ونڈسر سے مستعار لیے ہیں۔ جب ہم متفرقات کے ذخیرے سے ان کی یادوں کا اثاثہ از سر نو کھولتے ہیں تو شکستہ دل ہوتے ہیں کہ بچھڑے ہوئے کی تصویر نکال کے کئی بار سے رو پڑتے ہیں۔ آہ! مجھے ان دنوں کے وہ اوقات یاد ہیں خوش اوقات جو دل کے کسی گوشے میں آباد ہے — اور — یاد کا پیرہن اس خوشبو سے معمور ہے جو گزر گئی۔ وہ کا دامن اس دولت سے معمور ہے جو بکھر گئی۔

مجھے یقین ہے کہ اب تک زندہ جانی کا سندیسہ دیتی تھی اور اب فضا میں گونجتی رہے گی کہ یہ باتیں یاد کرنے میرا دل آ گیا تھا۔

ہوا کی انگلی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ ہجر کی رات گزر جائے گی۔ ہجر کی اوس دھیرے دھیرے اترے گی۔

جائے صاحب دل است ناکسے بیدل نشد

ذاکر صاحب کی نثر

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ذاکر صاحب کی تربیت اقتصادیات میں ہوئی تھی لیکن ان کا دل قومی کارکن کا اور ذہن ادیب کا تھا۔ ماہر تعلیم ہونا یا ادیب بننا ان کی زندگی کا مقصد نہیں تھا بلکہ جس طرح ان کی قومی لگن نے انہیں معلم سے ماہر تعلیم بنا دیا، اسی طرح ان کی تخلیقی صلاحیت اور شائستہ متانت نے ان کی ہر بات [illegible] دلنشینی پیدا کر دی۔ ان کی قومی لگن اور تعلیمی خدمات نے انہیں اردو میں زیادہ نہیں لکھنے دیا لیکن جتنا کچھ بھی انہوں نے لکھا ہے اس کی [illegible] و کے اسلوب کے بننے میں منفرد مقام حاصل کر چکی ہے۔ [1]

اردو کا نیا اسلوب کیا ہے؟ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں۔ اس وقت ان کا مضمون [illegible] نہیں ہے لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے انہوں نے بعد کے مصنفین میں سرسید کے بعد حالی، عبدالحق اور سید عابد حسین کی نثر پر زور دیا ہے۔ ان مصنفین کے [illegible] اردو کے لسانی مزاج میں [illegible] سے آگے اور ان سے الگ اعتدال کی کوشش ملتی ہے۔ اردو ایک نہایت متنوع اور مخلوط زبان ہے۔ اس کی [illegible] بنیادی ہے لیکن اس میں سامی، ایرانی اور دوسرے لسانی خاندانوں کے عناصر بھی بڑے کارفرما نظر آتے ہیں۔ صوتیات اور لفظیات کی سطح پر لسانی [illegible] کی مختلف لہریں ایک ساتھ کارفرما ہیں۔ اسی طرح جملوں کی ترتیب اور تہذیب کے بھی اس میں کئی رنگ ملتے ہیں۔ اردو کی اس رنگا رنگی [illegible] تنوع کا مطالعہ اگر اس کی سات آٹھ صدیوں کی تاریخ کے پس منظر میں کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع ہی سے اس میں اسالیب کے دو دھارے ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے ہیں اور اردو کے لسانی مزاج کی تشکیل میں مدد دیتے رہے ہیں۔ اتنی بات واضح ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اردو [illegible] عجیب و غریب [illegible] کا مظہر رہی ہے۔ یہ مختلف عناصر [illegible] دو مختلف تہذیبوں اور دو لسانی گروہوں کے درمیان [illegible] تھا۔ گویا اردو نام ہے ایک تہذیبی [illegible] لسانی توازن کا جو [illegible] آمد کے بعد اور دوسری طرف [illegible] گروہوں کے درمیان طے ہوا تھا۔ اگر اس توازن کو ایک طرح کی [illegible] تسلیم [illegible] جو حقیقت ہے [illegible] کسی شخصیت میں بالعموم تہذیبی توازن کسی درجے اپنی [illegible] مکمل حالت میں [illegible] بلکہ کوئی مصنف [illegible] کوشش [illegible] کم و بیش کامیاب [illegible] منسوب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو کے کسی ایک اسلوب [illegible] اردو کے لسانی توازن کی مکمل شکل سے [illegible] نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بھی دور میں اردو کا لسانی توازن بھی ایک تصور محض ہے جس کا [illegible] البتہ جو اسلوب اس توازن کو پا لیتے ہیں اور اس کے نقوش زیادہ متناسب اور خوش آہنگی سے [illegible] کرنے میں جس [illegible]

---

[1] یہ مضمون [illegible] ذاکر صاحب کی [illegible] اردو کی تمام [illegible] اتفاق سے [illegible] ذاکر صاحب کی دو کتابیں تعلیمی خطبات اور [illegible] کی کہانیاں [illegible] زیر نظر مضمون لکھتے وقت [illegible] صاحب [illegible] کوشش کے باوجود [illegible] نہیں لیا گیا۔

[illegible] اردو کی صدیوں کی تاریخ [illegible]
[illegible] موجود [illegible]
[illegible] اردو [illegible] اسالیب
[illegible]
[illegible]
[illegible] ایک محمد حسین آزاد [illegible]
[illegible] ایک لسانی [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہی جائے گا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اردو نثر کے "عناصرِ اربعہ" کہا جاسکتا ہے۔ یہ ہے کہ اس دور میں انہوں نے اردو کی علمی نثر کے دامن کو وسیع کیا اور ایسے اسلوب کی مثالیں پیش کیں جو اردو کے بنیادی اسلوب سے نہایت قریب ہے۔

(۲)

ترسیل کے نقطۂ نظر سے نثر نگار تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں مخاطب یاد رہے یا نہ رہے اپنی ذات ضرور یاد رہتی ہے۔ دوسرے وہ جنہیں اپنی ذات یاد رہے یا نہ رہے، مخاطب ضرور یاد رہتا ہے اور تیسرے وہ جنہیں نہ اپنی ذات کا پتہ ہوتا ہے نہ مخاطب کا۔ ذاکر صاحب کی نثر کی نمایاں یہی خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو نہیں بھولتے۔ ان کی نثر میں ان کی ذات کچھ اس طرح سے [illegible] مخاطب [illegible] جادو کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور ان کی تحریر کی تاثیر اور دل نشینی میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ مخاطب سے براہِ راست باتیں کرتے ہیں [illegible] انداز ان کے اسلوب کی جان ہے۔ محمد مجیب نے تعلیمی خطبات کے پیش لفظ میں صحیح لکھا ہے

"ان خطبات میں انداز تقریر کا ہے تحریر کا نہیں۔ ان میں کوشش کی گئی ہے کہ ... ان سب سے براہِ راست بات کی جائے۔ (ص ۵)

ذاکر صاحب کے اسلوب کے تجزیے کے لیے مندرجہ ذیل اقتباسات کو غور سے پڑھنا ضروری ہے۔

۱۔ اگر ہم ذہانت اور فہم کی قابلیت کو مٹانے پر تلے رہیں اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم کر بیٹھیں جس میں [illegible] انسانوں کی [illegible] انسانیت سے محروم ہوں [illegible] اگر ہم دولت کی ہر قسم [illegible] اگر ہم [illegible] اور نسل کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں تو ان سب [illegible] سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن [illegible] اور جس کی [illegible] تعلیم [illegible] کی [illegible] اور [illegible] اپنے [illegible] اور افسوس [illegible] جو [illegible] رہیں گی اور [illegible] اور اپنے [illegible] سب [illegible] اور [illegible] ہے [illegible] خیال [illegible] وطن کی [illegible] ہوتی [illegible] انسانوں [illegible] ہمیں [illegible] وقت [illegible] پیشے [illegible] بعض [illegible] تعلیمی خطبات ص [illegible]

(ب) یہ نصب العین [illegible] یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد کی جتنی تعداد ممکن ہو
پیٹ پال سکے [illegible] نوکریاں [illegible] آرام چین اور یہاں [illegible] کی حکومت کے ساتھ زندگی [illegible]
[illegible] کے قابل ہو جائے اچھا ہے۔ یہ چند افراد اپنی خوشحالی کا معیار جس قدر بڑھا لیں اتنی ہی قوم ترقی
کرتی چلی جائے۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہوں وہ ہر طرح دور کی جائیں۔ مستقبل کے مشتبہ منصوبوں سے حال کی یقینی
[illegible] منفعتوں میں [illegible] نہ ہو اور قومی آزادی کا تصور [illegible] دنیا کے عیش میں خلل نہ ڈالنے پائے۔ معاشرت
[illegible] اچھی [illegible] معاشرت [illegible] ہے اور [illegible] اس لیے ہے کہ ایک با اقبال صاحب اقتدار قوم کی
معاشرت سے مختلف ہے۔ سیاست سے بے تعلق رکھی جائے۔ اس لیے کہ انفرادی ترقی و ترفیہ کے لیے
اپنی جماعت سے سیاسی اقتدار کی ضرورت کچھ بہت واضح نہیں۔ حکومت کی جو شکل بھی ہو بس وہ ان کی
قدر کرے۔ مسلمانوں کے معاملات [illegible] انصاف کرے۔ نوکریاں ملے۔ چند افراد [illegible]
[illegible] مذہب [illegible] اس جماعت کی زندگی کا مرکز [illegible]
[illegible] ترقی کی راہ
[illegible] دنیا سے [illegible] تعلیمات اور ان کی حکمتوں کو زیادہ تر
[illegible] اختیار کر لیا جائے۔

(تعمیر خطبات ص ۲۹، ۳۰)

(ج) [illegible] خیال بھی [illegible] میں سمجھتا ہوں کہ [illegible] زیادہ [illegible]
[illegible] سماج [illegible] ہو سکتا
ہے [illegible] سماج کی حیثیت [illegible]
[illegible] مضمون [illegible]
اس خیال کے متعلق میں بحث ہوں کہ ذہنی زندگی [illegible] سماج کے [illegible]
[illegible] انسان کی حیثیت سے [illegible] امتیازی خصوصیت [illegible]
نہیں۔ ذہنی زندگی [illegible] ذہنی زندگی [illegible] چراغ ہمیشہ [illegible] چراغ [illegible]
جا سکتا ہے۔ ذہنی زندگی میں [illegible] اس لیے ذہنی زندگی کے لیے [illegible]
معنوں میں اجتماعی زندگی ہے۔ سماج کا وجود لازمی ہے۔ [illegible] الگ الگ حیثیت [illegible]
[illegible] وابستہ ہے [illegible] خدمت انجام [illegible]
[illegible] جسم [illegible] جسم سے الگ ہو کر
[illegible] نہیں رہ سکتا [illegible] ہاتھ کے [illegible]

سے درخت ختم نہیں ہوتا۔ درخت سے الگ ہو کر ڈال اور پتی کے لیے سوائے فنا کے اور کچھ نہیں۔"
(تعلیمی خطبات ص ۱۳-۱۴)

(۵) "تعلیمی نظام ہمارے ہاتھ میں ہو تو اس وقت بھی کیا مدرسے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لیے قائم ہوا کریں گے اور ان کا مقصد بھی تندرست اچھے سچے آدمی پیدا کرنے کی جگہ چلتے پھرتے کتب خانے پیدا کرنا ہوگا؟ کیا اس وقت بھی بچوں کی قدرتی صلاحیتوں کا خیال کیے بغیر سب کو ایک ہی طرح سے ہانکا جایا کرے گا اور اس طرح قوم کی ذہنی قوت کو کہ اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، برباد کیا جائے گا؟ یا مختلف صلاحیت والوں کے لیے مختلف قسم کے مدرسے ہوں گے۔ جن میں ابتدائی تعلیم کے بعد بچے بھیجے جا سکیں گے اور اپنے خاص رجحان ذہنی کے مطابق تعلیم پائیں گے۔ کیا اس وقت بھی مدرسے اور قوم کی زندگی میں اتنا ہی کم تعلق ہوگا جیسا کہ اس وقت ہے یا یہیں سے ایسے سوتے بھی پھوٹیں گے جن سے ہر ہندوستانی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ قوم کی سیوا کرنے ہی سے وہ اپنی ترقی کی راہ نکال سکتا ہے؟ کیا اس وقت بھی ہمارے مدرسے خود غرضی اور شخصی مقابلے ہی کے محل بنے رہا کریں گے اور دوسروں کی خدمت اور مدد کے موقعے ان میں ناپید ہوں گے؟ کیا اس وقت بھی مدرسوں کو بس اسی سے سروکار ہوگا کہ علم سکھا دیا، لیکن علم کے برتنے اور سیرت پر اثر انداز ہونے کا کوئی سامان نہ ہوگا۔" (تعلیمی خطبات، ص ۲۴)

ان تحریروں میں وہ کیا چیز ہے جو ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے؟ جن مسائل کا ذکر ہے وہ علمی اور ملکی اور قومی نوعیت کے ہیں، لیکن نثر بوجھل نہیں، لکھنے والے کی ذات سے [illegible] موثر ہے، لیکن اس کی کشش ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ زبان علمی ہے، بیان انداز خطابت کا سا نہیں۔

ان اقتباسات میں جملوں کی ساخت اور افعال کے استعمال کو دیکھیے۔ پہلے پانچ جملے جو اگر سے شروع ہوتے ہیں اور حال پر ختم ہوتے ہیں [illegible] گرفت میں لے لیتے ہیں۔ حال کا یہ صیغہ بعد کے دو جملوں میں بھی جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد چنانچہ سے فعل کا استعمال تاریخ مستقبل میں بدل گیا ہے اور آخر تک یہی رہا ہے۔ حال اور مستقبل کے یہ صیغے اور فعل کی سادہ ترین شکلوں میں سے ہیں [illegible] اپنے سبب [illegible] خیال یعنی [illegible] وضاحت کے لیے شروع میں مضارع [illegible] استعمال ہوتے ہیں۔ [illegible] میں اضافی رو دیکھتے جائیے۔ معلوم ہوگا کہ مضارع کے استعمال کی جو فضا پہلے جملے میں تیار ہوگئی تھی [illegible] قائم رہی ہے۔ [illegible] اقتباس [illegible] ہے۔ اقتباس کی فضا استفہامیہ ہے [illegible] خیال کی معنوی نکتے کی وضاحت کی ضرورت تھی۔ فعل کا استعمال استفہامیہ انداز سے ہوا ہے۔ اقتباس ۵ میں بھی شروع سے آخر تک فعل کا سادہ صیغہ یعنی حال استعمال ہوا ہے۔

ذاکر صاحب کی تحریروں کو بس سے کھول کر پڑھیے، آپ کو فعل کے استعمال میں مسلسل ہمواری ملے گی یعنی تبدیلیاں بار بار اور [illegible] نہیں ہوتیں بلکہ استقلال میں ایک طرح کا تواتر پایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ فعل کے استعمال کی [illegible] سادہ شکلیں سامنے آتی ہیں۔ استفہامیہ توجہ کو بڑھا سکتے ہیں، مضارع اور حال سے تصویر کھینچنے میں اور مستقبل سے [illegible] ابھارنے میں مدد ملتی ہے۔ ذاکر صاحب کو اس کا

کہ احساس تھا۔ ان کے یہاں افعال کی اس سادہ اور بے جا شکلوں کے استعمال کی بڑی وجہ مخاطب کا تصور ہے جو ان کے ذہن میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ سادہ افعال کے مجرد استعمال سے مخاطب تک بات پہنچانے کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔

ذاکر صاحب نے اسلوب میں ان کے جملوں کی نحوی ساخت کا کیا درجہ ہے، اس سلسلے میں مزید بحث کرنے سے پہلے یہ مزید معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کی نثر کے بارے میں "گفتگو کا انداز" اور "خطاب کا انداز" کی جو ترکیبیں زیر نظر مضمون میں استعمال کی گئی ہیں ان سے متعلق چند باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔ اول یہ کہ گفتگو کا انداز کے تصور میں گفتگو کا لہجہ شامل نہیں۔ گفتگو کے انداز میں لکھنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اسے گفتگو کے لہجے میں لکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ خطاب کا انداز کے تصور میں خطابت شامل نہیں۔ خطاب کا انداز سے مراد محض یہ ہے کہ مخاطب ہر وقت نظر میں رہتا ہے اور متکلم اور مخاطب میں کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس خطابت سے مراد گویا طرز کے جذباتی، جوشیلے اور مرعوب کرنے والے اسلوب سے ہے۔ ذاکر صاحب کا اسلوب اس کی ضد ہے۔ ان کی بنیاد تھمے ہوئے جذبات اور متحمل ہوتی عقلیت پر ہے۔ تین چار اقتباسوں سے ہمیں اس عام رنگ سے ہٹے ہوئے طرز واضح طور پر امتیازات مل سکتے ہیں۔

"کیا اسلام کے پیش نظر جماعت کا یہی تصور ہے کہ وہ الگ الگ افراد کا بس ایک اتفاقی اور اضافی مجموعہ ہو؟ اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے؟ کیا شخصی مفاد کی نسبت اسلام اپنے اصول اور اپنی جماعت کے متعلق طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اس تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے؟ نہیں اور ہرگز بار نہیں۔" تعمیری خطبات ص ۴۴

"اور اگر آپ اپنی قومی زندگی کی موجودہ پستی پر مطمئن نہیں تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ آپ کے ثانوی مدرسے ہی کیا آپ کا سارا تعلیمی نظام بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں ذرا تبدیلی نہ کیجیے۔ وہ صحت بخش مقصد، مذہب میں کھوکھلی رسمیت، سیاست میں غلامیت پسندی کے پیدا کرنے، علم میں ذوق تحقیق سے اور فنون میں ذوق تخلیق سے نوجوانوں کو بے بہرہ رکھنے اور بے حس دماغ اور بے سوز دل پیدا کرنے کے نہایت کامیاب کارخانے ہیں۔" تعمیری خطبات ص ۴۴،

یہ کس کی آواز ہے؟ ان سطروں میں تاکید و تنبیہ کا جو انداز ہے، وہ کس کا ہے؟ پہلے کی مثال میں حقیقت تک پہنچی اور نیکی پر زور کا تصور ہے اور "بشارت" کہنے میں جو طنز ہے، وہ کس کے اسلوب کی یاد دلاتا ہے؟ ان جملوں میں جو اعلام آزاد کے انداز کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے کس حد تک یہ خطابت کا انداز ہے۔ یہ ذاکر صاحب کا اپنا رنگ نہیں۔ ذاکر صاحب کے ہاں تیزی اور طنز کا اسلوب پیدا نہیں ہوتا۔ وہ برتری کے جذبوں اور عصبیت کی آنچ سے دور رہتے ہیں۔ ان کی نثر تو ہوتے دل نشیں کی طرح نرم خوئی کی خبر رکھتی ہے۔ وہ مخاطب کو حقیقی فضا میں لے نہیں جاتے بلکہ نرمی اور خلوص سے اس کے دل کو اپنی میں لے لیتے ہیں۔ وہ مخاطب کا احترام کرتے ہیں۔ اس کی کم علمی پر طنز نہیں کرتے، اس کے ذہن کو ماؤف کر کے اسے اسیر نہیں بناتے، بلکہ اسے جگا کر اس کے دل و دماغ سے براہ راست

رہتے ہیں۔ یہ خطاب کا انداز ہے، خطابت نہیں۔

ذاکر صاحب کی نثر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چاہے خیال کتنا ہی مجرّد اور موضوع چاہے کتنا ہی فلسفیانہ ہو، کیا مجال کہ ان کی تحریر میں کہیں سے پیچیدگی یا ژولیدگی پیدا ہو جائے۔ وہ فلسفیانہ مباحث کو بھی اسی سادگی اور صفائی سے پیش کرتے ہیں جس طرح سیدھی سادی باتیں کر رہے ہوں۔ اس سلسلے میں اقتباس ج دوبارہ ملاحظہ ہو۔ سماج اور فرد کے تعلق کی بحث ہے لیکن کہیں کوئی نامانوس لفظ یا ترکیب استعمال نہیں ہوئی۔ علم فلسفہ کی اصطلاحوں سے بھی مدد نہیں لی گئی اور معنویت و صداقت بھی کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پائی۔ الفاظ بھی جتنے استعمال ہوئے ہیں سب کے سب روز مرہ استعمال کے لفظ ہیں جو ذہن میں آتے ہیں۔ نیز جملوں کی ترتیب روانی کا خون کیے بغیر جملوں کی ساخت سادہ اور صاف ہے۔

سادگی سے عام طور پر چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب کے ہاں سادگی کی بنیاد چھوٹے جملوں کے استعمال پر نہیں۔ ان کی کتب و مقالات میں سے کسی ایک کو اس نقطۂ نظر سے ایک بار پھر غور سے پڑھ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ذاکر صاحب کے جملے زیادہ تر خاصے طویل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔ یہاں تجزیے کے لیے اقتباس الف کو لیا جاتا ہے۔

۱۰ "اگر ہم دنیا سے مرتبے کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف تک نہ پہنچنے دے، اگر ہم دولت کی صرف اس کی تقسیم کی عدالت کا تہیہ کر چکے ہیں، اگر ہم [illegible] سے تعصب کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، اگر ان سب کاموں کو پورا کرنے کا وقت سب سے پہلے ہمارا ہے، اپنے وطن میں جہاں آج کل لوگ اس فرض سے غافل ہیں اور جہاں کوئی پیچ ہم رکھتے ہیں ... چنانچہ ہمارے نوجوانوں کی تعلیم، نوجوانوں سے دل میں بڑی محبت کی روشنی جگانے کی، رعب داب کی خواہش سے اپنے کو آزاد کرنے کی اور غلامی اور خدمت کرنے کی اور جن کو ... اور جو ادارے اس مہم کی تکمیل کے لیے قائم ہیں اس کی تعمیر نہ ہو سکے، اور جب تک ہم ... اپنی اس سب کی بنیاد نہ ڈالیں گے، [illegible] بھی قائم نہ رہیں گے، اور نوکریاں بھی نہ رہیں گی، پھر ان کی کاروں کی اپنی ... ہوں، جلد پہنچ کر ... کی اور وطن کی خدمت ہو گی، جس سے ان کے پیٹ کی آگ بجھے گی، اور روح کی بھی ... کی بھوک مٹے گی، جو اپنی تکمیل کے لیے ... اور اگر ابھی دنیا اتنی بے نیاز نہیں لگتی، پھر جو آج ... انسانوں کے لیے دولت سے کہیں زیادہ ضروری ہے، اور ... بنائیں گے کہ پھر اس کے سوا ... ہمارے سامنے ... جن سے انسانیت کا ... نہ ہو ... [illegible] ... بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں سے، بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت سے، آج اس حال کو پہنچا دیا ہے اور ... کی شان ربوبیت پر ایک دھبہ سا معلوم ہوتا ہے۔" ✗

شامل سطروں کے اس ترجمے میں صرف چند جملے ہیں۔ پہلا جملہ جو "اگر ہم دنیا سے ..." سے شروع ہو کر "... پھر واپس جائیں" پر ختم ہوتا ہے سات سطروں کا ہے۔ دوسرا "... ہمارے ..." سے شروع ہو کر "تین دن میں وہ سب کچھ پی گئے" پر ختم ہوتا ہے یہ بھی سات سطروں کا ہے۔ اگرچہ تیسرا جملہ "یہ دونوں بھی ..." ایک چھوٹا سا صرف تین سطروں کا ہے۔ لیکن چوتھا جملہ "... اپنے ذہنی ... وصیت ساتھ ..." ہوتا ہے وہ گیارہ سطروں کا ہے۔ اس طرح کے جملوں کو اردو زبان کے طویل ترین جملوں میں شامل سمجھنا چاہیے۔ [illegible] سے مجھے واسطہ ہے جو حامد ساز کی کتاب کے آدھے صفحے کا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قدر طویل جملوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب کا مطلب واضح طور پر ہوتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے!

پہلے جملے پر غور کیجیے۔ یہ شروع ہوتا ہے "اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں" تو اس جملے (PHRASE) کی نحوی ساخت یہ ہے:

ہم مجبور ہیں	[illegible]
ہم مٹانے پر مجبور ہیں	[illegible]
ہم غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں	[illegible]
ہم ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں	[illegible]
ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں	[illegible]
اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں	[illegible]

[illegible] PHRASE VP: فعلیہ؛ NOUN PHRASE NP: اسمیہ؛ حرف ربط: CONJUNCT [illegible]

حرف تعلیہ: M [illegible] صفاتیہ؛

بقیہ نحوی ساخت۔ اگر ہم نے نیت ... سے شروع ہونے والے دوسرے جملے (PHRASE) کو لیں۔ اس کے بعد ... سے شروع ہونے والے فعلی جملہ (RELATIVE CLAUSE) ہے جس میں دو چھوٹے جملے (PHRASE) اور ... کی ترتیب ہے۔ پھر "اگر ہم ..." سے شروع ہونے والا تیسرا حصہ اس کے بعد ... سے شروع ہوتا ہے۔ آخری دونوں ٹکڑوں کی نحوی ساخت پہلے دو کے انداز پر ہے۔ گویا ان چاروں ٹکڑوں کی ساخت کے اعتبار سے نحوی ... (STRUCTURAL PARALLELISM) ہے۔ اس کے بعد معنوی اعتبار سے ... جملہ ... ہے۔ اس سارے ... کا

نحوی ساخت بنیادی طور پر یہی ہے کہ پہلے ٹکڑوں کی کمی ...

اگر ہم ... تو

اس کے بعد جملے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس کی نحوی ساخت یوں ہے:

موقع ہے

فرائض کو پورا کرنے کا موقع ... ہے [illegible]

ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع خود اپنے پیارے وطن میں ہے — NPN2 PVPN PNP N PV

تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے — CONPN2 PVPN PAPNPN PV

اس جملے کے بعد دو ضمیمے یا تابع جملے ہیں جو دونوں "جس" سے شروع ہوتے ہیں اور جن دونوں کی ساخت یوں ہے

جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں۔ — PPN2 PN PV

جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے — PPN2 PN P(A) PV

گویا ان دونوں میں ہم ساخت کے اعتبار سے نحوی متوازیت (STRUCTURAL PARALLELISM) ہے

جملے کے پہلے حصے میں پانچ جملے ہیں دوسرے میں تین ہیں۔ جب پانچ میں چار کی ساخت ایک جیسی ہے اور پانچواں تابع جملہ ہے۔ دوسرے حصے میں دو تابع جملے ہیں اور دونوں کی نحوی ساخت ایک جیسی ہے گویا پورے جملے میں نحوی متوازیت (STRUCTURAL PARALLELISM) ان جملوں میں اور دو جملوں میں کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ مجموعی طور پر ہونے کے باوجود شگفتگی یا ٹیپ [illegible] نہیں [illegible] میں چھوٹے چھوٹے جملوں والا [illegible] موثر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں نحوی متوازیت (STRUCTURAL PARALLELISM) کا گہرا تعلق اسلوب کی اس امدادی حیثیت سے ہے جس کی موجودگی یا عدم موجودگی اسلوب کا آسان اور مشکل بنانے سے معنوی اعتبار سے جملے کے پہلے نصف میں جو سوال بار بار مختلف صورتوں میں ذہن پر دستک دینے کی طرح پڑ رہا تھا۔ دوسرے نصف میں اس کا جواب وطن کی خدمت کے شعوری معنوی پیکر کی شکل میں واضح طور پر سامنے آگیا ہے

اب دوسرے جملے کو دیکھیے [illegible] کے ملاوہ ساخت [illegible] نقشے سے واضح ہے۔

چنانچہ ہمارے مدرسوں کی تعلیم نو ہو [illegible] ملک کی خدمت کی، شمع جلانے کی [illegible] ان کے اردگرد (ان سے پتے کھیرتے)

ظلمت شب کی اور [illegible]

ظلمت شب کی اور جہل

تیرگیاں رسم کی اور [illegible]

سست کوششیاں [illegible] کی اور مایوسیاں

یہ (جہالت کی نیند) نہ سونے دے

اب یہ بات صاف ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے طویل جملوں کے موثر ہونے کا راز جملے کی سادہ نحوی ساخت اور اس ساخت کی متوازیت یعنی جملے کے داخلی توازن اور تکرار اور شعوری معنوی پیکروں کے استعمال میں پوشیدہ ہے۔ اب آخری دو جملوں کو بھی ملاحظہ کر لیا جائے۔ ان کی ساخت اعلیٰ بھی [illegible] کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس اقتباس میں جملوں کی نحوی تقسیم کو ایک آخری کیپرے معنوی مرکز اور دو آخری ٹکیروں سے اور نحوی متوازیت کو پورے جملے کی تکرار سے ظاہر کیا گیا ہے جملے کی حد بندی [illegible] سے کی گئی ہے۔ تیسرے جملے میں پیٹ کی آگ اور دل اور دماغ کی [illegible] اور پورے جملے میں جنت نشاں [illegible] اور [illegible] ہے [illegible] کے متضاد معنوی پیکروں سے جو کام لیا گیا ہے اس کی حیثیت ظاہر ہے۔

اقتباس الف جس کا تجزیہ اوپر پیش کیا گیا مستثنیات میں سے نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو کہیں سے کھول کر دیکھئے ایسے ہی اصول کی نحوی متوازیت اور ان کے ذہن کی ساخت ... واقع ہوا ہی اندازہ لگے گا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں چھوٹے جملے بھی کہیں کہیں ملتے ہیں لیکن زیادہ تر طویل جملوں سے اور نحوی متوازیت ملتی ہے جس سے طویل جملوں میں چھوٹے جملوں کا لطف پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے اقتباس ب کا نشان زدہ اور دوبارہ نیچے پیش کیا جاتا ہے۔ اقتباس الف کی وضاحت کے بعد اس کے تجزیے کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نحوی متوازیت والے نشان زدہ ... واضح ہو جائیں گے

ب۔ یہ سب جیسی ہی تھا اور ہر طرف سے مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے زوال کی حقیقی تصویر پیش ہوتی ہے، ... اور جن تھوڑی سی صورت کے ساتھ زندگی ... کے قابل نہ رہ جائے، اتحاد ہے، یہ ضرورت ہے کہ اپنی خوش حالی کا معیار جس قدر بڑھائیں اسی قدر خوش حال بھی ہو جائے، اس راہ میں جو رکاوٹیں ہوں اور مشکلات دور ہو جائیں، مستقبل کے منصوبوں سے حالات یقینی ہوں، منصوبوں میں صحیح نہ ہو، اور قومی طاقت و شعور انفرادی دنیا کے حصول میں صرف نہ لگنے پائے، معاشرت بدل جائے، اپنی پرانی معاشرت بدل دی ہے، اور یہی اس کا سبب ہے کہ جب اقبال صاحب اقتدار قوم کی معاشرت سے منسلک ہے، سیاست سے بے تعلق ہو گیا، اس لیے کہ انفرادی ترقی اور ترقی کے لیے اپنی جماعت کے سیاسی اقتدار کی ضرورت کچھ بہت واضح نہ تھی، صورت کی جو شکل بھی ہو جو کچھ بس وہ اسی قائم رہنے سے حکومت کے معاملات باہمی میں انصاف کرنے، نوکریاں دینے، چندہ لینے، ذکر اور تب چند نشستیں چاہیے، ... اور صداقت پیشے، مذہب، اس سلسلے میں جماعتی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا، تحریک تو کیے لازم رکھا جائے، اس طرح کہ دوسرے اداروں میں بھی دخل نہ ہو، اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے، معاملات پر اثر اہل دنیا سے متعلق ہیں، اس کی تعلیمات اور اس کی عشرتوں کو زیادہ نہ اختیار کیا جائے،

جب چاہتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہل دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے۔

اب کچھ جو نمونے پیش کیے گئے وہ علمی نثر کے تھے۔ ایک اقتباس بیانیہ نثر کا بھی دیکھ لیا جائے:

"جنگل ہی جنگل تھے اور پھر پہاڑیاں ہی پہاڑیاں۔ ساتویں جنگل کے نیچے اور ساتویں پہاڑی کے پیچھے ایک گھسیارا رہتا تھا، جو اور خوب صورت۔ وہیں ایک گڈریا رہتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جیسے چاند کا ٹکڑا۔ یہ بھی جیسے کسی جڑیا کا لال تھی۔ غریب اور بھولی بھالی تھی، جیسی اس کی بھیڑیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ لڑکی کی نظر میں گھسیارا کسی شہزادے سے کم نہ تھا اور گھسیارے کے نزدیک کوئی شہزادی اس غریب لڑکی کی برابری نہ کر سکتی تھی۔ کہنے کو دونوں بہت غریب تھے"

(پہلی محبت، مشمولہ ابوالخیر کی کہانیاں اور دو کسی کی کہانیاں)

اس نثر کا عام رنگ بیانیہ ہے۔ لیکن دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ انداز کہانی لکھنے کا نہیں، سنانے کا ہے یعنی مخاطب نظر میں ہے اور انداز گفتگو کا ہے۔ دوسرے اگرچہ جملے چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن نحوی متوازیت یہاں بھی موجود ہے۔ خط کشیدہ جملوں کو دیکھیے۔ اگرچہ پہلا ٹکڑا "پھر پہاڑیاں ہی پہاڑیاں" مختصر بیت، دوسرا بیان اور خوبصورت صفاتیہ ہے۔ اس کے بعد تیسرا "جیسے چاند کا ٹکڑا" چوتھا "جیسی اس کی چھیڑ" اور پانچواں ... دونوں جب ... صفاتیہ ہے لیکن دراصل پانچوں کے پانچوں اختتامیہ ہیں۔ اصل جملے جو اسم و صفت سے مکمل ہیں۔ ان سے فوراً پہلے آتے ہیں ان جملوں میں سے چند جا کر فعل ... ہی نہیں۔ یہ پہلے آنے والے جملے کی معنوی توسیع کے سبب یا بات کا وزن بڑھانے کے لیے یا اس پر زور دینے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے جملے کے ساتھ مل کر یہ دو دو کا سٹ بناتے ہیں اور اس لحاظ سے ان میں اور ان سے پہلے آنے والے جملے میں نحوی متوازیت ہے جس سے نثر میں ایک طرح کا داخلی وزن اور آہنگی پیدا ہوئی ہے۔

جملوں کے نحوی تجزیے کے بعد ایک نظر اگر الفاظ و تراکیب کے استعمال پر بھی ڈال لی جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اسلوبیات کی ... میں تجزیے کی ... کے لیے ضروری ہے کہ نثر کا پورا متن ہی لے لیا جائے۔ اس لیے موضوعی طور پر نثر اقتباسات منتخب کرنے کے بجائے ایک دو صفحہ ان چار اقتباسات سے کام لے سکتے ہیں جنہیں شروع میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اردو الفاظ کا ایک ... یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مصنف کی ... میں مستعار اور غیر مستعار الفاظ کا باہمی تناسب معلوم کیا جائے۔ لیکن چونکہ اردو کی نحوی آہنگی عربی فارسی اور دیسی الفاظ کے باہمی تناسب سے کہیں زیادہ مانوس مستعار اور غیر مانوس مستعار الفاظ کے باہمی تناسب پر منحصر ہے: اور مانوس اور غیر مانوس کا تصور خاصا اضافی اور موضوعی ہے اس لیے ایسا تجزیہ زیادہ کارآمد نہ ہوگا۔ چنانچہ زیر نظر تجزیے کو صرف عطف و اضافت اور مانوس و غیر مانوس کے استعمال کی بحث تک محدود رکھیں گے۔

عطف و اضافت کا استعمال اردو کی ان خصوصیات میں سے ہے جو اردو کو ہندی سے ممتاز کرتی ہیں لیکن عطف و اضافت کا حد سے زیادہ استعمال بھی مستحسن نہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات میں ان کی مثالیں یہ ہیں:

ا	شانِ ربوبیت: امید و خوف، رزاق و کریم، رحمٰن و رحیم، ... قہار	کل پانچ بار
ب	صاحبِ اقتدار، معاملات باہمی، مراتب بلند، اہلِ دنیا، اسالیب عمل، ترقی و ترفع۔	کل چھ بار
ج		صفر
د	رجحانِ ذہنی	صرف ایک بار

اردو کی عمومی نثر میں عطف و اضافت کے استعمال کی جو بھی حدود ہوں ظاہر ہے ... صاحب نے جن عطف و اضافت کا استعمال ... کیا ہے وہ ... ہے۔

اب بحث کی شکلوں کو دیکھیے:

	مستعار مجموعہ	مستعار الفاظ کی دیسی شکل
ا	تعصبات جنس و نسل	مدرسہ، نوجوانوں، بیماریاں، ... بدکرداریاں، پیٹ جوڑنا، زیادتیوں، کوتاہ نگاہیوں۔

ب۔ سماعت، مراتب، تعلیمات، مطالب — مضمون، بعد، سندیں، نظموں، صدیوں، مختلف

ج۔ صفحہ — مضمون، مضمون

د۔ صفحہ — یوں، ملاحظہ

آخر میں ایک نظر صوتیات پر بھی ڈال لی جائے۔ اس بحث میں ت، ص، ط، ث، ح، ع وغیرہ آوازوں کو نہیں لیا جائے گا کیونکہ ان کی بنیادی آوازیں بالترتیب [illegible] ہیں اور مختلف صورتیں دیسی آوازوں سے مطابقت رکھتی ہیں اور صوتیاتی سطح پر ان کی کوئی امتیازی حیثیت نہیں۔ البتہ ز، ژ، ذ اردو میں ز اور ض کو بھی آوازیں [illegible] ف، غ، خ، ق کو اردو کی کیا جائے گا جو اردو کی مستعار امتیازی آوازیں ہیں اور اردو کو ہندی سے ممیز کرتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں اردو کی ہکاری آوازیں [illegible] اور ہکار آوازیں [illegible] وغیرہ۔ [illegible] کا جو اردو کی مستعار امتیازی آوازیں ہیں اور اردو کو فارسی سے ممیز کرتی ہیں۔ اردو میں ہکار آوازوں کا ذخیرہ خاصا وسیع ہے اور یہ تمام ہندی آوازوں کے علاوہ [illegible] کے ساتھ اور تینوں معکوسی آوازوں کے ساتھ بھی استعمال ہوتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی اردو میں ان کا وقوع [illegible] بہت زیادہ ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: الفاظ کے ذخیرہ میں اسما اور صفات [illegible] افعال مستعار الفاظ کی تعداد پہلے ہی سے خاصی کم ہے۔ اس لیے ان میں دیسی آوازوں کا استعمال [illegible] اور اسما اور افعال زیادہ تر ہندی ہیں جن میں ہکار آوازوں کا استعمال اسما اور افعال کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں ہکار اور معکوسی آوازوں کا استعمال بہت زیادہ نہیں۔ اس لیے قیاس یہ ہے [illegible] اردو میں [illegible] مستعار اصوات کا باہمی تناسب شاید نصف نصف کا ہے۔ اور بعض زبانوں میں تو دیسی آوازوں کا تناسب اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ [illegible] صاحب کی نثر سے اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔ نمونے کے لیے اقتباس ب کو جہاں [illegible] پیش ہو چکا ہے ان آوازوں کے نسبتہ نشان زد [illegible] کا نقشان مستعار [illegible] آوازوں کا خط کشیدہ [illegible] گیا ہے، باقی اقتباسات کو تسلسل نہیں دیا گیا صرف اعداد و شمار پیش کیے جاتے ہیں۔

ا	مستعار آوازیں	۳۸	دیسی آوازیں	۶۰
ب		۴۱		۲۳
ج		۴۰		۲۷
د		۳۰		۲
		۱۵۳		۹۰

گویا یہ تناسب [illegible] سے زیادہ ہوا۔ اردو کے اسالیب میں صفت کی نوعیت کے مسئلہ پر غور کرنے میں نظر سے تناسب و تعدد سے بنیادی اسلوبیاتی صورت کے انکشاف ہو سکتے ہیں۔

اس تجزیہ سے ظاہر ہے کہ خواہ جملے کی ترکیب ساخت اور اس کے اجزا کی داخلی تنظیم ہو، خواہ الفاظ کی نوعیت [illegible]

و، نہی تناسب، ڈاکٹر صاحب کا اسلوب سادگی، ہمواری اور ہم آہنگی کی بہت اچھی مثال فراہم کرتا ہے۔

اگرچہ نثر میں آورد اور کوشش کر کے لفظوں کو گن گن کر نہیں لکھا جاتا، لیکن نثر میں یہ خوبیاں اتفاقاً پیدا نہیں ہو جاتیں۔ ان کے پیچھے بڑی تخلیقی لگن، مسلسل کوشش اور فنی خلوص کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مشکل نثر لکھنا مشکل اور آسان نثر لکھنا آسان ہے۔ یہی واقعہ یہ ہے کہ مشکل نثر لکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا آسان نثر لکھنا دقت طلب ہے۔ خون جگر کھائے بغیر علمی مباحث کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ [illegible] صاحب اردو کی خوش سلیقگی کے مزاج داں اور اس کی امتزاجی خوش آہنگی کے رمز شناس تھے۔ گفتگو کا انداز، سادہ الفاظ، طویل جملے اور [illegible] متوازیت ان کے اسلوب کے بنیادی ارکان ہیں۔ انہوں نے اپنی نثر کے ذریعہ جملوں اور ذیلی جملوں میں ربط و توازن کے جو نمونے پیش کیے ہیں، افعال کی سادہ شکلوں سے جو کام لیا ہے، اردو کے مزاج لاسانی عناصر میں تخلیقی توازن کی جو مثالیں پیش کی ہیں اور اردو کے فطری حسن کو بروئے کار لانے اور اس کے جینیس سے انصاف کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کا اعتراف ضروری ہے۔ اردو کے بنیادی اسلوب کا جب بھی جائزہ لیا جائے گا، ڈاکٹر صاحب کی نثری خدمات کو نظرانداز نہ کیا جا سکے گا۔

حسرت کاشمیری

ڈاکٹر اکبر حیدری

محمد علی نام اور حسرت تخلص کرتے تھے۔ ان کے نام میں اختلاف ہے۔ میر[1] قائم[2] گردیزی[3] خوشگو[4] شفیق[5] مبتلا[6]
شوق[7] ابراہیم خلیل[8] شورش[9] علی ابراہیم خاں[10] عشقی نے میر محمد علی اور قیام[11] اس کا نام محمد علی بتاتے ہیں۔ مصحفی،[12] شیفتہ[13] باطن،[14] اسپرنگر،[15] علی حسن خاں،[16] آزاد[17]

۱۔ نکات الشعرا صفحہ ۱۰۱ میر تقی میر، مرتبہ انجمن ترقی اردو

۲۔ مخزن نکات صفحہ ۴۲ قیام الدین محمد قائم چاندپوری، مرتبہ انجمن ترقی اردو

۳۔ تذکرہ ریختہ گویاں صفحہ ۵۵ سید فتح علی حسینی گردیزی

۴۔ سفینۂ خوشگو صفحہ ۲۹۹ بندرابن داس خوشگو، مرتبہ عطا کاکوی

۵۔ چمنستان شعرا صفحہ ۱۳۶ شفیق اورنگ آبادی

۶۔ گلشن سخن صفحہ ۵۰ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی

۷۔ طبقات الشعرا (قلمی) صفحہ ۴۵ مولوی قدرت اللہ شوق

۸۔ تذکرہ شورش صفحہ ۵۰ مرتبہ کلیم الدین احمد

۹۔ گلزار ابراہیم صفحہ ۱۰۱

۱۰۔ تذکرۂ عشقی صفحہ ۱۰ مرتبہ کلیم الدین احمد

۱۱۔ تذکرۂ شعرا … صفحہ ۳ …

۱۲۔ دستور الفصاحت صفحہ ۴۲ احمد علی یکتا، مرتبہ امتیاز علی عرشی رامپوری

۱۳۔ مجموعۂ نغز صفحہ ۲ میر قدرت اللہ قاسم، مرتبہ محمود شیرانی

۱۴۔ گلشن بے خار صفحہ ۲۵ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

۱۵۔ گلستان بے خزاں صفحہ … میر قطب الدین باطن

۱۶۔ … صفحہ ۲۳ … اسپرنگر

۱۷۔ بزم سخن صفحہ ۱۰ علی حسن خاں

۱۸۔ آب حیات صفحہ ۱۳۵ مولوی محمد حسین آزاد

[illegible] نے انھیں میر محمد علی لکھا ہے اور بعض نے قاسم علی[illegible] نصر[illegible] اور کسی نے محمد علی خاں لکھتے ہیں۔ میر حسن ایک جگہ تاباں کے ترجمے میں حشمت [illegible] میرزا محمد علی لکھتے ہیں۔

حشمت کی تاریخ ولادت اور ان کے والد بزرگوار کا نام کسی تذکرہ میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ اتنا تو معلوم ہے کہ وہ کشمیری تھے [illegible] کشمیر کے بلند پایہ شاعر اور مسلم الثبوت اُستاد مرزا عبد الغنی بیگ قبول کے شاگرد تھے[illegible] ہی کہتے ہیں کہ حشمت کا قدیم وطن کشمیر تھا مگر غالباً آباؤ اجداد [illegible] وطن کر کے دہلی میں سکونت گزین ہو گئے تھے۔ [illegible] وطن کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غنی بیگ قبول کے شاگرد ہو [illegible] یہ کہنا درست نہیں ہے کہ قبول کشمیر میں تھے اور کشمیر کی آمد و رفت سے حشمت کی شاگردی کا سلسلہ قائم رہا۔ اس زمانے میں قبول دہلی میں ہی [illegible] تھے اور وہیں حشمت نے اُن کی شاگردی اختیار کی۔ اُن کے دو بھائی عابد یار خاں اور مراد علی خاں شاہ عالم ثانی[illegible] کی سرکار میں داروغہ جواہر خانہ

[illegible] سرخوش [illegible] مولوی عبد الغفور خاں نساخ

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] ۲۹۵ [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] ۲۶ [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

شاہد ہے۔

حشمت شعرائے متقدمین میں سے تھے۔ شاہ مبارک آبرو (متوفی ۱۱۶۱ھ) یعنی آبرو (متوفی ۱۱۶۱ھ) شاہ حاتم (متوفی ۱۱۹۷ھ) اور سودا (متوفی ۱۱۹۵ھ) کے ہمعصر تھے۔ انہیں اپنے عہد میں ایک مسلم الثبوت استاد کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ وہ اردو کے ایک قدیم اور مستند شاعر میر عبدالحی تاباں کے استاد تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تاباں شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ مصحفی نے تاباں کے متعلق جو شہرت تاباں کو حاصل ہوئی تھی وہ حشمت کی شاگردی کے سبب سے ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں: "اگرچہ زبانی شاہ حاتم ابتدا شاگرد شاہ حاتم است اما آنچہ شہرت دارد و واقعی است اینست کہ بہ شاگردی محمد علی حشمت کہ شاگرد محمد فقی بیگ قبول کشمیری است استفادہ بسیار نمودہ۔"

تاباں نے ایک مثنوی اپنے استاد اور عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی مدح میں لکھی ہے جس میں وہ صاف صاف حشمت کی شاگردی کا اعتراف کرتے ہیں۔

خورشید سلطنت حشمت تھم بودند — کز رحلت عدم آباد شد کشور ہند
سال تاریخ چو جست شاہ ولد — گفت دل زیر زمین پوشیدہ کشور ہند

(دیوان تاباں ص ۱۲۳)

۱؎ مجموعہ نغز، ص ... جلد اول
۲؎ گلشن ہند، ص ۹
۳؎ تذکرہ شورش، ص ۹۹
۴؎ تاباں: میر عبدالحی نام اور تاباں تخلص کرتے تھے۔ بڑے دلچسپ نوجوان تھے۔ غضب کا حسن پایا تھا۔ دلی کے رہنے والے تھے۔ بہت حسین، خوش خلق، پاکیزہ، نرم گو اور خوش مزاج معشوق تھے۔ سب نوجوان ... صاحب دیوان تھے۔ دیوان ایک ہزار شعر پر مشتمل تھا۔ تذکرہ شورش ص ... ان کا انتقال ۱۱۶۰ھ اور ۱۱۶۳ھ کے درمیان ہوا۔ دلی کا دبستان شاعری ص ... طبقات الشعراء ص ۱۹۹، ... تذکرہ ... جلد دوم، ... قاموس المشاہیر ص ... نکات الشعراء ... ۱۱۶۳ھ ... تھے۔
۵؎ طبقات الشعراء ... ص ...
۶؎ چمنستان شعراء ص ۵۵ شفیق اورنگ آبادی۔
۷؎ تذکرہ ہندی ص ۴۲
۸؎ انجام: نواب امیر خاں نام، عمدۃ الملک خطاب اور انجام تخلص۔ گلشن ہند ص ... تفصیل ... محمد شاہ بادشاہ کے امراء میں سے تھے۔ ۱۱۵۹ھ میں اپنے حرم کے ... شہید ہوئے۔ تاریخ وفات "فرمودہ ..." سے ... نکلتی ہے۔

نہ اُستاد کی مجھ کو تاب ثنا — کہوں گر تو کب ایسی فکر رسا
کمالوں میں جن کے نہیں کچھ قصور — تھے سب علم کتب میں ان کے حضور
کسی کو کہاں اس سے ہے برتری — کہ ہے نام اس کا محمد علی
تخلص بھی حشمت ہے اس کا بجا — وہ اہلِ سخن بیچ ہے بادشاہ

ڈاکٹر اسپرنگر، مصحفی اور عشقی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حشمت کا خیری محتشم علی خاں حشمت کے بھی استاد تھے لیکن عشقی اس بارے میں خاموش ہیں۔ مصحفی نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ حشمت کاشمیری محتشم علی خاں حشمت کے بھی استاد تھے۔ انہوں نے تاباں کے ترجمے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ حشمت تخلص محتشم علی خاں ... نیز وہ ... یعنی تاباں محمد علی حشمت کے شاگرد تھے اور محتشم علی خاں حشمت ایک اور شاعر تھے۔

میر حسن حشمت کو شاعر مرد اور خوش وقت پسند ... مقالات اور علی ابراہیم خاں ... ریختہ میں سلیقہ رکھتے تھے اور خیال از کیفیت نہیں ہے ... وہ سپاہ زمیدان سخن دانی و ... خرام قلم و معانی تھے ... سرور لکھتے ہیں کہ ان کا ... میں پایا جاتا ہے اور وہ ... تھا۔ ... و میدان سخن کے سپاہی تھے اور ... شمشیر زبان سے تسخیر کرتے تھے ... شاعر تھے۔ شعر ... شائستہ ... پڑھتے تھے۔

حشمت تخلص محتشم علی خاں نام ... تذکرہ ہندی ... [illegible]
سپاہی ... فارسی اور ریختہ کے بہت اچھے شاعر تھے۔ دلی ... [illegible]
... خاں آرزو ... صاحب دیوان تھے ... تذکرہ ہندی ...
... اردو ... [illegible]
تذکرہ ہندی صفحہ ۳
تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۳۰
گلشن سخن صفحہ ۵
گلزار ابراہیم صفحہ ۱۰۳
تذکرہ شورش صفحہ ۱۰۵
چمنستان شعرا صفحہ ۳۶
تذکرہ سرور صفحہ ۲۲۹
تذکرہ ریختہ گویاں صفحہ ۵
تذکرہ مسرت افزا صفحہ ۳۶ ... [illegible]

حشمت فضیلت علمی کے ساتھ ساتھ شعر بھی خوب کہتے تھے مگر اس فن میں بقول مؤلف مجمع ... جاوید شہرت نہیں چاہتے تھے ...
... اُن سے بہت بیزار تھے۔ انھیں ان کی شاعری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی وہ کہتے ہیں کہ اکثر جو لوگوں کے اشعار پسند ...
... تھے اور یہاں کا مناسب اور صحیح جواب پا جاتے تھے۔ ان کا کلام بہت گھٹیا لفظ اور بے سر و پا ہوتا تھا۔ الغرض بڑے ...
ادنیٰ ... آج بھی ان کا ذخیرہ نہیں ملتا ہے۔

حشمت کا دیوان ... ہے۔ اردو کیٹلاگ ... انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطات میں ان کے دیوان کا ذکر نہیں ہے۔
... سالار جنگ میوزیم، آصفیہ اور ادبیات اردو حیدرآباد کے کتب خانے بھی ان کے دیوان سے محروم ہیں۔
... تذکروں سے ان کے صرف دو شعر دستیاب ہوئے ہیں ؎

جب آہ ان چمن میں ہوئی آشنائے گل — تب عندلیب رو کے پکاری کہ ہائے گل
خط نے ترا حسن سب اڑایا — ہے سبزہ قدم جہاں سے آیا

گردیزی نے پہلا مصرع اس طرح لکھا ہے۔

ع خط نے ترا حسن سب اڑایا

قائم اور شیفتہ نے یوں لکھا ہے۔

ع خط نے ترا حسن سب گنوایا

قائم نے ذیل کا شعر حشمت کاشمیری کی طرف منسوب کیا ہے ؎

تہمت گل نے سنا پا کہ زمانے کا پیچ — ہر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

آتش نے بھی اس شعر کو قائم کی بنیاد پر انھیں ... کے حشمت کاشمیری کا ہی تسلیم کیا ہے۔ اس شعر کو ان کی طرف منسوب
کرنا صرف غلط ہے بلکہ گمراہ کن ہے۔ اصل میں یہ شعر محمد ... خان حشمت دہلوی کا ہے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ...

۱؎ ... صفحہ ۲۰۰ جلد دوم
۲؎ نکات الشعراء صفحہ ...
۳؎ نکات الشعراء صفحہ ...
۴؎ تذکرہ ریختہ گویاں صفحہ ...
۵؎ مجموعہ نغز جلد اول صفحہ ...
۶؎ گلشن بے خار صفحہ ...
۷؎ مجموعہ نغز صفحہ ...
۸؎ نکات الشعراء صفحہ ... ۹؎ تذکرہ ہندی صفحہ ...

۲۔ شفیق[1] مبتلا[2] شورش[3] عشق[4] سرور[5] اور سری رام[6] نے اس شعر کو انہی مستقیم علی خاں حشمت کے زیر میں نقل کیا ہے۔
آسی کی دوسری فاش غلطی یہ ہے کہ انہوں نے مصحفی کے حوالے سے نیب اور جگہ مستقیم علی خاں حشمت کے درج ذیل اشعار کو محمد علی حشمت
کشمیری سے منسوب کیا ہے[7]

گورے سرتے دوانوں کو جھلاتی ہے بہار — شور ہے غل ہے قیامت مست آئی ہے بہار

حشمت اپنا درد دکھ تو اس برس ظاہر ہے کہ — ہم نے کی ہے توبہ اور دھوم میں مچاتی ہے بہار

حقیقت یہ ہے کہ مصحفی نے یہ دونوں شعر مستقیم علی خاں حشمت کے ترجمے میں لکھے ہیں اور انہی سے منسوب کیے ہیں[8] آسی یہ بھی
مانتے ہیں کہ مصحفی محمد علی حشمت کے ترجمے میں لکھتے ہیں۔

"شعر فارسی را بسیار به لطافت می گفت و گاه گاہے خیال ریختہ هم داشت این مطلع وی به لطافت طبع او است"[9]
یہاں بھی حضرت آسی سے بھول چوک ہوئی ہے۔ مصحفی نے یہ عبارت مستقیم علی خاں حشمت کے ترجمے میں لکھی ہے اور شعر بھی وہیں
دیا ہے[10] جسے قائم اور آسی نے حشمت وغیرہ سے منسوب کرنے غلطی کی ہے۔ غرضیکہ مصحفی نے یہ تینوں شعر جنہیں آسی مرحوم نے حشمت
کشمیری کی تصنیف بتایا ہے حشمت دہلوی سے منسوب کیے ہیں۔

نکہت گل نے جگایا کسے زنداں سے نکل — پھر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

گورے سرتے دوانوں کو جگاتی ہے بہار — شور ہے غل ہے قیامت مست آئی ہے بہار

حشمت اپنا کہہ درد تو اس برس ظاہر ہے کہ — ہم نے کی ہے توبہ اور دھوم میں مچاتی ہے بہار[11]

1۔ گلزارِ نکات صفحہ ۶۰ 2۔ چمنستانِ شعراء ۱۵۰
3۔ گلشنِ سخن صفحہ ۹
4۔ تذکرۂ شورش صفحہ ۶۱
5۔ تذکرۂ عشق صفحہ ۹۶
6۔ عمدۂ منتخبہ صفحہ ۲۲
7۔ خمخانۂ جاوید صفحہ ۲۳۸ جلد دوم
8۔ مخطوطاتِ نادر خزینہ صفحہ ۷۵
9۔ تذکرۂ ہندی صفحہ ۷۸
10۔ تذکرۂ ہندی صفحہ ۶۰
11۔ تذکرۂ ہندی صفحہ ۶۰
12۔ تذکرۂ ہندی صفحہ ۶۲

مصحفی نے حشمت کاشمیری کا ان کے تذکرہ ہندی میں نہیں کیا ہے۔ البتہ ریاض الفصحا میں وہ ان کے باب میں صرف اتنا لکھتے ہیں۔

"محمد علی خان حشمت۔ از حال ایشاں خبر ندارم" اس کے ساتھ یہ شعر بھی لکھتے ہیں ؎

خدا نے تجھ حسن سب اٹھایا — یہ سبزہ قدم کہاں سے آیا

مولف گلزار جاوید نے ذیل شعر حشمت کاشمیری کا تسلیم کیا ہے ؎

گر نہ بیاہے گھیر مجھے یار تنگ کر اب — دیکھے ساتھ لینے سے پھر کر جواب دل

جناب اثر [illegible] نے بھی مولف گلزار جاوید کی تقلید میں اس شعر کو حشمت کاشمیری کا ہی قرار دے دیا۔ لیکن گردیزی، مبتلا، شفیق اور مصحفی نے یہ شعر حزین سے منسوب کیا ہے اور واقعی یہ انہی کا ہے جیسا کہ تقطیع سے نمایاں ہے ؎

آ اور دیکھ کہ رنگ [illegible] کا [illegible] — کیا کرے [illegible] حزیں اضطراب دل

اسی طرح [illegible] نے ذیل شعر کو حشمت کاشمیری سے منسوب کر کے نقل کیا ہے ؎

اس بے وفا کے عشق میں کچھ جلا نہیں — یاں تک بھی [illegible] دسترس نہیں

حالانکہ یہ شعر میر، گردیزی، شورش، مصحفی، شفیق اور ابراہیم نے حزیں سے منسوب کیا ہے۔ [illegible] ہے ؎

اس فصل گل میں کیوں نہ گریباں کیجیے چاک — جاں [illegible] حزیں [illegible] نہیں

---

۱ ریاض الفصحا صفحہ [illegible] ۲ گلزار جاوید صفحہ [illegible]

۳ تذکرہ [illegible] صفحہ [illegible]

۴ [illegible] صفحہ [illegible] ۵ [illegible] شعرا صفحہ [illegible]

۶ تذکرہ [illegible] صفحہ [illegible]

۷ حزیں [illegible]

[illegible]

[illegible] تذکرہ [illegible] صفحہ [illegible]

[illegible] حزیں کا کلام [illegible] صفحہ [illegible]

۸ [illegible] صفحہ [illegible] ۹ [illegible] ۱۰ تذکرہ [illegible] صفحہ [illegible]

۱۱ [illegible] صفحہ [illegible] ۱۲ تذکرہ [illegible] ۱۳ تذکرہ [illegible] صفحہ [illegible] ۱۴ [illegible] صفحہ [illegible]

۱۵ [illegible] یہ مصرع یوں لکھا ہے ؎

کیا [illegible] — [illegible] حزیں [illegible] بس نہیں

تعجب اس بات پر ہو رہا ہے کہ خود اس مطلع کو سرورؔ نے ایک اور جگہ پر آزادؔ سے منسوب کیا ہے۔[1]
الغرض آسیؔ نے جو چھ شعر حشمت کاشمیری سے منسوب کیے ہیں ان میں سے صرف یہ دو شعر ان کے ہیں اور باقی چار شعر محتشم علی حشمت دہلوی کے ہیں ؎

جب آ خزاں چمن میں ہوئی آشنائے گل — تب عندلیب رو کے پکاری کہ ہائے گل

خط نے ترا حسن سب اڑایا — یہ سبزہ قدم کہاں سے آیا

حضرت آسیؔ مرحوم نے اپنی تحقیقی کتاب میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ

"حشمت کاشمیری کا کلام ممکن ہے کہ کسی خاص لائبریری میں موجود ہو مگر عام طور سے وہ بالکل ناپید ہو چکا ہے ... اس حساب سے ان کے کل چھ شعر ملتے ہیں لیکن ہم اپنی بیاض سے ایک مخمس واسوخت ۲۶ بند کا پیش کرتے ہیں اور ایک مخمس ۸ بند کا جو کلام کا ایک معتدبہ حصہ ہے اور غالباً یہ نوادر میں سے ہے"[2]

واسوخت اس بند سے شروع ہوتا ہے ؎

یا الٰہی میں کہوں کس سے تو اپنا احوال — زلف خوباں کی طرح سے دل کو ہوئی ہے جنجال
یا رب اس ہیچ سے تو اس دل شیدا کو نکال — کاش یا موت ہو یا دور ہو سر سے یہ خیال
تجھ سوا اور کسی سے میں یہ کہوں اپنا حال — تیری ہی ذات سے میرا تو یہ ہر دم ہے سوال

سازد آباد خدایا دل ویرانے را
یا دہد مہر بتاں ہیچ مسلمانے را[3]

اور مخمس کی ابتدا اس بند سے ہوتی ہے ؎

اے واعظو بہت نہ کرو شور بس کرو — اپنی کتاب باندھ کے تم طاق پر دھرو
سب بندے ہیں خدا کے اسی یک دل چلو — بے جیتے آج مستوں سے مت اس طرح لڑو
[illegible] میں تم بھی ہیں اور تم بھی واہ واہ

آسیؔ نے یہاں بھی وہی کاوش فعل کی ہے جو اس سے پہلے وہ کئی بار کر چکے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ زیر بحث مخمس واسوخت اور مخمس حشمت کاشمیری کے کلام کا معتدبہ حصہ ہے۔ اس حصۂ کلام کو حشمت کاشمیری سے منسوب کرنا نہ صرف حقیقت کے منافی ہے بلکہ تحقیق کرنے والوں کے لیے گمراہ کن ہے۔ اول تو کسی تذکرہ نویس نے ان کے اس قسم کی نظموں کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا دوسرے یہ کہ آسیؔ نے متعلق کو توڑ موڑ کر اسے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کتاب میں جہاں حشمت کا حوالہ دے [illegible] ہیں لیکن

---

[1] عمدۂ منتخبہ ص ۲۳۳ ۔ [2] نوادر زمانہ بیاض [illegible] ص ۵۶
[3] [illegible] ص ۵۴ [illegible] سوخت [illegible] ۔ [4] نوادر زمانہ بیاض [illegible] ص ۵۶

مصحفی نے وحشت کاشمیری کا الگ ترجمہ تذکرۂ ہندی میں نہیں لکھا ہے۔ البتہ ریاض الفصحا میں وہ ان کے باب میں صرف اتنا لکھتے ہیں۔

"محمد علی خان وحشت۔ از حال ایشاں خبر ندارم" اس کے ساتھ یہ شعر بھی لکھتے ہیں ؎

خط نے ترا حسن سب اٹھایا — یہ سبزہ قدم کہاں سے آیا[1]

مولف خمخانۂ جاوید نے ذیل شعر وحشت کاشمیری کا تسلیم کیا ہے ؎

تم نے بیاں سے کھینچ کے یاں تک کر (؟) — دیکھے ہے ساتھ بیٹھے ہے کہ جواب دل[2]

جناب آسی مرحوم نے بھی مولف خمخانۂ جاوید کی تقلید میں اس شعر کو وحشت کاشمیری کا ہی قرار دے دیا۔ لیکن گردیزی[3] مبتلا[4] شفیق[5] اور عشقی[6] نے یہ شعر [illegible] سے منسوب کیا ہے اور واقعی یہ انہی کا ہے جیسا کہ تخلص سے نمایاں ہے ؎

تا دیکھ کر تجھے [illegible] کے بیچ — [illegible] اضطراب دل

[illegible] ذیل شعر کو وحشت کاشمیری سے منسوب کر کے نقل کیا ہے ؎

اس بے وفا کے عشق میں کچھ مبتلا نہیں — یاں تک کہ جب [illegible] دسترس نہیں

علاوہ یہ شعر میر[7] گردیزی[8] شورش[9] مصحفی[10] عشقی[11] اور مبتلا [illegible][12] نے حزیں سے منسوب کیا ہے۔ مثلاً ؎

اس فصل گل میں کیوں نہ گریباں کیجیے چاک — جاتی ہے یوں بہار حزیں ہائے ہم نہیں[13]

---

[1] ریاض الفصحا صفحہ [illegible] خمخانۂ جاوید صفحہ [illegible]

[2] [illegible]

[3] [illegible]

[4] [illegible]

[5] [illegible]

[6] [illegible]

[7] [illegible]

[8] [illegible]

[9] [illegible]

[10] [illegible]

[11] [illegible]

[12] [illegible]

[13] [illegible]

کیا [illegible] — [illegible] حزیں ہائے بس نہیں

تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ خود اسی مقطع کو سرور نے ایک اور جگہ پر تاباں سے منسوب کیا ہے [1]
الغرض آسی نے جو چھ شعر حشمت کاشمیری سے منسوب کیے ہیں ان میں سے صرف یہ دو شعر ان کے ہیں اور باقی چار شعر محتشم علی خاں حشمت دہلوی کے ہیں:

جب آ خزاں چمن میں ہوئی آشنائے گل — تب عندلیب رو کے پکاری کہ ہائے گل
خط نے ترا حسن سب اڑایا — یہ سبزہ قدم کہاں سے آیا

حضرت آسی مرحوم نے اپنی تحقیقی کتاب میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ
"حشمت کاشمیری کا کلام ممکن ہے کہ کسی خاص لائبریری میں موجود ہو مگر عام طور سے وہ بالکل ناپید ہو چکا ہے ... اس حساب سے ان کے کل چھ شعر ملتے ہیں لیکن ہم اپنی بیاض سے ایک مخمس واسوخت ۲۳ بند کا پیش کرتے ہیں اور ایک مخمس ۵ بند کا جو کلام کا ایک معتدبہ حصہ ہے اور غالباً یہ نوادر میں سے ہے" [2]
واسوخت اس بند سے شروع ہوتا ہے:

یا الٰہی میں کہوں کس سے اپنا احوال — زلف خوباں کی مرے دل کو ہوئی ہے جنجال
یا رب اس پیچ سے اس دل شیدا کو نکال — کاش یا موت ہو یا دور ہو سر سے یہ خیال
تجھ سوا اور کسی سے میں یہ کہوں اپنا حال — تیری ہی ذات سے ہے یہ اتو یہ مردم ہے سوال

ساز آباد خدایا دل ویرانے را
یا مدہ مہر بتاں ہیچ مسلمانے را [3]

اور مخمس کی ابتدا اس بند سے ہوتی ہے:

اے واعظو بہت نہ کرو شور بس کرو — اپنی کتاب باندھ کے تہ طاق پر دھرو
سب بندے ہیں خدا کے اسی ایک کی چلو — بے پیچ آج مستوں سے مت اس طرح لڑو
ٹک مست ہیں ہم بھی ہیں اور تم بھی واہ واہ

آسی نے یہاں بھی وہی فاش غلطی کی ہے جو اس سے پہلے وہ کئی بار کر چکے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ ۲۳ بند کا واسوخت اور مخمس حشمت کاشمیری کے کلام کا معتدبہ حصہ ہے۔ اس معتدبہ کلام کو حشمت کاشمیری سے منسوب کرنا نہ صرف حقیقت سے ناواقفیت ہے بلکہ تحقیق کرنے والوں سے بے گمان کرنا ہے۔ اول تو کسی تذکرہ نویس نے ان کے اس قسم کی نظموں کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا دوسرے یہ کہ آسی نے حقائق کو توڑ مروڑ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کتاب میں جس متن کا حوالہ دیا ہے [4] لیکن

---

۱ لطائف منتخب ص ۳۳ ۔ ۲ مذاق ادب نمبر ۹ بیاض خیبر ص ۹۵
۳ یہ صرف ۵ بند کا واسوخت ہے۔ ۴ مذاق ادب نمبر ۹ بیاض ص ۲/ ۵۹

اس بات پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ یہاں بھی انہوں نے اُس مصرع کا بغور مطالعہ کرنے کی زحمت نہیں فرمائی جس میں میر حسن نے حشمت کا نام اور حشمت دہلوی کا ذکر کیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مذکورہ نظمیں میر محتشم علی خاں دہلوی کی ہیں۔ پہلی نظم واسوخت کے بارے میں میر حسن اس طرح لکھتے ہیں:

"این واسوخت از وے مشہور است

کیوں لے دل جا کہیں پھنسا میں نہ تجھے کہتا تھا" [1]

میر آثم کی بیاض کا دوسرا بند ہے۔ واسوخت کا یہ ذیل بند میر حسن کو پسند آیا تھا جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"بند دوم این بند را خوش آمدہ"

جان اس غم کو جدا بیٹھ کے بہلاتے ہیں — تم سے دل تنگ تمہارے کو جو بہلاتے ہیں
کیا ہوا تم کو بھی اب گریہ و زاری بھاتے ہیں — آج کل جو تمہارے ہے وہ سب جاتے ہیں
پھر وہی تم ہو وہی ہم ہیں وہی باتیں ہیں — ہم وہی عشق وہی دن ہیں وہی راتیں ہیں

باز وا خواست کہ زلف تو بود دام دگر
من بجان عاشق و بر سینہ ز بر دوش بتم

آثم کی بیاض کا یہ چوتھا بند ہے۔ انہوں نے اسے یوں لکھا ہے

جان سے اس تم کو صنم بیٹھ کے بہلاتے ہیں — ہم سے دل تو تمہارے کو وہ چھینے ہیں
کیا ہوا تم کو صنم گر سب سے بھی بھاتے ہیں — آج کل جو تمہارے ہے وہ سب جاتے ہیں
پھر وہی ہم ہیں وہی تم ہو وہی باتیں ہیں — وہی خطیں ہیں وہی دل ہے وہی باتیں ہیں [2]

جہاں تک دوسری نظم مخمس کا تعلق ہے یہ بھی میر محتشم علی خاں حشمت دہلوی کی تصنیف ہے۔ اس کا دیباچہ ... کہ اس کا ذکر حمید اورنگ آبادی نے اپنے تذکرے میں ان کے ترجمے میں کیا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"در عصر محمد شاہ شہرہ داشت مخمس در ریختہ گفتہ" [3]

اور یہ نظم مخمس کو انہی سے منسوب کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حمید اورنگ آبادی کی بتائی ہوئی دونوں اس نظم میں پائی جاتی ہیں۔

آثم نے صرف سات بند کا مخمس نقل کیا ہے۔ برعکس اس کے حمید اورنگ آبادی نے دس بند لکھے ہیں۔ مخمس کی ابتداء اس بند سے ہوتی ہے اور یہ آثم کے مخمس میں شامل نہیں ہے۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو ص۴۹ ، [2] تذکرہ شعرائے اردو ص۴۹ ، [3] دو نایاب زمانہ بیاضیں ص۱۱
[4] گلشن گفتار ص۱۰ سنہ تصنیف ۱۱۶۵ھ مرتبہ سید محمد، مصنفہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی۔

سب جان اور جہان کا خداوند ہے اِلٰہ — اس کے سبھی ہیں سرخرو اور سارے روسیاہ
اے اہلِ زہد مستوں کو اس سے ہے اور راہ — دیکھیں تو تم ثواب کرو ہم کریں گناہ
کل معرکے میں ہم بھی ہیں اور تم بھی واہ واہ

حشمت کاشمیری بڑے بہادر سنجیدہ طبع[1] با حیا، صاحبِ کیفیت[2] بلند ہمت تھے[3] خوشگو کے ساتھ ان کے مراسم بہت اچھے تھے اور وہ انہیں جوان وجیہہ و خوش فکر کہتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حشمت دیگر شعرا کے ساتھ گرمجوشی سے پیش آتے تھے[4] اگرچہ وہ عورتوں کا لباس پہنتے تھے لیکن بڑے جری اور بیشۂ شجاعت کے شیر بر تھے[5] مؤلف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں کہ وہ [illegible] شخص تھے اور فنونِ سپہ گری میں طاق، پہلوانی پھیکنی میں شہرۂ آفاق تھے[6] آخر قطب الدین خان فوجدار کے ساتھ روہیلوں کی فوج کے مقابلے میں لڑتے لڑتے بڑی بہادری کے ساتھ مراد آباد میں مارے گئے تھے[7] قطب الدین خاں نواب عظمت اللہ خاں مراد آبادی کے پوتے تھے[8] مؤلف خمخانۂ جاوید[9] اور آتش دل نے ان کا نام غلطی سے نعمت اللہ خاں لکھا ہے جبکہ ان کا نام قطب شاہ کہتے ہیں[10] جو صحیح نہیں ہے۔ ذکر اپنے تذکرہ میں گردیزی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حشمت ۱۱۵۱ھ میں مراد آباد کے نواح میں لڑائی میں کھیت رہے[11] گردیزی نے لڑائی کی تاریخ یا سال نہیں لکھا ہے۔ البتہ قائم کہتے ہیں:

> سابق بریں دو سال برفاقت قطب الدین علی خاں کہ آوازۂ سخاوت و شجاعت رسیدہ اطراف و اکناف عالم شہرتے عظیم دارد در عہد الشیخ و بسط آں تلف حوصلگی بستہ ایں ادراک بزم تا بہ سمت چکلۂ مراد آباد رفتہ بود در آنجا با فوج محمد علی روہیلہ پائے جنگ میاں آمد ہمراہ نجابت خاں مذکور مجروحات تمام گشتہ شد[12]

قائم کی اس عبارت سے یہ مطلب کہیں نہیں نکلتا ہے کہ حشمت بقول اسپرنگر ۱۱۵۱ھ میں جنگ نادر میں مارے گئے۔ مؤلف خمخانۂ جاوید روہیلوں کی لڑائی کی تاریخ بغیر کسی حوالہ کے ۱۱۵۱ھ لکھتے ہیں[13] جو غلط ہے۔ نور الحسن ہاشمی صاحب حشمت

---

۱ تذکرۂ عشقی صفحہ ۱۹۱۔ ۲ مخزن نکات صفحہ ۲۶
۳ تذکرۂ ابراہیم صفحہ ۱۰۳۔ ۴ سفینۂ خوشگو صفحہ ۲۰۵ بند ابن داس خوشگو
۵ گلشن ہند صفحہ ۹۔ ۶ خمخانۂ جاوید صفحہ ۳۵۴ جلد دوم
۷ نکات الشعرا صفحہ ۱۰۱، مخزن نکات صفحہ ۲۶
۸ طبقات الشعرا قدسی صفحہ ۲۵ شوق رامپوری۔ ۹ خمخانۂ جاوید صفحہ ۲۵۴ جلد دوم
۱۰ دو نایاب زمانہ بیاضیں صفحہ ۱۲۶۔ ۱۱ تذکرۂ عشقی صفحہ ۱۹۱
۱۲ اودھ کیٹلاگ صفحہ ۲۲۳۔ ۱۳ مخزن نکات صفحہ ۲۶
۱۴ خمخانۂ جاوید صفحہ ۲۵۴ جلد دوم۔ اصل میں مولوی کریم الدین نے طبقات شعرائے ہند صفحہ ۱۰۱ پر حشمت کی تاریخ وفات ۱۱۵۱ھ لکھی ہے۔ مؤلف خمخانۂ جاوید نے انہی کی کورانہ تقلید کی ہے۔

ی تاریخ وفات [illegible] ہجری لکھتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ دراصل وہ [illegible] میں جنگ سناخنہ میں مارے گئے۔ تمکین کو ان کی موت سے صدمہ ہوا اور انہوں نے ایک درد انگیز مرثیہ لکھا جس کے آخری بند میں مادۂ تاریخ بھی درج ہے جس سے [illegible] نکلتے ہیں ۔

تیرا آباں زیب وحشت جہاں ۔۔۔ فکر تاریخ میں تھا جب مضطر

مصرع آخر سی یہ کی جو نظر ۔۔۔ کہہ دے ہاتف نے اس کو دی یہ خبر

ہائے حشمت شہید داویلا [2]

۲۲ ء ۱۱۳۰ ء [illegible]

تمکین نے بند کے آخری مصرعہ کو مادۂ تاریخ قرار دیا ہے جس سے [illegible] نکل آتے ہیں اور انہوں نے غلطی سے [illegible] لکھے :

بقول ان کے حشمت کا قتل [illegible] میں ہوا جو قطعی غلط ہے ۔

مرثیے کے مزید چند بند یہ ہیں :-

چھوڑ کر اپنا کارِ بیداد و ۔۔۔ کی شہادت خسرو داویلا

ہوا جل [illegible] داد ۔۔۔ یار بچوں کا سینہ داویلا

ہائے حشمت شہید داویلا

جانتا میں کہ چھوڑ دار جنت ۔۔۔ یہ سفر تو کرے گا کیسے فن

تو میں جانے ہی تجھ کو دیتا ۔۔۔ اب کہاں سے کروں تجھے پیدا

ہائے حشمت شہید داویلا

تو وہ تھا کہ گر ہو ترہ وار ۔۔۔ کھینچ کر جا بتا کے ایک بار

بند کرتا تو [illegible] ۔۔۔ اب میں حیران ہوں کیا ہو اسرار

ہائے حشمت شہید داویلا

گھر میں تیرے جنگ ہوں گریاں ۔۔۔ اشک تو ہے سب از دل

لوگ کہتے ہیں سے سب عزیز ۔۔۔ جب میں کہتا ہوں کہ آ تمکین

ہائے حشمت شہید داویلا

راز تیرا دل کو بے قراری ہے ۔۔۔ کہ کو بھی حد انتظاری ہے

ہر گھڑی آہ و نالہ زاری ہے ۔۔۔ عمر بھر یہ ہمیشہ جلتا ہے

ہائے حشمت شہید داویلا

---

[1] دلی کا دبستانِ شاعری [illegible] ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی طبع دوم [illegible]

[2] دیوان تمکین [illegible] مرتبہ ڈاکٹر عبد الحق ۔ [3] وہ نایاب نہ ما بیاض [illegible]

غم نے تیرے جب اشتہار کیا　　سارے عالم کو سوگوار کیا
ہر گریباں کو تار تار کیا　　جن نے یہ درد اختیار کیا
ہائے حشمت شہید واویلا

حشمت فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ایک دن خوشگو کے گھر میں شعرا کا مجمع تھا وہاں حشمت بھی آئے اور یہ غزل انہیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی ہے

زرنگ لالہ و داغش عیاں است.　　کہ حسن و عشق باہم توامان است
ز لاف غلامی پیش قدت　　بپا استادہ ام سرو از آنست
مے گلگوں کشش و زمانہ زنہار　　خراب سرخ لب بوستاں است
سخن بر سوز کوئی نماندہ است　　برنگ خامہ عرفی بر زباں است
بساں آسیا سرگشتہ حشمت　　شود ہر کس بفکر آب و ناں است
پے گردیدم و سر می گردد
آسیا وقت سحر می گردد　　۱؎

--- O ---

۱؎ سفینۂ خوشگو ص ۲۹۹ مرتبہ سید شاہ محمد عطاء الرحمٰن عطا کاکوی

غزل سے افسانے تک

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

جب میں اس تمام ادبی روایات پر غور کرتا ہوں جس کی مقبول ترین و نمائندہ ترین صنف غزل ہے اور سب سے افسانوی صنف داستان نظر آتا ہے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اردو ادیبوں اور ادب نوازوں کے لئے غزل سے افسانہ تک کا ذہنی سفر کتنا سہل اور کتنا ممکن ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے غزل گو اور افسانہ نگار بلکہ ہر صنف کے ادیب ایک ہی کام کرتے ہیں یعنی اقبال کے الفاظ میں —

مجھے سب زود مدعا دل کا آئینہ دکھاتا ہے — وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

دوسرے لفظوں میں سب ہی حیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس سے جو انفرادی تجربہ سامنے آتا ہے اس کو بیان کرتے ہیں۔ مگر دونوں کی نظر ایک ہی عالم میں الجھ کر رہ جاتی ہے بڑے سے بڑے شاعر بھی ایک وقت محو ہو جاتے ہیں۔ ان کے اپنے زندگی کے تجربے کی جو تصویر منعکس ہوتی ہے اس میں ذاتی رجحانات کی آمیزش بھی ہو جاتی ہے مگر غرض زیادہ سے زیادہ دونوں کی حیثیت ساحر ہے —

آمیزشے کو کہ پاک اوکب — از تاک جدہ گیرد درو ساغر انگور

مگر اس تجربہ کو پیش کرنے کے سلسلہ میں غزل کی روایت اور ادیب جو راہ اختیار کرتا ہے وہ اس راہ کی بالکل مخالف ہے جو افسانہ کی روایات کی ہے اس قدر مخالف کہ ایک پر چلنے والی قوم دوسرے پر چلنے کی اہل ہی نظر نہیں آتی اور ایک راہ سے دوسری راہ طے کرنے کے لئے صدیوں کے تجربے کی اور ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک روایات کو بالکل بھول کر دوسری میں پہنچ گئے ہوں یعنی غزل کی روایات کا پروردہ جس قدر زیادہ افسانہ کی روایات سے مانوس ہوگا اور ہوتا جائے گا اور غزل کی روایات کو ترک کرتا جائے گا اتنا ہی زیادہ افسانے کے مخصوص فن سے قریب ہوتا جائے گا اور اس سے لطف اندوز ہونے اور اس کو تخلیق کرنے میں کامیاب نظر آتا جائے گا۔ ہمارے افسانہ نگار جن میں داستانیں لکھنے والے پھر وہ چیز لکھنے والے جس کو ناول کہا جاتا ہے اور وہ بھی جو آج کل مختصر افسانے لکھتے ہیں سب کو شامل کرتا ہوں بیشتر میرے ذہن پر یہ تاثر ڈالتے ہیں کہ وہ شعوری طور سے ترقی نہیں کر رہے ہیں مگر ان کا لاشعور یعنی قومی یا روایتی لاشعور انہیں غزل ہی کی طرف لے جا رہا ہے اور افسانہ پڑھنے والوں کا بھی یہی حال ہے وہ عام قدر ہوں یا مشہور نقاد ۔ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ افسانے کو بھی انہوں نے غزل کی طرح پڑھا اور اس میں غزل والی ہی قدر کو ہی تسلیم حاصل کی۔ مثلاً ہمارے افسانہ نگار اپنے قصے میں ڈرامائی حالت کس ڈرامائی یا نفسیاتی بتانے کے بجائے ... اور نپا تلا بیانات سے آغاز کر کے کمال کرتے ہیں۔ اور ان کے پڑھنے والے ان ہی باتوں پر ان کی تعریف کرتے ہیں ۔۔۔

یہ مقدمہ بیتے جیسے سال دو میں۔ دونوں پر تنقید پڑھ کر بیشتر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جن ناولوں پر تنقید ہو رہی ہے ان کے مصنف کی توجہ افسانویت کی طرف تھی ہی نہیں اور اس کے نقاد کو بھی اس سے کوئی خاص سروکار نہیں ہے۔ افسانے کے بابت وہ کلی بندش مقدمہ جیسی جو اردو کے وقت سے استعمال ہو رہی ہیں جیسے قصہ، پلاٹ، کردار، خیالات، جذبات، تشکیل، انفرادیت وغیرہ بڑ بڑ استعمال ہوتی ہیں اور ان کی وضاحت بھی صحیح طور پر ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کرنے والے اور تنقید کرنے والے دونوں جنگل میں آ کر درختوں کی وجہ سے جنگل کو بھول گئے۔

میرے یہ سب کہنے کا ... اکثر لوگوں کی ... افسانے پر ... یہاں یہ غزل نہیں ہے افسانہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دو مختلف اور متضاد رنگ ہیں کیا جو ہمارے ادب کو اور اس کی نمائندہ صنف غزل کو اور یورپ کے ادب کو جس کی نمائندہ صنف ناول یا ڈرامہ ہے ایک دوسرے سے ... دکھاتی ہیں دونوں کے درمیان ... مشترک ہیں ... اس فرق کو سمجھنے کے لیے خسرو کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر دیکھئے۔

رقیباں گوش بر آواز او در ناز و من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

یہاں ایک عاشق سامنے آتا ہے جو معشوق سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں پاتا کیونکہ رقیب لوگ اس کی بات سننے کے لیے کھڑے ہیں اور معشوق ناز میں اس کی طرف ... نہیں کرتا۔ عجیب ... ہے۔ اس ... ایک سپاٹ اجمالی تصویر شاعر نے کھینچ دی ہے اب افسانہ نگار ... سامنے آتا ہے ... یا عاشق کی طرح تمام افسانوں اجمالی ... معنی ... ہے۔ جو اس کی انفرادیت ... انفرادیت ایسے ... ہمیں دکھائی دیتی ہے جو ... کی وجہ سے کوئی ... عاشق۔ دل پر پتھر رکھنے والا عاشق ... تفصیل ... ناول نگار یا افسانہ نگار اپنے اپنے ... سے ... ہوتے ہیں ... عاشق ہوں گے ... اپنے اپنے انفرادی ... اس قسم کے عشق کی مثال ہوگا ... تجربے کی طرف خسرو نے شب جائیکہ من بودم ... ختم ہو جاتا ہے ... مختلف مقامات ہوں گے اور ... اگر ہوگی تو وہ پورے جزئیات اور پوری فضا کے ساتھ سامنے آئے گی ... کوئی شعر ... عاشق کو معشوق کے سامنے ... اور وہ کبھی نہایت افسوس ناک طریقہ پر اور کبھی مختلف طریقہ پر اور کبھی کسی اور طریقہ پر ... بات ... تمام قصہ ... معلوم ہوگا ... کی طرف ... اشارہ کرنے میں ... زیادہ ... تفصیل کے ساتھ پیش ہو رہا ہے۔ شاعر نے ... ایک شعر ... اور قصہ ختم ... ایک ... مطالعہ کرنے والے کی طرح ... باریک ... کا ... کیا تھا اور اس کا ... زیادہ ... جانے پر زیادہ

زیادہ وسیع ہوتی چلی جاتی ہے۔ غزل گو پرانے حکیم کی طرح نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض پہچان لیتا ہے اور افسانہ نگار ایکسرے کی طرح کرکے وہ مقام دیکھتا ہے جہاں مرض کا مرکز ہے اور ان سب متعلقات کو بھی دیکھتا ہے جو اس مرکز کے اثر میں ہیں۔ مرض کے بھی گو شاعر چیزوں اور اقسام اور ہر فرد میں انفرادیت کو بھی نمایاں کرتا ہے مگر عام طور سے اس کی تعمیم ہی ہوتی ہے جو حکیم کی محض عام حالت سے زیادہ اس کی توجہ اس حالت کے زیادہ سے زیادہ جزئیات پر ہوتی ہے جو دوا کے خیر کی ہے۔ شاعر نے ایک دو رخے منظر کو خیالی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ افسانہ نگار اسے بات قریب سے دیکھ رہا ہے بلکہ خوردبین بھی استعمال کر رہا ہے تاکہ کوئی ذرہ بھی باقی نہ رہ جائے۔

اس معاملے کو اگر تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یورپ کی سب سے زیادہ قدیم صنف ڈراما ہے اور سب سے پہلی تنقیدی کتاب "بوطیقا" ہے جس کو ڈرامے سے سروکار ہے اور جسے آجکل کے نقاد فسانہ۔ تمثیل پر پہلی تنقید کہتے ہیں دوسری طرف ہمارے ادب میں عربوں کی سب سے زیادہ نمایاں صنف قصیدہ یا غزل ہے اور تنقید علم بیان یا RHETORIC ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہیں سے دو مختلف راہیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں سے ایک الیٹی سے ہوتی ہوئی یورپ کے مختلف ممالک کے ادبوں تک پہنچتی ہے اور دوسری فارس سے ہوتی ہوئی جدید اسلامی ممالک کے ادبوں تک جاتی ہے اول کی نمائندہ مثال انگریزی ادب اور دوسری کی اردو ادب ہے لیکن افسانوی ادب کی جدید شکلیں ناول اور مختصر افسانہ انگلستان میں شروع ہوتی ہیں اور یہاں کے اثر کے زیر اثر انہیں سماجی تاریخ کہتا ہے اور ان کے واقعات اور افراد کا واقعی محسوس دیکھے ہونا لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کی زیادتی دو اصناف یعنی ایپک اور ڈراما کا امتزاج بناتا ہے اور اس طرح اس میں تخیل کی بے پناہ وسعت آجاتی ہے اور انسانی زندگی کے جو نقشے ملتے ہیں وہ سب سے زیادہ انفرادی حقیقی اور ابھرتے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہاں انسانی زندگی کا بڑا گہرا اور بڑا وسیع مطالعہ نظر آتا ہے اور یورپ کے تمام ادب کا جدید ترین اور بہترین حاصل معلوم ہوتا ہے۔ ناول نگاری کے پہلے شاہکار فیلڈنگ کے ٹوم جونس کو لے لیجئے اس کے ہیرو کے واقعاتی کردار کی چند جلدوں میں وہ تفصیل جو عام انسان کی ہر خوبی اور ہر خامی سامنے لاتی ہے اور پھر بھی ایک انفرادیت اختیار کرتی ہے اور ایک ارتقا دکھاتی ہے ایسا بڑا اور مکمل نقشہ ہے جیسا کسی اور صنف میں اس سے پہلے نہیں ملتا۔ اس نقشے کو سامنے رکھتے ہوئے اردو ادب کی طرف آئیے اور شاعری کے اصناف کو چھوڑ کر داستانوں پر نظر ڈالئے تو یہ معلوم ہوگا کہ ان میں جن افراد کا ذکر ہے وہ غزل کے عاشق معشوق اور رقیب کی طرح روایتی ہیں اور داستان کی خوبی اس میں ہے کہ اس کی نثر کا طرز غزل کے طرز کی طرح دلکش ہے۔ انگریزی اثر کے ساتھ ادیبوں کا رخ واقعیت کی طرف ہوتا ہے اور مولوی نذیر احمد کے تمثیلی فسانے سامنے آتے ہیں۔ ان میں کی بہترین تخلیق مرزا ظاہر دار بیگ کو لے لیجئے اور دیکھئے کہ ان کی بابت مصنف جو بیان دیتا ہے اس میں ظاہر داری کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اور جو واقعہ سامنے لاتا ہے یعنی کلیم کا اس کے گھر جانا اور ٹوٹی مسجد میں پڑنا وہ بھی ظاہر داری ہی کی شکل ہے اور اس کے بعد مرزا ظاہر دار بیگ ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ نذیر احمد ہی کے قلم میں نہ ایک سے زیادہ اور ایک صفت یعنی ظاہر داری کو ایک انسانی مجسمہ یا شخصیت میں تبدیل کرنے ہی کی صلاحیت کم کمال ہے۔ وہ صاحب جنہوں نے دعوے کے ساتھ ناول کو اردو میں جنم دیا اور صحیح ناول کو اردو میں رائج کیا یعنی مولوی عبدالحلیم شرر انہیں بھی ترقی کرتے۔ سامنے سرا جہاں واقعات اور اس پر مبنی

اسلوبی کا اُبھرنا ان کی ناول نگاری کی ساری بنیاد ٹھہری تو وہ غزل کے عاشق معشوق اور رقیب سے فرضی تقاریر کرانے سے آگے کیے جا سکتے تھے۔ ان کی بڑی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی نثر کا طرز بہت ہی دلکش ہے اور ان کی شان سے ادبی ناول کا عام تصور بن جاتا ہے وہ یہ ہے قصہ کچھ ہو کردار ہوں یا نہ ہوں اگر زبان اچھی ہو تو ناول ادبی ہوتی ہے۔ مجھے اپنے والد کے ایک دوست یاد آتے ہیں جو وکیل تھے اور انگریزی کی ناولیں پڑھنے کے شائق تھے۔ انہوں نے مجھے اسکاٹ کی ناول پڑھتے دیکھا تو بولے۔ "اچھا۔ تم ایسی ہی ناولیں پڑھا کرو ان سے انگریزی درست ہو جائے گی۔" مجھے خیال نہیں کہ میری انگریزی درست کرنے میں اسکاٹ کی ناولوں نے کوئی حصہ لیا بلکہ جب مجھے انگریزی درست کرنے کی ضرورت ہوئی اور اس کے متعلق استادوں سے ہدایت چاہی تو انہوں نے اسکاٹ کی ناولوں سے اجتناب بتایا اور انشا نگاروں پر وقت صرف کرنے کو کہا۔ نثر کی طرز میں اسکاٹ کا کوئی مقلد نہیں ہے مگر ناول نگاری میں اس نے اپنے ملک کے ہی نہیں بلکہ تمام یورپ کے ناول نگاروں کو متاثر کیا اور ماحول کی کشمکش اور کردار نگاری کی ایک نئی راہ کھول دی مگر ان سب باتوں کا ذکر کرنے پر جو ناولوں کی جان ہیں سمجھے جاتے ہم تیار نہیں بلکہ نقاد بھی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ یہ شعر یاد آتا ہے۔

عشق کی باتیں ایسی باتیں   ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

علامہ نیاز فتحپوری مرحوم کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ میں اور آل احمد سرور ان کے مکان واقع گھسیاری منڈی لکھنؤ میں پہنچے۔ نیاز صاحب نے میز پر جھکے ہوئے سر کو اٹھا کر ہم کو دیکھا اور میز کے ایک طرف رکھی ہوئی ایک موٹی کتاب کو سرور صاحب کو دیتے ہوئے کہا: "اس کی زبان تحقیق کی مدد ہو جیسے بنا پر آپ اس کو دنیا کی عظیم ترین ناول کہتے ہیں مگر مجھے یہ بالکل پسند نہ آئی۔" میں نے اس کتاب کو دیکھا وہ دستوفسکی کی "برادرز کارمزاف" تھی اور نیاز صاحب کی صورت دیکھ کر سرور صاحب کی صورت دیکھی۔ نیاز صاحب میری طرف دیکھنے لگے میں نے کہا: "میں اسے دنیا کی عظیم ترین ناول تو نہیں مانتا۔ وہ تو ٹالسٹائے کی "وار اینڈ پیس" ہے مگر یہ دنیا کی عظیم ترین ناول ضرور ہے مگر ان دونوں ناولوں کی عظمت کا راز ان کی زبان یا طرز کی خوبی سے کیا تعلق۔ ہم نے ان دونوں ناولوں کی زبان کو بھی کوئی اہمیت ہی نہیں دی اور اگر ان کی زبان میں کوئی خوبی ہو گی تو وہ روسی میں ہو گی اس ترجمہ میں تو کہیں نظر نہیں آتی۔ مجھے ان کی خوبی اس کتاب کی نفسیاتی تحلیل میں سے جو تمام بھائیوں اور باپ میں جاری ہے کرداروں میں نظر آتی ہے۔ نیاز صاحب نے تعجب کا اظہار کیا: "یہ تو ہو گا مگر مجھے پسند نہیں آئی۔" نیاز صاحب سے آگے کچھ کہنا سوئے ادب تھا کہ میں اور سرور صاحب سب گھر سے نکلے تو بات چیت نیاز صاحب کی ناول سے متعلق نظریہ پر تھی۔ نتیجہ یہی نکالا کہ عربی فارسی اور اردو میں تو تنقید کا یہی مذاق ہے۔ جتنے والہانہ ناول نگار ہیں کے مضمون اثر کو زبان محسوس کرتا ہے۔ نیاز صاحب نے اپنے ناول "شہاب کی سرگزشت" اور "شاعر کا انجام" ہم نے ان کو پڑھ رکھا ہے ہم ان کو ناول کا نام دیں گے۔ یہ ہیں تو افسانے ہیں۔ ان کے پیچھے جو زبان ہے وہ نثر میں غزل کہہ رہے ہیں ذہنی رنگ کے باب میں بالکل غزل کے طرز میں نثر و نظم میں آ کر چلا جا رہا ہے۔ نیاز صاحب کا ذہن ان سے افسانے تک کی منزل پر چلتے ہی گر پڑتا ہے اور کہہ دیتا ہے "یہ کیا ہے۔ مجھے یہ راہ پسند نہیں۔"

ان دنوں ان کا جب میرا ساتھ تھا تو وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر مقرر ہو کر آئے تھے مگر وہ کہتے تھے "میری پہلی محبت انگریزی ادب ہے"۔ اور شاید یہ بھی کہتے ہوں کہ۔ "شاید یہ کہتے تھے" ...EP AS FIRST LOVE AND WITH ALL REGRIT وہ پہلی محبت کی طرح اس پر ہمیشہ مہربان رہیں۔ ہم دونوں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے اردو ذوق کی بنیاد تمام تر انگریزی ادب سے ہے۔ انگریزی ادب سے واقف ہونے سے پہلے ہم فارسی اور اردو ادب کی روایات میں پڑھ چکے تھے مگر یہ درست ہے کہ نوجوانی سے ہی زیادہ تر توجہ انگریزی ادب کی طرف دیتے تھے۔ ان کے اس مخصوص ذوق سے واقف ہیں جن تک نیاز صاحب بھی نہ پہنچ سکے۔ ہمارے ملنے کا انداز ہماری ادبی ایک اتفاق کا ساتھی ہے [illegible] ہم دونوں کا ذہن غزل ہی کے دائرے میں رہا اور اگر اس کا دائرہ وسیع ہوا ہے تو ہمیں اتنا حق نہیں تھا کہ [illegible] یہ بات ہم ضرور سمجھتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء کے بعد جو تحریک شروع ہوئی تھی اس کے بعد ہم نے صرف اردو ناول کی [illegible] سے جو انگریزی ادب سے کسی طرح پوری طرح واقف ہو کر غزل سے ذرا ہٹ کر [illegible] ان کے عام ہیں جہاں [illegible] میں کسی [illegible] جائیں۔ مگر یہ سب ناول نگار پیدا نہیں ہوتے۔ مگر یہ ادبی ناول نگاری کی [illegible] کسی تیز [illegible] کی۔ وہ پڑھ لئے گئے اور ان کے حصے میں غزلوں کے ذریعہ شہرت نہ مل سکی۔ اس وقت ناول نگاری جدید ہیئت [illegible] ناول نگاری کا دور کم چلا ہوں مگر اس ادب سے ہم اور اس ادب کا ذوق کم ہوتا ہو۔ محبت جس کی بنیاد پر ناول نگاری کھڑی ہو سکتی ہے۔ اردو ادب نے اس وقت کے اہم [illegible] ذہنی عام جب ناول لکھ کر دیتے ہیں۔ ناول پر تنقید کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے [illegible] اس کی کسی [illegible] میں ایک انگریزی ناول منتخب [illegible] مثال [illegible] اردو ادب کے [illegible] ناول کا ایک [illegible] تھا شاید ایک ہی اور ایسی کتاب تھی جس [illegible] لکھا جا سکے اور جس کا [illegible] سے [illegible] نہیں [illegible] وغیرہ کی طرح [illegible] کا تجربہ ہوا اور وہ اپنے [illegible] ناول پر تنقید تو لکھ رہے ہیں مگر [illegible] میں کچھ [illegible] باتیں سمجھے بغیر [illegible] ہیں یا [illegible] نے تو اب اس طرح ہو رہے ہیں کہ [illegible] اور [illegible] ہے۔ [illegible] تخلیق یا تنقید کو دیکھ کر یہ [illegible] شعر یاد آتا ہے۔

ایسے دیکھ سنے [illegible] مجھے [illegible] ہے پر
کس کے دیدہ [illegible] کا راستہ [illegible]

[illegible] اس گروہ کی ہے جو [illegible] کے [illegible] کے جو [illegible] میں [illegible] کر دیا گیا اور دونوں کی [illegible] کی [illegible] ہی میں بھرا کر گیا۔ مگر کی وہ روایات جو غزل کا مذاق پختہ کرتی تھیں ختم ہو گئیں۔ زیادہ تر طالب ایسے ہی [illegible] ہیں جہاں اگر کوئی مذاق تھا تو آنے والی کا اور [illegible] کی کمائی کر ایک جست میں پار کر کے [illegible] ہو جاتے ہیں۔ کچھ ادب پڑھنے کا وقت بھی [illegible] حاصل کر لیتے ہیں اور [illegible] میں [illegible] حاصل کرنے کے لئے تنقید [illegible] کی [illegible] رہ جاتے ہیں۔ ان کے لئے [illegible] سے [illegible] کا سوال ہی نہیں [illegible] ہی [illegible] دیکھئے۔

قابلِ قدر وہ لوگ ہیں جو غزل سے افسانے تک پہونچ گئے ہیں۔ میں ان کی تعداد بڑھاتا نہیں چاہتا کیونکہ
میں اعداد و شمار میں عقیدہ نہیں رکھتا مگر ایسے ہی لوگ ہیں جو اُردو کے افسانوی ادب کو اور اس پر تنقید کو اس مقام
پر لے آئے کہ اردو ادب کا بھی دنیا کے ترقی یافتہ ادب میں شمار ہونے لگے۔ ہم اس دور کی خامیوں سے قطع نظر
کرکے جب اس دور کے ادب کو دیکھتے ہیں تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم "غزل" کے دور سے نکل آئے ہیں۔
"ادب" کے دور میں آگئے ہیں۔ اس بات کو یوں کہیے کہ ہمارے اہم ادیب غزل سے افسانے تک پہونچ چکے ہیں۔
ان ادوار سے محو انسان یہاں تک کہ اقبال کی مثنوی "اسرار" تک میں "انسان" ایک مابعد الطبیعاتی وجود
ہے اور اس کے واقعات اشارے ہیں۔ ایسا ہی کچھ ہمارے پہلے دور کے افسانوں میں بھی رہا مگر اب انسان ایک نفسیاتی
وجود، اپنی انفرادیت اور گونا گونی کے نمایاں ہو رہا ہے اور یہی افسانہ کی منزل ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ
ہم مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کہ اب منزل پر پہونچ گئے۔ اصل میں اس دنیا میں آخری منزل تو ہے ہی نہیں۔ ساری
زندگی سفر ہی سفر ہے اور بقول اقبال ؎

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

ہمارے یہاں سلسلہ ابھی تو ادب جاتا وہ مزید نئے معنی اور تشکیل کی ... اور ... نہ ہوں؟ راہ وہ افسانوی اسپرٹ
کے خلاف ہے۔ ہمارے بیشتر نثر نگار اپنے پیش رووں کے زیر اثر تخلیق کرنے سے اس منزل سے ہٹ کر چلتے نظر آتے ہیں۔ اگر ہم مڑ کر
دیکھیں گے تو پتھر کے ہو جائیں گے۔ ان سے بہتر نظر اور یورپ کے افسانہ نگاروں کا زیادہ ... ہر دو ... دوری سے
... افسانے کی منزل ... نئے ادب کی تخلیق میں آگے بڑھتے رہیں

نئی شاعری کا منفی کردار

ڈاکٹر سید محمد عقیل

اب یہ مسئلہ کوئی ڈھکا چھپا مسئلہ نہیں رہ گیا کہ اردو ادب میں بھی ہندی اور انگریزی کی طرح ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنی فکر و عمل کی ماہیت الگ بنا رہا ہے۔ یہ ادب کے فکری اور روحانی دھارے سے کٹ کر ایک ایسی دنیا کی تعمیر کر رہا ہے جہاں حسرت، ناامیدی، تنہائی اور رائیگانی، محرومی، نامرادی، تاریک مستقبل اور موت ہی آج کے انسان کا مقدر ہیں۔ ان لوگوں کے خیال میں وہ تمام لوگ محض خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں جو ایسے نہیں سوچتے اور بے نور دور میں بھی امید کی کرن کے متلاشی اور متمنی ہیں۔ یہ دنیا اب انسانوں کے لیے کسی طرح کی خوش نصیبی کی مستحق اور نہ اس میں اب اتنی صلاحیت رہ گئی ہے کہ تاریخ اور ادب کے اسٹیج پر کوئی عظیم کردار پیش کرے، اور اس لیے اب انسانوں کو ماضی کی محبت اور نفرت، صلح و آشتی، زندہ رہنے اور مرنے کے طریقوں کو ایسی نظر سے نہ دیکھنا چاہیے جس سے ہم ہمیشہ سے ان باتوں کو پرکھنے کے عادی رہے ہیں۔ آج کا انسان اور اس کی دنیا پہلے کے انسانوں اور ان کی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے محسوسات، زندگی اور مسائل سب بالکل مختلف ہیں۔ بہتر ہوگا اگر ہم ان خیالات کا تاریخی پس منظر بھی دیکھ لیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے یورپ اور دوسرے مغربی ملکوں میں ان تمام خیالات نے جن کا ذکر اوپر کیا گیا، تیزی سے سر اٹھانا شروع کیا، یوں تو اگر ان خیالات کی تاریخی تفتیش کی جائے تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی ان کی ابتدا ہو جاتی ہے اور انگریزی ادب میں اس سلسلے کا سب سے واضح اور دلکش نمونہ ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ ہے۔ ہیوم (HULME) آزمایا چکا اور ہلڈا ڈولٹل (HILDA DOOLITTLE) کی ایمیجسٹ تحریک (IMAGIST MOVEMENT) اور دوسری تحریکوں سے گزر چکا تھا جس کا مقصد کشف کا نیا تجربہ اور اس تجربے میں الفاظ کی نئی قدر و قیمت، صوت اور اوزان و بحور کا نئے ڈھنگ سے استعمال کرنا تھا تو روایتی صداقتوں کی دیواروں میں آمد اور آورد کی دراڑیں پیدا ہو چلی تھیں۔ کبھی کبھی تو شاعری کے لیے بحروں کا استعمال بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اس تحریک کے ایک علمبردار فلنٹ (FLINT) نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بحروں سے آزادی نے ہماری شاعری کو روایتی جبر سے آزاد کر کے اس میں ایسا ترنم پیدا کر دیا ہے جو اس سے پہلے شاعری کو نصیب نہ تھا۔ بحروں سے آزادی اور نظموں میں آہنگ اور نئے تجربوں کے سبب ایک نئی طرح کی شعریت قبول کی جانے لگی۔ ایک مکتب خیال تو اس کا یہاں تک حامی ہو گیا کہ اس کے نزدیک شاعری لکھنے کا نہیں، بلکہ صرف بولنے کا فن ہے، جس میں الفاظ ہی سب کچھ ہیں اور انہیں کے پیچھے چھپی ہوئی تصویریں اصل شاعری ہیں۔ ابھی ان سارے تجربوں کے رسیا اپنی تحریروں میں سنجیدہ اور پختہ بھی نہ ہو پائے تھے کہ ادب کے نقادوں نے اس تحریک کو خشک اور بے روح شاعری سے تعبیر کرنا شروع کیا جس میں سوالات کے اور کچھ نہ تھا۔ کسی نے کہا کہ یہ ایسی شاعری ہے جس کا علاج نامواقف شعرا ہی کے دور میں ہے اور جس کا اثر کبھی کوئی اچھا شاعر نہیں لے گا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس تحریک کے ماننے والے سماجی زندگی سے الگ ہو کر خود اپنے

طرف بند ہو گئے تھے زندگی کی ہوائیں ان تک پہنچ ہی نہ سکتی تھیں۔ ان لوگوں نے حقائقِ حیات اور خیالات سے زیادہ آہنگ کو اہمیت دی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ تجربے کی دنیا میں وقتی طور پر ایک نیا راستہ بنتا نظر آیا۔ لیکن ایسا راستہ جو کسی واضح سمت کو نہ جاتا ہو۔ جو شاعر کو خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکا کر بھٹکاتا رہتا۔

امیجسٹ (IMAGIST) تحریک کا قلع قمع بہت جلد ہو گیا۔ اور اس تحریک کے ختم ہوتے ہی انگریزی ادب میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا جو گروپ (SITWELL GROUP) کے نام سے مشہور ہوئی۔ [illegible] سے [illegible] تک کا دور [illegible] اس قدر دلچسپ بات [illegible] [illegible] کے ادب کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ادب میں [illegible] [illegible] (EDITH SITWELL) [illegible] (SACHEVERELL SITWELL) [illegible] [illegible] (OSBERT SITWELL) [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] (SURREALISM) کا نام دیا گیا۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] انسانوں کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] پرانی چوہدھری [illegible] ادب [illegible] خیال [illegible] زیادہ [illegible] خیال [illegible] خیال کی تلاش اور ان کے [illegible] کرنا چاہیے۔ خیال [illegible] حقیقت ادب [illegible] تخلیق [illegible] فن کا [illegible] کرتی ہے۔ خیال کی [illegible] ادب [illegible] پیدا کر سکتی ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] ادب [illegible] حقیقت [illegible]

[illegible] صاف بات کہی [illegible] بنیاد [illegible] وقت [illegible] کیا جائے [illegible] شاعروں [illegible] کچھ [illegible] تہذیب [illegible] شاعر [illegible] زندگی [illegible] شاعری کی [illegible]

[illegible] ادب [illegible] شاعر [illegible] تہذیب [illegible] انسانی [illegible] حاصل کرنے کے لیے انسان کو ایک نئی تہذیب اور نئی زندگی کی ضرورت ہے [illegible] نئی تہذیب اور زندگی موجودہ [illegible]

سب نے جنگ کے یہ دن دیکھے تھے۔ اس لیے اس طرح کے خیالات خواہ ان سے اتفاق کیا جائے یا نہ کیا جائے، ممکن تھے اور ان شعرا کا ایک طبقہ اسی بات کو کہنے میں مشغول تھا

"کیا مکانات سنسان ہو چکے ہیں اور تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں

اور ہم شکستہ مکانات کے کھنڈروں میں تنہا رہ گئے ہیں

گھڑیاں ساکت ہیں اور [illegible] میں کوشاں ہیں

اب کوئی باقی نہیں رہا کیا کوئی اس کے بعد نہیں رہا

[illegible] صاحب [illegible] ہیں اور ہمارے خلاف آخری فیصلہ ہو چکا ہے۔

گھر [illegible] سے [illegible] کے گرد [illegible] ہیں

[illegible] باقی نہیں [illegible]"

دوسری طرف [illegible] ایک بیان گروہ بھی تھا جن کی [illegible] اور [illegible] آف گرامی [illegible] کی [illegible] [illegible] اور اس دنیا سے محبت کے لیے صاف [illegible] تھے۔ ان میں [illegible] نے [illegible] بعض لفظوں سے محبت دیا کی [illegible] ان حالات میں [illegible] سے [illegible] سے [illegible] کی ترغیب دی [illegible] ہے [illegible] انسانیت سے [illegible] اور [illegible] سے محبت کے لیے [illegible] ہے۔

یہی وقت تھا جب [illegible] شاعری کی [illegible] [illegible] بعض [illegible] اور [illegible] جو [illegible] ایسا [illegible] [illegible] ان کی [illegible]

[illegible]

[illegible] تھے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ملاحظہ کیجئے۔

یہی چاہتا ہے کہ جیسے [illegible]

جہاں میں وہ کشتی [illegible] نہیں ہے [illegible] بہتے چلی جاتی ہے

اور جب کوئی نہیں آتی ہے
ایک گھر سے ستونوں سے ملاقی ہو جاتی ہے
وہ سگریٹ جو ہر مسافر تو آگے بڑھا نہیں سکتے، جھگڑے دئیے جاتے ہیں۔
جھگڑے دئیے جاتے ہیں۔
اور پھر کچھ ہی دیر میں مسافر یہ کہتا ہے اپنی کہانی تو نہیں تھی۔
پرانی کہانی میں کیا لطف آئے
جیسی آج میں نے کہا تھا — پرانی کہانی سن کر

میری نظمیں سننے کے بعد اگر قاری اپنی معذوری پیش کرتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ جو ہجوم گروں اور گلہ بار کی دنیا میں گھر سے ہیں وہ میری نظمیں نہیں سمجھ سکتے۔

یہ اور بات ہے کہ اپنے ہجوم گروں اور گلہ بار کی دنیا سے نکل کر میری نظموں کو آسانی سے سمجھ سکتے تھے [illegible] اور [illegible] ہوگی۔ اگر بات سمجھے بغیر ہی باتیں اچھی لگتی ہیں تو اس میں عجب کیا ہے۔ [illegible] نظمیں کہتے ہیں اور ہر گز زندگی کا صرف ایک دنیا ہے بہت شخص نے یہ نہیں جانی اس لیے لوگ کہتے ہیں کہ یہ نظمیں ہی صرف اپنی [illegible] میں جو تیرا کچھ سوال ہوں یا کچھ جانتے ہوں اور اس کے لیے کوشش بھی کرتے ہوں۔

[illegible] نظمیں [illegible] [۱۲]

لیکن سب سے پہلا سوال ہے کہ وہ لوگ جو میرا جی کی نظموں کو سمجھنے کے اہل ہیں یا نہیں ان کے [illegible] کے علاوہ وہ بڑے تھے جنہوں نے [illegible] بھی صرف [illegible] ہی واقف تھے۔ سمجھنے والی [illegible] ہی [illegible] اور دماغ اور [illegible] وہ لوگ جو [illegible] آج بھی کہہ سکتے ہیں [illegible] ذہن میں آتا ہے [illegible] مطلب یہ ہے کہ مجھے اس میں کوئی شک نہیں [illegible] نظموں کا [illegible] مطلب [illegible] نہیں کہ [illegible] اور کوئی نظم [illegible] بنا یا جائے [illegible] جنسی عمل کی طرف اشارہ کرتی ہے [illegible] حقیقت [illegible] [۲۱] سے شخصی اور ذاتی اشاروں کو سمجھنے کی [illegible] ہوگی [illegible] مطلب [illegible] جدیدیت، ابہام پسندی اور جنسیت کی طرف [illegible] توجہ دینے میں واضح ہوا۔

[illegible] Benn [illegible] نے [illegible] جب [illegible] جدیدیت [illegible] پہلے عام شاعروں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ [illegible] اور جب شعراء تمام انسانی [illegible] محدود ہو چکے [illegible] اور [illegible] زندگی میں ہوا [illegible] یہ جدیدیت [illegible] اپنی ذات میں اسیر ہو گئے۔ ان سے زندگی کی وہ قابل محسوس انسانی خصوصیات نے جب اپنے دور کے ساتھ تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہی ہے۔ یہ شعراء صرف چند لوگوں کے ذاتی تجربات میں محدود ہیں۔ ان کی ایک توجیہ

یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ یہ رجحان اشرافیہ (ARISTOCRACY) کے ذریعہ ادب میں داخل ہوا تھا جس کا مقصد جمہوریت اور عوام کی سوسائٹی سے الگ رہنا تھا۔ اسی وجہ سے ابہام پسند لوگ [illegible] عوامی طرز معاشرت اور اس کے فکر و فن سے متنفر رہے۔ [illegible] جو انہوں نے اپنا آئیڈیل بنایا تھا۔ میراجی نے [illegible] بد قسمتی سے [illegible] کا اظہار ہے۔ [illegible] اس نظریہ میں بھی [illegible] مشرق و مغرب سے [illegible] میں بھی [illegible] پر ایک لمبا مضمون شامل ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میراجی کا ذہنی تعلق اشرافیہ (ARISTOCRACY) سے کس حد تک تھا [illegible] اردو ادب میں ابہام پسند اور تجریدی [illegible] کی اصلیت کیا ہے۔ زیادہ [illegible] رجحان کے تحت ہیں جہاں تک ابہام [illegible] زندگی کے حالات کا اندازہ لگا کر ان کے ذہن کا جو [illegible] ہوتا ہے [illegible] سے ہی زندگی [illegible] ادب کے منفرد نظر و فکر سے [illegible] بھی [illegible] کی جو میراجی کو [illegible] نہیں [illegible] وقت [illegible] دنیا [illegible] جب وہ [illegible] اس وقت جنگ کا آغاز ہو چکا تھا [illegible] معاشرت سے گزر رہی تھی [illegible] میراجی اپنے خیال کی دنیا میں [illegible] رہتے تھے۔ ان کے پسندیدہ شعرا میں [illegible] ان کا [illegible] بھی [illegible] اسباب [illegible] اور [illegible] سے منسلک ہو کر اور کبھی تنہائی ادب کی دنیا میں [illegible] بھی حاصل کرنے [illegible] زیادہ [illegible] کے لیے [illegible] ہو گئے۔ یہی [illegible] میراجی نے اپنے انتخاب میں [illegible] جیسے [illegible] [illegible] بھی [illegible] [illegible] میراجی [illegible] خیالات [illegible] لکھے ہیں [illegible] حیثیت [illegible] [illegible] ہے [illegible] [illegible] میراجی کو شاید [illegible] حاصل تھی اور وہ انہیں دنیا کا سب سے [illegible] سمجھتے تھے [illegible] میراجی کی زندگی سے [illegible] طرف [illegible] وہ [illegible] دنیا [illegible] اور [illegible] [illegible] زندگی کا [illegible] یہ بات بھی [illegible] [illegible] اور انسانوں کی [illegible] سے [illegible] کا [illegible] ہے۔ [illegible] نے [illegible] [illegible] کی ہے:

> "وہ اب زمانے کے مشہور آدمی کی شخصیت کو دیکھنے اور پھر انہیں اپنے پرکھے آدمی کے معیار پر پرکھنے کی جیسی صلاحیت میں [illegible] ان کے زمانے کے [illegible] یہ بھی [illegible] کہ میراجی وہ تنہا شاعر تھا جس کی ذات میں اس زمانے کی مخصوص [illegible] [illegible] ہونے [illegible] کو [illegible] جیسے [illegible] نے کبھی [illegible] کر دیا اور جب کہ اب [illegible] بلکہ شاعری کی [illegible] [illegible]"

۱۔ [illegible] مصنفہ سلیم احمد صفحہ [illegible]

معلوم نہیں [illegible]

[illegible]

میرا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(افضل [illegible])

○

[illegible]

[illegible]

یہ دونوں ایک سیمیں تیلیوں کے ساتھ اور نیچے
ہیں مشرق و مغرب کے مانند
[illegible] ہے
صداقت [illegible] آشنا

ابن آدم کے درمیان حائل ہے (نظم: [illegible])

میاں قادری [illegible] جدید شاعری کا [illegible] شاید بہی فہم کا [illegible]
[illegible] بلکہ [illegible] ہماری [illegible]
[illegible] کہ شاعر [illegible] کہ [illegible] میں [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]
اسی [illegible] ہیں۔

جدید شاعر نے تجربات اور مشاہدات [illegible] ہیں [illegible] جنہوں سے
[illegible] مشاہدات سے بھی [illegible]
[illegible] ہو
[illegible] اور [illegible]
[illegible] جدید شاعری [illegible] رکھتے۔ [illegible] جدید شاعری [illegible]
[illegible] کہ [illegible] شاعری نہیں [illegible] بے شک ہر شخص [illegible] شاعر نہیں [illegible] شعر [illegible] ہو [illegible]
[illegible] موجود ہو۔ [illegible] جدید شاعر اپنے [illegible]
[illegible] جدید [illegible] ایک [illegible]
[illegible] جدید شاعر کو [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] کرنے [illegible] نہیں [illegible] شاعری کا [illegible] وقت [illegible]
دیکھنے اور [illegible] وہ اپنا [illegible] ہے۔[1]

[illegible] ہے کہ [illegible] ایک [illegible] حاصل [illegible] داستانوں کا [illegible]
جس سے تمام ادیبوں اور شاید شاعروں کو بھی [illegible] پڑ رہے تھے [illegible] آج بھی [illegible]
ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ [illegible] جدید شعر [illegible] اہم اور [illegible] ہوگا۔ اگر [illegible]

---

[1] دیباچہ [illegible] صفحہ ۲۳–۲۵

[illegible] مصاحت اور ہمارے مقالے کے برابر ہی ہے۔ شعر کی کوئی ایک تخلیق ہم سے چاہنے تو یقیناً جدید شاعروں کا انتخاب مسلم بھی جانے گی۔ علاوہ
[illegible] کی تجویز بھی جو رشید صاحب نے پیش کی ہے۔ وہ بھی کچھ کم افسوس ناک نہیں۔ علاوہ ازیں [illegible] جو PSEUDO
ART [illegible] ہوتے ہیں کسی حقیقی اور فطری ادب اور [illegible] سے کیا حاصل ہوگا۔ اس طرح کی باتیں کسی مبتدی سے لیے تو شاید ہو سکتی
ہیں [illegible] رشید صاحب پر زیب نہیں دیتیں۔ اگر نقاد ان کی باتوں کو نہیں سمجھتا تو وہ نقاد کی پرواہ کیوں کرتے ہیں۔ اگر تمام دنیا کے نقاد اور
[illegible] اور [illegible] نقطۂ نظر رکھتے ہیں تخلیقی صلاحیت رکھنے والے کسی تنقید نگار سے اپنی کتابوں پر مقدمہ اور ریویو لکھنے کے خواہشمند
ہوتے ہیں۔ ان کے تجزیوں پر [illegible] کیوں ہوں۔ [illegible] ان [illegible] نقادوں کو شکست کھانے کے
[illegible] ہیں کہ فنکار نقادوں [illegible] کی اہمیت کم کرنا ہے۔ [illegible] تنقید نگار تخلیقات کو اعلیٰ معیار سے جانچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو آج تک
[illegible] دنیا میں بہترین ادب کو پرکھنے کے اصول اور معیار [illegible] ہیں۔ [illegible] خواہ یہ [illegible] اور روسی کیوں نہ ہو۔ [illegible] ادب عالیہ
[illegible] کے [illegible] اور [illegible] کے تجربات اور [illegible] ہوا کرتے ہیں اور وہ اپنی عادت کے مطابق
[illegible] تمام باتوں سے [illegible] کرتا ہے [illegible] اس کے لیے مناسب [illegible] سے مسائل اور [illegible] اس کے لیے سازگار ہیں اور
[illegible] میں خرابیاں کہیں [illegible] نقادوں سے [illegible] کوتاہ ہیں [illegible]
[illegible] ادبیات کی [illegible] اور جانے کیا کیا کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن تنقید نگار
[illegible] اپنی ذمہ داریوں سے [illegible] ہو جاتے اور ادب [illegible] کیسے مرتب کرتے ہیں۔؟
[illegible] ادب کی [illegible] اسی طرح نقاد [illegible] ان پر رائے دینے کا حق [illegible]
[illegible] سے مجبور [illegible] اپنی [illegible]
[illegible] پسند [illegible] ادب [illegible] سے دنیا کا کوئی شخص واقف نہیں لیکن اگر [illegible]
[illegible] بہت سارے لوگ [illegible] اتفاق [illegible] تو [illegible] نقاد تنقید نگار کو محض [illegible]
[illegible] دنیا [illegible] قاری [illegible] کے لیے [illegible] اور اس کے خیال میں تنقید نگار کے
[illegible] تنقید نگار [illegible] تخلیق کا مطالعہ [illegible] مطالعے کی کوشش کرتا ہے۔
[illegible] اپنی تخلیقات [illegible] کے لیے [illegible] تنقید نگار [illegible] ایسے [illegible]
[illegible] رشید صاحب [illegible] تنقید نگار [illegible]
[illegible] نہیں کر سکتے [illegible] تخلیق کرتا ہے [illegible]
[illegible] سے معیاری [illegible] ادیب [illegible]
[illegible] قاری بھی [illegible] ادب [illegible]
[illegible] تنقید نگار بھی [illegible]
[illegible] تعلقات [illegible]

لوگوں کا مستند اور معتقد ہونا ضروری بھی ہے۔ رمزیت نگاری یا ابہام پسند لوگ کوئی لغت تیار نہیں ہوا جس میں ان لفظوں کے وہ معنی الگ سے لکھے ہوں جو یہ شاعر استعمال کرتے ہیں اور جن سے عام پڑھا لکھا آدمی واقف نہیں۔ پھر ہر رمز نگار اپنے لیے الگ الگ الفاظ استعمال کرتا ہے جن سے ممکن ہے وہ واقف ہوں اور کوئی دوسرا واقف بھی نہیں ہوتا۔ اکثر ایک علامت کو کچھ جدید شاعر دوسرے معنوں پر دوسرے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کا فیصلہ کیونکر ہو گا؟ تنقید نگار جب فن کار سے سوال کرتا ہے کہ اس کے گرد و پیش اس کا [illegible] تو [illegible] محنت بھی فضا کی محنت سے کیوں کر کم ہو گئی ہے؟ — آپ تخلیق کے [illegible] میں تخلیق کا مسئلہ بیان ہوا ہے تو پھر اس طرح یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ فن کار نے کون سی ایسی بات سوچ لی یا کہہ دی جس سے دنیا ناواقف تھی یا جس کو اس نے [illegible] کا کوئی وجود نہ تھا [illegible] کا کوئی تعلق ہے تو اسے یہ زیب دیتا ہے کہ شاعر یا ادیب یہ بات کیسے کہہ سکتا ہے [illegible] الفاظ کو ایک نئے طریقے سے [illegible] باتیں کہہ دیتا ہے۔ اس میں کوئی چیز نئی [illegible] سماج نے [illegible] کا ادراک اور اس کے علاوہ [illegible] فن کار کے پاس ہو گی اور ان باتوں کے اظہار کو [illegible] سے باہر نہیں [illegible] کرنے کے لیے [illegible] وجود [illegible] ہے تو اسے یہ بھی سوچنا پڑے گا [illegible] سماج سے الگ ہو کر فن کار سے خیالات کا [illegible] ہو گا۔ زندگی سے [illegible] فن کار [illegible] یہ درست ہے کہ تخلیق سے پہلے [illegible] کا وجود [illegible] تخلیق میں [illegible] کر تخلیق کرتے تو [illegible] تخلیق کے مسائل تعین کرتے [illegible] فن کار نہیں کر سکتے بھی ہیں [illegible] تنقید نگار [illegible] فن کار پر یہ واضح کرنا [illegible] عام انسانی سماج سے [illegible] یہ ہے اور [illegible] سے [illegible] دوسری [illegible] کو [illegible] گیا ہے کہ [illegible] زندگی کے تجربے [illegible] نہ یہ کہ [illegible] فن کار [illegible] ذہنیت سے باہر [illegible] تخلیق [illegible] الفاظ اور معانی کا [illegible] سے انسان واقف ہیں اور [illegible] شاید سمجھتے ہیں۔ عام پڑھا لکھا آدمی [illegible] جیسا کہ [illegible] صاحب نے لکھا ہے کہ جدید شاعر [illegible] زبان [illegible] کرتا ہے۔ وہ اس کی زبان نہیں [illegible] خیالات میں تبدیلی نہیں [illegible] ان کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اور یہ سب [illegible] تنقیدی [illegible] کر لیتا ہے۔ فن کار کو اس کے وجود کا انکار کرتا ہے۔

ادب کے پرکھنے کا جو بھی معیار ہے گا، اس کے بنانے والے ادیب اور شاعر نہیں، قاری اور سامع ہوں گے جو [illegible] نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں جنہیں ان کی رائے قائم کرنے سے کوئی فن کار روک نہیں سکتا۔ [illegible] اور تجربہ کی بنا پر ہے کہ سامع یا قاری [illegible] بنا لیتا ہے۔ کوئی محض تاثرات کو بنیاد [illegible] کا کوئی [illegible] اور احساس یا معاشی [illegible] اور کوئی سماجی حقیقت پسندی کے [illegible] کیوں [illegible] اس بات کا احساس کیوں [illegible] شخصیت ریزہ ریزہ ہو گئی ہے [illegible]

(cult) بنانا چاہتا ہے یا نہیں؟ اور اگر بنانا چاہتا ہے تو اس کا اظہار کیوں کرتا ہے۔ ایک طرف اگر وہ مقصدیت کا انکار کرتا ہے تو دوسری طرف ایک خاص مقصد کے تحت اپنے فن کی تشکیل کیوں کرتا ہے۔ اسے سامعین [illegible] کے ذوق سے الجھن کیوں ہوتی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو وہ کس کے لیے تخلیق کرتا ہے؟ کیوں رسالوں میں اپنا کلام شائع کرتا ہے۔ کیوں مشاعروں میں اپنا کلام سناتا ہے اور سامعین سے داد کا طالب ہوتا ہے؟ جب وہ سامعین سے اور سامعین اس سے بیگانہ ہیں تو؟ یہ سوال راشد صاحب کی نفسیاتی الجھن کا مظہر ہے۔ انہوں نے ماضی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، ان کا خارجی ماحول صرف [illegible] فرد کا ماحول تھا لیکن راشد نے اسے ذاتی کرنے سے بچایا۔ اسی کا نتیجہ وہ کیفیت ہے جو ان کی نظموں میں وطنیت کا رنگ بن کے ابھرتی ہے لیکن پھر [illegible] اور تصوّف کی صوفیانہ حالت کے ساتھ وہ بھی [illegible] کی طرف چلے گئے اور ایران میں "اجنبی" رہے۔ ان کی قدریں موروثی راستوں سے ہو کر شخصی اور ذاتی تجربوں میں گم ہو گئیں [illegible] شاعر [illegible] اس کے ذاتی تجربوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں جنہیں جب تک شاعر خود واضح نہ کرے، اس وقت تک ان سوالوں کا جواب نہیں مل سکتا اور کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اب اگر کوئی ان تبدیلیوں کو [illegible] کے اصولوں سے پرکھے تو یہ وہی ذہنی حوالے سورج کے ڈھلنے پر دور اندیشی اور مآل بینی کے سبب پیدا ہوا کرتی ہیں۔ [illegible] شاعروں کا مزاج [illegible] اس تبدیلی کا تجزیہ وہ اس طرح کرتے ہیں:

> "جدید آج کی نظم کسی [illegible] شاعری نہیں بلکہ یہ زوال [illegible] ہے اور اس لیے اس کا منبع واضح طور پر [illegible] روشنیاں اور حرکت [illegible] کی طرف ہے [illegible] خود انسانی زندگی میں سب [illegible] موت کے سائے [illegible] سورج کے ڈھلتے ہی انسان [illegible] سے دوسرے نصف کے ساتھ چلنے لگتا ہے [illegible] موت کا خوف [illegible] ذہنی خلفشار [illegible] نظموں میں [illegible] کی پراگندگی پر دال ہے۔"

ہو سکتا ہے [illegible] درست [illegible] یہ اصول [illegible] لیکن [illegible] اصول [illegible] کے بہاں میں آج ایسے شعر بھی ملتے ہیں [illegible] شاعری کی ابتدا ہے محمد علوی [illegible] کے مطابق [illegible] موت [illegible] سمجھتے ہیں۔

"تو ہر سب کی ماں ہوتی ہے
. . . .
دیکھ میں تیرے پیچھے کب سے
ہاتھ پسارے بھاگ رہا ہوں
مجھ کو اپنی گود میں لے لے

---

* [illegible] شاعروں کو جدید شاعری سے [illegible] سمجھتے ہیں۔

* جدید شاعری کے لیے [illegible]

میں برسوں سے جاگ رہا ہوں"

ڈاکٹر وحید اختر کی ایک نظم "موت کی بشارت" سے چند اشعار دیکھئے۔

"موت اس ایک لمحے کی آمد کا ہے انتظار
جب کہ ذہنوں کے ، سوچوں کے آئینے
آنکھوں میں دُھندلا
اور ہونٹوں سے چُپ سکوت
ایک بار
خواہشِ زیست
زیست ہم پر ہمیشہ سے الزام ہے
ہم نہ زندہ رہے ہیں کبھی اور نہ زندہ ہیں اب
ایک دیوانہ گر خواہشِ مرگ جو کبھی سمجھے ہے زندگی"

کمار پاشی نے بھی موت اور اس کے متعلقات پر بہت سے شعر کہے ہیں اور موت ہی انسان کی آج کی زندگی بتائی جاتی ہے ۔ ان کی نظم "مرثیہ" سے چند شعر لیجیے۔

"میں شاموں اور سحر کی بیت کر سولی پہ آیا ہوں
اس نے ہے
جس وقت میری زندگی کی دھوپ
میری موت ہے"

ایسی صورت میں ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا ہے کہ ایک عام تجزیہ سمجھنا چاہیے جس کی جھلکیاں میر، غالب، ذوق، انیس سبھی کے ہاں آخری عمر میں ملتی ہیں لیکن اس نظریہ کو آج کی شاعری پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔

مختصر یہ کہ آج کے نظم نگاروں میں عیسیٰ خالد اور دوسری صف میں بھی کچھ محمد مختار صدیقی، قیوم نظر اور آج نئی صف کے نئے شعرا میں بھی ہے ایک مسلسل تضاد کے باعث موت، تنہائی، خوف کا احساس، بے تعلقی اور بیزاری ایک خاص صورت میں ابھری ہے جسے بعض لوگ نظم کی اصل جہت سمجھتے ہیں اور بہت سے لوگ ان کا اظہار ان بکھرے ہوئے ذہنوں میں کرتے ہیں جو انسانی اقدار کے معیاروں کے راستوں اور پیمانوں کو توڑ کر ایسی دنیا میں سفر کرتے ہیں جس سے خود ان کے سنسناسا آشنا ہو جاتے ہیں۔ ؎

؎ بہت سے لوگ جس طرح لکھتے ہیں وہ صرف یہ سب کچھ ہیں کہ گروہ بندی شاعری سلسلوں کو جوڑ کے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی قابل ذکر شاعری مثال نہیں ملتی [illegible] ۔ "معاصر تنقید" ڈاکٹر [illegible]

یوسف ظفر کے مجموعۂ زنداں، زہر خند اور دوسری نظموں سے جس طرف اشارہ کیا وہ موت، تنہائی، مایوسی، سناٹے کے ساتھ ساتھ اس دنیا سے بے نیازی تھی جس سے دوسری جنگِ عظیم سے پہلے ہمارا ادب دوچار تھا۔ جنگ کے گرد [illegible] کوئی یا [illegible] تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس نئیاں کو دوسرے ادیب اور شاعر خارجی طور پر محسوس کرتے ہیں جنگ نے ساوات کا جائزہ لے رہے تھے [illegible] انہیں حالات سے [illegible] اضمحلال، انتشار اور [illegible] کو اس طرح ظاہر کر رہے تھے جس میں انہیں انسانیت منتشر اور پارہ پارہ ہوتی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس وقت کے ابہام پسندوں نے نہ صرف اس بات کا اشارہ کیا اور نہ کہیں کوئی ایسی تمثیل پیش کی جو ذہن کو اس خیال کی طرف لے جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے پھر یوسف ظفر کے وقت میں ابہام پرستی کا یہ عالم تھا کہ [illegible] چھوڑ دیے جائیں اور پڑھنے والے انہیں جوڑ کر خود معنی سمجھ لیں۔ یہی وجہ ہے کہ یوسف ظفر نے خیال سے کوئی تعلق رہے یا نہ رہے لیکن ان کی شاعری کی [illegible] میں کوئی [illegible] نہیں ہوتی خالی طریقے پر موت، مایوسی اور تنہائی وغیرہ ان کی دنیا کا حصہ ہیں۔ چند مثالیں اس سے تجزیہ کی جا سکتی ہیں۔

دیکھ یہ میرے تجسس کا بھیانک انجام
میں بھی ناکام، مرا ذوقِ سفر بھی ناکام (زنداں)

○

جب تو [illegible] سے [illegible] دوشیزہ ہے
میری نگاہوں سے کچھ مسافت پہ کھڑی ہے
مسکراتی ہے [illegible] دیکھتی ہے
[illegible] تمام
[illegible]
اور میں ہوں [illegible] تنہائی [illegible] ([illegible])

○

مجھے ان سایوں نے دیوانہ بنا رکھا ہے
ذہن پر چھائے ہیں آنکھوں پہ لپکتے ہیں
کانپتے سائے، لرزتے ہوئے کالے سائے
مجھ کو ہر راہ میں ہر گام پہ آ لیتے ہیں (۱۹۵۱ء)

ڈاکٹر وزیر آغا نے یوسف ظفر کی نظموں میں یہی کیفیت دیکھی ہے اور اسی سے [illegible] ان کی ایک نظم "انتقام" کو مثال کے لیے پیش کیا ہے۔ وہ اس کے تجزیہ میں کہتے ہیں کہ یوسف ظفر نے یہاں موت اور اس کی علامات تاریکی اور سناٹا سب ایک روپ دھار رہے ہیں۔ [illegible] شاعر اس کی [illegible] کے [illegible] سے [illegible] ہے۔ اس کے یہاں [illegible] سطح پر [illegible] آگے [illegible] ہونے کا [illegible] ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یوسف ظفر کے یہاں اس [illegible] کی باتیں ڈھونڈ نکالنا محض کوشش خیال ہے۔ انہوں نے خود اپنی

کتاب 'زنداں' کے دیباچے میں بھی اپنی محرومیت اور مایوسی کا بہت واضح تذکرہ کیا ہے اور نظموں میں بھی اور یہی مایوسی اُن کا مجموعی تاثر ہے۔

تیوّر نظر نے اس افسردہ دلی کو اور بڑھا دیا۔ مایوسی اور موت دُنیا کا حل۔ تیوّر نظر کے یہاں اس طرح تو نہیں جس طرح فانی کے یہاں ملتا ہے بلکہ ان کی یہ مایوسی بے بسی اور عدمِ حصولِ اُمید کے بجائے ماضی میں چھٹ جانے اور پیچھے گرنے سے ترتیب پاتی ہے۔ ذاتی حیثیت اور ماحول کی شخصیت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے اور تنہائی ایک بے چارگی اور ناشناسا منزل کی طرف انسان کو لاکر ہمیشہ کے لیے گم کر دیتی ہے۔

وقت نے منزلیں کی ہیں کیا طے
مجھ سے بیگانہ ہو رہے ہیں پتے
ہر طرف جیسے سیہ راتیں ہیں
اب نہ وہ خواب نہ وہ باتیں ہیں

اور اسی طرح کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

اس طرح کے شعرا کی فہرست طویل ہے اور سب پر تفصیلی بحث اس مقالے میں ممکن بھی نہیں صرف چند نام لیے جا سکتے ہیں جنہوں نے دوسری جنگِ عظیم سے لے کر تقسیمِ ہندوستان کے بعد تک [illegible] تنہائی کے ساتھ انہیں خیالات و محسوسات کو واقعیوں سے پیش کیا ہے۔ یہ لوگ عارف عبدالمتین، مجید امجد، منیر نیازی، ظہور نظر، ضیا جالندھری، مختار صدیقی، اشفاق احمد، [illegible] فارغ بخاری، [illegible] اور ابنِ انشا ہیں۔ ان ناموں میں [illegible] اور اضافہ ہو سکتا ہے۔ ان تنہائی پسندوں نے کبھی بھی کا بھی اشارہ کیا ہے کہ انہوں نے یہ راستے فطری انسان کی تلاش میں اختیار کیے ہیں۔ [illegible] نہیں آتی ہیں ان ظالموں سے خیال میں یکسانیت آتی ہے اور جو ذاتی حیثیت و ہمیشہ کے لیے گم کر دیتی ہیں۔ [illegible] سمجھنے کے واسطے بیں میں اور سوچنے لگے اور ٹھکنے کے ذہنی بھی ہیں کہ سماجی انسان سے الگ ہو کے اور اس طرح وہ [illegible] میں گم ہو گیا ہے پھر تنہائی و بے بسی مل جانے کا اپنے محسوس اور ذاتی محسوسات اور تجربات کے ساتھ۔ جہاں وہ [illegible] خود مختار ہوگا جہاں وہ تنہا سب پر ارادے اور سوچنے کا مجاز۔

فطری انسان کی یہی تلاش بھی کوئی نئی چیز نہیں بلکہ [illegible] شعرا نے گزاری ہے۔ یوں بھی دنیا میں سب کی چیزیں [illegible] کے لیے کہاں ہوتی ہیں۔ فطری انسان کی تلاش کی ابتدا بھی کی ہے۔ یہی مختصر طور پر یوں کہیے کہ جیسویں صدی میں [illegible] محسوس کیا۔ وہ فطری انسان تو اس دور [illegible] ہمیشہ سے رہی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ سوچنے نے کبھی کوئی مثالی [illegible] تھا یا نہیں لیکن وہ اس فطری انسان کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ [illegible] کی سب سے عام [illegible] کا عاشق۔ بھی اس فطری انسان کے [illegible] جو کہ علیحدہ سماجی انسان کے بنائے ہوئے اخلاقی اصولوں کا پابند نہ مانے۔ [illegible] جب اور جہاں چاہتے ہیں [illegible] تلاش کرتے ہیں [illegible] سماجی انسان کے [illegible]

وہ ذہن پر مسلط ہے۔ جنگل کے سین بھی اسی فطرت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں فطری انسان آزادی سے گھومتے تھے۔ نئی اردو شاعری میں بھی جنگل کی واپسی کے اشارے غالباً لاشعوری طور پر اسی فطرت کی آزادی کی طرف اشارے کرتے ہیں جو اپنی مایوسی اور گھٹن کی وجہ سے دور جا بسے عاشق [illegible] تھا اور اس کے مدمقابل ساقی تھے۔ نئی شاعری میں جنگل دیوتاؤں کی شکل میں ابھرتا ہے یا اسی ابتدائی انسان (PRIMITIVE MAN) کے گرد و پیش کی صورت میں جو تمام سماجی بندھنوں سے آزاد تھا۔ بیگ شدہ کے کچھ اپنے افسانے اور ناول بھی اس کا شکار ہیں۔

قاتل (THE KILLERS) اس میں ہیمنگوے دکھاتا ہے کہ [illegible] انسان شکل سے قانون کا قائل ہے۔ [illegible] بیٹے شوہر کو خود اس لیے بندوق کا نشانہ بنا دیتے [illegible] کی طاقت شوہر [illegible] پیر [illegible] مذہب انسانوں کی پابندیاں عائد کر رکھے اور اس طرح اس طرح اس فطری جذبے کا خون ہو جاتا ہے [illegible] کے دل میں پیدا ہوا ہے

اس تمام بحث اور ایسی مثالوں کا شاعری سے تعلق میں پیش [illegible] کہ آج کا انسان سے الگ ہو کر فطری انسان کی وحشت ان راستوں پر سے باقی ہے جہاں سے [illegible] جہاں [illegible] کا قانون [illegible] سے ایک قانون ہے اور [illegible] اور صنف انسان [illegible] مو ہو چکا ہے۔ ہماری آج کی شاعری میں [illegible] غلط استعمال [illegible] کے [illegible] [illegible] کے درمیان مروج اسلوبوں کی نامناسب [illegible] [illegible] کی دنیا کا نام دیا جا رہا ہے۔ انھیں [illegible] کی [illegible] بتانے والے [illegible] صورت [illegible] کا تجزیہ [illegible] کا [illegible] اپنے مقام [illegible] صاف صاف [illegible] رہتے۔ مجھے [illegible] ہمارے جدید شاعر [illegible] [illegible] رہتے ہیں [illegible] [illegible] [illegible] زیادہ [illegible] [illegible] رسالوں [illegible] کلام [illegible] [illegible] [illegible] کے لیے [illegible] [illegible] بنا رکھا تھا اور [illegible] [illegible] گروپ [illegible] شامل سے [illegible] [illegible] [illegible] کبھی بار آور ثابت ہوا [illegible] کے لیے [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] کے دو سال کی [illegible] بھی دو فرد سے ہو گئے ہیں [illegible] وغیرہ سے [illegible] رسالہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کبھی [illegible] سے کبھی [illegible] سے ادبی [illegible] سے بہت۔

ان سے لکھنے والوں میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] محمد [illegible] [illegible] [illegible] پرکاش [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

خود کو ڈال سکے۔ اس کی شخصیت ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔ بے یقینی کی فضا میں منتشر ہو چکی ہے۔ ادب اور زندگی سے کس طرح زنجیری [illegible] ہے۔ زندگی کے تمام اقدار ختم ہو چکے ہیں۔ نیا انسان جب تک اپنی نئی قدروں کی پوری تشکیل نہیں کرے گا، وہ اس ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ پرانے سانچے پرانے رواج ہیں۔ اور آج کی زندگی میں فنکار اور ادیب ابھی تک اس نئے انسان کے مزاج اور اس کے معاملات و مشکلات سے اچھی طرح آگاہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج پیچھے چھوٹتے جانے والا طبقہ جدید ترین افکار، منطق و اعتقاد، نظریہ حیات، ہیئت اور فن کے اصولوں اور نظریوں سب سے بغاوت اور نتیجے کے طور پر سماج اور زندگی کی نئی تشکیل نہیں ہو پاتی یا دیر سے ہو رہی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی طرح ان نئے لوگوں کا بھی نعرہ ہے کہ انسان آج کی تہذیب کھو چکا ہے۔ وہ محض اپنی بکھری تہذیب کا ڈھونگ رچائے ہوئے گھومتا پھرتا ہے۔ جدید ادب آج کی الجھی ہوئی زندگی کا ساتھ نہیں دے رہا اور اسی لیے بھی ادب اور زندگی کے تمام نظریات بدل دینا چاہیے۔ ادیب دوسرے طرح کی طرح توڑ پھوڑ کو اہمیت دیتا ہے اور جیسے کے متعلق فتویٰ دیتا ہے کہ MAKE IT NEW ان کے خیال میں جب زبان، ادب، قواعد، الفاظ کی پرچھائیاں جو قاری کے ذہن پر چھا گئی ہیں سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو گئیں تو نیا انسان نئی سوجھ بوجھ کے ساتھ تمام باتوں کو خود بخود سمجھنے لگے گا۔ آج کا قاری اپنی ادب ناشناسی کے باعث محض [illegible] ہے۔ چنانچہ افتخار جالب صاحب خود اس کے گولڈ فش کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"زبان و معانی کا رشتہ بوسیدہ ہو چکا ہے اور [illegible] ذہن پر مسلط رہتے ہیں، اس لیے قدیم روایتوں کو دور کرنے کے لیے صاحب [illegible] کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔"

ہو سکتا ہے کہ افتخار جالب صاحب کا خیال کبھی درست نکلے لیکن ارسطو سے اہل علم اور ادب کا پاس بھی ادب میں [illegible] —— اور خیال ہے کہ دور میں ایسا کرنا ہی پڑتا ہے —— تو پھر ان لوگوں کا نیا پن کا جو ترسیل اور تفہیم کے ساتھ قواعد کے ان اصولوں کے بھی قائل ہیں جو کہ زبان و ادب سے وابستہ ہر فنکار کو ہوتی ہے۔ اگر ظفر اقبال صاحب چند غلطیاں کر کے اردو ادب کے قواعد اور اصولوں کو توڑ کر صاحب طرز بن سکتے ہیں تو اقبال، جوش، جگر، فراق، فیض، ندیم قاسمی، حفیظ جالندھری کے ساتھ تمام لیے ہوئے وہ بھی جو ادب میں قواعد و ضوابط کے قائل ہیں اور رہے ہیں سب پچھلے زمانے میں پڑے ہوئے ہیں جہاں ان کا پوچھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ "نئی کی شاعری آج کل کے نئے نسل پسندوں جیسے صاحبان عہد کے کام کی کب ہوگی۔

ایک اور صاحب ارشد [illegible] صاحب شاعر کے لیے دوسری شرطیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی شرطوں کو منبر دار [illegible] طرح سمجھا سکتا ہے جو انہیں کے الفاظ میں یوں ہے۔

(۱) ادب کی ظاہری صورت وقت اور حالات کی پیداوار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

(۲) اردو ادب کی موجودہ حالت کے بارے میں ایک جملے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید ادب شخصیت سے عاری ہے۔ دماغی ہیجان اور نقل کی پیداوار ہے۔ (معلوم نہیں کہ یہ کس ادب کے لیے کہا گیا ہے)

(۳) ادبی واقفیت اور ادبی قابلیت برسوں کی ریاضت کے بعد نصیب ہوتی ہے اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مغرب میں اکثر ادیب ۴۰ برس کی عمر کے بعد کوئی کام کی بات لکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اور یہ وہ عمر ہے جہاں پہنچ کر

ہمارے لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں

براج کومل صاحب نے یہ مقدمہ اپنے پہلے مجموعے "میری نظمیں" میں لکھا ہے جو دورِ … : "یہ شائع ہو۔ ان شہروں میں ادب کی تصویر بھی موجود ہے، جدید ادب سے بیزاری کا اظہار بھی ہے۔ ورنہ ادب کی تخلیق کے لیے ایک ریاضت کی جستجو بھی ہے۔ ایک ایسے نظر کی بھی تلاش ہے جو تقریباً چالیس سال عمر گزر جانے پر پیدا ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کہ براج کومل نے اپنے اس خیال پر نظر ثانی کی یا نہیں۔ اب جدیدیت پسند شعرا کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کی باتیں وہی سمجھ سکتا ہے جو ابھی چالیس سال کی منزل میں نہیں پہنچا کیونکہ اس عمر کے بعد ادب کی کیفیت سامانیوں کو سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا۔ یوسف ظفر صاحب "زہرخند" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"اہل نظر جانتے ہیں کہ بے ترتیبی اور بے عملی بھی نوحۂ مستقبل سے کم حسین نہیں۔ مجھے زہرخند کے اجزا کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے ایک ہجوم ہے جس میں قہقہوں کے ماتم کی صدائیں بھی بلند ہو رہی ہیں۔ مسکراہٹیں آنسوؤں میں بکھری ہوئی ہیں۔ منتشر چیزوں سے ہم کنار ہیں۔ میں نے زندگی میں یہی کچھ پایا ہے اور زندگی کے اس آئینے میں اسی کا عکس پیش کر رہا ہوں۔"

گویا شاعر ان تمام باتوں کا اظہار مقصد شاعری سمجھتا ہے اور پڑھنے والے ان حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن اسی دیباچے میں آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"میں کسی مقصدی ادب کا قائل نہیں۔ میرے سامنے میری زندگی، میرا ماحول، میرا وطن، میری دنیا، میرے … سب کچھ ہے اور بس۔"

کوئی پوچھے کہ پھر مقصدیت اور کیا ہوگی؟ … وطن پرستی، اپنے ماحول کی عکاسی اپنے شعروں میں کرتا ہے تو یہ بھی تو مقصدیت کا تابع ہے۔ اسی طرح شاذ تمکنت صاحب "تراشیدہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"میں شعر سے پیغام کی خدمت لینے کی بات نہیں کہتا بلکہ اس لیے کہتا ہوں کہ کچھ باتیں جلوت میں ممکن نہیں ہوتیں اس لیے خلوت کے انتخاب کو ناگزیر جانتا ہوں اور اگر کوئی شاعر … تجربے کی شدت میں … یہ کہتا ہو کہ وہ شعر کے ذریعہ محض اصلاحِ قوم کرتا ہے تو مجھے یہ دعویٰ ماننے میں تامل ہوگا۔ دیانت داری کی بات یہ ہے کہ شعر ہو یا افسانہ اول اول فنکار اپنی تسکین کے لیے اپنی ذات … لکھنے کی خاطر تخلیق کرتا ہے۔"

غرض کہ جتنے لوگ ہیں اتنے نظریات ہیں۔ … جدیدیت کی … کوئی ایک نقطۂ نظر … نہیں رہ پایا۔ … ان کے نظریات میں بھی … کوئی ابہام کو … سمجھتا ہے تو کوئی … کوئی شعر میں معنی و بیان کی … کوئی محض چند … جدیدیت … سمجھتا ہے۔ کوئی شاعری کے لیے ریاضت … سمجھتا ہے۔ شاذ تمکنت کا خیال ہے کہ شاعر یا افسانہ نگار محض اپنی تسکین کے لیے … کرتا ہے۔ حالانکہ یہ خیال بھی ان کا اپنا نہیں۔ بہت پہلے … نے بھی یہی بات کہی تھی جس کے لیے اکبر الہ آبادی کا ایک شعر موجود ہے۔

بہت خوب ہے قول یاد عزیز   میں خود شعر کہتا ہوں اپنے لیے

لیکن اس نقطۂ نظر کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ حالی سے لے کر اقبال، چکبست، جوش، جگر، فراق اور بہت سے شاعر ابھی تک، قوم کی اصلاح کے لیے شعر کہتے رہے۔ اور آگے بڑھئے تو سعدی اور فردوسی کو بھی اس میں شامل کر لیجیے۔ یہاں تک کہ کسی نہ کسی شکل میں ہومر اور سعدی تک سلسلہ پہنچتا ہے۔ لیکن بقول شاذ تمکنت: "اگر شعر صرف اپنے سکون کے لیے کہے جاتے ہیں تو یہ کیا ہے جس سے سکون حاصل کرنا مقصود ہے۔ کیا وہ خارجی دباؤ کے تحت جذبات اور مسائل کے ٹکراؤ سے نہ پیدا ہو کر انفعالی طور سے پیدا ہوتی ہے؟ کیونکہ ایسی کشمکش سوا اس کے کہ مجہول قسم کے تصوف کی طرف لے جائے اور کچھ ایسی کشمکش کا حاصل نہیں۔ جو شاعری بالآخر کیوں ہوتا ہے یہی کا تذکرہ پہلے بھی اسی مضمون میں کیا گیا یعنی کلام کا چھپانا۔ دوسروں کو شعر سنا کر وہ حظ ہو میں کلام پڑھنا اور "شعر سے حظ" جو جیسے پہلے کہا۔ اس کے معنی ہیں کہ یہ سب محض مفروضہ ہے۔ اگر کوئی شعر اپنے لیے کہتا ہے تو اس کو خالص بات لیکن دوسروں کو سنانے اور چھپانے کے بعد سننے والے کی پسند اور ناپسند بھی شاعر کو سننی پڑے گی۔ سامع کو بھی تحسین کا حق حاصل ہے۔ کوئی فن کار روز مرہ عام معاملات کی طرح یہ کہہ کر نہیں نکل سکتا کہ "جدید معاشرے کا مادہ جملہ جوا ہوا۔ ... اس کی تشریح زندگی ایک مختلف تقاضا ہے ... یہ اس لیے کہ روایات ادب سے منحرف ہو چکے ہیں۔"

ادیب قاری سے ہٹ کر نئی روایت بناتا ہے اور نہ اپنے دور سے الگ ہو سکتا ہے لیکن جب وہ اپنے قاری سے بلند ہونے کی کوشش کرتا ہے تو مجہولات کی رو میں بہتا ہے۔ وہ ابہام کی ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اس طرح کے اشعار کہتا ہے:

اونٹوں نے میزوں پر کافی پی
اور سڑکے کی دیواروں پر
ا، ب، د، ج، ف، ق
انا، انا چنا کروں
کرسے پرسے کرو چڑاں
(عادل منصوری)

یا پھر معنی و بیان کی ایسی دنیا سے گزرتا ہے کہ جس کے فقرے کسی بھی نظم سے نہیں ملتے۔ مثال کے لیے یہ شعر ملاحظہ ہو
"گرد سفر"

پھر بندگی سے وا ہو سکے آنکھوں میں دل کا چور سکے
من کے سمندر میں دور سکے
وہ خواب بالا سستو رہے سب شیشے چکنا چور ہو گئے
کچھ رنگ چلے کچھ رہ گئے (دھیمی بستیاں۔ محبوب خزاں)

○

بڑے ڈاک خانے کی گھڑیوں میں گیارہ
بجا برف
پیروں کی دس انگلیاں، ہونٹ، سر اور آنکھیں
بدن سے جدا، وقت کی چادر پر بکھرے ہوئے زرد نقطے

نہ چولہے میں سبز رستہ
نہ پیلی مسرت
نہ دیوار کی سرخ رنگت سلاوٹ
نہ کاروں کے جمگھٹ

نہ چہروں کا کہرام
اونچی عدالت بھی بائیں طرف کی عمارت ہے
جس کے کسی گوشے میں پرندے نہیں ہیں
بڑے ڈاکخانے سے سینما کے چولہے تک
ایک میں
دوسرا، تیسرا اور چوتھا بھی ہیں
پانچواں سال کا آخری سانس
کھیتوں میں پہلی محبت ملی ہے
اور کہرے کی چادر پہ بکھرے ہوئے زرد نقطے محبت کا آغاز تھے۔ (عباس اطہر)

ان اشعار کا شاعر کے علاوہ کوئی اور بھی کچھ سمجھ سکتا ہے، اس میں شبہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تجریدی آرٹ کے نمونوں کی طرح ہمارے جدید شاعر [illegible] بات مفہوم نہ ہو، فطرت کا حسن [illegible] رنگ پر سیاہی پھیر دو [illegible] لکیروں کو [illegible] باتوں کا اظہار محض ذہنی تعیش پرستی ہے اور جو انہیں پسند کرتے ہیں وہ اسی قبیل [illegible] شاعری کے علاوہ تمام شاعری محض ذہنی تلذذ کے سوا اور کچھ نہیں [illegible] جدید شعرا [illegible] بحث نہیں کر کے جدید شعر [illegible] ایک شاعر ہیں [illegible]
سکتے ہیں۔

• نئے شاعر [illegible] کے سلسلے میں [illegible] نفسیاتی تجزیے کے معاملے میں [illegible]
[illegible] اکثر جگہ تو شاعری [illegible] پہنچ جاتی ہے۔ اصل میں یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگ [illegible] میں پیدا ہو جاتے
ہیں [illegible] جب [illegible] چکا ہے [illegible] نہیں ہو سکے۔

آخری بات ضیا جالندھری نے بعض جدید شعرا کی بحث کے سلسلے میں کہہ دی ہے۔ مضامین کی پہلی بات تو صحیح ہے۔ لیکن مجھے اب یہ نہیں کہ ضیا جالندھری کو "جدیدیت پسند" اپنی جماعت میں شامل سمجھتے ہیں یا نہیں۔

اتنی لمبی چوڑی گفتگو کے بعد جو نتیجے نکلتے ہیں وہ یہ کہ شعر و شاعری کی دنیا میں بہت سے تجربے جدیدیت اور دوسرے کے سلسلے میں ہو رہے ہیں ان میں سے اکثر نامناسب اور بے وقت ہیں۔ جدیدیت کی آڑ میں بہت سے لوگ جو خرافات کو "جدید ادب" اور "جدید شاعری" قرار دینا چاہتے ہیں اور اس روح سے بالکل بے خبر ہیں جو کسی ادب پارے کو بقا اور دوام عطا کرتی ہے۔ یہ لوگ بغیر ریاضت کے محض اوٹ پٹانگ کو فن بنا کر پیش ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے بھی متمنی ہیں کہ انہیں ادب عالیہ کا درجہ دیا جائے۔ یہ راہ روی کی متعدد راہیں پیدا کرتے ہیں واقفیت کو علم دانی کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ رسالوں میں چھپنا چاہتے ہیں تو اس بات پر زیادہ زور دیتا ہے کہ ... اہمیت اس بات کا ہے یا ... اردو ادب ہی اس مخصوص نظریے سے اتفاق کریں۔ پروفیسر ... نے کیا ہے ... ایک خیال ہے۔ ... کسی لفظ کا اگر آپ صحیح تلفظ جانتے ہیں تو آپ اچھے ادیب ... ہیں ... آپ کا شمار جاہلوں میں ہوگا۔ ... میں کیا تجربے چل رہے ہیں ... آپ ... کی بات۔ ... جانتے ہیں اگر کوئی پوچھے کہ آپ جس زبان میں شاعری کر رہے ہیں اس کے مزاج، اس کی تاریخ اور اس کی تمام عروضیات آپ کے ... سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ ... آپ نے ... کہا ہے تو جدیدیت پسند ... ترقی پسند ... اپنی جماعت جا فروختہ ہو جاتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ اور اس ... آپ جانتے یا نہ جانتے لیکن ... جائیے ... فرانس والے ادب میں ... کی مزاجیت پھیلاتے ہیں ... جس کی ... اقدام کرنا چاہیے۔ اس بات پر ... رسالوں کے شماروں میں ... کہ ... لفظ ... جدید شاعروں کی ... نہیں کہ ... مشہور ... جو ... ہونا چاہیے یا حرکت ... شعر ... یہ لوگ ... ریاضت سے ... طرف ... ضیا جالندھری نے اشارہ کیا ہے ... کسی ... ادب عالیہ کا درجہ ... ہے۔ یہ راہ روی ... پیدا کرنے ... واقفیت کو علم ... کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ ادب ... کا تصور محض ... ہے اور ... خود ساختہ ... ادب نے شعر و نثر کے ... اور ... زندگی ... سے ... نہیں

سلامت ہو ... جو ... دل ... ہے

O

... جدیدیت پسند ... میں شائع ہوئی ہے ... ہو ...

... ہے ... ...
... کے ... ...

گلی کے کونے میں اک گھر
اور گھر کے کمرے کے اندر
میں بیٹھا سوچ رہا یہ بات
یہ دھرتی، یہ جنگل، یہ کھیت
میں تنہا تنہا سا انساں،
سمندر چاروں طرف گھیرے

ترجمہ پرائی جانے سمیر

○

افق پر شام کے سائے اداس اور تنہا

یہ ساری حالتیں محض خود اختیار کردہ ہیں، خارجی عوامل سے ان کا کوئی واسطہ نہیں

دوسری بات نہایت اہم اور بنیادی ہے اور یہ اس دور کا سوال بھی ہے۔ کیا ادب اور فن کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں؟ ۱۹۴۷ء کے ادبی انقلاب کے بعد کیا کسی نئی ادبی تحریک اور تبدیلی کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی اور اگر ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی؟ کیا ہر دور اپنے ساتھ نئے مسائل، نئی قدریں، نئی تحریکیں اور نظریے اپنے ساتھ نہیں لاتا؟ جواب صاف ہے۔ ادب میں نئی راہیں اگر بند ہوں تو ادب جامد ہو جاتا ہے۔ کسی ایک نسل کو یہ حق کس طرح حاصل ہے کہ آئندہ نسلوں پر نئے تجربوں کے دروازے بند کر دے اور اگر ایسا کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مسائل ہمارے مسائل نہیں۔ صرف نئی نسل کو اس بات سے ضرور باخبر رہنا چاہیے کہ اس کے مسائل کیا ہیں۔ اسے محض تقلید پرستی اور بیرونی تحریکات کو زبردستی نہیں اوڑھنا چاہیے۔ اس مضمون میں ہم نے نئی نسل کا انکار نہیں کیا اور تعجب کیا ہے وہ بیزاری، وہ ذہنی علحدگی اور خود اختیار کردہ تنہائی کی بات کی گئی ہے۔ جن کے لیے بغاوت کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان لوگوں کی کچھ نظموں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ زندگی سے فرار اور بغاوت (A REBELLION WITHOUT A REASON) میں مبتلا ہیں۔ آج کی زندگی کا مسئلہ موت، تنہائی اور جنگل میں چلا جانا نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کی کشمکش نے ہر انسان کے لیے ذہنی، اقتصادی، سماجی، قومی اور سیاسی الجھنیں پیدا کر دی ہیں، ان کا حل کیا ہو۔ شاعری حل نہیں تلاش کرتی، شاعری صرف مسائل کی نشاندہی بھی نہیں کرتی۔ اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنی الجھنوں کا حل ڈھونڈتے ہیں تو اچھا ادب زندگی اور انسان کو مسائل سے چھٹکارا دلانے کے لیے سوچتا ہے۔ آج کا آدمی کس طرح ان الجھنوں پر قابو پا کر نئے حالات کے لیے ایک نئی جمہوری دنیا تشکیل کرے۔ معاشی اور سیاسی رشتوں پر قبضہ پا جائے۔ نظریاتی اور زندگی کی صحت مندی کا نیا معیار کیوں کر متعین کرے۔ جیسے جیسے حالات تبدیل ہوں اور سیال وقت اور معاملات کا تسلسل کیوں کر تبدیل ہو جائے، نئے حالات ہمیشہ نئے مسئلوں سے دو چار کرتے رہے ہیں اور اس طرح [illegible] کا یہ تسلسل کسی ایک تحریک، وقت اور [illegible] کا پابند نہیں رہ سکتا۔ [illegible] صورت [illegible] پرانی دنیا ہمارے نئے مسئلوں کا ساتھ [illegible] اور جب ہم اپنا [illegible] کے سامنے [illegible] انسانوں کی فہم و فکر

قریب لایا جا سکتا ہے۔ دیکر ہمارے شخصی تخیل ہیں اس لیے ہم اب اکیلے ہو گئے۔ ہم فکر و خیال کی ایسی شخصی اور ذاتی دنیا بسا چکے ہیں کہ اسلوب صرف معدودے چند لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ ہم باتیں مبہم کہتے ہیں اس لیے کہ مسائل حیات خود مبہم اور گنجلک ہو کر رہ گئے ہیں۔ جنہیں بیان صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور بعض اوقات وہ سرے سے محسوسات کی دنیا میں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ انہیں صرف موسیقی کے (VIBRATIONS) اور حروف کے حرکت و سکون ہی ظاہر کر سکتے ہیں۔ تنہائی چند لوگوں کے لیے ذاتی چیز تو ہو سکتی ہے لیکن وہ تمام انسانوں کا مسئلہ نہیں بن سکتی۔ تنہائی، مجہولیت اور (MORBIDITY) تو پیدا کر سکتی ہے لیکن ادب کو نہ تو توانائی بخش سکتی ہے اور نہ اس کی صالح روایات حاصل ہو سکتی ہے کشمکش حیات سے بھاگ کر تنہائی میں جلنے والا انسان مجہول، بے عمل، ناکارہ اور اس معنی میں وہ زندگی کے صحیح رستہ سے ہمیشہ ناواقف ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ ادب کا یہ رخ غیر متوازن (DISEQUIL LIBRIUMED) اسی لیے ہے کہ یہ اور تنہائی انسان کی زندگی کی حقیقت سے تو بقائے حیات کے لیے ہاتھ پیر ہلانا لیا کی رکھتا ہے۔ تنہائی پسند افراد انجمن سازی اور کاوش سے کیا لینا دینا! فردی حیثیت اگر جماعت میں ضم ہو جاتی ہے تو جدیدیت من حیث الجماعت اپنے افکار کی ترسیل میں کہیں کامیاب ہو پھر تو ایک منزل یہ بھی آ سکتی ہے کہ انسان سب ایک دوسرے سے ملنا جلنا، باتیں کرنا، تفریح و تفرقہ سارے سماجی رشتوں اور رسوم کو چھوڑ کر کو لمنٹ کر بیٹھا کریں۔ اگر عمل ہو۔ پر ایسا نہیں ہے۔ تنہائی کا سبق پڑھانے والے سب سے زیادہ زندگی کی نعمتوں سے مستفید ہیں۔ لیکن تنہائی کا احساس انہیں کھائے جاتا ہے۔ ہر طرف اندھیرے کے سوا انہیں اور کچھ نظر نہیں آتا حالانکہ ان کی معاش اور معاشرہ اکثر عام انسانوں کی دنیا کو خیرہ کرتی ہوتی ہے۔ ادب میں اس زندہ خیزی کی اصلیت پھر آخر کیا ہے؟ اگر موجودہ پیکر ذرد ہا ہے۔ اور ایک نئی زندگی وجود میں آ رہی ہے تو اس نئی زندگی کا خیر مقدم کرنا سب کا حق اور فرض ہے۔ اس نئی زندگی کا جز بن کر چاہیے اور تجربہ کرنا کی دلیل ہے۔ موت کی نہیں۔ موت جس کا مستقبل ہو چکی ہے۔ وہ مسرتیں ساعت کی دینے چپ ہی جا سکتے ہیں۔ انہیں کامیر کے آنت ساتھ ہیرو کی طرح پھانسی کے پھندے کی گرفت اور سرپر پھنٹ پادری کی آخری سرمن کے الفاظ ہی سنائی دے سکتے ہیں۔ لیکن جنہیں زندگی پیاری ہوتی ہے وہ امید کا دامن آخری وقت تک نہیں چھوڑتے کیونکہ امید ہی زندگی کی دلیل ہے۔

جدیدیت کا "مرگ کوشش" اور "تنہائی پسند" ادب جس میں چند جدیدوں کے تجربے بھی شامل ہیں ان کی بقا کا سوال یہ ہے نہیں ہوتا۔ پھر یہ فیصلہ ہمارے اور آپ کے کیا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ یہ تو تاریخ اور آنے والی نسلیں فیصلہ کریں گی۔ لیکن اگر حق انصاف کی رہبری کرتی ہے اور کرتی رہے گی تو ہمیں ہمیشہ صحیح اور غلط کا احساس ہوتا رہے گا۔ نئے ادب میں بھی وہی اعلیٰ نمونے باقی رہیں گے جو فن اور ریاضت کی سان پر چڑھے ہیں اور جن میں صالح روایتوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تفہیم و ترسیل کی صلاحیت بھی ہو۔ لیکن جو تجربہ، فکر اور فن میں کچے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے زندگی کے فاصلوں میں دفن ہو جائیں گے چاہے ترقی پسند ہوں، قدامت پسند یا جدیدیت کے ہوں جنہوں نے ادب کے حسن، معیار اور معنویت کو چھوڑ کر ذہنی انتشار، ہیجان، بے یقینی، مہمل ابہام گوئی اور غیر متوازن ہیئت نگاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔

—o—

...اہ صادق کا ایک نایاب دیوان

...ڈ اکبرالدین صدیقی

شاہ صادق کے متعلق ہمارے تذکرے خاموش ہیں۔ تذکرہ فترت (ریاض حسینی) میں ایک صادق کا ذکر ہے جو دکن کے قلعوں میں ست...
...قلعہ دار ہوئے ۱۔ وہ کے قلعہ دار اور ملا احمد بیجاپوری کے پوتے تھے۔ ان کے چار شعر منتخب دیے گئے ہیں۔

کیا تجھ کو احتیاط ہے مانع ہیں غیر سے　　　　صادق حصول مقصد دل ہے خدا کے ہات

یہ غزل اس دیوان میں نہیں مل سکی۔ جناب ادبستان شعرائے معاصر تذکرے ہیں مگر اس میں صادق کا ذکر نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ قلعہ دار
...دق ہوں جنہیں ملا احمد بیجاپوری کا پوتا بتایا گیا ہے۔ دیوان کے مطالعے سے بھی ان کے پورے نام یا مقام کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اس کے ترقیمہ
...سے بھی کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ ترقیمہ یہ ہے :

"دیوان دکھنی حضرت صادق صاحب باتمام رسید کاتب الحروف العبد من عباد اللہ الصمد سید علی بن شیخ محمد الشہدی بتاریخ ششم
...ذیقعدہ ۱۲۵۸ ہجری نبویہ۔" "وجیہ الدین وجدی" میں اس کے مصنف محمد بن عمر مرحوم نے لکھا ہے کہ شاہ صادق فتح آباد دھاروڑ صوبہ خجستہ
بنیاد اورنگ آباد میں قاضی عبدالصمد کے پاس آکر قیام پذیر ہوئے جہاں وجیہ الدین وجدی بھی موجود تھے۔ انہوں نے وجدی کی شہری سلاست
دیکھ کر فارسی مثنوی کے ترجمہ کی ترغیب دی جس کی بنا پر انہوں نے مخزن عشق ۱۱۳۳ھ میں لکھی[1]۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ
...صادق وجدی کے پاس ایک قابل احترام ہستی تھے جن کا مشورہ وجدی نے قبول کیا۔

...دیوان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے قادری سلسلے میں عبد الحفیظ قادری کے ہاتھ پر بیعت کی تھی چنانچہ لکھتے ہیں :

دریں حفیظ کی سوں پر جن ہو کر می لدین　　　　بیستا ہے صادق پر یوں راز آشکارا

عبد الحفیظ والی ہست است ہے قول　　　　یک جام مستی کوں دیتا ہے پیر اشہ کا

...ہو سلسلہ قادری سے تعلق کا اظہار متعدد اشعار میں کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں :

صادق تو قادری یوں کئے حضرت نبی　　　　منزل بلا ہوسے جبی جاگ خدا کی طرف

ظاہر عبودیت میں آ باطن عبودیت تجا　　　　یوں صادق ہو حق نا گرت اوری سر ایہ

کتب خانہ سالار جنگ میں ایک کتاب شمس الحقائق نامی ہے جس کا ذکر وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ مرتبہ نصیر الدین
ہاشمی صفحہ ۲۵۱ پر ہے۔ کتاب کا نمبر ۹۰ سائز ۷×۴ صفحات ۹۲ ہیں۔ مصنف صادق تاریخ تصنیف ۱۲۰۰ھ۔ شاہ صادق کے متعلق

---

[1] مخزن عشق و باغ جانفزا، صفحہ ۱۳۳، مقدمہ وجیہ الدین وجدی، صفحہ ۱۰۲، محمد بن عمر مرحوم۔

تذکرہ اولیائے دکن کے حوالے سے لکھا ہے کہ:[1]

"ایک بزرگ شاہ صادق ہی کے متعلق صراحت کی ہے کہ وہ [illegible] ملازم تھے فقیر دوست تھے۔ اولاً شاہ [illegible] صاحب سے بیعت لی پھر [illegible] شاہ [illegible] کے مرید ہوئے۔ اپنے مرشد کے ہمراہ ارکاٹ سے حیدرآباد آئے اور [illegible] کے خلیفہ بنے۔ مثنوی شریف کے ماہر تصور کیے جاتے تھے۔ [illegible] میں انتقال ہوا۔ باغ [illegible] کے قریب مدفون ہیں۔"

کیا یہ شاہ صادق شمس الحقائق کے مصنف نہیں ہو سکتے کیونکہ انہوں نے شمس الحقائق میں کہیں بھی شاہ رضا یا شاہ [illegible] کی بیعت کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس کے برعکس شاہ عبداللطیف کا ذکر یوں کرتے ہیں:

دیا ہے مجھ کو شاہ عبداللطیف — کیا ایک نظر لطف کی وہ شریف

ہے شمس کو [illegible] سے نظر کیمیا — کیا شمس کو [illegible]

دسویں صدی ہجری کے آخر اور تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں عبداللطیف نامی تین بزرگ گزرے ہیں۔

۱۔ شاہ عبداللطیف قادری: سید شاہ ولی اللہ قادری کے بیٹے تھے۔ انہوں نے [illegible] میں وفات پائی۔ مادہ تاریخ وفات [illegible] ہے۔ آپ کے بیٹے سید شاہ [illegible] سلطان عادل شاہ کے عہد میں تھے اور وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ [illegible] کے قریب [illegible] میں [illegible] ہے۔

۲۔ سید عبداللطیف ثانی: والد سید شاہ [illegible] قادری [illegible] صاحب [illegible] تھے [illegible] عبداللطیف [illegible] آپ کا وصال [illegible] میں ہوا۔ تاریخ "لطیف [illegible] لطیف" [illegible] ہے۔ آپ ایک عارف کامل اور صوفی صافی تھے۔ [illegible] شاہ [illegible] حضرت تھا [illegible] آپ [illegible] لیکن آپ نے اس کو قبول نہ کیا۔ آپ کے مریدوں کی [illegible] تک پہنچی ہے۔ [illegible] کہ یہی شاہ صادق کے مرشد ہوں [illegible] فضل اور [illegible] کا ذکر [illegible] میں ملتا ہے۔

۳۔ سید شاہ عبداللطیف الموسوی: ان کا [illegible] تاریخ وفات [illegible] ہے [illegible] آپ ہی کے پوتے سید عبداللطیف ثانی شاہ صادق کے مرشد ہو سکتے ہیں۔

شمس الحقائق تصوف کا ایک منظوم رسالہ ہے [illegible] مسائل بیان کیے گئے ہیں [illegible] گئے ہیں۔ عنوانات فارسی میں لکھے ہیں۔ بعض جگہ فارسی کی بجائے عربی میں بھی ہیں۔ [illegible] عنوان بنایا ہے۔ [illegible] مرشد سے۔ اس کے آخری اشعار سے رسالہ کا نام اور [illegible] کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

جہاں تک لکھا فارسی میں کتب — تو بیت اس پر ہوں کر کامیاب

---

[1] روضۃ الاولیائے بیجاپور، ص [illegible]۔ تذکرہ اولیائے دکن، ص [illegible]۔ [2] تذکرہ اولیائے دکن، ص [illegible]

کیا وو صادق رسول جب سعی — زبان بیچ دکھنی کیا میں بیان
خدایا وو سب ہے ترا فیض عام — کہ نا رہیں نہ محروم عالی مقام
رسالہ شمس الحقائق حقیقہ — کہ اس خلقت لوں آپ دلپذیر
اگیارہ سو [illegible] بیچ زبان [illegible] — خلاصہ حقائق کا سب منتخب

ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

تمت الکتاب از تصنیف شاہ صادق [illegible] قدس اللہ سرہ کاتب محمد حسن [illegible] غفر اللہ شمس الحقائق کے ابتدائی اشعار جو تصوف کے مضامین پر مشتمل ہیں حسب ذیل ہیں۔

الحمد [illegible] — کہ احمد ہے جس حمد میں آشکار
احد احدیت ذات سوں [illegible] تھا — اس حسن کے دعوں مست تھا
[illegible] وہاں شارات سے [illegible] — اہیں وہاں اشارات سے [illegible]

ادارہ [illegible] اردو [illegible] ایک بیاض ہے [illegible] سنہ ۱۱۱۱ھ [illegible] ہوئی ہے اور خط [illegible] ہے [illegible] میں صادق کا بھی ایک [illegible] موجود ہے [illegible] مخطوطات جلد اول میں لکھا ہے کہ [illegible] صادق [illegible] سے قبل ان کا کوئی [illegible] دستیاب نہیں [illegible] اشعار [illegible] اور اس میں کوئی [illegible] نہیں یہ اسی صادق سے [illegible] معلوم ہوتا ہے چند نمونے پیش ہیں:

[illegible] — ستارے [illegible] وقت [illegible]
[illegible] — [illegible] جد [illegible]
چند [illegible] اسمان [illegible] — اس [illegible] سوں [illegible]
[illegible] اس [illegible] — اس [illegible] سوں [illegible]
یوں صادق ہے [illegible] — کیا [illegible]

شاہ صادق کے [illegible] دیوان [illegible] ہے۔ یہ ایسا دیوان ہے جس میں نہ صرف یہ کہ غزلیں تصوف کے مضامین پر مشتمل ہیں [illegible] ایسے دیوان [illegible] دیوان [illegible] کے ایک بزرگ تھے۔ [illegible] سلطان [illegible] حضرت خواجہ بندہ نواز کے [illegible] ان دونوں [illegible] عنوانات نہیں [illegible] صادق کے دیوان میں غزلوں کے عنوانات بھی دیئے گئے ہیں اور یہ سب [illegible] ردیف الف میں چند غزلوں کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ غزل اول در [illegible] حقیقت محمدیہ [illegible] کنت کنزاً مخفیاً [illegible] ذاتیہ۔
۲۔ غزل [illegible] حقیقت [illegible] حقیقت انسانی۔

۳ - درکشف ظہور محمدیہ بہ جلوہ گاہ روحانیہ
۴ - درترتیب سکان فیل مست نفسانیہ
۵ - درکشف حقیقت شکر و رفوف حروف شکر۔
۶ - درکشف حقیقت صبر بتقریر حرف لفظ مقدم حرف ربہ
۷ - درکشف حقیقت سالک کامل و عاشق کامل۔
۸ - درکشف حقیقت حفظ ستوران و آئینہ داری کوران
۹ - درکشف وحقیقت امانت و خلافت آدم علیہ السلام
۱۰ - درکشف وحقیقت محال با ہر کس و ناکس۔

غرض اسی طرح ہر صنف نظم پر عنوان دیا گیا ہے۔ دیوان کے جملہ ۱۴۴ صفحات ہیں۔
اس میں ۱۲۱ غزلیں ۳ قصیدے ۱ مخمس اور ۲۰ رباعیاں ہیں۔ تین قصیدوں میں پہلے قصیدہ کے آغاز میں یہ عبارت لکھی ہے

نام ایں قصیدہ وحیدہ گلزار قادریست کہ در ترتیب ایں قصیدہ بہ صنعت الفاظ است و لہم تجنیس کلمات بر صاحب بصیرت کہ بر نزاکت تحلیل و تقلیبت و تمثیل ایں قصیدہ تامل خواہد فرمودہ و انصاف خواہد نمود۔

اس کا مطلع ہے۔

وہ عاشق صادق کہ جسے ہو سلسلہ سبے دم کا — جسے عشق ہے دم کا وہی ثابت ہے قدم کا

چار پانچ شعر حسب ذیل ہیں۔

ہے طالب باحال میں نہ کیے عروت نعمت — مو طالب حق اور نہ طالب ہو شکم کا
کہ رحم وہاں پر کہ یہی بیت حرم ہے — ہو وہم روحاں کہ یہی حج سے حرم کا
آزادہ وہ عالم کہ جنہیں شاد کی کچھ فکر — ہے کچھ نہیں فکر جو سے بیشی و کم کا
نامی میں بنی رکھو کرستی حق کو ہے بالحق — پیدا جو مخاسوں ہے نہ لائق ہے نجم کا
اثبات آکل ہو موکل ہو تو کل سار — ملہ ابر ہے نیر تہے تیر شب غم کا

ان اشعار کے بعد شیخ عبد القادر جیلانی کی منقبت میں شعر کہے ہیں۔ کل اشعار کی تعداد ۵۵ ہے۔ دوسرا قصیدہ کو جینے کے نام سے ہے اور تیسرا منقبت شیخ عبد القادر جیلانی میں دس مخمسوں میں ایک نصرتی کی غزل پر ہے جس کا مطلع ہے۔

دیکھو سکھیاں میرا پیا کس سیتی ملنا سلتا ہے — پر جھوڑ کر اپنا پیا وقت بھی کہیں گنا سکتا ہے

یہ غزل راقم نے سب رس میں شائع کر دی ہے۔
ولی کی دو غزلوں پر مخمس لکھے ہیں مطلع ہیں
عجب غافل پڑا ہے کیا فکر کچھ کے پانے کا — صفا کر آرسی دل کی سکندر ہو زمانے کا

اب مزا ر دنا کرے ہے تیری جنسی — اب بس نہیں پر بس ہے پر بسی

بحری کی چار غزلوں کی تضمین کی ہے۔ ایک کا مقطع اور تین مطلع ہیں۔

بات اُس ساں بول اے بحری — جسم انجو جس کے چاک سوں چکتے ہیں
اے سجن دل سنگ سوں مل سنگ کرنا محق — دوستی کرا اوّل آخر جنگ کرنا احمق
سور تجہ مکھ مثال نئیں پتہ ہے — لال تجہ لب ستے لال نئیں رتے ہے
یار اب ہے سو کچھ عجب ہے ہے — اب جو سب ہے سو کچھ عجب ہے ہے

چوتھا شاعر جعفر زٹلی کا ہے جس کی غزل تضمین کی گئی ہے۔ یہ غزل جعفر کے اس دور کی ہے جبکہ ابھی وہ زٹل نہیں ہوئے تھے یہاں جعفر کی پوری غزل پیش ہے۔

اے دل عقل کوں کر برطرف تو ں — پڑے گا عشق کا تب یک حرف توں
کی میں عشق کی نئیں بار تجہ کوں — بدھال تک میں سمجھا من حرف توں
ز جگ عقل کوں سٹ دے شتاب ملد — جو سنگتا عشق میں اپنا شرف توں
نہ پاسے من عرف کا بھید جب لگ — لے ناچیں سورج اٹک برف توں
آپس کوں کچھ سمجھ کر دیہ جعفر — نہ کر کو ہر شہ کا یوں صرف توں

دو مخمس خود صادق نے لکھے ہیں اور بیس رباعیاں۔ تین رباعیاں پیش ہیں۔

۱۔ جہاں میں وہ توں خیال جو سلام کوئی نہ کرے — تجھے بزرگ سمجھ کر قیام کوئی نہ کرے
اگر نماز کوں مسجد میں جائے تو یوں جا — کہ معتقد ہو ترا تجھ امام کوئی نہ کرے

۲۔ گر تجکوں سمجھ کچھ ہے خدا دانی میں — نسبت نہ کرا جو سب کی نادانی میں
آزار نہ دے دل کوں کسی سے یکو — یہ کام ترا ہو جو مسلمانی میں

۳۔ یو نفس سیاہ جیو کو جنجال سے — جوں صید کوں صیاد رکھے جال منے
آدم کی جو دانا ہوا دے کا دیوانا — جہاں کی پڑیں او جو کھوں ال منے

تصوف کے مسائل کو صادق نے اپنے دیوان میں جا بجا پیش کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ کہتا ہے۔

ہے مجھے شوق کہ جو سے مرقوم احمد رنگ — یہ رباعی صادق سے توں دیوان میں آ

صادق نے عام تشبیہوں کے علاوہ اچھوتی اور نادر تشبیہیں بھی استعمال کی ہیں۔ ان میں مقامی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ چند تشبیہیں پیش ہیں ملاحظہ ہوں:

نور لطیف حق میں میرا کثیف تن ہو — کھل گیا ہے یوں جیوں کل دھدھ میں بتاسا
شیطان جور دنیا کی جتنی ستی جتا ہو — ہے نفس اوکھن یو ذال مرا فوا سا

لطیف نور کوں اپنے کثیف تن میں جذب کرنے کی تشبیہ دودھ میں بتاسے کے حل جانے سے دی ہے اور نفس کو شیطان اور دنیا کی اولاد بتلا کر اسی نوالے سے تشبیہ دی ہے جس کی نانی مر چکی ہو۔ اور دو تین تشبیہیں پیش ہیں:

دستا مبارک مکھ اوپر سیس پھول یوں تجھ سیس کا   گویا قراں جوڑا ہے ہل چاند سوں برجیس کا
ایک چاند پورا مکھ اتھا تس پر جھلکت کا چاند لا   دو چاند دکھلائے لا ایک چودھواں ایک بیس کا

کیا نفع گر ابھروں تیرے کئے انا الحق   چوری کا گرہ چھپا کر مکھ موند چپ نکل جا

دیکھ کثرت کے بیچ وحدت یوں   سوت کا تنے منے سے جیوں کپاس
حق کی ہستی میں تیری ہستی جیوں   زعفران کے ہے کھیت میں نسناس

(انسانی ناچیزان)

مسی لا پان کھا دانتاں رنگا لے لعل و نیلم سے   جوں یاقوت میں نیلم سبب عاشق پہچانے کا

چند ایسے اشعار پیش ہیں جو کہ اسرار ہونے کے دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں۔ کہتا ہے:

قول نبی شریعت فعل نبی طریقت   حال نبی حقیقت دیکھ آئینہ درس کا

وحدۃ الوجود کی تفہیم کس انداز میں کرتا ہے۔

یک بیج سے اصل شجر اکھوں سوں پھول ہوا بار و بر   دو بیج ہر ایک شئے بھیتر نہیں تو بولے سو کیا
زر کھان کا ایک ذات ہے زیور بنا کئی دھات ہے   یک زر سبھی کے سات ہے نہیں تو بولے سو کیا
یک نور کے سب جیو جن سا توں فلک منورا تر جوں   اس ایک کے یہ سب برن گر نہیں تو بولے سو کیا

کہیں کہیں ناصحانہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ یہ نصیحت بالواسطہ بھی ہے اور بلاواسطہ بھی۔

تو برا سے جیتا نہ تک دستا ہے جو تجھے سب   جو نیک دیکھ بد سے کاں نقش ہے بدی کا
گنے کی ذات اصل سے ہے بخش پیسہ   گنگا میں صبح و شام نہائے تو کیا نفا
صادق آدمی ستے وو ہی بھے   بے ادب خلق جھوٹ یا جھوٹا
اس راہ میں مشکل ہے اگر تجھ سے تو آ   ناؤ ہو سکے کا بچار ہر ایک خام عشق کا

اور عشق کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد وہ اپنی حالت کا یوں اظہار کرتا ہے۔

مجھ میں بسا تھم کا پاٹ قول دیا پیٹ باٹ   سکھ کا گھر لوٹ لوٹ دکھ کا پسارا کیا

یہاں تین غزلیں مکمل پیش کی جاتی ہیں جس سے شاعر کی طاقت لسانی پر گرفت اور قادر الکلامی کا اندازہ ہو سکے گا۔ صادق ولی کو دیکھا ہوا اور متاثر، بحری اور وجدی کا معاصر ہے اس لیے ان سب کے کلام کی خصوصیات اس کے کلام میں بھی بدرجہ اتم نظر آئیں گی۔

جھلتی مجھ کوں مجھوں کی نت مجھ میں بس بس بس ... جلتی میں پیا رکھ یا امرت کا رس رس رس
بیٹھے رین بھر پیا کا رن لینے کوں کس کس ... گرد رنگ اس کی تج بس پیالی بس بس بس
ہے گر سوں کین سے دیکھوں منزل پیا کئے توں پیا ... سیس سے مری پرلی [illegible] دانت [illegible]
کرسے الماس کوں یاقوت سوں یا قوت اوں تیر ... بھی جب [illegible] لکا دیں دانت گھس گھس گھس

اتے میں صادق [illegible] نہ رشتہ سے اس گس کا
نکال [illegible] دریا مجھ کوں [illegible] بس بس

(۲)

جبل سے لالہ زار کھلا دیکھ جیسے باغ ... تو جانے کیوں تمہارے دلاں میں سیاہ داغ
گل نے زبان حال سوں جبل کوں یوں کہا ... [illegible] ہے دفا کا جلا یا دل و دماغ
جا آرسی محل [illegible] دیکھ ... [illegible] میں [illegible] چراغ
[illegible] سب [illegible] ... شاہ و گدا دوں دیکھ [illegible] سوں فراغ

صادق جہاں کے باغ سوں گئے جیلاں تمام
[illegible] بات [illegible] زاغ

(۳)

تجہ حسن کے گلشن منے [illegible] کے باد آئے گل ... [illegible] دیکھ [illegible] سرکشی [illegible] شرمائے گل
دیکھ [illegible] تری [illegible] دیوانہ ہوا ... [illegible] لالی کوں دیکھ لالہ [illegible] جائے گل
تعریف تیرے بال کی [illegible] سنبل ہیا ... [illegible] سیاں [illegible] آپ ہی [illegible] گل
[illegible] دن [illegible] ہے تو ... [illegible] ہاتھ [illegible] پائے گل
صادق اُسے [illegible] ... [illegible] رنگ تازہ تر [illegible] گل

صادق کی یہ غزل بیاض سے [illegible] میں موجود ہے۔

جس دن سے [illegible] ... سب [illegible] ہے
[illegible] آرسی ہے [illegible] آرسی سے [illegible] ... [illegible] بات [illegible] ہے
[illegible] ذات شمس سے [illegible] جان [illegible] ... دل [illegible] صفا [illegible] آرسی ہے
اس آرسی محل [illegible] ... دیکھ [illegible] آرسی ہے
حق بات حق سے [illegible] حق ہوا ... اے عاشقاں صادق اس [illegible]

نصرتی، ولی، بحری اور معظم کی تضمینوں سے دو دو بند پیش ہیں۔

نصرتی

ادھر اودھو بہت خوش بہنے کر بہت اکمپت سکے پیار سوں
قبول لیسا پریاں بنا بیٹھنے لگے ہر یک سے موں
ادھر دیو کا بیش دانندکاں سے سکت جو میں کیوں
دھرت تجہ چالی ادھر از بن پت سکے شوق سوں
لگی بہت ہسنے محبت کا بجے پھر پھر پاتا سامنے
جب سے پیا مجہ سٹ ین دل اسکے دیکھے پکن
لگے یوں پیا آرام سے یوں یوں دھنا دیتے ہمن
پیاں سنے دعا سوں شہریں کہ لیتے تب مجہ محن
جانو اوچار پیو بجے کل سیں نکاتا سامنے

ولی

چست ہو جاؤں ہو ثابت قدم — ہوں تمہارے عشق میں ہر دم بدم
سوں ناسک تجہ رقیباں کا ستم — سست ہونا عشق میں ہے مذموم

نالسی ہے نالی ہے ناکسی

فخر لیتی فخر پر حضرت نبی — فخر ہے فخر شہنشاہ دوجہاں اصل
صادق اوسٹو چلو جگ میں چل — باعث رسوائی عالم ولی

دانش

مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

بحرتی

زلف ہے ناگ نیں من سے منی — سیس لٹ سیس چوال چھو سے فن
تیں دات تجہ ہیرے کی کھن کے تن — دھو ترسے دھتے نین سے تن

برنگال گول نیں پیاسے

صادق دستر سس کرنے بجستے ری — عاشق کا بوس کرا سے بجسری
چھوڑ دیئے اپس کرنے بجسری — اب خوش خادروں بہ کرنے بجری

تجہ پر اس کا خیال میں پیاسے

ے مخطوطے میں بیچ ادھورا ہے۔ ے نامکمل اندازہ ہے۔

جعفر

خودی میں صرف کیتا عمر اب لگ   رہے گا خود نمائی نہ بچ کب لگ
خودی سوں کوں کر پہنچا ہے اب لگ   نہ پائے من عرف کا بھید جب لگ
گئے نا ہیوں سورج منگے برف توں
خدا کے راز کا صادق نشانہ   نہ ہوے جب لگ نہ پیوے آب کوثر
حقیقت کی تو راہ میں دل سوں آکر   اپس کوں پھر پھر کر دیکھ جعفر
گزر گو ہر عمر کا یوں صرف توں

ادبی قدروں کی تشکیل جدید

عبد المغنی

ہم اپنی محدود ذہنی زندگی کو وقت کے پیمانوں سے ناپنے کے عادی ہو گئے ہیں کیونکہ اپنی پوری زندگی ماہ و سال، روز و شب اور ساعات لمحات میں ہی گزرتی ہے۔ ہماری نگاہوں کا افق ہمہ وقت پھیلتے ہوئے آفتاب کو کبھی طلوع ہوتا ہوا اور کبھی غروب ہوتا ہوا دیکھتا ہے اور یہیں سے ہم اپنی صبحوں اور شاموں کا حساب لگاتے ہیں۔ زمین کی گردش ہمارے سامنے کبھی چاند کے ایک رخ کو لاتی ہے اور کبھی دوسرے رخ کو۔ اور اس طرح اپنی قدرتی رفتار سے گزرتا چلا جاتا ہے اور ہم اس کے ساتھ ساتھ اپنے سفر حیات کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کو آسانی سے سمجھنے کے لیے ہم نے اپنی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کر لیا ہے: ماضی، حال اور مستقبل۔ ظاہر ہے کہ تاریخ انسانی کی یہ تقویم ہمارے اعتبارات کی مبنی ہے۔ ورنہ وقت اپنی حقیقت کے لحاظ سے ایک لازوال، بے کراں تسلسل ہے۔ ایک کے بعد دوسرا لمحہ آتا ہے اور لمحوں کی یہ پیہم حرکت بغیر کسی ایک لمحے کے بھی انقطاع کے جاری ہے۔ کوئی ایک دقیقہ، وقت بھی ایسا نہیں جہاں تک کہ گزشتہ، موجودہ کی تفریق اور آئندہ کی تعیین کی جائے۔ یہاں تک کہ اس تجزیے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زمانے کی اس حرکت پیہم کو ہم مستقر تصور کریں بعض بہ حال ہم اس کے تسلسل کو توڑ کر اس کو ٹکڑوں میں بانٹنے سے قاصر ہیں۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک

جب زمانے کی حقیقت یہ ہے تو ہم اعتقاداً کیسے قدیم کس کو کہتے ہیں اور جدید کس کو؟ ارتقا اور ترقی پسند دانشوروں کے نظریۂ حیات نے یہ کیا ہوا ہے جس کے مطابق زندگی ہمہ وقت اپنے ماضی کو چھوڑتی ہوئی نئے مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ایک کے بعد دوسری ترقی یافتہ شکل بنتی رہی ہے اور اس طرح گزشتہ دور کا ہر تصور نئے دور کے مقابلے میں پسماندہ و پسماندہ ہے جب کہ نئے دور کا ہر تصور گزشتہ کے مقابلے میں ترقی یافتہ اور عروج پذیر ہے چنانچہ قدیم ایک فرسودہ و ازکار رفتہ چیز ہے اور جدید ایک تازہ و کارآمد قوت۔ ماضی بد بخت ہے اور حال حسین و جمیل اور مستقبل درخشندہ تر۔ اس سے ارتقائی ذہن کا اعتقاد حاصل ہے۔ اس کے بالکل برعکس نظریہ وہ ہے جو روایت پرست مذہب پسندوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق انسانیت کا نقطۂ کمال ایک انتہائی منزل پر صدیوں پہلے پہنچ کر رک گیا ہے جس کے بعد زندگی کی ہر حرکت آدمی کو زیادہ سے زیادہ خرابی اور تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ چنانچہ صدیوں پہلے کا قدیم ہی حسن اور خیر کا معیار ہے۔ جب کہ اس کے بعد آنے والا ہر جدید قبیح اور شر میں اضافے کا موجب ہے۔ پس صرف قدیم ہونے کی وجہ سے پسندیدہ ہے اور جدید صرف جدید ہونے کے سبب ناپسندیدہ۔ اس طرح "ارتقا" اور "مذہب" کی یہ دو انتہائیں جدید پرستی اور قدیم پرستی کے تصورات کو ابھار کر دونوں کے درمیان ایسی تفریق پیدا کرنے والی ہیں۔ یہ دونوں ہی انداز نظر حقیقت سے بعید رہے ہیں۔ قدیم اور جدید حقیقتاً وقت کے دو کنارے ہیں۔ زمانے کی دو روئیں ہیں اور اس لحاظ سے ان دونوں کے درمیان جس ذاتی امتیاز کا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اس بات کی متقاضی نہیں ہے کہ صرف اس بنیاد پر قدیم و جدید کے درمیان تفرقہ برپا کیا جائے۔ ایک کو سراپا خیر اور دوسرے کو سراپا شر قرار دیا جائے۔ اور اس طرح قدامت یا جدت کو بجائے خود ہی ایک معیار بنا لیا جائے اور ان کو مطلق اقدار کی حیثیت دے دی جائے

واقعہ یہ ہے کہ قدیم و جدید صرف وقت کے انسانی تصورات ہیں ورنہ ہر جگہ ہر وقت بدلتے رہتے ہیں وہ متعین بالذات نہیں ہیں عارضی اور اضافی ہیں، ہر لمحہ ابھی جدید نظر آتا ہے وہ فوراً قدیم ہو جاتا ہے اور جو قدیم نظر آتا ہے وہ بھی جدید رہ چکا ہے

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ

ایسی صورت میں قدیم و جدید کی متضاد خانوں میں تقسیم اور ان کے درمیان تفریق بالکل بے معنی اور عبث ہے، یہ صرف ہمارے محدود نظر کا کرشمہ ہے؛

ہیگل کا نظریۂ قدیم و جدید

لیکن ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا اب ثبات نہ صرف یہ کہ کوئی خواب نہیں رہا [illegible] بلکہ اس میں پہنچنے کے لیے نئے زاویے پیدا کیے گئے ہیں جن سے وقت کا تصور اور بھی بدل گیا ہے۔ ڈارون کے نزدیک ارتقائے حیات میں عناصر کی کشمکش کا نتیجہ بقائے اصلح کی صورت میں نکلتا ہے دوسرے لفظوں میں قوی فرد [illegible] پر غالب آجاتا ہے اور زندگی کے آئندہ رخ کو وہی متعین کرتا ہے۔ جہاں تک کہ اس سے زیادہ قوی فرد منصۂ شہود پر ابھر کر اس کو شکست دے دے اور پھر آگے وہ زندگی کو اپنے رخ پر لے جائے۔ اس کے علاوہ ہیگل نے باضابطہ جدلیت کا نظریہ پیش کر دیا جس کے مطابق ایک خیال ابھرتا ہے [illegible] ایک نئے خیال کو جنم دیتا ہے، دونوں میں حرب و ضرب کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور بالآخر ایک خیال مرکب نمودار ہوتا ہے، جو جزوی طور پر [illegible] نئے خیال کو جنم دیتا ہے [illegible] ایک نئی ترکیب خیال سامنے آتی ہے [illegible] حیات آگے بڑھتی جاتی ہے۔ ڈارون کی حیاتیت [illegible] ہیگل کی جدلیت [illegible] استعمال کیا اور دوسری جانب مارکس نے [illegible] ہیگل کی [illegible] جدلیت کی [illegible] کی صورت میں [illegible] حساب کیا جاتا ہے، اور [illegible] معاشیات [illegible] ہیگل کے فلسفے اور [illegible] مارکس کے [illegible] ارتقائے انسانی [illegible] حیات [illegible] تضاد اور تصادم اس نظریے کی بنیاد ہے [illegible] قدیم اور جدید کی [illegible] ہوتی رہتی ہے [illegible] برتر ہوتا ہے [illegible] قدیم [illegible] ثابت ہوتا ہے [illegible] تصورِ حیات ہے جس میں [illegible] ہے [illegible] سے [illegible] ایک ہی مفہوم کی دو تعبیریں ہیں۔

کائنات کے احوال پر غور کرنے [illegible] ترتیب و توازن کی [illegible] ترتیب [illegible] حیات تضاد اور [illegible] بے، تو توافق اور تعاون کی [illegible] ترتیب [illegible] کشاکش نہیں کشش کے نظام پر قائم ہیں اجزاء کے درمیان [illegible] ایک اجتماعیت کا احساس ہے کوئی بھی اجتماعی روایت سے علیحدہ ہو کر اپنا کوئی مقام نہیں رکھتا۔ جدت کے پیچھے کوئی قدامت ہوتی ہے جو پھر مستقل اقدار کے پس منظر میں ہی ہوتی ہے۔

اس طرح واقعہ یہ ہے کہ جدید وقت دہر بس ایک فریبِ نظر ہے، وقت کسی قدرِ حیات کا نام نہیں، زمانہ کسی اصول اور معیار کا حامل نہیں یقیناً ہماری کائنات کا دائرہ وقت ہی کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ لیکن وقت ایک میکانکی مظہرِ فطرت ہے جو شعور اور ارادے سے تو عاری اور قوت و طاقت سے بھی عاری ہی ہے اپنے اندر کوئی وصف اور صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ کسی امر کا فیصلہ کرنے کی استعداد سے بھی یہ نہیں، اشیا کے درمیان تمیز کا جوہر بھی نہیں رکھتا۔ زمانہ ایک بالکل ہی خارجی، مادی اور عقلی تصور ہے جو کسی بھی قسم کی روحانی صفت اور صلاحیت سے یکسر محروم ہے۔ وقت کائنات و حیات کی ایک فضا ہے جس میں مخلوقات کے تمام اعمال و حرکات کے نقش پذیر ہوتے ہیں اور ان اعمال حرکات کی قدر بھی وقت کا کوئی جزو نہیں وہ صرف ایک غیر جانبدار ظرف ہے۔ اعمال و حرکات کا محرک، مقصود اور معیار وقت و زمان کے علاوہ ہوا کرتے ہیں [illegible] مستقبل [illegible] محرک، مقصود اور معیار کی تعیین میں دخل نہیں رکھتا۔ [illegible] محرک، مقصود اور معیار کا تعلق انسان کے شعور، ارادہ اور حکمت و عمل سے ہے۔ [illegible] زمانہ تصورات و نظریات سے [illegible] [illegible]

[illegible]

سوالات میں اُن کے جوابات پر ہی کسی پارۂ فن کی مجموعی حیثیت کا انحصار ہے۔ بس یہ ہے کہ اگر صرف فن و ہیئت کے اصول و قواعد اور ان کے سلسلے میں پیدا ہونے والے ابتدائی سوالات کو معیارِ تنقید مان لیا جائے تو پھر کامیاب فن پاروں کے درمیان امتیاز کی کوئی بنیاد نہیں رہ جائے گی اور اس صورت میں عملی تنقید کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی کیونکہ تنقید لازمی طور پر دو عناصر سے مرکب ہے: ایک تجزیہ، دوسرے موازنہ۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ کہ اگر فن اپنا آپ مقصود ہو جائے اور فن کار اپنے گرد و پیش کی فکر سے بالکل بے نیاز ہو جائے تو [illegible] ہیں۔ پھر فن کی کیا اپیل رہ جائے گی قارئین کے لیے؟ کوئی بھی فن ہو اپنے فن کار کی ذہنی فضا سے [illegible] پرواز کر سکتا ہے؟ [illegible] روح کو بہرحال قفسِ عنصری [illegible] کام کرتا ہے۔ تنقیدی موازنہ [illegible] کے علاوہ اور ان دونوں سے زیادہ [illegible] یہ ہے کہ ایک فن پارہ ابتداءً [illegible] کے جس حلقے کو پیشِ نظر رکھ کر تخلیق کیا گیا اور جس کے سامنے [illegible] اس فن پارے کا جو اثر مرتب ہوا اور کس قدر کامیاب [illegible] ہے یا مثبت تعمیری ہے یا تخریبی [illegible] اس لیے کہ [illegible] فن کار بھی اپنی فن کاری کے ذریعے شعوری یا غیر شعوری طور پر [illegible] تخلیقات کے ذریعے [illegible] بلاشبہ [illegible] ہے اور [illegible] ہونے کے ساتھ مقصدی بھی ہے [illegible] کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس [illegible] میں حریتِ فکر [illegible] ضمیر کی [illegible] تمام افراد اور [illegible] معاشرے کے [illegible] لیکن [illegible] سے جائز نہیں [illegible] وضع کے لیے [illegible] تمام [illegible] میں ڈال دیا جائے [illegible] بالکل [illegible] فنکار کے [illegible] سے اصول لینے چاہئیں [illegible] کے اوپر [illegible] دخل کر دینا چاہیے [illegible] کے لیے [illegible] اس کا اعلیٰ [illegible] اور [illegible] ہونا چاہیے۔

[illegible]

[illegible]

کی بنیادوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان و ادب کی تشکیل جدید میں مذہب نے جو اساسی اور تعمیری عمل ادا کیا ہے، اس سے مغرب کی آگاہی ان دانشوروں کو میسر نہیں آئی۔ جب کہ اسلامی ادبیات کی لسانی و ادبی معنویت کا اعتراف کرنا انہوں نے ضروری نہ سمجھا۔ شاید وہ مذہب کو بھی ان ہی اوہام و خرافات میں شامل سمجھتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ان میں سے کچھ لوگوں نے ادب اور تصوف کے تعلق کو گوارا کیا ہے۔ اس لیے کہ بالعموم تصوف اور سیکولر رجحانات میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ مطلب یہ کہ وہ مذہب و دانشور مذہب کے جمالیاتی پہلو کو اس کی اصلی و حقیقی شکل میں منکشف ہی نہیں کر سکے ہیں۔ ان کے ذہنی ذوق اور ظرف میں اس کی گنجائش ہی نہیں، لہٰذا اپنی علمیت کا ثبوت وہ اس کو مسخ کر کے دیتے ہیں۔ بہرحال زیر بحث موضوع سے ادب میں اخلاقی مقصد کا وجود اور اس سلسلے میں اخلاق کا تصور اس معاملے میں دراصل انتہاپسندی کا ثبوت ان لوگوں کی طرف سے کہیں کاٹ لیتا ہے جو شاید مذہبوں کے رد عمل میں ادب کو براہ راست مذہبی عقاید و اخلاق کا صحیفہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مقصد اور اخلاق کا کوئی تصور راست اور بحیثیت مذہبی عقیدوں سے الگ ہے ہی نہیں۔ وہ ادب کی حیثیت کو بھی بالعموم وعظ و پند کا منبع سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں کچھ لوگ فقہی اور کلامی مسائل کا دل شکاف بیان اصناف ادب میں بھی روا رکھنا خیال کرتے ہیں اور ضروری سمجھتے ہیں۔ ادب میں اخلاقی مقصد بس یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر اپنے معتقدات کا کھلا اعلان کر دیا جائے۔ ان معاملوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے کہ ہر فن اور ہر شے کا اپنا مخصوص موقع و مقام ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر دائرے کا اپنا مخصوص طریق کار ہے اور یہ طریق کار اسے کچھ خاص حدود کا پابند کرتا ہے۔ صرف ادب اور آداب ہی نظریہ اور مذہب سے متعلق کوئی بھی موضوع مختلف دائروں میں اس کو پیش کرنے کے متقاضی ہوں گے اور اس انداز و پیش کش میں ہر دائرے کی خصوصیات کا لحاظ رکھا ہوگا تب ہی ایک خاص دائرے میں کسی نظریے اور مذہب کو کوئی رسوخ حاصل ہو سکے گا۔

ان ابتدائی مباحث کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ادب میں اخلاقی مقصد کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مقصد اخلاق دونوں کے وسیع مفہوم میں سے ہمارا اصل مقصد کا تعلق ہے۔ یہ وہی شعور و رجحان ہے جو انسانی تہذیب و سرشت میں داخل ہے اور انسان جیسی باشعور اور ذی روح ہستی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ مقصدیت انسانی فطرت میں شامل ہے۔ انسان کی حرکات و ارادی ہوتی ہیں۔ اس کی ہر شے کی ہر غایت مقصد سے خالی نہیں ہو سکتی جب کہ ہر انسان اپنی کسی بھی نقل و حرکت سے مقصد چاہتا ہے۔ یہ بات عقل عام کی رو سے بالکل صاف اور سیدھی ہے اور کوئی بھی ذی ہوش انسان اس کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ بہرحال دبستان وابستہ ادب اس بات کو بالکل ہی بھول جاتے ہیں۔ آخر ادب کو ہی مقصد سے دور رکھنے کا مطلب کیا ہے اور کیا محض جمالیات دونوں تصور مقصد ہوں گے یا انسانی صداقت کو ختم کر دیا جائے گا۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ادب کو ایک ذہنی عیاشی کا ذریعہ بنا دیا جائے گا۔ ایک بند اور فن کار نے بیان کیا کہ تیز تیشہ ہو جائے تو فنکار ہی سب کچھ ہو گا اور جب سب فنکار ہوں گے تو پھر فنکار کی قدر ہی ختم ہو گی۔ یہ فنکار کا ایک ایسا دور ہوگا جس میں مناصب کے سلسلے سے امتیازات ختم ہو جائیں گے۔ صداقت و قدر کا معیار ختم ہو جائے گا۔ تنقید و تنقیص کے دفتر لپیٹ دیئے جائیں گے اور فن محض لذت اندوزی کا ذریعہ نہیں رہے گا بلکہ یہاں تک کہ سوداگرانہ مصنوعات کے ڈھیر لگ جائیں گے اور ادب ایک شخص کی خواہش بن جائے گا جس سے صرف کچھ لوگ ہی یہ سمجھتے ہوں کہ ان کا ذاتی تجربہ پہنچ کر ادب بن گئے اور یہ ادب ہی ہے۔

ہم کھلے پن کو محسوس کر لیں گے ۔

واقعہ یہ ہے کہ ادب کا یہ مسئلہ براہِ راست انسانی تہذیب سے وابستہ ہے اور دورِ جدید میں اس کی جتنی بھی شکلیں پائی جاتی ہیں
سب تہذیب کے مستقبل پر ایک [illegible] سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے بنیادی اشغال دو ہیں — کام اور کھیل۔ چنانچہ تہذیب
ہر دور میں انسان کو یہ مسئلہ درپیش رہا ہے کہ وہ کام اور کھیل کے درمیان توازن [illegible] کس طرح قائم کرے [illegible] دونوں کی ترتیب و
تہذیب اس طرح کرے کہ بحیثیت مجموعی دونوں اپنے اپنے طور پر [illegible] انسان کے نشوونما اور تہذیبِ انسانی کے ارتقاء کا سامان [illegible] کھیل
اور کام کے درمیان وہ تفریق و تضاد [illegible] انسان [illegible] اور تفریح کے [illegible]
[illegible] ایک ہو کر اپنی شخصیت [illegible]
[illegible] نظام [illegible] اس کے اجزا [illegible] پریشان [illegible] شخصیت [illegible]
[illegible] ہم آہنگی کی طالب [illegible] مخالف [illegible]
[illegible] ظاہر ہے کہ اس دور [illegible] جان [illegible] ساتھ ساتھ [illegible]
[illegible]
[illegible] علمی و علمیہ [illegible]
[illegible] ایک دوسرے [illegible]
[illegible] تفریح کے بارے میں [illegible] اختلاف [illegible]
[illegible] اختلاف [illegible] کھیل [illegible]
[illegible] گیا اور تفریح [illegible]
[illegible] تماشائی [illegible] کھیل [illegible]
[illegible] ایک [illegible] کام [illegible] اچھا
[illegible] اضافہ [illegible]
[illegible] کام کرنے والے کی جان [illegible] کھیل
بھی ایک دوسرے [illegible] کام [illegible] کھیل [illegible] ساتھ [illegible]
[illegible] ہم آہنگی [illegible] تہذیب [illegible]
[illegible] اسی طرح [illegible] کھیل [illegible]

آگے بڑھنے سے پہلے [illegible]
[illegible] کا تعلق [illegible] زندگی گزارنے [illegible]
[illegible] ہر شخص جب کام [illegible] مشغلہ [illegible] ایک

تمام وقت سے ہمکنار کرے۔ اس لیے آدمی ایک تو مشین نہیں ہے کہ کام کے اوقات کے بعد بس چپ چاپ کھڑا رہے۔ دوسرے آدمی محض معدہ نہیں ہے کہ صرف جنس، غذا اور نیند کے خالص جسمانی اشغال اس کی تفریح اور تسکین کے لیے کافی ہوں۔ بلکہ اس کو ضرورت ہے ذہنی و قلبی توجیہات کی جو اس کی روحانی بشاشت کا سامان کر سکیں اور ذہنی و قلبی تفریحات ہی کے طور پر وسائل کا نام ہے فنون لطیفہ، جن سے انسان کے احساس میں لطافت، تسکین، جمالیت اور اس کے اندر چھپے ہوئے مسرت کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اس طرح فنون لطیفہ بھی انسان کی تہذیب نفس کا کام کرتے ہیں جو اپنی معیشت کے کھردرے کاموں میں تھک کر اپنے نفس کو طرح طرح کی الجھنوں میں ڈالتا رہتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ ذہن میں حاضر رہنا چاہیے کہ کھیل اور کام انسان کے دو بنیادی و فطری اشغال ہیں جن میں انسان بیک وقت پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک تیسرا عنصر بھی ہے جو انسان کی زندگی کا اور یہی وہ عنصر ہے جو انسانی کام کرتا ہے اور جس کے دو زاویے ہیں کھیل اور کام۔ اس مرکزی عنصر کو ہم جو نام بھی دیں اس کا مفہوم ہوگا مقصد زندگی۔ چنانچہ کام اور کھیل کی ساری تمدنی و تہذیبی اہمیت اسی مقصد زندگی سے وابستہ ہے۔ اور یہی وہ مقصد ہے جو افعال انسانی کے دونوں پہلوؤں کو مقصدیت اور سنجیدگی کی ایک لڑی میں پرو کر زندگی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اس مرکزی عنصر سے بھی انسان کی کچھ دلچسپیاں اور اشغال وابستہ ہیں جن پر مختصر کام ممکن نہیں۔ بس اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ ادبیات، دینیات، فلسفہ، تاریخ وغیرہ علوم اسی دائرے سے متعلق ہیں اور یہ کہ یہی علوم کام اور کھیل کے تمام حرکات و سکنات پر فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں اور ان کی رہبری کرتے ہیں۔

کام اور کھیل کا مفہوم، ان کی مقصدیت اور ان کے درمیان توازن پیدا کرنے والے جوہر انسانیت کی تشریح کے بعد اپنے آپ واضح ہو جاتا ہے کہ فنون لطیفہ خاص کر ادب میں اخلاق کا کیا مقام ہے۔ اور یہ کہ اخلاق کا مطلب تہذیبی اقدار ہے۔ انفرادی عادات و خصائل اور سماجی رسوم پر بھی اخلاق کا اطلاق ہوتا ہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ اخلاق کی اصل روح یہی شکل ہے جس کو اصطلاحاً اخلاقیات کہا جاتا ہے اور اخلاقیات تہذیب انسانی کے اس نظام اقدار کو کہتے ہیں جس پر حیات کی تمام سنجیدگی اور بالیدگی مبنی ہے۔ یہ نظام اخلاق ہی ہے جو عالم انسانیت کے سارے ذہنی میلانات اور عملی رجحانات کی تعیین، تنظیم اور رخ [illegible] کرتا ہے۔ اسی کی مساعدت میں افراد کی سرگرمیاں انسانیت کو عروج و ارتقاء کی طرف لے جاتی ہیں۔ اخلاقیات دراصل ذہانت کے جوہر سے [illegible] انسان کی طلب [illegible] کرتی ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اخلاقیات سے بیگانہ ہو کر اپنی ذہانت و صلاحیت کا جادو جگاتے ہیں وہ [illegible] کی غارت گری اور تباہی کا سامان کرتے ہیں۔ فنون لطیفہ اور ادبیات اگر اخلاقیات سے خالی ہوں تو وہ بے جان ہی نہیں [illegible] بھی جمالیت اور فنیت کی ساری باتیں ایک [illegible] سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتیں بلکہ اس غبارے کے برابر ہیں [illegible] ادبیات [illegible] یہ سب یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ انسانی اشغال خواہ ان کے لطیف و [illegible] [illegible] ہو کر عالم انسانیت کے لیے [illegible] زہرناک اور [illegible] مضر ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ [illegible] [illegible] سے باہر ہو کر کسی فعل کا کوئی اصل مفہوم ہی نہیں رہ جاتا ہے۔ بلکہ ایسی حالت میں [illegible] [illegible] اخلاق تہذیبی اقدار کا عملی پہلو ہے لہٰذا اس سے عاری ہو کر [illegible] باقاعدہ دوسری مخلوقات کے امتیاز و شرف ہی ختم ہو جاتا ہے۔ آخر تہذیب سے الگ ہو کر انسان ہے بھی کیا۔

اس طرح ادب میں مقصد کا تعلق ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ جہاں مقصد ہوگا، وہاں اخلاق اپنے آپ آ جائے گا۔ اخلاق اور مقصدیت دونوں سے الگ ہو کر [illegible] مقصد اور اخلاق دونوں کا تعلق [illegible] اور سنجیدگی کے اوصاف سے

اور اخلاقی مقصدیت ان ناگزیر اوصاف انسانیت اور اقدار تہذیب کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں اخلاقی مقصدیت کو بعض ناقدوں نے اعلیٰ درجہ کی "سنجیدگی" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اس سلسلے میں تعبیر کے اور بھی بہتر سے بہتر انداز اختیار کیے گئے ہیں مگر سب کا مفہوم وہی ہے جس کو میں نے "اخلاقی مقصد" کے وابستگان فقرے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں صرف اخلاق یا صرف مقصد کہنا بھی کافی ہوتا جیسا کہ بعض دوسرے ناقدوں نے لکھا ہے۔ لیکن آج کے دور ابہام و اہمال میں بات کو زیادہ سے زیادہ واضح اور محکم شکل میں پیش کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال ادب میں اخلاقی مقصد کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب کے دو بنیادی اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں ایک اس کا موضوع اور دوسرا اس کی ہیئت۔ جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے [illegible] وہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک جمالیاتی اور تکنیکی چیز ہے اور اس لیے اصلاحی مقصد اور اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہے [illegible] لکھنے والے پر لازم ہے۔ لیکن موضوع تو ایک سراسر فکری عنصر ہے اور یہ موضوع ہی کی خاصیت ہے [illegible] چنانچہ موضوع [illegible] مقصد اس لیے اخلاق کا حامل ہوگا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اخلاقی مقصد [illegible] اس مقصد سے بغیر اپنے وجود میں بھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں [illegible] بات کو مسلمات میں ہونا چاہیے تھا کہ ادب اور اخلاقی مقصد باہم پیوستہ ہیں [illegible] ادب [illegible] اخلاق سے باہمی ربط سے متعلق اختلافی بحثوں کے لیے [illegible] مثال [illegible] چند معروف عنوانات [illegible] بار بار [illegible] رہا ہے ان مباحث میں دو موقف اختیار کیے [illegible] ادب سے [illegible] مقاصد [illegible] ان کی مطابقت کا کوئی سوال نہیں [illegible] سوال [illegible] ہے اور اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں [illegible] انسانی مقاصد سے اس کا جدا ہونا [illegible] آپ شیدائی [illegible] ہے کہ دونوں کے نزدیک ادب [illegible] تجزیہ عناصر کے لیے اس طرح کا خط امتیاز کھینچتے ہیں [illegible] چنانچہ تخلیق کے سلسلے میں [illegible] مواد و ہیئت اور موضوع و اسلوب دونوں [illegible] کی قوت [illegible] دونوں ایک ہی [illegible] وحدت کے [illegible] عناصر [illegible] پیوستہ ہیں [illegible] دوسرے کے ساتھ [illegible] بغیر [illegible] ہیئت کی [illegible]

بلکہ فن اور ہیئت کا یہ لازمی تعلق موضوع کے تابع پڑھتا ہے۔ ایک فنکار کی پیش کردہ ہیئت کی مخصوص تراش اس کے ذہنی رویے سے بھی ترتیب پاتی ہے۔ ہر ادیب کا اسلوب خواہ اس کے اسلوب فن کا انطباق ہوتا ہے مخلوق خالق کے رنگ میں رنگی ہوئی سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] اور بہت سے [illegible] طور پر منتقل ہونے کے باوجود ہر ادیب کے ساتھ اس کی شخصیت کا انداز بدل جاتا ہے۔

اس طرح فکر [illegible] کا ایک [illegible] موضوع سے اور اس میں تغیر کو اولیت حاصل ہے۔ لیکن اس کا مفہوم یہ لینا صحیح نہیں ہے کہ فکر ہی سب کچھ ہے اور فن کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ فکر کے لیے فن کو قربان بھی کیا جا سکتا ہے۔ بالعموم جو لوگ ادب اور سماج کی باتیں اشتراکی تحریک کیا کرتے ہیں وہ ادب کو [illegible] ایک ذریعہ [illegible] بنا کر رکھتے ہیں اور ادب کی قیمت پر سماجیت کو ابھارتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ادب کو [illegible] بنا دیتے ہیں [illegible] جذبات [illegible] کا کام لیتے ہیں۔ چنانچہ زندگی کے دوسرے [illegible] کی طرح ادب بھی [illegible] بند [illegible] ہیں [illegible] فنکاری اور حسن کاری کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور [illegible] سیاسی و سماجی [illegible] کا [illegible] دیا جاتا ہے [illegible] ادب [illegible] وہ اس مخصوص جسمانی صحت مندی کا حامل ہو جو ان کی [illegible] سے [illegible] خارج [illegible] ادب [illegible] کسی طرح صحیح نہیں [illegible] افادیت [illegible] طور پر [illegible] انسانی مشغلے میں [illegible] ہیں [illegible] ادب کے مختلف دائرے ہیں اور ہر دائرے میں افادیت کا انداز اس دائرے سے [illegible] ادب سے [illegible] ادب میں افادیت کو [illegible] ہونا چاہیے [illegible] قیمت پر [illegible] ادیب یا ادب کا [illegible] ادب کی [illegible] اور [illegible] حقیقت [illegible] ادب میں [illegible] نہیں [illegible] کا جہت [illegible] کیا [illegible] کہ جہاں [illegible] کا تعلق ہے [illegible] یہ چیز عام طور پر پائی جاتی ہے [illegible] اختلاف [illegible] رشتہ ابھی [illegible] ہے۔ چنانچہ [illegible] ادب میں [illegible] اعتبار سے [illegible] ترتیب [illegible] ہیں [illegible] بھی شامل [illegible] کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا [illegible] منضبط نظم [illegible] نہیں [illegible] ادب کی [illegible] ممکن نہیں ہوتی [illegible] ادب میں [illegible] ایک [illegible] شکل ہے۔ میں سمجھتا ہوں [illegible] نظریے کے بغیر [illegible] جیسا کہ بالعموم [illegible] کہ ادب کے اندر [illegible] کو ادب کے باہر [illegible] عجیب قسم کا تضاد [illegible] سے [illegible] کے متعلق مغالطہ [illegible] ہے۔ جہاں تک ہیئت اور فن کا تعلق ہے نظریہ [illegible] موضوع کے بغیر [illegible] ہو سکتا مگر بہرکیف موضوع [illegible] نہیں ہے [illegible] موضوعات [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] ہے وہ [illegible] ہے [illegible] جہاں ایک [illegible] ایک بات ہے [illegible] بات ہے کیونکہ [illegible] کے تعلق فن کا [illegible] ہے اس طرح [illegible] ہیئت کی [illegible]

ہی بندش سے بالا ایک عنصر ہے۔ بلاشبہ یہ مواد ہی ہے جو انداز نظر کو ہیئت پر اثر ڈالنے کا موقع و وسیلہ فراہم کرتا ہے لیکن بہرکیف مواد اور انداز نظر کے درمیان ایک فرق ہے۔ ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ نظریے کی طرح انداز نظر بھی خارج سے ہیئت فن پر اثر ڈالتا ہے۔ جب کہ مواد [illegible] باہمی ترکیب کے سبب انداز نظر بھی [illegible] ہیئت فن کی ترتیب کے لیے ایک ناگزیر عنصر ہے جب یہ صورت حال ہے تو ہیئت کے پہلو سے نظریہ اور انداز نظر کے درمیان کوئی تباین نہیں، دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر نظریہ اور انداز نظر کے درمیان وجہ امتیاز کیا ہے۔ نظریہ ایک منظم فکر ہے اور انداز نظر صرف ایک فکری رویہ [illegible] نظریہ ایک باضابطہ نظام فکر کا سرشتہ ہے اور انداز نظر بس انداز [illegible] نظریہ اس وقت قائم ہوتا ہے جب تمام متعلق کائنات اور [illegible] حیات پر تفصیل و تعمق کے ساتھ غور و فکر [illegible] ایک جامع فلسفہ زندگی مرتب کیا جاتا ہے اور انداز نظر اس فلسفہ زندگی کا ایک حوالہ اور [illegible] کی طرف ایک اشارہ ہے۔ اس طرح [illegible] نظریہ اور انداز نظر [illegible] تفصیل اور اجمال کا [illegible] جب بات یہ ہے تو پھر انداز نظر [illegible] کے نظریے سے اجتناب [illegible] میں [illegible] بالاتمام حقائق کو اپنے [illegible] تو خیال ہے کہ [illegible] فلسفہ زندگی [illegible] حوالہ و اشارہ [illegible] کی طرف [illegible] سیدھی بات یہ ہے کہ [illegible] انداز نظر [illegible] نظریہ [illegible] ہوتا ہے [illegible] پہنچا ہو۔ اس شخص کا انداز نظر [illegible] نظریہ [illegible] ادب میں [illegible] جلوہ دکھائے تو یہ [illegible] ادب میں [illegible] ساتھ [illegible] اظہار میں ہو جائے گا۔ [illegible] اگر یہ کہا جائے کہ ادیب کے پاس [illegible] نظریہ [illegible] ادب میں [illegible] انداز نظر [illegible] ادب [illegible] سے قبل نظریہ اور [illegible] انداز نظر [illegible] کیا جاتا ہے۔

[illegible] درمیان [illegible]

سوچنا چاہیے کہ انداز نظر [illegible] ادب کا [illegible] نہیں۔ [illegible] ادب [illegible] شش ہو۔ [illegible] ادب میں نظریے کا وجود [illegible] حقیقت [illegible]

لیکن یہ سوال بہت اہم ہے کہ ادب [illegible] ہے [illegible] مختلف [illegible] ہیں اور [illegible] کچھ [illegible] خصائص ہیں [illegible] ایک شخص [illegible] زندگی [illegible] میں [illegible] تو اس [illegible] مخصوص ضوابط و قواعد کو ملحوظ رکھنا [illegible] ایک [illegible] کے ساتھ ملحوظ رکھ [illegible] ادب کا [illegible] ضوابط و قواعد [illegible] ادب [illegible] اپنی ایک مستقل حیثیت ہے اور اس [illegible] اصناف ہیں [illegible] ادب [illegible] اصناف ادب میں داد تخلیق دینے کے لیے [illegible] جذبہ تخلیق کے علاوہ [illegible] صورت [illegible] مناسبت [illegible] وقت [illegible] ایسا [illegible] ہے جس کو [illegible] ادب کی اپنی جمالیات ہیں اور اپنی اخلاقیات

کو ادب بعض کسبیہ ان جمالیات سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا۔ ادب میں کوئی بھی مقصد ان جمالیات سے صرف نظر کر کے نہیں برتا جا سکتا۔ کوئی بھی نظریہ ادب کے اندر اسی وقت راہ پا سکتا ہے جب وہ جمالیات ادب میں پیوست ہو چکا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ نظریہ اور ادب کے درمیان باہمی پیوستگی کی صورت کیا ہو؟ میرا خیال ہے کہ ادب کے اجزائے ترکیبی تو موضوع و اسلوب ہیں اس لیے نظریہ محض ادب نہیں ہو سکتا۔ لیکن جس طرح زندگی کے دوسرے دائروں میں نظریے کی بالیدگی گرچہ ناگزیر حیثیت ہوتی ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی نظریے کا اثر رد عمل ایک بلند تر سطح سے ہی ہوگا اور یہ نہیں ہوگا کہ نظریہ اور ادب میں سے کسی دو اپنی ہستی بالکل ختم ہو جائے اور ایک بالکل نئی تیسری چیز پیدا ہو جائے۔ ایک تو کوئی نظریہ صرف ادب کے لیے نہیں ہوتا۔ اس لیے فقط ادب ہی تک محدود ہونے کا امکان نہیں۔ دوسرے ادب کی نوعیت کو بھول کر ادب کی بات ہی نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا اپنی اپنی جگہ نظریہ نظریہ ہے اور ادب ادب۔ یعنی ادب کو اپنی تکمیل کے لیے نظریے کی ضرورت ہے اور نظریے کو اپنی تکمیل کے لیے ادب کی بھی ضرورت ہے اور یہ باہمی ضرورت محض نظری بات نہیں کی جا رہی ہے۔ ان حقائق کو نظر میں رکھ کر ادب اور نظریے کا رشتہ اور تبادلہ آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ اب دونوں کی باہمی پیوستگی کا انداز یہ ہوگا کہ جو شخص ادب کی تخلیق میں کمال پیدا کرنا چاہے گا وہ زندگی کے ایک نظریے کا حامل ہوگا اور ساتھ ہی بحیثیت ادب کے لوازم و رموز سے صرف آگاہ نہیں بلکہ ان کے برتاؤ میں ماہر ہوگا۔ علاوہ بریں وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ نظریہ اور ادب کا امتزاج کس توازن کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ایسا شخص جب تخلیق ادب کے لیے اپنی فاروہ میں بیٹھے گا تو اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ نظریے کی بجلیاں اس کے رگ و پے میں دوڑ رہی ہوں گی اور ادب کے شعلے اس کے جوہر استخواں سے اٹھ رہے ہوں گے۔ ایسی صورت میں نظریہ نظریہ اور ادب ادب رہتے ہوئے بھی تخلیقی عمل تخلیق کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ مدغم ہو جائے گا۔ اس شان سے کہ فنکار تو فن کی تراش خراش میں ہمہ تن مصروف ہوگا اور نظریہ اپنے آپ اس کے باطن سے اچھل کر اور تخیل کی ریزش کے ساتھ فن کے تار و پود میں اترتا اور سماتا چلا جائے گا۔ یہ کیفیت کوئی محض گفتگو اور خلوص فن سے تعبیر کر دیں گا۔ کسی نظریے کا دخل ہو اور کس حیثیت ادب کا عمل ہو، فن کار کے اندر اگر خلوص ہے اگر اس نے اپنے فن کے لیے ریاض کیا ہے اور اس پُرخلوص ریاض کے نتیجے میں سوز و گداز کی دولت ہاتھ آگئی ہے تو نظریہ اور ادب کا متوازن امتزاج اپنے آپ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک نظریے کا تعلق ہے وہ تو ہر شخص کی شخصیت میں کار فرما ہے۔ چنانچہ یہ شخص زندگی کے جس دائرے میں بھی کام کرے گا اس کے نظریے کا اظہار اپنے آپ اس دائرے میں اس کے آداب کے مطابق ہوگا۔ اس لیے ادب میں قصداً نظریے کو داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بلکہ نظریہ بہ لطف حیثیت ادب میں نافذ ہو جائے گا۔ لہٰذا ایک صاحب نظریہ ادیب تخلیق ادب کے وقت اپنی تمام تر توجہ ترکیب ادب پر ہی مرکوز رکھے گا۔ اس طرح جو تخلیق بروئے کار آئے گی وہ ادب کے سانچے میں ڈھلی ہوگی۔ ساتھ ہی یہ تخلیق کسی نظریے کی حامل ہوگی۔ فن کا شہ پارہ کوئی بے جان اشتہار نہیں ہوگا، یہ ایک زندہ وجود ہوگا جو اپنے پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوگا۔ یوں ادب میں اخلاقی مقصد کا حصول بالکل فطری اور خالص ادبی انداز میں ہوگا۔

جدید بنگلا افسانے

وفا راشدی

ہمارے قلم کاروں نے ہر موقع اور ہر تقاضے کے مطابق تمام اصناف ادب کو سنوارا اور نکھارا۔ اصناف ادب میں ہر چیز از علم و زندگی اور حیات و کائنات کے رشتے سے قریب تر رہتی ہے وہ صنف افسانہ ہے۔ انسان کی کاوش، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی، ماحول و معاشرے کی رنگینی و تاریکی کی ترجمانی و عکاسی جس طرح سے افسانوی ادب میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور صنف میں نہیں پائی جاتی۔ مغربی پاکستان میں اردو افسانہ نگاروں اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ افسانہ نگاروں میں ایک نیا رجحان ایک نئی اٹھان پیدا ہوئی۔ اس رجحان نے اس فن لطیف کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کی نسبت بنگلہ افسانے زیادہ لیے گئے جس انداز سے بنگلہ ادب میں افسانوں کا اضافہ ہوا اس کی نظیر سے اس فن میں ترقی، وسعت و رفعت پیدا ہوئی۔ ان افسانوں میں نئے نئے تکنیک، نئے نئے تجربات کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کی دیہی اور شہری زندگی سے متعلق تمام عناصر و عوامل کو نہایت چابکدستی سے پیش کیا گیا۔ بلاشبہ اب بنگلہ فن افسانہ اس منزل پر ہے جہاں دوسری زبانوں کے معیاری افسانے نظر آتے ہیں۔

افسانہ نگاروں کا وہ گروہ جس نے تقسیم ہند سے پہلے لکھنا شروع کیا تھا اور خصوصاً آزادی کے بعد نمایاں ہوا، آزادی کی مسرتوں سے سرشار ہوا تھا۔ ان میں معروف نمایاں افراد کی انفرادی ترقی سے نئے گروہ ابھرے۔ ایک ایک فرد پر مختلف افسانہ نگار۔ جو ذمہ داریاں عاید ہوئیں ان سے روگردانی ذرا بھی ممکن نہ تھی۔ پہلا اول سے یہ عنصر رہا تھا۔ قومی خدمت، سیاسی رجحانات اور زندگی سے تعلق رکھنے والے تصورات رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں عمل و حرکت، سماجی مسائل، تہذیب و تمدن اور معاشی خصوصیات کی جھلکیاں ملتی ہیں اور ساتھ ہی خوش آئند مستقبل کی نوید بھی ملتی ہے۔ علاوہ ان کے ڈاکٹر ابوالکلام شمس الدین، بسیول محمد ہدایت اللہ کی دوست ... ابو المنصور احمد کی ... محبوب ... شمس الدین کی ... اور پرنسپل ابراہیم خاں کی ... افسانے میں شک ہی نہیں ... ہیں۔

... جدید بنگلا ... افسانوں ... چند لفظ یا چند سطروں میں ان کے تفصیلات کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

پرنسپل ابراہیم خاں نقاد، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ممتاز ہے۔ ایک دھندلا سا عکس ہے اس تیسری نسل سے تعلق رکھتے ہے۔ ... ان کے کرداروں جو ... سے حرکت اور ... نظر آتے ہیں ... دکھائی دیتے ہیں۔ کردار ... کو ... سمجھتے ہیں

پیش کرنا، ان کے خیالات و جذبات کو صحیح روپ دینا، ابراہیم خاں کے فن کی خصوصیات ہیں۔ ابراہیم خاں میمن سنگھ کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے اس لئے بالخصوص میمن سنگھ ہی کے لوگوں کی زندگی کی جھلکیاں بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔ "نشو پیارا"، "تکمی چھاڑا" اس کے شاہکار افسانے ہیں۔

نئی نسل کے جن افسانہ نگاروں نے اصلی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے بنگلہ افسانوں کو نئے نئے موضوعات اور نئے نئے اسلوب سے آشنا کیا، تفسیر حیات اور تصویر زندگی کی مختلف نوعیتوں اور متنوع رنگ سے پیش کیا ان میں شمشیر حیدر دین، علاؤالدین الآزاد، جمیل الدین ابوالفضل، سکندر ابو جعفر، شوکت عثمان، ابوالکلام شمس الدین، معین الدین، سید ولی اللہ، ابو ظفر شمس الدین، نجیب الدین احمد، ابو رشد، اطوار رحمن اور اشرف صدیقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عہد حاضر کے ان بنگالی افسانہ نگاروں نے مغربی افسانوں کے مطالعہ اور استفادے کے باوجود کوئی نقطہ اثر قبول نہیں کیا اپنی زبان کی شائستگی اور جمالیات افروز صنف کو مغربی اثرات کی بے راہ روی سے محفوظ رکھا۔ انہوں نے تقلید کے بجائے اپنے مسائل اور اپنے وطن کے رسم و رواج کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے نئی نئی راہیں نکالیں۔ ان کے افسانوں میں حقیقت، صداقت اور واقعیت کے ساتھ ساتھ جذبہ و احساس کا بھرپور رچاؤ ملتا ہے۔ یہ رجحانات آزادی سے قبل تو نشوونما پا رہے تھے لیکن نئی نسل کے افسانہ نویسوں کو اپنی صلاحیتیں منظر عام پر لانے کے لئے وہ مواقع حاصل نہ تھے جو آزادی کے بعد حاصل ہوئے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں کو خصوصیت سے ہندو مسلم فسادات پر ایک نیا موضوع ہاتھ آیا اور اس موضوع پر جب جو کہتی سے [illegible] نے انسانیت و بربریت انسانی جبلت اور جذبات کی بڑی ہی تصویریں پیش کیں اس سے ان کے فن سے دلچسپی اور موضوع سے انصاف کا پتہ چلتا ہے۔ اردو کی نسبت بنگالی میں فسادات پر بہت کم افسانے لکھے گئے لیکن جو بھی لکھے گئے وہ افسانوی ادب میں قابل قدر اضافہ اور ایک مخصوص دور کا آئینہ دار ہیں۔

شمشیر حیدر جیسے تیز رو، تند قلم اور ذہین افسانہ نگار کا اصل جوہر کلکتہ سے مشرقی پاکستان تک ہجرت کے کئی دنوں سے بعد کھلا۔ کلکتہ، بہار اور نواکھالی کے فسادات کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا دل میں جذبات و خیالات کا ایک طوفان سا کر آیا اور بے پناہ لکھنے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے اپنی مؤثر و پرکشش تحریروں سے عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ مختلف افسانوں کے علاوہ اس کے کئی مجموعے افسانے ناول کی شکل میں منظر عام پر آئے جنہوں نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ ان میں تارا اور جھنکار، وفا اور پھول، بے ایمان، رکشا والا، بوڑھی گنگا، پرکھے، [illegible] نامی افسانے اور ناول پاکستان کے موجودہ انقلابی کشمکش اور تغیراتی نظام حیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ راقم الحروف نے شمشیر حیدر دین کے ایک ناول "بے ایمان" کو اردو میں منتقل کیا ہے جو عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے۔

مشرقی پاکستان کی اکثریت افلاس و غربت کی آغوش میں پروان چڑھتی ہے۔ مفلسی و بے چارگی ان کا مقدر بن چکی ہے کتنے ہی لوگ ہیں جو بھوک اور افلاس کے سائے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے بعض افسانہ نگاروں کے افسانوں کے چاند سورج کے اسی طبقے سے متعلق تشکیل پاتے ہیں۔ علاؤالدین الآزاد کی چھتری اور جمیل الدین کی ڈاکٹر مدثر کی

بہترین مثالیں ہیں ۔

'چھتری' ایک ایسے مجبور و بے بس انسان کی کہانی ہے جس کے پاس صرف ایک ہی چھتری ہے مسلسل بارش میں صرف ایک چھتری اس کے اور اس کے بچوں کے لئے کافی نہیں اس کی مالی حالت اس قابل بھی نہیں کہ وہ دوسری چھتری خرید سکے۔ اس کے پاس اسکول کی فیس کے پیسے بھی نہ تھے اسے فکر تھی کہ بارش کے دوران اسکول بھیجنے کے لیے دوسری چھتری کا انتظام کہاں سے کرے یہی غم اسے کھائے جا رہا تھا لیکن وہ بھی بے بس تھا اور اس کی بیوی بھی مجبور تھی ۔ آخر کار یہ بے بسی یہ بے چارگی بیماری بن گئی کہ اس کی جان لے کر رہی ۔ سفر د I

صفحہ I ۔ محی الدین نے 'دائرہ' افسانے میں ایک آدمی کی مشینی اور بے رنگ روزمرہ زندگی کو پیش کیا ہے ۔ یہ ایک مجبور شخص کی جیتی جاگتی کہانی ہے جسے مسرت کی تلاش ہے سکون کی تلاش ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن ماحول کی ناسازگاری نے اس کی زندگی اجیرن کر دی ۔ اس بھری دنیا میں کسی نے اس کے ساتھ ہمدردی نہ کی ۔ پھر بھی وہ زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔

'سڑک' ابوالمعالی شمس الدین کا مشہور افسانہ ہے اس میں گاؤں کی ایک سڑک [illegible] ہے ۔ اس نے بڑے خلوص سے گاؤں سے شہر تک ایک سڑک تعمیر کرائی [illegible] ۔ گاؤں کی ترقی [illegible] ۔ اب گاؤں والوں کو [illegible] اناج وغیرہ شہر لے جانے میں بڑی آسانی ہو گئی ۔ گاؤں [illegible] میں اضافہ ہو گیا ۔ کسی نے اس کا احسان نہ مانا ۔ اس کے برعکس وہ گاؤں والوں کے [illegible] اور بے اعتنائی کا مرکز بنا رہا ۔ لوگوں کی اس روش سے اس کے دل پر گہرا اثر ہوا ۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سڑک کو دیکھ کر کبھی مسکرا دیتا اور کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ۔ [illegible] ابوالمعالی شمس الدین کا فنی اعتبار سے دلچسپ اور [illegible] افسانہ ہے ۔

صفحہ ۲ I [illegible] الدین [illegible] افسانے [illegible] میں [illegible] رکھتا ہے [illegible] وہ بھی [illegible] وقت اپنے آپ [illegible] ہوتا ہے ۔ [illegible] افسانے [illegible] روپ میں اس کے سامنے [illegible] بھوک [illegible] اس کے [illegible] افسانے میں [illegible] زندگی کی [illegible] دور کی [illegible] اور [illegible] پیدا ہونے والے [illegible] اور بھر پور زندگی کی [illegible] اس کے افسانوں میں [illegible] توانائی کے ساتھ پائی جاتی ہیں ۔ [illegible] لیا اور [illegible] صفحہ م

[illegible] ہیں اور [illegible] پر ان کی عزت آن اور خودداری کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں ۔ اس کی مثالیں ابوالفضل کے افسانے 'شریف' اور [illegible] ابو جعفر کے افسانے 'اصول کی خاطر' میں ملتی ہیں۔

'شریف' کا ہیرو [illegible] داخل ہو گیا تھا اور [illegible] کے قابل نہیں رہا تھا ۔ باپ

کی ضد پر اس کی بیوی سہاگ رات کے وقت اسٹیشن پار جانے کے لیے پتے پہننے پر مجبور ہوئی۔ حالانکہ سلطان نے کہا تھا: اب رات کے وقت کون دیکھتا ہے: لیکن سہاگن آخر کار سڑک پار کرتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ تاریکی میں بڑے میاں کے ہاتھ سے ہر چیز مس ہوئی وہ خون کے لوتھڑے کے سوا کچھ بھی نہ تھی:

"اصول کی خاطر" گاؤں والے صمد کے خلاف اس لیے ہو گئے تھے کہ وہ ہر بچے اور با اصول آدمی کی حمایت اور مدد کیا کرتا تھا۔ ایک دن گاؤں کے کچھ لوگ اس کے باپ کو مارنے کے لیے چھپے ہوئے تھے کہ شمشیر بیچ میں آ گیا۔ شمشیر کے سر پر ایک ساتھ دو تین لاٹھیاں پڑیں وہ لاٹھیاں جو صمد کو مارنے کے لیے اٹھائی گئی تھیں شمشیر نے آنکھیں کھولیں اور صرف اتنا کہہ پایا "بپ جان معاف ...!" وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ گھر پر شمشیر کی لاش آئی تو اس کی ماں اس منظر کی تاب نہ لا سکی۔

صمد صاحب خاموش تھے۔ پھر خود ہی بڑبڑا کر بولے۔

"دوست سا کھو دیا۔ دوست۔ میرے بیٹے نے اپنا رکھ لیا۔ میرے بیٹے نے ان اصولوں کو ٹوٹنے نہ دیا جن کے لیے میں نے زندگی بھر جدوجہد کی۔ دوست۔ میں نہیں روؤں گا۔ ہم میں سے کوئی نہیں روئے گا۔"

شوکت عثمان اردو کا ادیب ہے اور افسانہ نویس بھی۔ اس کے دو ناول 'زبیدہ' اور 'بنی آدم' کے علاوہ افسانوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔ شوکت کے افسانوں میں 'بڑو آپا'، 'عباس گل'، 'یوز'، 'سابق کہانی'، 'عمر' وغیرہ بہت اچھے افسانے ہیں۔ 'ماہ نو' اور 'غنوامال' میں اس کے افسانے چھپتے رہتے ہیں۔ معاشرے کی مزدوریوں اور عوام کی ذہنی پستی کو فنی خوبیوں کے ساتھ پیش کرنا شوکت عثمان کا کمال ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بنگلہ اکیڈمی ڈھاکہ نے شوکت عثمان کے منتخب افسانوں کا ایک خوبصورت مجموعہ اردو میں شائع کیا ہے۔

سید ولی اللہ مشرقی پاکستان کی مسلم زندگی کی الجھنوں اور وہاں کے باشندوں کی ذہنی کیفیت کی ترجمانی بڑی چابکدستی سے کرتا ہے۔ 'لال شالو' اور 'کانا ماچاند' اس موضوع پر بہترین طویل افسانے ہیں۔ 'کانا ماچاند' میں دیہات کے ایک معمولی گھرانے کی روزانہ زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو نہایت صفائی سے پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ انسان کس طرح جیتا ہے۔

'لال شالو' میں ایک مولوی صاحب کی ذہنی کشمکش اور ریاکاریوں کو جس انداز میں بے نقاب کیا گیا ہے وہ نام نہاد اسلام پرستوں کا پردہ چاک کرتا ہے۔ دراصل ولی اللہ کی حقیقت نگاری ہی اس کے فن کا حقیقی حسن ہے اور یہی اس کے دوسرے مختصر افسانوں 'شتد ریکش'، 'تیرہ'، 'تین تارہ'، 'ایکتی تلسی گاچھیر کاہنی' میں پوری رعنائی اور رنگینیوں کے ساتھ ابھر آیا ہے۔ ولی اللہ کے افسانوں کے دو مجموعے 'تیمیر' اور 'دو تین تیر' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

علاؤالدین الآزاد ان فنکاروں میں سے ہے جن کو بیک وقت اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ وہ ایک شاعر، نقاد، اچھے مترجم، مقالہ نویس اور افسانہ نگار ہیں۔ اس کے متعدد افسانے بنگلہ ادب کے گرانقدر سرمایہ ہیں۔ الآزاد زندگی کو اپنے ماحول اور گرد و پیش کے مطالعے کا بڑا شوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماحول و معاشرے کی عکاسی اس کے فن کی خصوصیت ہے۔ 'پرشنگ'، 'جولائی'، 'پیٹری'، 'دولی میرو'، 'شہید یاپا'، 'آسمان بدو جوناکی' اس کے مشہور افسانے ہیں۔ پھیلی پروسے اس کی وہ کہانی ہے جو افسانوی ادب ...

. . . مار کی جا سکتا ہے۔

اکبر حسین افسانہ اور ناول دونوں کا تخلیق کار ہے۔ [illegible] کے افسانے اور ناول دونوں معیاری ہیں۔ [illegible] کی [illegible] ۔ [illegible] جنا، [illegible] ناقابل فراموش افسانے ہیں۔

بنگلہ ادب میں طنز و مزاح بالکل نئی صنف ہے۔ اس زمانے میں لکھنے والے بھی بہت کم ہیں۔ اس اعتبار سے ابو رشدکو [illegible] حاصل ہے کہ وہ مزاحیہ مضمون بھی لکھتے [illegible] اور طنز و مزاح سے بھرپور افسانے بھی [illegible] اور جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے [illegible] رنگ میں اس کا حق ادا کر دیتا ہے۔ ابو رشد اپنی افسانوں کی [illegible] مسائل [illegible] رکھتے ہوئے سوسائٹی کی [illegible] اور طبقاتی کشمکش پر بڑے لطیف انداز میں طنز کرتا ہے۔ [illegible] امیر و غریب [illegible] نے کرد اصلاحی [illegible] ہمارے معاشرے میں امیری غریبی کے امتیاز اور کشمکش کی [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] کے پرمزاح [illegible] وغیرہ [illegible] مزاحیہ افسانے ہیں۔

منظور حسین بنگالی ادب کا منفرد فن کار ہے۔ افسانہ نویسی [illegible] مشہور ہے۔ [illegible] کم لکھے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

شمس الدین ابو الکلام [illegible] افسانہ نگاروں [illegible] ذکر پہلے آ چکا ہے [illegible] افسانوی تکنیک سے خوب واقف ہے [illegible] ناقد [illegible] اس نے بڑے خلوص [illegible] ہے [illegible] اور [illegible] اس کے منتخب افسانے [illegible] خصوصیات [illegible] ہیں۔

ان سے علاوہ [illegible] کے طویل افسانے [illegible] شاہد [illegible] علاوہ ابو جعفر [illegible] حبیب نے [illegible] رنگ [illegible] کے پیچھے [illegible] الدین نے [illegible] علاوہ ابو جعفر [illegible] الدین کے [illegible] حسین [illegible] اعتبار سے [illegible] افسانے ہیں اور بنگلہ ادب کا [illegible] ہیں۔

نئی نسل کے نوجوان افسانہ نگاروں [illegible] ابو الحسنات [illegible] شاہد علی، [illegible] چودھری [illegible] محنت اور خلوص کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے افسانوی تخلیقات سے [illegible] کر [illegible] سے بڑا [illegible] ہیں۔ [illegible] افسانوں [illegible] کے [illegible] حیثیت سے [illegible] ہے۔ ان میں قاضی [illegible] اور [illegible] شاعر [illegible] اور افسانہ [illegible] ہے اس میں [illegible] الدین سے [illegible] میں [illegible] رشتہ ہے [illegible] عوام کے [illegible] ۔ جدید [illegible] کے بعد جیسے [illegible] نے اسے زندہ [illegible] ہے۔

ابو الحسنات بہت جلد افسانوی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کر چکا ہے۔ ان کے افسانوں میں [illegible] ہے۔

کہیں کہیں رومانی تحریروں میں رومانیت ، سوار میں زندگی رومان دراں ، ان کے طور میں کشش و دلپذیری ہے ۔ نئی تکنیک نیا مثلیت وغیرہ اس کی نئی ہوئی مثبتوں منظر میں ۔ اس کے افسانے برجستہ و برنظریہ کے ساتھ لوگوں میں یکساں مقبول ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے افسانے حقیقت سے بہت قریب اور افسانے سے بہت دور ہوتے ہیں ۔ روزمرہ کے واقعات کو افسانوں کے سانچے میں ڈھال دینا ، چھپے ہوئے افسانوں کو افسانوں کے کردار کا روپ دے دینا ان کے فن کا کمال ہے ۔ انہوں نے اس کے کئی افسانے اردو میں پیش کئے ہیں جو ماہ نو ، اشتہارات وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں ۔

ابو اسحاق افسانوں سے دو قبرستے ہو با نگ اور باہم دنیا نے افسانہ کو پیش کر چکا ہے ۔ معاشرے کی اصلاح و تعمیر ان کی افسانہ نگاری کا اصل مقصد ہے ۔ اس نے ان افسانوں کی تصویر میں خوب رنگ بھرا ہے ۔ طبقاتی کشمکش اور اقتصادی الجھنوں کو افسانوں کے سانچے میں ڈھال دینا اس کا دلچسپ مشغلہ ہے ۔ اس کے نزدیک مزدوروں اور سرمایہ داروں میں کشمکش کی وجہ یہ ہے کہ مزدوروں کی پیشہ کی شناخت ہونے سے پہلے [illegible] کی ہوتی ۔ ان حالات میں دستکاروں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کھیتوں کو چلا کر اپنا گزر کرتے ہیں ۔ انسانی حقوق کا تحفظ تقاضے سے انسانیت سے دیانت ، حق گوئی ، ہمدردی ، انصاف اور رواداری وہ اوصاف ہیں جو انسانی اقدار ، قانون اور انصاف کی قدر کی ضامن ہیں ۔ ابو اسحاق کی کہانیاں مضمون سے بھرپور ہوتی ہیں ۔ ہر جو ان کے ہوتی ہیں ۔ اسی رنگ اور اسی انداز کی کہانیاں ہیں ۔

شاہد علی نے افسانوں میں سادگی سے اپنی آراء کی ، جیسے چٹان ، شادی ، سوتیلے ، دین برادری ، پرائی ، شادی افسانے ہیں ۔ پرائی شادی ان کا بہترین افسانہ ہے ۔ اس افسانے میں اس نے دو نسلوں کی زندگی کے نظریوں کو پیش کیا ہے ۔ والدین اپنے بچوں کو لڑکیوں سے شادی کرنے سے خوش ہوتے ہیں انہیں اپنے بچوں کا اندازہ نہیں ہوتا ہے ۔ دو بچوں نے ایک کھیل میں اس کی دلچسپی لیتے ہیں کہ ان کے ماں باپ جو اپنے اپنے حق میں اس کھیل کو بہت پسند کرتے تھے ۔ والدین اور بچوں کی نفسیات کو نہایت خوبصورت انداز میں DEAL کیا ہے ۔ شاہد کا کمال یہ ہے کہ اس کے افسانے بڑوں کے لیے جتنے دلچسپ ہیں ان میں بچوں کے لیے بھی اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے ۔

سید شمس الحق نے کئی افسانوں کی دنیا میں شہرت پائی ہے ۔ ایک رومانی افسانہ ہے اس کے نزدیک حسن ، محبت کی یہ قسمیں زندگی کو حسین بناتی ہے ۔ چوٹ کے تجربے سے اس نے ثابت کیا ہے کہ واقعی محبت کے بغیر زندگی گزر سکتی ہے ؟ ۔

جمیلہ چودھری جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں اسکی کہانیوں کا ایک مجموعہ "عمر بھر کی بے چینی" کے نام سے کافی مقبول ہوا ہے ۔ اور اس کے افسانے اور بے شمار مشہور افسانے ہیں ۔

احمد نذیر (لال مٹیا) ، وصی آزاد ، ادیب و ... سید ظفر الحق (چاند گل) ، چیلانی (ربوتی) ، علاؤ الدین خان جہانگیر (جو اپنی تحریروں میں ...) ، جمیلہ چودھری جیسے قابل ذکر افسانوں کے علاوہ ایک مجموعہ افسانوں کا ادب میں اضافہ ہے ۔ شکیلہ ایوب (جو ...) شہید صابر ایک قابل ذکر نام ہے اسی نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے ۔ افسانہ دیوار خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ

سعادت قادر، نگہت محل، نور العین، پرویز عالم، سید مقصود علی (ثمتی)، مرزا ادیب، شوکت ادیب، انیس چودھری، ادیب قزلباش، نصرت علی چودھری، نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ ان کے ہاں رومان کی نزاکتیں، حسن و محبت کے شدید جذبات بھی ہیں، زندگی کی تلخ و ترش حقیقتیں بھی لیکن ان کے افسانوں میں تکنیک کے رچاؤ اور فنی ارتقا کا فقدان ہے۔ ابھی ان میں وہ تخلیقی قوت پیدا نہیں ہوئی جو انھیں مشرقی پاکستان کے مقبول افسانہ نگاروں کی صف میں جگہ دے سکے۔

اوپر جن اہل فن اور اہل قلم کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ گزشتہ دس سال سے نئے نئے لکھنے والے سامنے آ رہے ہیں۔ جن میں ابھرنے کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں اور جن سے خوشگوار توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں شہید اقبال، شوکت علی، حسن عزیز الحق، میر ابوالحسین، ہمایوں قادر، انیس چودھری، بشیر الاسلام، جیوتی پرکاش، مرتضیٰ بشیر، ہونہار اور ذہین افسانہ نویس ہیں۔ نئے رجحانات اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ بعض ترقی پسند نظریے کے قائل ہیں اور بعض جدت پسند نظریے کے حامل ہونے کی بنا پر کسی قید و بند کے پابند نہیں۔ ان کی افسانوی تخلیقات میں رومانیت بھی ہے اور حقیقت بھی۔ نئی تکنیک بھی۔ موجودہ دور کے ترقی پسند اور حقیقت پسند رسائل و اخبارات مثلاً ماہِ نو، پاکستان، ... ، شعور، سوغات اور ... وغیرہ ان کے افسانے شائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب مستقبل کے معمار ہیں اور افسانوی ادب کی آئندہ عمارت انھیں معماروں کی مرہون منت ہوگی۔

معراجِ آدم

ادریس احمد خالد مینائی

اس نظم کے [illegible] میں شاعر نے [illegible] دوسرا [illegible]
[illegible] اور [illegible] تشنگی [illegible] تجربات [illegible]
تاکہ نظم [illegible] روشنی میں بھی [illegible] سکے۔ [illegible]

ہر شے میں ہر جہت میں ان کی نشانیاں ہیں
پھر بھی وہ پوچھتے ہیں ہم کون ہیں کہاں ہیں

اے اہلِ علم و دانش ہو لاکھ حشر برپا — فطرت کے راز اب تک انساں سے نہاں ہیں
تو بیں ہے نظامِ [illegible] پہ قادر — آئین اس کا محکم [illegible] ہیں
جب منتہی ہو منزل، جب یار منتظر ہو — طے کرتے ہیں کے قافلے منزل جو بےنشاں ہیں
کانوں میں گونجتی ہے اب تک صدائے دلبر — بتلائے کس نے آخر جو نام حرزِ جاں ہیں
آدم ہے اور بشارت تسخیرِ لامکاں کی — تھے پردۂ خفا میں گو تھے جواب عیاں ہیں
سکھلائے اس کو اسمائے اشیائے دو جہاں کے — مانند شمع سوزاں دل روشن و تپاں ہیں
اہلِ جنوں پہ کھولے وہ راز رفتہ رفتہ — جو غایتِ جنوں تھے جو غایتِ جہاں ہیں
ہے سوز ان کے دل میں اور سوز ان کی جاں میں — قلب و نظر میں چشمے عرفان کے رواں ہیں
ہمدرد کے پتلے، حسنِ عمل کے پیکر — روح و بدن میں ان کے زندہ تجلیاں ہیں

اب اُن کی آرزو ہو یا جستجو وہی ہے
جس کی تجلیوں سے کون و مکاں جواں ہیں

ہے اُس کے دیکھنے کو درکار چشمِ بینا
گھر گھر ہے طورِ سینا، گھر گھر تجلیاں ہیں

پڑتی ہے چشمِ بینا [illegible]
اُس پر عیاں مکان و اسرارِ لامکاں ہیں

اے کارسازِ فطرت اے [illegible]
عارف جو ہیں وہ تیری مدحت میں تر زباں ہیں

مخلوق تو سبھی ہیں جن ہوں ملک کہ آدم
انسان ہی کو لیکن درپیش امتحاں ہیں

ہم کر چکے ہیں اپنے جان و دل حوالے
ہر سمت تو ہی تو ہے، تیری تجلیاں ہیں

جاں کو ہوئی ودیعت جب تیری محبت
دیتا ہے دل شہادت [illegible] ہیں

جذبات پاک جان سینوں میں موجزن ہیں
[illegible] میں نہاں ہیں، کردار سے عیاں ہیں

اے جانِ حسن و خوبی [illegible]
[illegible] امتحاں ہیں

یا مشتِ خاک مجھ کو [illegible] دشت و صحرا
[illegible] ہیں

اس خاک داں سے اُٹھ کر تیری طرف چلے ہیں
[illegible] سلامت [illegible] آسماں ہیں

مغرور [illegible]
[illegible] ہیں

کیا دیکھتا ہوں اک دن صف بستہ ہیں دو عالم
[illegible] وقت آ گئے [illegible] بستیاں ہیں

عالم ہے اُن کے بس میں [illegible]
[illegible] ہیں

زیرِ نگیں ہیں اُن کے آفاق ہوں کہ انفس
[illegible] ہیں

ابلیس ہے اور اس کو [illegible]
[illegible] فغاں ہیں

اک ہوک سی ہے دل میں [illegible]
[illegible] زیاں ہیں

یوں جا رہے ہیں سوئے دل دار ہم کہ خالد — کونین ہم عناں ہیں، جبریل مہرباں ہیں
جچتے نہیں نظر میں، حور و قصور و جنت — آنکھوں میں بس رہے ہیں جلوے جو بیکراں ہیں
ہم کر چکے ہیں اپنی مرضی کو اُس کے تابع — اور آج کَانَ قَابَ قَوسَین کا نشاں ہیں

ہر شے ہمارے بس میں، ہم ہیں کہ اُس کے آگے
ایسے جھکے ہیں گویا سرِ زیبِ داستاں ہیں

استفسار

مشفق محترم۔ السلام علیکم

لاہور میں اس بار آپ کے دوران قیام مجھے قرآن حکیم کی [illegible] آیات کے متعلق تصریح طلب کرنے کا موقع ملا تھا۔ سبب اس استفسار کا دراصل ایک نظم تھا جو مرسل ہے۔ یہ نظم [illegible] کانفرنس کے جلسہ [illegible] کے موقعہ پر پڑھی گئی تھی۔

اس کا مرکزی خیال قرآن کریم سے مستعار ہے اور ہر قاری کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ قرآن کائنات کی [illegible] حصول علم و عمل صالح کی تاکید کرتا ہے اور انسان کو خلیفۃ اللہ قرار دیتا ہے [illegible] تسخیر کائنات [illegible] خود فطرت نے اٹھا رکھی ہے [illegible] معراج کو اس وقت پہنچتا ہے جب ایک طرف تو وہ صاحب تصرف ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اپنی مرضی کو بالکل اور پوری طرح اپنے خالق و مولیٰ کی مرضی کے تابع کر دے۔

[illegible] اس نظم میں مجرد خیال آرائی سے زیادہ ان پہلوؤں کو ملحوظ رکھا ہے [illegible] اب آپ ایسے عالم دین کی رائے سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں [illegible] قرآن میں ہے [illegible] معروف و مشہور فقرہ بھی اور جس کا [illegible] شعر [illegible]۔
[illegible] از راہِ شفقت بزرگانہ [illegible] کا شرف [illegible] بخشا جائے گا

[illegible] محمد حنیف خالد

الجواب

کرمفرمائے محترم دام مجدکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ نظم گرامی قدر شوق سے پڑھی۔ بحمد اللہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں [illegible] اور قرآن [illegible] نظر کے خلاف ہو۔ [illegible] ایک بات اپنے ذہن میں رکھنے کی یہ ہے کہ

قرآن کریم جو تدبر و تفکر فی الکائنات کی دعوت دیتا ہے اس کا یہ مقصود ہرگز نہیں کہ انسان تسخیر کائنات کی فکروں میں کھو یا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ تسخیر کائنات تو حق تعالیٰ نے انسان کے لیے اپنے ازلی فیصلہ کے مطابق کر دی ہے وہ ہو چکی ہے۔ البتہ تسخیر کائنات کا مظاہرہ اس دنیا میں دنیا کی ضرورتوں کے ماتحت روز افزوں ترقی پر ہے "مشہور مقولہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے" بالکل صحیح ہے۔ جوں جوں دنیا کو کسی نئی ایجاد کی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس زمانے کے لوگوں کے قلوب اس طرف متوجہ کر دیتے ہیں اور کائنات کی مسخر کردہ قوتوں میں سے کام لینا اس نئی ایجاد کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ مظاہر تسخیر کائنات کے مظاہر ہیں ہر دور کے اندر جدید اضافے ہوتے رہتے۔ قرآن کی دعوت تدبر و تفکر کا مقصد یہ ہے کہ انسان ان مسخر شدہ کائنات ہی میں الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ ان تمام چیزوں کو مشاہدہ کمال حق جل شانہ کا آئینہ بنائے۔ مسخر شدہ کائنات سے خدمت لیتے وقت اس کی نظر اس پر رہے کہ یہ تسخیر میرے بس کی نہیں تھی حق جل شانہ نے کی ہے اس کے بس میں نہیں تسخیر بھی بس میں نہیں وہ سب چیزیں حق جل شانہ کے عطیات ہیں۔ تسخیر کائنات کی فکروں میں الجھ کر خالق کائنات اور تسخیر کرنے والی ہستی سے غافل ہو جانا کوئی بڑا کمال نہیں بلکہ غفلت ہی غفلت ہے۔ قرآن ان غافلوں کو متنبہ کرتا ہے کہ ہمیشہ [illegible] انسان اس آئینہ خانہ میں داخل ہو کر اس کے حسن و جمال میں نہ الجھ جائے بلکہ ان کو خالق کائنات کے مشاہدہ کا ذریعہ بنائے۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے۔

ہمہ اندر زمن تو اے پسر است [illegible] ز تو عقل و مال ز عکس من است

والعاقل تکفیہ الاشارۃ والسلام

محمد شفیع

۲۹/۳/۶۹ کراچی ۱۳

(۲)

لندن [illegible] صاحب

۶۹/۲/۲

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ نے جو رائے [illegible] میری زبان و دانش نظر سے اس قدر مطابقت رکھتی ہیں کہ مجھے اور زیادہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ نے [illegible] خصوصیت سے نظم کا انتخاب [illegible] قابل ہے کہ اس کی ملک میں زیادہ اشاعت ہونی چاہیے۔

مجھے آپ کے خط سے بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے کراچی میں سب بخیریت ہوں گے۔

مخلص

عبدالسلام

حسن نعیم (نئی امیجری کی تلاش)

ڈاکٹر محمد حسن

غزل شاعری کے اعلیٰ ترین فن کا نمونہ ہے۔ احساس، تفکر اور بصیرت کی ساری تہوں سے مل کر وہ داستان مکمل ہوتی ہے جو غزل کے دو مصرعوں میں بیان ہو سکتی ہے۔ ایمائیت غزل کا حسن بھی ہے اور اس کی مجبوری بھی۔ غزل بات کو وسعت اور ساحرانہ ابعاد کے ساتھ تہ بہ تہ انداز میں ادا نہیں کر سکتی۔ مگر احساس، جذبے، فکر اور بصیرت کی جس ہم آہنگی سے اچھی غزل کا ہر شعر بنتا ہے وہ اپنی ایک انوکھی کشش رکھتی ہے۔

غزل روایت کا آئینہ بھی ہے اور اس کی تعبیر کا آئینہ اس لئے کہ اس کے تمام تر رموز و علائم صدیوں پرانی روایت نے ڈھالے ہیں ان میں انسان مضمر ہے۔ مگر ان سے قطع تعلق ممکن نہیں۔ شاید وحشت کی کھنک بھی شیشہ و ساغر کی علامتوں میں ڈھل کر ہی روایت غزل کو رسمی اور روایتی بنا دیتی ہے۔ غزل کو زوال ہوا اور روایتی انداز فکر نے اس فن کی روح تعفن کرنی شروع کی۔ حالی سے جوش تک جو بھی غزل کا مخالف ہوا وہ اسی چیلنج کے سبب تھا۔

دور حاضر میں یہ چیلنج سب سے زیادہ شدید اور جان کاہ ہے۔ دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد کے گئے چنے چلے اور نئی ٹکسالیں اور دبستان کھلے نہیں۔ البتہ دور حاضر کی دو دیو قامت شخصیتوں نے جہاں یہ ثابت کر دیا کہ غزل کو عصر حاضر کے تقاضوں کا ذریعۂ اظہار بنایا جا سکتا ہے وہاں ان کی پرچھائیاں اتنی طویل ہوگئیں کہ نئے شاعروں کو ان سے بچ نکلنا دشوار ہوگیا۔ یہ دو شخصیتیں تھیں فیض اور فراق۔

فیض نے درد کو تغزل اور کیف کے سانچے میں ڈھال دیا۔ اور خون دل کی کشید سے زندگی کی نئی بصیرت اور کیفیت کا امتزاج (ABSORBED) حاصل کر لیا اور اس کے لئے انداز بیان وہ اختیار کیا جو غیر مرئی تصورات کی پیکر تراشی اور تجسیم سے آراستہ تھا۔ دوسری طرف فراق نے عصری حسیات کو زبان دے دی۔ عشق یہاں محض لذت نہیں عرفان کا ہم معنی تھا اور زندگی کی اس عروج اور دردمندانہ بصیرت کا اظہار غزل کے مانوس لب و لہجہ اور مانوس تر خود سپردگی اور کلاسیکی پابندی کے ساتھ کیا گیا۔ ان کے ساتھ غزل کی کچھ اور جہتیں بھی تھیں جن میں خوش گوار سے پھول کھلتے تھے اور چمن بندی کے پرانے انداز نئے روپ سے جلوہ گر ہوئے تھے۔ یگانہ نے غم کو آفاقی بنا کر کلاسیکی ضبط و نظم سے ہم آہنگ کیا۔ پھر مجروح کی غزلیں تھیں جن پر نکتہ چینی بہت ہوئی مگر جن کے خوشگوار امکانات کا صحیح محاکمہ آج تک نہیں ہوا۔ پھر پرویز شاہدی اور مخدوم کی غزلیں تھیں جنہوں نے عصر حاضر کی نئی اور پیچ در پیچ جنگ کو غزل میں کامیابی سے ڈھالا۔ (مخدوم غزل کی طرف بعد کو مائل ہوئے اور اسی لحاظ سے ان کا ذکر بعد میں آیا ہے) پھر سلام، ربانی تاباں جن کی خوشنوائی اور خوش گوئی نے نئی غزل کو دلآویز لہجہ بخشا۔

حسن نعیم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ پچھلے برس جب میں نے حسن نعیم کی غزلیں سنیں تو مجھے ایسا لگا کہ ایک شاعر نئی امیجری کی تلاش میں بھٹک رہا ہے اور ریزہ ریزہ یہ امیجری جمع ہو رہی ہے۔ میرا احساس یہ تھا کہ حسن نعیم کی غزلوں میں مصرعے اچھے اور بنے ہوئے تھے۔ مگر اکثر دولخت اور ایک دوسرے سے الگ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک مصرعے میں کسی انوکھی امیجری کی تلاش کرتے ہوتے ہیں مگر دوسرا مصرعہ ایک دوسری امیجری کو لے آتا ہے اور یہ دونوں شعر میں آکر ٹکرا جاتے ہیں۔ بہت برسوں بعد جب میں نے حسن نعیم کی غزلیں پڑھیں تو احساس ہوا کہ اب وہ اس تلاش کے ایک نئے موڑ تک آ پہنچے ہیں۔

حسن نعیم غزل کے ذریعے محض بات کہنا نہیں چاہتے۔ بات کے مناسب کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تخلیق فن میں عموماً اور اردو شاعری میں خصوصاً اس کیفیت سازی کی بڑی اہمیت ہے۔ شاعر جتنا بڑا ہوگا اس کی کیفیت سازی کی سطح اتنی ہی بلند ہوگی۔ معمولی شاعر محض روایتی پیکروں یا استعاروں سے یا محض لفظی بازیگری سے یا محض تکنیک سے کیفیت سازی کرتا ہے۔ بڑا شاعر اس کیفیت کو چیزوں میں [illegible] اپنی پوری شخصیت کے ساتھ کہتا ہے۔ وہ کیفیت سازی اس طرح کرتا ہے کہ وہ خود کیفیت بن جاتا ہے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب شاعر کی زندگی ہموار زندگی نہ ہو بلکہ بنتے اور بکھرتے ہوئے تجربوں سے عبارت ہو یعنی تجربہ یا اعتقادات [illegible]
حسن نعیم کی غزلوں میں اسی کیفیت آفرینی کی کوشش کا اندازہ ان کے ان اشعار سے ہوگا۔

گرے بہار سے [illegible] دامانِ شب
مجھ سے [illegible] خواب [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]
دوستی [illegible] تعلقات [illegible]
[illegible] ماہتاب [illegible]
میں [illegible] جسم [illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible] جب [illegible]
[illegible] آ [illegible]
[illegible] تب [illegible]
[illegible] کوئے [illegible]
[illegible] کہاں [illegible]
ہر ایک راہ [illegible] سے گزرے [illegible]
کہیں [illegible] کہیں [illegible]

ان غزلوں میں سب سے قابلِ قدر کوشش نئی امیجری کو غزل کی روایات سے ہم آہنگ کرنے کی ہے جو حسن نعیم کے یہاں کہیں

تشبیہ و استعارے یا علامتوں کے ذریعے اور کبھی اس کے بغیر بھی پڑھنے والے ذہن کے سامنے ایک تصویر یا ایک منظر پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس منظر کی کیفیت اور اشاریت کے ذریعے دلوں کو فطری معنویت کی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ کوشش روایت سے فائدہ اٹھانے کے طریقے میں ایسی خوبیاں ہوتی۔

اس امیجری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ پیکر تراشی حسن تاثر پاروں کے تعاقب میں مصوری کے بچے منظروں کی طرح کیفیت اور آب و رنگ سے آسودہ خوشی ہے۔ حسن نعیم کی امیجری پر سپاٹ بیانات اور اس سے پیدا ہونے والی لذتیت نہیں بلکہ ایک جمالیاتی ارتعاش پیدا کرنے والی دلچسپی ہے۔

اس امیجری کی اشاریت حسن نعیم کی خصوصیت ہے۔ اس اشاریت کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ غزل میں ابہام پیدا کئے بغیر ایک پرکیف تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس امیجری کے پیچھے حسن نعیم کی فکری اور جذباتی روداد کی کئی جھلکیاں چھپی ہوئی ہیں یہ کتنا دلفریب ہے۔ البتہ اتنی بات اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ حسن و عشق کی فرسودہ جسمانی لذتیت یا آسانی سے حاصل کرنے والی آزادی اور خود رحمی جذبات اس شاعری کا موضوع نہیں ہیں ان کے پیچھے ایک ایسی شخصیت جھلکتی ہے جو اپنی ذات سے [illegible] ہے اور زندگی کی چلچلاتی دھوپ سے بچ کر چھپنا نہیں چاہتی۔ اس کی تمازت اور سختی سے دوچار ہے۔ زندگی سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ اور اس سے پیدا ہونے والا [illegible] حسن نعیم کو عزیز ہے۔

ابھی سے شب میں اُجالا، ابھی سے زرفشاں
مرے لئے تو بہت کچھ ہیں دیدۂ بے خواب

رہے چھپائے ہوئے سینہ حسن نعیم
غم کو شاید ہے نہ زر و مال کی حسرت

نئی غزل کے نام سے بہت کچھ مزاح پیدا ہوتی ہے۔ لیکن نئی غزل کی مزاج شناسی صرف اسی وقت ممکن ہے جب علامتوں کو پڑھنے اور آنکھوں سے [illegible] پرہیز کیا جائے۔ [illegible] کے ساتھ ساتھ تحقیق اور [illegible] اصل میں نئے [illegible] کو کہا جائے کہ [illegible] داخلیت اور [illegible] کی نمائش نہیں بلکہ ذات کی ایسی توسیع ہے جو معروضیت اور آفاقیت کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے اور انفس اور آفاق کو اس طرح اپنی ذات کا حصہ بنا سکے کہ خارجیت اور داخلیت کی سرحدیں مٹ جائیں۔ حسن نعیم کی غزلوں میں عصری مسائل اور آفاقی احساس کی پرچھائیاں ملتی ہیں اور غزل کی روایت کے احساس و احترام کے ساتھ ملتی ہیں۔

ان کی تازہ غزل:

جو غم کے شعروں سے بجھ گئے تھے ہم ان کے داغوں کا ہار ہوتے
کسی کے گھر سے دیا اٹھایا، کسی کے دامن کا تار ہوتے

ان کے فن کا اشاریہ ہے تو یقیناً ان کا فن بلندی کی نئی منزلوں تک پہنچ گیا ہے۔ اس غزل کی شگفتگی، سادگی، دلکشی اور صداقت عصری غزل کے سرمائے میں ایک اضافہ ہے۔

سماجی شعور کے معنی ہماری شاعری میں کسی سیاسی پارٹی کے منشور کو نظم کرنا لیے جاتے رہے ہیں۔ نظریے کا ذکر محض سیاست کے ضمن میں ہونے لگا ہے۔ لیکن جس طرح الفاظ کھوٹے سکے بن کر اپنا مفہوم کھو رہے ہیں اسی طرح اکثر نئے تصورات بھی بیانات کے دامن میں ادھوری سچائیاں بن کر رہ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی سچائیوں کا شعور شخصیت کو نئی گہرائی اور بصیرت کو نئی جہت بخشتا ہے۔ نظریہ آسانی سے دستیاب ہونے والی وردیوں میں سے کسی ایک وردی کو منتخب کرنے سے ہرگز عبارت نہیں بلکہ عصری زندگی کے حقائق پر سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

حسن نعیم کی شاعری کا انسان ہارا ہوا نہیں، شکست سے دوچار ہو کر بھی وہ زندہ رہنا جانتا ہے۔ نوجوان نسل سے بلکہ ایسا باشعور انسان ہے جو زندگی کے سفر کو محض وقت گزاری نہیں سمجھتا۔ وہ ان کی تمام رکاوٹوں سے بچتے ہوئے آگے رواں رہ کر مڑنے اور بار بار اٹھنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ راہ کی مشکلوں سے گزرنے کی ہمت بھی اور طوفانوں کی سختیوں اور گرد و غبار کے مقابلے میں اپنا سر اٹھائے رکھنے کی جرأت بھی۔ اسی سے حسن نعیم کی غزل میں ایک ایسا لہجہ پیدا ہوتا ہے جو غزل میں فرسودہ عشق کی جگہ نئی شخصیت ابھرتی ہے بقول احمد ندیم قاسمی یہاں حسن سے بھی سوا ہے زندگی عزیز ہے۔

حسن نعیم نے زندگی اور شخصیت کے ارتقا کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی غزلوں میں تفکر کی زیریں لہر جلوہ گر ہے نئے زمانے کی ترقی ہے ایسے دور میں زندگی کے عناصر پر سوچنا ان سے پہلے ممکن نہ تھا۔ اپنے دور کے سماجی تقاضوں سے اپنا رشتہ اس طرح جوڑنا کہ نقش فن پارے سے ہم آہنگ ہو کر فن بن جائے بڑی بات ہے اور حسن نعیم کی غزلوں میں یہ کوشش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اپنے معاصر غزل گو شاعروں میں یہی خصوصیت انہیں ممتاز کرتی ہے۔ اردو غزل کے لیے یہ فال نیک ہے کہ حسن نعیم جیسے شاعر نئے دور کے تقاضوں کو اردو شاعری کی بلند روایتوں سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ادب میں نئی اور پرانی، قدیم اور جدید کے مباحث بے معنی ہیں۔ بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ اچھی شاعری ہے جو تجربے اور بصیرت کی روشنی سے معمور ہو، دلوں کو گرماتی ہو، اپنے دور کا آئینہ ہو اور پڑھنے والوں کو بھی نئے خواب دکھا سکتی ہو۔ حسن نعیم کی غزلوں میں حسن اور شعریت کے یہ پہلو موجود ہیں جن سے صرف ان کے فن کے مستقبل ہی کی نہیں بلکہ اردو غزل کے خوش آئند مستقبل کی بشارت ملتی ہے۔

حسن نعیم

○

دیکھ لوں صورتِ الفاظ تو معنی دیکھوں
دل میں ارماں ہے کہ ہر درد کا چہرہ دیکھوں

قصبہ و شہر میں ہے آگ کا طوفاں برپا
کون سی شاخ پہ چڑھ کر یہ نظارہ دیکھوں؟

کوچہ ویراں ہے، ستوں سوچ رہا ہے کب سے
کیا دھرا ہے جو مکینوں کا بھی رستہ دیکھوں

مثلِ سیاح کھڑا سوچ رہا ہوں میں بھی
دیکھوں میں حلقۂ زنجیر کہ دنیا دیکھوں

شورِ زنداں میں بھی باعثِ تسکین مجھے
آنکھ جھپکاؤں تو ممکن ہے کہ سپنا دیکھوں

مجھ کو ہر رنگ میں وہ شخص بھلا لگتا تھا
اس کو نم دیدہ و خاموش کہ ہنستا دیکھوں

اک ندا کوہ کی چوٹی سے بلند ہے کہ حسن
جھاڑ لوں گردِ سفر، آس کا خیمہ دیکھوں

○

جو غم کے شعلوں سے بجھ گئے تھے، ہم ان کے داغوں کا بار لائے
کسی کے گھر سے دیا اٹھایا، کسی کے دامن کا تار لائے

یہ کوہساروں کی تربیت ہے کہ اپنا خیمہ جما ہوا ہے
ہزار طوفاں سناں چلائے، ہزار موجِ غبار لائے

لبے بتائیں کہ غم کے صحرا کو خلدِ دانش بنایا کیسے؟
کہاں سے آبِ رواں کو موڑا، کہاں سے بادِ بہار لائے

ہر ایک راہِ جنوں سے گزرے، ہر ایک منزل سے کچھ اٹھایا
کہیں سے دامن میں غم سمیٹا، کہیں سے جھولی میں پیار لائے

خودی کے ماتھے پہ ایک بندی نہ جانے کب سے چمک رہی تھی
اسے بھی فرقِ زمیں کی خاطر ہوا میں اڑ کر اتار لائے

جو اپنی دنیا بسا چکا ہے، اسے بھی مشکل کا سامنا ہے
کہاں سے شمس و قمر اٹھائے، کہاں سے سیل و نہار لائے

وہی شباہت، وہی ادائیں، مگر وہ لگتا ہے غیر جیسا
نعیم یادوں کی انجمن میں نہ جانے کس کو پکار لائے

○

صبحِ طرب تو مستی و غزل خواں گذر گئی
شامِ الم جو آئی، تو آ کر ٹھہر گئی

دیکھا کسی نے اوجِ تصور نہ اوجِ فن
پنہاں تھا ایک عیب تو سب کی نظر گئی

یادِ خدا سے بابِ حرم تک کھلا نہیں
یادِ بتاں سے دل پہ قیامت گذر گئی

تڑپا قفس میں کون جو اے صبحِ نو بہار
روئے گل و گیاہ، صبا چشمِ تر گئی

اتنا دلِ نعیم کو ویراں نہ کر جناب
روئے گی موجِ گنگ جو اس تک خبر گئی

○

شامِ الم کو یاد رکھو صبحِ طرب کے بعد بھی
سوزِ جنوں سے کام لو منزلِ شب کے بعد بھی

دل میں نہ جانے کیا رہا مثلِ شرارِ جستجو
جوشِ طلب کے وقت بھی ترکِ طلب کے بعد بھی

تجھ کو بتائیں کیا صبا، ہم نے جلایا کیوں چراغ
آمدِ خور کے باوجود، زحمتِ شب کے بعد بھی

شکر ادا کرو دل گیا، نرم و سبوؤں کے بعد ہو
ملتا ہے ورنہ کس کو جام حسنِ طلب کے بعد بھی

سر میں اگر جنوں نہ ہو، ملتا نہیں ہے تاجِ فن
فکر و نظر کے باوجود، نام و نسب کے بعد بھی

دیکھے نہ مجھ کو اہلِ بزم ایسی نظر سے اے نعیم
آیا ہوں میں تو بارہا بزم میں سب کے بعد بھی

○

جب تک شعورِ عشق ہے، پاسِ جمال ہے
زندانِ آرزو سے نکلنا محال ہے

ہر لمحہ اضطراب ہے، ہر لحظہ انتشار
دل کا وہی ہے حال، جو دنیا کا حال ہے

گذرا جو کوئے یار سے، اس نے صدا نہ دی
دل ہے کہ اتنی بات سے ناحق نڈھال ہے

جو بھی صلہ ہو تجھ سے محبت کا اے حیات
ہر شخص اپنے آپ وفا کی مثال ہے

سنتے ہیں اے نعیم سوائے کمالِ فن
دنیا میں ہر عروج پہ اک دن زوال ہے

○

خیر سے دل کو تری یاد سے کچھ کام تو ہے
وصل کی شب نہ سہی، ہجر کا ہنگام تو ہے

نورِ افلاک سے روشن ہو شبِ غم کہ نہ ہو
چاند تاروں سے مرا نامہ و پیغام تو ہے

کم نہیں اے دلِ بیتاب متاعِ امید
دستِ میخوار میں خالی ہی سہی، جام تو ہے

بامِ خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی
خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

جو بھی الزام مرے عشق پہ آیا ہو نعیم
اُن سے وابستہ کسی طور مرا نام تو ہے

○

ل میں اُترو گے تو اِک جُوئے وفا پاؤ گے
ج در موج سمندر کا پتا پاؤ گے

یں تو کھو جاؤں گا تنہائی کے جنگل میں کہیں
ز بھرے گھر میں کہاں مجھ کو بھلا پاؤ گے

ل سے بے ساختہ اُٹھے ہیں بڑھاؤ کفِ دست
ج آنسو کو بھی ہم رنگ حنا پاؤ گے

ں ہی آگ سہی خواب میں جل کر دیکھو
ں جہنم میں بھی جنت کی ہوا پاؤ گے

ر اُٹھانے کا یہ انداز بتاتا ہے نعیم
ں نہ اِک روز وفاؤں کا صلہ پاؤ گے

○

بیانِ شوق نہ حرفِ اضطراب بنا
وہ اک سوال کہ جس کا نہ کچھ جواب بنا

میں ایک باب تھا افسانۂ وفا کا مگر
تمہاری بزم سے اٹھا تو اک کتاب بنا

مجھے سفینہ بنا اپنا کو بہ [illegible] عشق
کسے [illegible] کہ دنیا میں کامیاب بنا

جسے جہاں کو اپنا جنوں سمجھتا تھا
[illegible] زمانے کا حسن خواب بنا

کبھی تو وجہ [illegible] سے خودداری
کبھی [illegible] طلب باعثِ عتاب بنا

مرے [illegible] توقعات [illegible] یہ بات
نہیں [illegible] کہ مجھ کو [illegible] خواب بنا

[illegible] احساں نہیں ہے مجھ پہ نعیم
مجھے [illegible] ذرہ تو [illegible] آفتاب بنا

○

وہ کج نگاہ نہ وہ کج شعار ہے تنہا
بس اک پیمبرِ جنت نثار ہے تنہا

نہ بلبلوں کی اذاں ہے نہ تتلیوں کا طواف
ابھی چمن میں گلِ نو بہار ہے تنہا

اُٹھائے منتِ صرصر کرے نہ بادِ نسیم
ہر ایک حال میں صحرا شکار ہے تنہا

فلک نجوم سے روشن زمیں چراغوں سے
ہجومِ نور میں اک شامِ تار ہے تنہا

تمہی سے بزمِ مسرت غزال چشموں سے
ملی ہے ہم کو نظر اشکبار ہے تنہا

ہمیں نے خیمۂ جگر میں کانٹے ہی رہے
ہمیں کو قدر بھی بے حد کیا ہے تنہا

چمن میں سب ہیں بہت یوں تو میکدے میں ندیم
میانِ جام و سبو بادہ خوار ہے تنہا

○

عشق سے اپنی نہیں ہو کہ زمانے سے گلہ
تم نے پوچھا نہیں افسوس کہ کیا ہم پہ
ان کے کوچے میں بسیں کہ پھرا شہر بہ شہر
دربدر تھے پھرا در دِ غریب الوطنی
جرأتِ شوق کا شاہد ہے ترا پیمان و
جرأتِ فکر کی نغمہ تری پیوں شکستہ
جب ملی دولتِ نایاب تمہارے غم
دشت و صحرا ابھی ہوئے نقشِ کفِ پا سے
کوئی تنہا نہیں دنیا میں بجز درد
اس کے ہمدم تھے آنسو نہ ہمی
کتنے آدھ رُکے زینہ ہے تری زلف
کتنے خوابوں کا چمن ہے تری گل پہ
عندلیبوں کی نوا نکہتِ گل ہے تو
ہم بھی سیکھیں گے لب سے تیرے سخن

○

[illegible]ے رسوائی سے اُٹھ کر دار تک تنہا گیا
مجھ سے پہلے بھی نہ دامن خواب کا چھوڑا گیا

[illegible] بساطِ خار و خس تھی بجھ گئی یوں شب بجھ گئی
دوش پر باد سحر کے دور تک شعلہ گیا

[illegible] کا ملنا سفر سے ایک بھی [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

○

سارے جہاں کی سیر کا امکان مل گیا
[illegible] میں عنوان مل گیا

[illegible]
[illegible] کا دیوان مل گیا

[illegible] سے طبیعت جو خوش ہوئی
دشواریوں کو [illegible] آسان مل گیا

مغرب [illegible]
[illegible] میں یہاں وصال کا سامان مل گیا

[illegible] خوب تو نغمے تھے [illegible]
[illegible] تو [illegible] سامان مل گیا

○

ایک داغِ مستقل ہے قربِ یاراں کا صلہ
چاند کو اس کے علاوہ آسماں سے کیا ملا

مجمزہ ہے سازِ نظر کا دورِ شب کے رو برو
دور تک پھیلا ہوا ہے روشنی کا سلسلہ

غم کی اپنی منطقیں، خوشیوں کے اپنے فلسفے
دل نے رکھا پھر بھی خوابِ نو بہ نو کا حوصلہ

اب تو آ جاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قیدِ انا
انتظارِ روشنی میں اپنا دیدہ و بہہ چلا

کس طرح اب باندھیے گا عشق کے مضموں نعیمؔ
ہاں وصالِ یار بھی ہے اقتصادی مسئلہ

○

کتابِ علم ہے قطرہ بھی، بحر کی مانند
فسانہ دہر کا تشنہ ہے، دہر کی مانند

ترا خیال جو میٹھا سا درد تھا پہلے
اتر گیا ہے رگ و پے میں زہر کی مانند

یہ دل کہ قصبۂ گمنام سے مشابہ تھا
ترے قدم سے ہے معروف شہر کی مانند

ہر ایک سمت سے گھیرا تھا تیرہ بختی نے
بچا لیا ترے گیسو نے سحر کی مانند

مجھے خبر ہے مرا منتظر ہے کون نعیمؔ
رواں ہوں جیسے سمندر میں نہر کی مانند

○

وحشتِ جاں کو پیامِ نگہِ ناز تو دو
اس فسانے کو ذرا گرمیٔ آغاز تو دو

میرے قدموں کے نشاں راہ سے کچھ دور سہی
تم سے میں دور نہیں ہوں مجھے آواز تو دو

دل میں طوفان نہیں ہو تو کرے کیا نغمہ
میں سناتا ہوں یہی راگ مجھے ساز تو دو

کوئی بنیاد نہیں قیدِ تعلق کی بھی
جذبۂ عزم کو ذرا لشکر کا انداز تو دو

اس نے سینے سے لگایا جو کہا میں نے حسن
دل میں رکھنے کے لیے اپنا کوئی راز تو دو

○

وہ بھی کہتا تھا کہ اس غم کا مداوا ہی نہیں
دل جلانے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں

زورِ وحشت بھی اگر کم ہو تو چلتا ہے مدام
سر چھپانے کے لیے دشت میں سایہ ہی نہیں

جل کے مر جاتے ہیں جینے میں رہتے ہیں کندن
جو ہیرے ہیں انہیں کسی شخص نے پرکھا ہی نہیں

گردشِ وقت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

میری آنکھوں میں وہی شوقِ تماشا تھا قیصر
اس نے جی بھر کے مری تصویر کو دیکھا ہی نہیں

○

لطف آغاز ملا، لذتِ انجام کے بعد
حوصلہ دل کا بڑھا کوششِ ناکام کے بعد

اب نہ جانے تجھے بھی ہے تعلق کہ نہیں
لوگ لیتے ہیں مرا نام ترے نام کے بعد

میکدہ تھا تو وہیں روز چلا جاتا تھا
اب کہاں کوئی ٹھکانا ہے مرا شام کے بعد

کوئی آیا ہی نہیں کوئے وفا تک ورنہ
کچھ بھی مشکل نہیں یہ راہ دو اک گام کے بعد

دشت گلزار ہی کتنی رہیں راہیں لیکن
ہم نے منزل کی تجلی دیکھی ہر اک گام کے بعد

کچھ تو ساقی سے گلہ ہوگا حسن کو ورنہ
کون میخانے سے اٹھتا ہے دو اک جام کے بعد

○

کوئی تھا ناصح تو کوئی ہم نشین و رازداں
کوئی دشتِ غم میں ہوگا اب رفیقِ عاشقاں

دشت پیمائی ہے اپنی، عہدِ حاضر کا جنوں
بن چکے ہیں مجھ سے پہلے میرے قدموں کے نشاں

خلوتِ امید میں روشن ہے اب تک وہ چراغ
جس سے اٹھتا ہے قریبِ شام یادوں کا دھواں

ذہن کو رکھنا ہے روشن اس اندھیری رات میں
حافظے میں قید رہنا ہے ضیائے رفتگاں

گوش بر آواز ہے محفل کی محفل اے نعیم
آ گیا شاید کوئی شعلہ نوا، جادو بیاں

○

نہ میرے خواب کو پیکر نہ خد و خال دیا
بہت دیا تو مجھے موقعِ وصال دیا
ملا نہ روح نہ دل کا کوئی حساب مگر
یہ کارِ زیست کسی طور سے سنبھال دیا
تمام عمر کی بے چینیوں کا آب تھا جو
مرے جنوں کو خرد نے کہ کے اچھال دیا
کسی نگاہ نے امید کو دیا جینا
کسی شبیہ نے سب تشنہ بے خیال دیا
مرے محبوب کی تصویر اس طرح کھینچی
مرے ہنر کو پسِ پشت اس نے ڈال دیا
کئی خیال جو آوارہ خو تھے سرکش تھے
انہیں بھی شعر کے سانچے میں ہم نے ڈھال دیا
اسی نے سر پہ بٹھایا تھا جس نے آج نعیم
سمجھ کے پاؤں کا کانٹا مجھے نکال دیا

○

ڈھونڈو تو صرف آگ ہے شعلہ کہیں نہیں
جلتا ہے دل کہ گھر کو بسایا کہیں نہیں
آنکھوں کی خانقاہوں کو شبنم سے دھو رہے
جو حق نگار دشت وہ چشمہ کہیں نہیں

تفصیلِ عمر تو درج ہے لوحِ حیات پر
تو زندگی کا کوئی خلاصہ کہیں نہیں
دیکھے تھے کچھ نقش جو آنے ہیں لوٹ کے
وہ تختۂ گلاب وہ خیمہ کہیں نہیں

اس گھر میں سب ہی کسی مہرباں کے ہیں
جس پیکرِ جمال کا جلوہ کہیں نہیں
سامان صد جنون تھا اٹھتے ہوئے نعیم
وہ چاند وادیِ ابر جو اترا کہیں نہیں

○

پوچھی تھی کہ شب وصل کا پیغام ملا
سو گئے خواب کی بانہوں میں جو آرام ملا

ڈھونڈتے رہیے شب و روز امیدوں کے قدم
کوچۂ زیست میں رہنے کو یہی کام ملا

خوبیٔ بخت کہ جب بھول چکا تھا سب کچھ
بے وفائی کا لبِ غیر سے الزام ملا

پا پیادہ تھی مگر راہ میں وہ دھوم مچی
جھک کے تعظیم سے شہزادۂ ایام ملا

ہم نے بیچی نہیں جس روز متاعِ غیرت
اک پیالہ بھی نہ مے کا ہمیں اس شام ملا

مختصر یہ ہے کہ جب وقتِ وداعِ گل تھا
خواب میں آ کے گلے مجھ سے وہ گلفام ملا

تم جنوں ہے کہ نہیں راہ میں پوچھیں گے نسیم
دشتِ غربت میں یہ کیا کم ہے کہ ہم نام ملا

○

چہرے پہ مہرِ غم ہے، خط و خال کی طرح
ماضی بھی دم کے ساتھ ہے اب حال کی طرح

پتے تھے خاک بوس تو شاخیں تھیں سرنگوں
گنجِ چمن بھی تھا، دلِ پامال کی طرح

تہذیب ہے کہ آئے تو ہنس بول کر گئے
چپکے سے جائیے نہ مہ و سال کی طرح

اپنے حروفِ شوق جو شعلہ بجاں تھے کل
ٹھنڈے پڑے ہیں آج وہ اقوال کی طرح

سب کے ستارے دیکھ کے دل نے صلاح دی
گردش میں کیوں پڑو کسی رمّال کی طرح

آنچل میں نیند باندھ کے لے رات آ بھی جا
یہ دن لگا ہے جان کو جنجال کی طرح

رکھیے بچا کے اپنا دفینہ حسن نعیم
عمر کو لٹائیے نہ زر و مال کی طرح

○

میں کس کس ورق کو چھپاؤں دکھاؤں کون سا باب
کسی حبیب نے مانگی ہے زندگی کی کتاب

نہیں ہے شب میں [illegible] نہیں ہے تو نہیں
[illegible] لیے تو بہت کچھ ہیں دیدۂ بے خواب

نہیں [illegible] آرام [illegible]
ہمیں ہیں مسکن [illegible] عذاب

[illegible] تھا وحشت سے [illegible] کی طرف
وہاں بھی تشنہ نصیبی وہاں بھی [illegible] سراب

[illegible] کے دامن [illegible]
دیا ہے خواب شکستہ کو [illegible]

وہ آنکھیں پیار کے [illegible]
ہمیں سے مانگ [illegible] شراب

ہوا بہار کے موسم میں یوں چلی [illegible]
[illegible] ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] پوچھنے [illegible]

اُردو کے کلاسیکی ڈرامے (ایک تعارف)

پروفیسر سید وقار عظیم

۲۰ مئی [illegible]

برادرم عقیل صاحب — سلام مسنون

ارشاد کی تعمیل میں مضمون بھیج رہا ہوں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ مضمون ایک خاص جلسے میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا اور میں نے اسے سامعین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ مضمون کی حیثیت محض تعارفی ہے۔ جس موضوع پر میں نے گفتگو کی ہے۔ اس کے متعلق صرف چند اشارے پیش کیے ہیں اسے کوئی جامع یا سیر حاصل بحث نہیں کہ اس لیے قارئین کی خدمت میں گزارش ہے کہ میری معروضات کو مجمل اشارات سمجھ کر پڑھیں۔

آپ سے درخواست ہے کہ میرا یہ خط تمہید کے طور پر مضمون سے پہلے چھاپ دیجیے

شکریہ! آپ کا — وقار عظیم

آج کی تقریب اردو کے کلاسیکی ڈراموں کی جن چھ جلدوں کے تعارف کے لیے منعقد کی جارہی ہے وہ اس عظیم علمی منصوبے کا سب سے پانچواں حصہ ہے جس کی تکمیل کا بیڑا مصاحب ادب کے ایک ایسے جانباز مجاہد نے اٹھایا تھا جس کی قسمت میں قدرت نے غازی کی نہیں شہید کی موت لکھی تھی۔ ایک ایسے شہید کی موت جس نے کام کی لگن کو اپنا مقصود بنا لیا اور اس مقصود کے حصول میں ہمیشہ اس دل سوزی اور جانکاہی کو اپنا مسلک سمجھا جس پر چلنے والے جیتے جی بعض کے جان نواز مرحلوں سے گزر کر بطل گراں کی سرفرازی تک پہنچتے ہیں۔ یہی سرفرازی ان کلاسیکی ڈراموں کے مرتب کرنے والے کے حصے میں آئی ہے جس نے ڈرامے کی تخلیق دنیا کا آخری شاہکار لکھنے کے بعد اس کی تحقیق دنیا میں قدم رکھا اور نہ جانے کتنے ہفت خواں طے کرتے اردو ڈرامے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ کارنامہ انجام دیا کہ ہم اس کی بدولت ڈرامے کے آغاز کے تقریباً سوا سو سال بعد اس قابل ہوئے ہیں کہ ڈرامے کی کوئی ٹھوس اور مدلل تحقیقی تاریخ لکھ سکیں۔ پہلی مرتبہ اپنے مشہور ڈرامہ نگاروں کے متن زیادہ سے زیادہ صحیح صورت میں یوں ہمارے سامنے آئے ہیں کہ انہیں سامنے رکھ کر ہم ان کی انفرادیت کے نقش کو اجاگر کر سکیں۔ پہلی مرتبہ ایک واضح مقدار میں ڈرامائی ادب کا وہ ذخیرہ ہمارے سامنے آیا ہے جسے دلیل بنا کر ہم اپنے اسٹیج کے ارتقا اور اپنے ڈرامائی فن کی صحیح داستان مرتب کر سکیں۔ پہلی مرتبہ ہمیں یہ سہولت میسر آئی ہے کہ صرف ڈراموں کو پڑھ کر اپنے بہت سے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے سلسلوں کو جوڑ سکیں اور زیادہ موثر انداز میں اس بات کا سراغ لگا سکیں کہ گجراتی، مرہٹی، بنگالی، دکنی اور اردو میں اشتراک کے کن پہلوؤں پر کام ہوتا رہا ہے۔ ان کا اظہار ایک خاص عہد کے ڈرامے میں کس طرح ہوا ہے۔ ان بہت سے پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو کو

سامنے رکھ کر میں نے اس کے صرف ایک رخ کی نقاب کشائی کی کوشش کی ہے۔ آج کی مجلس میں پیش ہونے والی چھ جلدوں میں سے جلد "خورشید" کے اسلوب اور زبان و بیان کے متعلق کچھ اشارے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

"خورشید" کے مختلف پردوں میں تماشائیوں کے سامنے آنے والے کردار آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں اور ان کرداروں کے سامنے آنے سے پہلے منظر کی جو تصویر "فدا" نگار اپنے لفظوں میں کھینچتا ہے، اس کی زبان کا مطالعہ کئی حیثیتوں سے بہت دلچسپ ہے۔ اول تو اس حیثیت سے کہ یہاں جو نثر استعمال ہوئی ہے وہ جا بجا مقفیٰ ہونے کے باوجود سادہ اور دل نشیں ہے اور کرداروں کی زبان سے جو باتیں نکلی ہیں ان میں تصنع بہت کم ہے۔ بیان میں سادگی اور رنگینی، دھیمے اور بلند آہنگ لہجے، آسان روزمرہ اور پرشکوہ ترکیبوں کا امتزاج ہے۔ اور اس امتزاج کے پیچھے صرف یہ خواہش اور یہ ارادہ کارفرما ہے کہ جو بات کہی جائے وہ ایک خاص محل پر ایک مخصوص اثر پیدا کرے لیکن اس اسلوب اور اس اسلوب کو دل نشین بنانے والی زبان اور اس کے قاعدوں اور ضابطوں کا خالص لسانیاتی مطالعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپی کی چیز ہے۔

پہلے میں آپ کی خدمت میں چند ایسے جملے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جن میں مجھے بار بار فورٹ ولیم کالج کے داستان گویوں کی بولی کی کھنک سنائی دی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے اس پہلے نثری ڈرامے میں اسی رنگ کی پیروی کی گئی ہے جو باغ و بہار جیسا میر امن کے لیے خاص ہے — بادشاہ نوشیرواں شہر کے اپنی رعایا کا حال پوچھتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے: "جہاں پناہ! آپ کے بخت کی بدولت سے سب خیریت ہے۔ جہاں پناہ کے جاہ و جلال سے مملکت اور رعایا آباد اور دل شاد ہے۔ کبھی جاکر امن چین کی بسیں اور دن دونی رات چوگنی ہے۔ ظلم اور زیادتی کا نام نہیں، چوروں اور ٹھگوں کا پتہ نہیں اور شکر کا کچھ کام نہیں۔ سب ملک صاف، پاک اور آباد اور شاد ہے۔[1]" شہزادہ جہانگیر حاسدوں کے جال سے محفوظ رہنے کے لیے شہر چھوڑ کر جنگل بیابان میں جا بستا ہے۔ لیکن وہاں اس کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا ذکر اپنے ایک ساتھی سے ان لفظوں میں کرتا ہے:

"دنیا چاہے جیسی دورنگی سے۔ تم چاہے جیسے دغا کرو یہی خون، جھگڑا، چوری، ظلم چاہے ویسے شہر والے جہاں بسنا ہے تو بھی شہر بھلا اس برے بیابان سے۔ یہ مت تو دنیا کی شان ہی ہے، مگر یہ تنہائی تو اب نہیں سہی جاتی۔"[2]

ہمایوں بادشاہ اپنے بیٹوں کے غم میں مارا مارا پھرتا ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے ایک وفادار ملازم سے کہتا ہے:

"پہلے مرد! دنیا میں ہر نعمت میں حاصل کر چکا ہوں ...... راج، تاج، گنج، دولت ان سب چیزوں کا مزہ لے چکا ہوں۔ مگر آج ...... شہر بہ شہر پھرتا ہوں۔ اگر میری امید بر آوے گی تو زندگی میں پھر مراد کا پھل چکھوں گا نہیں تو اب تھک گیا ہوں۔ رنج سے اور بھوک سے یہ جان ہلکان ہوئی جاتی ہے۔"[3]

خورشید فیروز شاہ پر اپنی احسان مندی ان لفظوں میں ظاہر کرتی ہے:

"بس میری جان! بہت ہوا، زیادہ میں زیادہ شرمسار ہوئی ہوں۔ آپ کا حق احسان میری گردن و جان

---

[1] خورشید صفحہ ۵۰ [2] خورشید صفحہ ۱۰۸ [3] خورشید صفحہ ۲۰۳

چاہتا ہے کہ اگر میرے بدن کی جلد سے جوتی بنا کر پہنے تو بجا ہے ؎ [1]

اور کئی شعروں میں جابجا باغ و بہار کی جو فضا ہے عبارتیں پڑھتے ہی ذہن ان کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ کوتوال شہر کی بتائی ہوئی
بت بادشاہ آزاد بخت کے دارالحکومت سے کتنی ملتی جلتی ہے اور خورشید کا اظہار احسان مندی پہلے درویش کی بہن کے انداز سے کس
مماثل ہے ۔۔۔ اور پھر عبارتوں میں قافیہ پیمائی نے الفاظ کی سادگی کے ساتھ مل کر کس طرح وہ نغمہ و آہنگ پیدا کیا ہے جو کریم الدین
کے نقادوں کو بھی میر امن کے جملوں اور فقروں میں سنائی دے جاتا ہے۔ یہ چیزیں بے شک بڑے لطف کی ہیں لیکن میں آپ کو ان چیزوں
علاوہ بعض دوسری چیزوں کی طرف بھی متوجہ کرنا چاہتا ہوں مثلاً پہلا ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے :

یہاں جاہ و جلال کو جاہ و جلال کہا گیا ہے۔

جگہ، جاگہ ہے، امن چین امن چین ہے اور شام، شاموں کی بدلی ہوئی صورت۔

دوسری عبارت میں دغاباز کے بجائے دغا خور ہے۔

تیسرے ٹکڑے میں تسلی کی جگہ تشفی نے لی ہے۔

خیال ہوتا ہے کہ جلال کی جگہ جلال محض عبارت میں خوش آہنگی پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لیکن پورا قصہ پڑھنے پر
چلتا ہے کہ یہ بات محض اتفاقی نہیں اس لیے کہ آگے چل کر ایسے بہت سے لفظ استعمال ہوئے جن میں "ی" اسی طرح زائد ہے جیسے جلال
، مثلاً دوائی، شفائی، خاطری، نفیسی، بہتری، تیری، غلطی، ضروری، انتظاری، میاں اور ہمی وغیرہ۔ گو یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں اس خاتمہ
نے جملے کو خوش آہنگ بنانے میں بھی مدد دی ہے۔ جیسے اس جملے میں

ہر درد کی دوائی اور ہر مرض کی شفائی ہے

لیکن یہ بات جیسا کہ میں نے ابھی کہا صرف کہیں کہیں ہے۔

یہی صورت امن چین کے معاملے میں ہے۔ امن چین پورے قصے میں امن چین ہی ہے، امن چین کہیں نہیں، جگہ ہر جگہ
ہے اور شاموں، شام۔ عبارت میں جہاں کہیں چپ چاپ کا محل ہے وہاں بالالتزام چپ چپاتا کیا ہے مثلاً ان جملوں میں :

(۱) میں یہ چادر وہاں سے چپ چپاتی ہوں (۲) وہ اژدہے کی مانند چپ چپاتا وہاں سے نکل گیا (۳) یہ انگشتری میں
اس کی انگلی سے چپ چپاتا نکال لی تھی۔ اسی طرح ہندی اور عربی فارسی کے کئی لفظ ہیں جو بہت بدلی ہوئی صورتوں میں استعمال
ہوئے ہیں۔ مثلاً نزدیک، نیک ہے، غوغا، اور گرتا ہے، ان جزو کے التزام کے ساتھ)، اسی طرح ہندی کا شپیل شغل بن گیا ہے۔
عربی صنزر، جنل (ض کی جگہ ج اور ر کی جگہ ل ہے) ترنج ترنگ ہے (ٹ اور ج دونوں بدل گئے)۔ خاطر بھی کھاتر ہو گیا اور اس
آگئے ہیں۔ "بڑھا کر" سے کھاتری کر لیا گیا۔ فند کا لفظ کبھی اکیلا اور کبھی فریب کے ساتھ بار بار دھوکے، چالاکی وغیرہ کے معنی میں
استعمال ہوا ہے۔ ممکن ہے پھندا کی تعریس ہو۔ لیکن استعمال بار بار ہوا ہے اور اپنا مفہوم بدلے بغیر استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح خوشبو
اور گلاب کی بو یا چنبیلی کی ہمیشہ لپٹ کے بجائے لپٹ ہے، دھپ (جیسے دھپ مارنا میں) ہمیشہ دھپا ہے (غالب
دھول دھپا کا ایک جزو) پنجابی میں روزمرہ استعمال ہونے والے لفظ بار بار بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں، مثلاً دیا

(وقت) گویا مغز پنجابی کے مغز کے مفہوم میں لیکن خاصی جدت کے ساتھ۔ مثلاً کوتوال سپاہی سے کہتا ہے:

جا، میرا مغز برقرار ہے[1]

جہان دار ایک موقع پر کہتا ہے کہ:

برادر! کیا دیکھوں، میرا مغز بے قرار ہے[2]

جہان دار ایک اور موقع پر کہتا ہے کہ:

اس چہرے کا نقش میرے مغز پر قائم ہے[3]

یا ایک اور مثال: کیسے بیان کردوں؟ کیا کہوں؟ مغز گھومتا ہے، زبان خشک ہوتی ہے[4]

ترکیبوں کی ساخت کے معاملے میں طرح طرح کی آزادیوں سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً نفی کے کلمات نا، غیر، بے وغیرہ کو جس طرح چاہے مثبت لفظوں کے ساتھ لا دیا جاتا ہے، جیسے ان مول، بیجان، بے مول ہے، بے صبری کی جگہ ناصبرت، بدسلوکی، غیر سلوکی، بے اور بدوقت، بدنوبت۔ صفت کی صورت میں مرکبات کا استعمال بار بار ہوتا ہے اور ان کے بنانے میں طرح طرح کی جدتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرز کے چند مرکب یہ ہیں:

مے پڑو خیرخان، دیپک وتی پیشانی، ہنس مارتی پیشانی، ناز بھرا لجھانی، گول چہرہ امیر، خوب چہرہ جورو، خوب ناصورت وغیرہ۔

اسم، صفت اور فعل میں واحد جمع اور تذکیر تانیث کے استعمال میں جن اصول سے کام لیا گیا ہے ان کی تفصیل خاصی طویل ہے۔ واحد جمع کے استعمال میں صرف ایک رجحان کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ خورشید کے مصنفوں کی طرح یہاں بھی عربی جمع کو اردو کے قاعدے سے جمع بنانے کا رجحان عام ہے۔ مثلاً اطراف کو اطرافوں، اوامر کو اوامروں اور اطلاع کو اطلاعوں کی جمع بنایا ہے۔ گو البتہ ایسا نہیں کیا گیا کہ کہیں جمع کی جمع کی صورت نہیں۔ مثالوں کی صفات، ہما اور فعالیں اور ان کے علاوہ متعلق فعل اور حروف جار کی ایسی صورتیں بھی عام ہیں جو دکنی کی صورتوں سے قریب یا ان سے ملتی ہیں۔

خورشید کی [illegible] کا پہلو ایسی [illegible] ہے۔ بہت سی زبان کی خصوصیت اس کا تراجم یا ان کے [illegible] کیا اور اس کے بعد ہندوستانی زبان کا لفظ استعمال کیا۔ یہ سیاق [illegible] سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی زبان کا یہ ذخیرہ گجراتی ہم لفظوں کا [illegible] ہے۔ ویسے بھی ذرا ماسبق تقریباً سو برس پہلے کی ان ہندوستانی زبان میں سے ہجو ہی اور غالباً اثرات کی بھی بہت پائی تھی۔ ایک گجراتی نے جب اسے ڈراموں کے مکالموں کے لیے استعمال کیا تو کرداروں کے مزاج اور واقعات و صورت حال کی مناسبت سے جب ایسی اسلوب کی تخلیق ہوئی جو نئے رنگ و آہنگ میں جذباتی، نازک اور رواں ہے۔ یہ مخصوص رنگ و آہنگ ایک خاص مقصد کے واضح ارادے اور کوشش کے تحت وجود میں آیا ہے اور خاص طرح کی کشش رکھنے کے باوجود ساختہ، پرداختہ اور مصنوعی ہے۔ جو چیز خاص طور سے ظاہر

---

۵ دکنی میں یہ لفظ اسی مفہوم میں مستعمل ہے جو اردو میں گوشا کا ہے۔ پنجابی میں ایک خاص گریڈ/ سے مخصوص معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اس سے تیل وغیرہ کے نیچے جم جانے والی یا مشینوں میں پڑنے والی گندگی مراد ہے۔

[1] خورشید صفحہ ۱۱۲ [2] خورشید صفحہ ۲۲۲ [3] خورشید صفحہ ۲۱۸ [4] خورشید صفحہ ۲۲۳

کرنے اور اس مطالعے کے بعد بعض علمی نتیجے اخذ کرنے کی ہے۔ وہ زبان ہے جو بے ساختہ لکھنے والے کے قلم سے نکلی ہے۔ اس سے لسانیاتی تجزیہ اور تحقیق کی بہت سی راہیں کھلتی ہیں۔ اب سے سو برس پہلے کی ایک خاص علاقے کی اردو زبان جس پر کہیں برج کا اثر ہے، کہیں پنجابی کا اور کہیں دکنی کا۔ اس کی قواعد و انشا میں جا بجا مختلف طرح کی بے قاعدگیاں ہیں، لیکن ان بے قاعدگیوں میں بھی ایک منطق ہے اور یہ منطق ہمیں تھوڑے سے فرق کے ساتھ ان چھیوں ڈراموں میں ملتی ہے جن پر ہم آج گفتگو کر رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا یہاں ان ڈراموں میں سے ایک کے اسلوب اور اس کے لسانی پہلوؤں کا ایک سرسری جائزہ ہے۔ چھ ڈرامے ان چھ جلدوں میں شامل ہیں وہ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۹۰ء کی درمیانی مدت میں لکھے گئے۔ انہیں سرسری انداز میں پڑھتے وقت بھی پڑھنے والا خوشی سے محسوس کرتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کا علمی کام کرنے کی ایسی گراں قدر اساس اس کے ہاتھ لگی ہے۔ پڑھنے والے کا تو یہ حال ہے اور ادب کی یہ گراں بہا اور بے مثال خدمت انجام دینے والا اپنے اس کام کے متعلق خود جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے:

> مجھ سے جو کچھ ممکن تھا میں نے پوری محنت اور دلی خلوص سے کام لے کر اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کام کو اردو ادب اور تھیٹر کی خدمت کا آغاز سمجھا جائے۔[1]

کام کو ہر حال میں عزیز رکھنے والے جب کوئی بڑا کام شروع کرتے ہیں تو اپنے ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھ کر۔ لیکن جب وہ اس کام کی تکمیل کر چکتے ہیں تو اسے ایک دوسرے بڑے کام کا آغاز سمجھ کر دوسروں کے دلوں میں کام کی لگن کا وہ دیا روشن کر جاتے ہیں جسے ازل سے ابد تک روشن رکھنا ہی خدمت گزاری کی معراج ہے۔

---

[1] خورشید، صفحہ ۵

سید امتیاز علی تاج کے حضور!

گوہر نوشاہی

یادوں کی بازگشت بھی خوابوں سے کم نہیں ہوتی۔ ماضی اور آج کے درمیان دنوں کے نہیں، زمانوں اور عمروں کے فاصلے ہیں۔ کبھی [illegible] کیا تھا اور آج کیا ہے۔ تصور کریں تو گزشتہ [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] اور بس آج کے عالم کی فکر [illegible] ابھی کل کی بات ہے سید امتیاز علی تاج صاحب نے دفتر سے [illegible] مجھے [illegible] ابھی کل کی بات ہے تاج صاحب نے ڈراموں کی انتخابی ترتیب کا [illegible] اور مختلف جواب [illegible] ابھی کل کی بات ہے سید صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا۔ آپ کا مقالہ اس ترتیب میں [illegible] جیسا آپ نے [illegible] کی افتتاحی تقریب پر پڑھا تھا، بلکا پھلکا ہنستا ہنساتا۔ [illegible] انسان کی عجیب ہے خوابوں کو زندگی کا حاصل سمجھتا ہے اور یادوں کے سہارے زندہ رہنے میں [illegible] آج ہم سید صاحب کے استاد کے متعلق ڈراما کی افتتاحی تقریب میں موجود ہیں۔ بعض چیزیں [illegible] تاج صاحب ہی سے حاصل کرنا ہے۔ لیکن تاج صاحب تو اس تقریب میں تشریف نہیں لا سکے [illegible] تشریف لے جانے کا وعدہ کر لیں [illegible] کبھی فراموش نہ کرسکتے آج پہلی مرتبہ اس تقریب میں تشریف نہ لا کر سید صاحب نے اپنی [illegible] کی ہے۔ اس سے میرا جی بھی چاہتا ہے کہ [illegible] ان کی مرضی کے خلاف ہنستا ہنساتا مضمون پڑھنے لگ جاؤں [illegible] سے میں خود [illegible] محفل سوگوار ہو جاتی ہے۔ پھر تاج صاحب کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جہاں ان کے کام کی تعریف ہو رہی ہو، اس محفل میں یا تو جاتے نہیں تھے اور اگر جائیں تو اس طرح چھپ کر بیٹھتے تھے کہ ان کی موجودگی کا [illegible] نہیں ہوتی تھی۔ [illegible] ایک شان تھی۔ آج [illegible] ان کی باتیں [illegible] ہیں عجب ہے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر بیٹھے ہوں [illegible] اس وقت اس جلسہ گاہ کے کسی گوشے میں چپ چاپ بیٹھے ہوئے نہیں ہیں۔

آج سے چار سال پہلے جب [illegible] تاج صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ نے [illegible] ہیں۔ ایک کلاسیکی کتابوں کی ترتیب و تدوین اور [illegible] معاونت [illegible] سید صاحب نے ایم اے اردو کیا ہے اور اس کورس میں اردو کے کلاسیکی ڈراموں پر [illegible] پڑھائی جاتی ہے۔ کلاسیکی ڈراموں کے متن نہیں پڑھائے جاتے اور ایم اے اردو کے طالب علم [illegible] ڈراموں [illegible] کا نام [illegible] جاتے۔ اس کے درمیان جو کچھ ہے [illegible] کتابوں میں ہے [illegible] صاحب میری اس بات پر مسکرائے [illegible] میں آپ کو تمام ڈرامے [illegible] دوں گا۔

اچھا ہے ابھی سے آپ کو ڈرامے پڑھنے اور سمجھنے کی تربیت حاصل ہو جائے گی۔" میں نے اس عنایت کو بہت بڑی نعمت جانا اور ہر قسم کی خدمت کا سید صاحب کو یقین دلایا۔ اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ سید صاحب ہر روز [illegible] بجے بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ڈرامے کی نقل اپنے سامنے رکھتے، اصل پڑھنے کے لیے مجھے ارشاد ہوتا۔ وہ سنتے جاتے، اپنے سامنے رکھی ہوئی نقل کو درست کرتے، تدوین کے اصولوں کے تحت اس کی نوک پلک سنوارتے، ادبی صورت دیتے اور جگہ جگہ حواشی کے نمبر ڈال کر بعد میں حواشی املا کراتے۔

سید صاحب نے ڈرامے کی تیس جلدوں کا جو منصوبہ تیار کیا تھا، اس میں سب سے پہلی جلد ان کے ڈرامے کی تاریخ پر ایک ہوتے طویل مقدمے اور بمبئی کے پہلے اردو ڈرامے "خورشید" کے متن پر مشتمل تھی، لیکن خورشید کا متن جسے سید صاحب ۱۹۵۰ء سے تلاش کر رہے تھے۔ ہنوز دستیاب نہ ہوا تھا۔ اور اس کے بارے میں بے شمار حضرات سے خط و کتابت جاری تھی۔ لہٰذا مجبوراً دوسری جلد کے مصنف یعنی نسروان جی مہروان جی خان صاحب آرام کے ڈراموں کی ترتیب و تدوین جاری تھی۔ میں نے آرام کی پہلی جلد کے بجائے دوسری جلد کے ڈراموں کی تدوین میں شرکت کی۔ آرام کے ڈراموں میں گجراتی اور مرہٹی زبان کے الفاظ اور محاوروں کی کثرت ہے۔ سید صاحب کو سندھی زبان تو خاصی حد تک آتی تھی، لیکن گجراتی اور مرہٹی سے واقف نہ تھے۔ لہٰذا ان زبان کے الفاظ، محاورات اور عبارتوں کا اہم انہوں نے [illegible] رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آرام کی تدوین کے سلسلے میں یہ مسئلہ بھی اہم تھا کہ آیا موجودہ قارئین کے لیے بمبئی کی اردو یا زبان قابلِ فہم بھی ہوگی یا نہیں۔ دوسری بات جو ان ڈراموں کے سلسلے میں بلکہ مرتب ہونے والے تمام کلاسیکل ڈراموں کے ضمن میں اہم تھی وہ یہ کہ کلاسیکل ڈراموں کے متون خواہ وہ بمبئی کے چھپے ہوئے ہوں یا دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے، مصنف کے لکھے ہوئے مسودے سے کم ہی شائع نہیں ہوتے تھے۔ پھر انہیں ادبی فن پاروں کی حیثیت سے چھپنا بھی نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو یوں ہوتا تھا کہ ناشرین تماشائیوں کی دلچسپی کے لیے کسی ایکٹر سے کسی ڈرامے کا مسودہ تیار کراتے تھے اور مصنف سے اجازت لے کر اسے [illegible] اسی طرح چھاپ دیتے تھے جیسے آج کل بھی نوجوانوں کی تفریح کے لیے فلمی گانوں کے کتابچے شائع ہوتے ہیں۔ سید [illegible] صاحب انہی ایڈیشنوں سے ڈرامے مرتب کر رہے تھے، لیکن ان کے پیش نظر تفریح نہ تھی بلکہ ان کا نصب العین ان کلاسیکی ڈراموں کو مصنف، ادب کی گمشدہ کڑیاں سمجھ کر انہیں [illegible] ادب کے سلسلے میں شامل کرنا تھا۔

سید صاحب نے ترتیب و تدوین کے دوران کن کن اصولوں کو سامنے رکھا اور کن کن مشکلات پر قابو پایا، اس کا بیان ایک طویل گفتگو کا تقاضا کرتا ہے، جو اس مختصر وقت میں ممکن نہیں۔ اس وقت میں صرف ان کیفیات اور تاثرات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا ڈراموں کی تدوین کے دوران میں نے سید صاحب کی ذات میں مشاہدہ کیا۔

ڈراما تاج صاحب کی شخصیت کا جزو نہیں کل تھا۔ وہ جب ڈراما پڑھتے یا اس پر گفتگو کرتے تو ان پر خشوع و خضوع اور محویت کا عالم طاری ہوتا کہ جیسے وہ ڈرامے کی بجائے اپنی ذات پر خود غور کر رہے ہوں۔ آرام کی تدوین کے سلسلے میں اجنبی الفاظ کو سمجھنے اور حل کرنے میں جس قدر کاوش اور عرق ریزی سے سید صاحب نے کام لیا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ غلط عبارتوں کی تصحیح [illegible] کا کام بھی سہل نہ تھا۔ ہر گجراتی داں سے ہر اہلِ زبان سے اور ہر ڈرامے کے جاننے والے سے اس قدر طالب علمانہ انداز سے پوچھتے کہ [illegible] کا حق ادا ہو جاتا۔ جب تک کسی بات پر خود اچھی طرح اطمینان نہ کر لیتے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ فرض کیجئے کوئی بات کسی دوسرے کے ذہن میں

واضح ہوگئی اور کبھی سید صاحب اس کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کر سکے تو بڑی خوش طبعی کے موڈ میں فرماتے " پڑھ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن یہ بات ابھی اپنی کی گرفت میں نہیں پڑی ۔ پھر مختلف لغت دیکھے جاتے ' اس کے بعد کلب علی خاں فائق صاحب سے پوچھا جاتا ۔ فرماتے مولانا آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے : اگر اطمینان نہ ہوتا تو ڈاکٹر سید عبداللہ ' پروفیسر سید وقار عظیم ' سید عابد علی عابد ' ڈاکٹر محمد باقر ' ڈاکٹر محمد صادق ' جناب شاہد حسین رزاقی ' ڈاکٹر وحید قریشی غرضیکہ بے شمار حضرات سے مشورہ کیا جاتا ۔ گجراتی اور مرہٹی زبانوں کے لیے سید صاحب کے مستقل مشیر جناب اے جی شیخ ' سیکرٹری اورینٹل کالج میگزین تھے ۔ لیکن انہی پر کیا موقوف تھا ۔ آزاد کے ڈراموں میں پارسیوں کے گانوں کے تراجم کے لیے مجھے کم از کم ایک درجن کے قریب گجراتی دوستوں کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا اور ہر شخص کے پاس بھیجتے ہوئے سید صاحب فرماتے ' قریشی صاحب میری طرف سے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کرنا نہ بھولیے ۔ سید صاحب کا کمال یہ تھا کہ اگر کسی سے ایک لفظ بھی دریافت کرتے تو اس کا شکریہ دیباچے میں ضرور ادا کرتے تھے ۔

سید صاحب کی خدمت میں میں نے ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک تقریباً چار سال ڈراما کی تدوین کے سلسلے میں حاضری دی ہے اس عرصے میں ان کی شخصیت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ۔ ان کا غصہ بھی دیکھا ۔ ان کی والہانہ محبت اور گرم جوشی بھی دیکھی مختلف مسائل پر ان سے دس دس گھنٹے کی گفتگو بھی ہوئی ۔ لوگوں اور چیزوں کے بارے میں ان کے تعلق اور نفرت دونوں کا مشاہدہ کیا مجھے یقین ہے کہ ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا کوئی شخص بیک وقت احاطہ نہیں کر سکتا ۔ سید صاحب کی شخصیت میں عمل حق سب حق وہ نہ تو خود نمائش اور جھوٹی وضعداری کے کیپسول میں بند رہنا پسند کرتے تھے اور نہ ایسے آدمیوں کو اچھا سمجھتے تھے جن کے پاس بیٹھ کر دوسرا آدمی کو اپنی شخصیت کمتر نظر آتی ہو ۔ سید صاحب کی ذات میں یہ بات جو نمایاں نظر آتی تھی وہ ان کا اپنے فن سے لگاؤ تھا ۔ وہ ڈرامے کو اپنا عقیدہ سمجھتے تھے اور اگر میرے جیسے لوگ بھی کوئی غلطی کر بیٹھتے تو ان لوگوں کی ... سید صاحب ڈرامے کی ترتیب و تدوین کا کام عبادت سمجھ کر کرتے تھے ۔ اس قدر محنت سے کام لیتے تھے ... صفحات پڑھتے تو کئی کئی دن ... خوش رہا ... کہا کرتے : غلط کو درست کرنا کوئی مشکل کام نہیں مشکل کام غلط کو غلط رکھنا اور مصنف کا اصل روپ پیش کرنا ہے ۔ اور اس کام کے لیے علم و فضل کے علاوہ ذوق اور تربیت بھی درکار ہے ۔ تصحیح قیاسی کے سلسلے میں سید صاحب اصل متن کو اس قدر قریب رکھتے تھے کہ تصرف کا گمان تک نہیں ہوتا تھا ۔

مجھے ابھی تک یاد ہے کہ جس روز خورشید ... کے ملنے کی خوش خبری پہنچی ہے اور جس دن سید صاحب نے اس کے متن کی نقل کی ہے سید صاحب کی خوشی کا عالم دیکھنے کے قابل تھا ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو ۔

آزاد کے تمام ڈرامے سید صاحب نے مجھے سبقاً سبقاً پڑھائے تھے ۔ یہ ان کی عادت تھی ۔ میں بعد عجز ... اور سید صاحب سے مختلف الفاظ سوال کرتا ۔ بعض سوال ایسے بچکانہ بھی ہوتے ۔ لیکن سید صاحب جس شفقت اور محبت سے سمجھاتے اس سے سید صاحب کے وہ الفاظ ہمیشہ یاد آجاتے کہ کوئی بات نہیں میں آپ کو ڈرامے سبقاً پڑھا دوں گا ۔ آزاد کے دونوں مجموعے مکمل ہونے کے بعد سید صاحب کو مجھ پر اس قدر بھروسا ہو گیا تھا کہ ... ڈرامے کو شروع کرنے سے پہلے مجھے بلا بھیجتے ... اور اس کے اصلاح میں میری رائے بھی طلب کرتے تھے ۔

دیباچے اور تبصرے بھی بڑے مرحلے طے کر کے مکمل ہوتے۔ سید صاحب بعض اوقات ایک ایک دیباچہ پانچ پانچ مرتبہ لکھتے، پھر جا کر وہ آخری صورت اختیار کرتا۔ سید صاحب اپنے قلم سے لکھنے کے اس قدر عادی تھے کہ ان کا لکھا ہوا جتنی مرتبہ ٹائپ ہوتا، ہر مرتبہ ٹائپ کیا ہوا مسودہ پڑھتے ہوئے اس میں تبدیلیاں کرتے جاتے۔ لکھنے کا طریقہ عجیب و غریب تھا۔ موٹے نب والے قلم سے لکھتے۔ باریک باریک الفاظ جیسے موتی پروئے جا رہے ہوں۔ الفاظ کی کفایت شعاری کے ساتھ ساتھ کاغذ کی بچت بھی مدنظر رہتی تھی۔ سطروں کے اندر سطریں لکھتے۔ جتنی جگہ میں دو سطریں لکھی جاتی ہیں، سید صاحب چار سطریں لکھتے حتیٰ کہ بعض اوقات اپنا لکھا ہوا بھی انہیں شیشے کی مدد سے پڑھنا پڑتا۔ جس طرح دیباچہ یا تبصرہ کئی مرتبہ لکھا جاتا، اسی طرح پروف بھی کئی مرتبہ دیکھے جاتے۔ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور کرتے۔ اصول تدوین میں بھی ان کا طریق کار عام محققین سے مختلف تھا۔ سید صاحب کے مرثیہ سوز میں آپ کو کسی جگہ بھی اصول تدوین جامد شکل میں نظر نہیں آئیں گے۔ سید صاحب فرماتے تھے: "تخلیقی انسان وہ ہے جو ہر آن اپنی ذات کا محاسبہ کرتا رہتا ہے" وہ ایک بزرگ کی زبان سے سنا ہوا یہ جملہ اکثر دہرایا کرتے تھے کہ "عقیدے کا آئینہ پر چھوٹ ہو تو بدنما ہوتا ہے سب" وہ کہتے تھے: "انسان کو ہر آن اپنی ذات کا محاسبہ کر کے اپنے رویوں کی صحت کا وثوق کرتے رہنا چاہیے۔ اگر کوئی امر نظرثانی کا محتاج ہو تو اس سلسلے میں عار محسوس نہیں کرنی چاہیے۔" چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ آزاد، ظریف اور رونق، تینوں مضمونوں کے ذرا مختلف تدوین کے طریق کار، نمایاں فرق موجود ہے ان کے بعد جب خورشید کو مرتب کرنے کی نوبت آئی تو ان تمام اصولوں پر نظرثانی کی گئی۔ خورشید کے متن کی تدوین محنت اور عرق ریزی کی انتہا ہے۔

سید صاحب ڈرامے مرتب کرتے وقت ان کی کیفیت سے بے حد لطف اندوز ہوتے تھے۔ میں نے بعض اوقات سید صاحب کو ٹھمریوں اور دادروں کے بول بڑے اچھے سروں میں گاتے ہوئے بھی سنا ہے۔ بعض اوقات میز پر انگلیوں سے ہلکی ہلکی تال بھی بجاتے تھے۔ اور اکیلے بیٹھے اس طرح گنگناتے تھے کہ ان پر وجد کی کیفیت طاری نظر آتی تھی۔ آرام کا ڈراما اصل و گوہر انہیں سب سے زیادہ پسند تھا، خصوصاً اس کی ٹھمریوں کے بول اور طرزیں سید صاحب کو بہت متاثر کرتی تھیں۔ جن طرزوں کو سید صاحب اکثر اکیلے بیٹھے گنگنایا کرتے تھے، یہ ہیں:

(۱) میں تو نہ جاؤں موری سیاں
(۲) موری انکھیاں پھڑکن لاگیں
(۳) آج گھن بوندن برسے رے
(۴) چھتی پون میں سو گئی انگنا

میں نے اپنی گفتگو میں کسی جگہ بھی سید صاحب کو مرحوم نہیں کہا، نہ ایسا کہنے کی مجھ میں جرأت ہے اور نہ میرا دل اسے قبول کرتا ہے۔ البتہ مجھے ان سے اس بات کا شکوہ ضرور ہے کہ میں نے یہ چند جملے ان کے ارشاد پر لکھے تھے۔ لیکن انہوں نے اتنا کرم کیوں نہ کیا کہ سامنے بیٹھ کر ان تحریروں کو سن لیتے اور چند لفظوں میں میری حوصلہ افزائی ہی فرما دیتے۔

تبصرے

"سرسید نمبر" برگِ گل

رسالہ برگِ گل انجمن اردو کالج کراچی کا ترجمان ہے۔ آج سے ۲۲ برس پہلے ۱۹۵۵ء میں اس کا ایک "سرسید نمبر" چھوٹی تقطیع پر شائع ہوا تھا۔ حال میں اسے بعض مفید اضافوں کے ساتھ جناب سید محمد ایوب صاحب قادری، پروفیسر اردو کالج کراچی نے اپنے معاونین کے ساتھ مل کر دوبارہ مرتب کیا ہے۔ جو بڑی تقطیع کے ۴۹۰ صفحات پر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے اور سرسید کے متعلق بڑی قیمتی اور نادر معلومات پر مشتمل ہے۔ اس خصوصی شمارہ کو حسبِ ذیل عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ پیغامات۔

۲۔ سرسید کی شخصیت اور ان کے سوانحی حالات۔ اس ذیل میں سرسید پر بائیس مضامین ہیں۔

۳۔ سرسید کی تعلیمی تحریک اور ادبی خدمات۔ اس ذیل میں چودہ مضامین ہیں۔

۴۔ سرسید کی سیاسی خدمات۔ اس ذیل میں نو مضامین ہیں۔

۵۔ سرسید کا مذہب۔ یہ عنوان تین مضامین پر مشتمل ہے۔

۶۔ سرسید کے رفقاء۔ اس ذیل میں چند خاکے ہیں۔

۷۔ اردو کالج کے کوائف۔ یہ حصہ چھ صفحات پر مشتمل ہے اور سرسید سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اگر برگِ گل کے کسی عام شمارہ میں یہ کوائف درج کیے جاتے تو مناسب تھا۔ رسالہ میں اردو کالج کے سربراہوں، اساتذہ اور طلبہ کے گروپ فوٹو بھی ہیں۔ اس کی جگہ سرسید کے احباب اور دوستوں کی تصویریں ہوتیں۔ جیسے نذیر احمد، حالی، محسن الملک، وقار الملک کے فوٹو ہوتے تو شاید زیادہ موزوں ہوتا۔ اور یہ چیز زیادہ دلچسپی کے ساتھ دیکھی جاتی۔ کسی کالج کے طلبہ کی تصاویر سے عام قارئین کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

سرسید کے متعلق جو مضامین اس رسالہ میں شائع کیے گئے ہیں، وہ بالعموم محنت سے لکھے گئے ہیں اور ان میں سرسید کی عظیم شخصیت اور ان کے کارناموں کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بعض مضامین اچھے اور بعض متوسط درجہ کے ہیں۔ مگر ان سے رسالہ کی خصوصیت اور افادیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کسی رسالہ کا کوئی بھی خصوصی شمارہ ایسا نہیں ہوتا جس کے سارے مضامین نہایت بلند پایہ اور نہایت شاندار ہوں۔ مگر یہ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا کہ اس سرسید نمبر میں بعض ایسے بیانات بھی شامل ہو گئے ہیں، جو واقعات کے خلاف ہیں اور دل آزار ہیں۔ کاش! مرتبین ایسے غیر ضروری بیانات سے رسالہ کو پاک رکھتے۔ ان کے درج کرنے کا سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں کہ انھیں پڑھ کر بعض لوگ سرسید سے بدظن ہو جائیں۔

آخر میں اس نمبر کی بعض بہت معمولی غلطیوں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اگرچہ پروف ریڈنگ احتیاط سے ہوئی تو یہ غلطیاں رہ گئی ہیں۔

صفحہ ۲۶۳ پر ایک حوالہ "اخبار نور آئین" کا دیا گیا ہے۔ مگر تاریخ نہ لکھنے سے حوالہ مہمل ہو کر رہ گیا ہے۔

صفحہ ۲۸۳ کے حاشیہ میں بجائے دار الحرب کے دار الحراب لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح بجنسہ کو صفحہ ۲۵۹ پر بجنسی لکھا گیا ہے۔

صفحہ ۳۰۱ پر نواب محسن الملک کی تاریخ وفات غلط لکھی ہے اور صفحہ ۲۵۶ پر مولانا حالی کے ایک شعر کا مصرعہ بری طرح نقل کر دیا گیا ہے۔

کتاب الفہرست ابن ندیم

محمد بن اسحٰق ابن ندیم عربی زبان کا نہایت مشہور مصنف اور ادیب تھا جو سنہ ۲۹۷ ہجری میں پیدا ہوا اور ۳۸۵ ہجری میں انتقال کیا۔ سنہ ۳۷۷ ہجری میں اس نے یہ کتاب لکھی جو آج ایک ہزار برس سے زیادہ برابر مشہور چلی آتی ہے اور عربی زبان کی بے مثل کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ ۳۷۷ھ ہجری تک کی عربی ادب کی مکمل اور مفصل تاریخ ہے۔ عربی لٹریچر کی کوئی بھی کتاب اپنی عمدگی اور جامعیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس عرصہ میں عربوں نے مختلف علوم و فنون میں جو ترقیاں کیں، جتنے نامور عربی مصنفین اس دوران میں ہوئے، مختلف موضوعات پر جس قدر کتابیں اس وقت تک عربی میں لکھی گئیں، ان سب کی یہ کتاب ایک جامع فہرست ہے اور اسی لیے اس کا نام کتاب الفہرست ہے۔ عربی تصنیفات، عربی علوم و فنون اور عربی مصنفین پر تحقیقی کام کرنے والا کوئی مورخ اس بے نظیر کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے ہر قسم کے تمام عربی علوم و فنون، تصنیفات اور رجال کی مستند تاریخ ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس سے بعد میں آنے والے ہر مورخ اور مصنف نے فائدہ اٹھایا ہے۔ کسی بھی متداول علم اور کسی بھی معروف فن کو اس مصنف نے نہیں چھوڑا، جن کے متعلق بیش بہا معلومات اس کتاب میں موجود نہ ہوں۔ اس میں جن کتابوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان میں سیکڑوں ایسی ہیں کہ آج صفحۂ عالم پر ان کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اور اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو کوئی شخص بھی نہ جان سکتا کہ ہمارے اسلاف نے علم و فن کی ہر شاخ میں کس قدر حیرت انگیز تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔

یورپ نے اس بے نظیر کتاب کی قدر اس کی شان کے مطابق کی۔ مختلف مستشرقین نے بڑی محنت و عرق ریزی کے ساتھ اس پر کام کیا۔ جن میں مستشرق فلوگل کا نام سرفہرست ہے۔ جس نے برسوں کی محنت و کاوش کے بعد اسے مرتب کیا اور بیروت میں مستند حواشی کے ساتھ چھپوایا۔ بعد میں مختلف اوقات میں یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے اور ان میں سے بیشتر نایاب ہو چکی ہے۔ [illegible] مگر آج تک اس کتاب کا اردو ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کو اس کا خیال آیا۔ اور اس نے مولانا محمد اسحٰق بھٹی سے اس کا آسان و سلیس ترجمہ کرا کے ایک ضخیم کتاب کی شکل میں ماہ جون ۱۹۶۹ء میں شائع کر دیا۔ کتاب دس مقالوں پر مشتمل ہے اور اس کی فہرست تنہا تیس صفحات پر آئی ہے۔ نہ صرف ترجمہ نے اصل کتاب پر بیش بہا مفید حواشی کا اضافہ کر کے کتاب کی افادیت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اس کا اشاریہ شامل ہو سکا جو آج کل ہر علمی کتاب کے لیے ضروری ہے۔ ہم یہ دریافت کرنے پر [illegible] ادارہ ثقافت اسلامیہ نے [illegible] اشاریہ تیار ہو رہا ہے اور عنقریب کتابی شکل میں

تاریخ ہو جیسے گا۔ کتاب کی تقطیع ۱۸×۲۲/۸ ہے اور صفحات ۱۳۸۰۔ فاضلانہ۔ کتابت و طباعت بہتر۔ جلد مضبوط۔ قیمت فی کتاب بیس روپے۔ جو اردو اصل درجہ کی علمی کتاب کے لیے ہرگز زیادہ نہیں ہو سکتی۔ ویسے اس کتاب کی قیمت ۱۲۵ روپے ہے۔

کتاب ہذا ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور سے مل سکتی ہے۔

م ۔ ا ۔ ح

طاہرہ (ناول)

مصنف : عنایت اللہ ۔ ضخامت : ۴۴۰ صفحات ۲۲×۱۸/۸ ۔ قیمت : پندرہ روپے

ناشر : التحریر ، اردو بازار ، کبیر اسٹریٹ ، لاہور

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ نے قومی ذہن و ہوش اور خون کو گرمانے والے واقعات سے جنم دیا۔ عنایت اللہ ان پر لکھ چکے ہیں اور اب ہمارے قارئین کے لیے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ [illegible]

ناول نگاری کے میدان میں طاہرہ ان کی پہلی کوشش ہے۔ [illegible] بیان میں غیر معمولی جرأت کے باوجود ناول کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے [illegible]

کہانی دو اہم کرداروں، جمال بیگ اور طاہرہ کے گرد گھومتی ہے۔ [illegible] غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ [illegible] جذباتی کشمکش اور نفسیاتی الجھنیں [illegible] ایک گمنام گوشے سے روشناس کر کے قاری کے ذہن [illegible] جذبات ابھارنے کی کوشش ہے۔

کہانی کے آغاز میں جمال بیگ ہمارے سامنے ایک نفسیاتی مریض کی صورت میں روشناس ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کی تعمیر میں سارا دار و مدار اس ماحول پر ہے جس میں [illegible] جذباتی عشق [illegible] تھیں اور قہر آلود نفرت بھری نظر پڑتی تھی۔ [illegible] وہ اس رنگ میں اس بری طرح رنگا جا چکا تھا کہ بیوی کو بھی [illegible] محروم رہی۔ [illegible] [illegible] اس پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ [illegible] خون کر دوں گا۔ لیکن وہ [illegible] محبت کا پیکر بن جاتی ہے۔ [illegible] دشوار گزار راہوں کے نشیب و فراز [illegible] والے [illegible] منزل [illegible] ہے۔

کہانی کو اس اسلوب [illegible] کی کمی کا احساس ہرگز نہ ہو۔ [illegible] اور دلکش [illegible] طاہرہ ایک اچھے ناولوں میں ہوگا۔

دل کی باتیں

دل کی باتیں میر نسیم محمود کی غزلوں اور نظموں کی کتاب ہے۔ میر نسیم محمود کی شاعری جذبات کی سچائی اور واردات کے خلوص کی شاعری ہے۔ کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں آپ کو شعر برائے شعر یا شاعری برائے اظہار صنعت گری نظر نہیں آئے گی۔ گویا ان کی شاعری دلی واردات کی کہانی ہے۔ شاعر پر کاروبار عشق میں جو کیفیات بھی گزریں انھیں کی عکس بندی ان شعروں میں نظر آتی ہے۔ دلی اور لکھنؤ کی شاعرانہ روایات میں سے ان کے کلام کا رشتہ دلی کی روایت سے جا ملتا ہے۔ ان شاعر کی توجہ اپنی ذات کی طرف اور اپنے جذبات محبت کی طرف ہے۔

میر نسیم محمود کے شعروں میں چند باتیں نمایاں نظر آتی ہیں جو دوسرے شعرا سے منفرد ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کے یہاں جذبات کی شدت ہے اور یہ جذبات بطور خاص عشقیہ جذبات ہیں۔ ان کے دل پر گھڑی گھڑی پل پل جو کیفیت گزرتی ہے اس کو شاعرانہ انداز میں بلا کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔ ان کا دل سیماب کی طرح بے قرار اور متلون مزاج ہے۔ جذبات کی شدت کے اعتبار سے اور خاص جذبے کے اظہار سے معاملات ان کی شاعری کے رشتے روایت سے جڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے شاعروں میں جذبے کی شدت کے ساتھ ساتھ ایک ہی پیکر حسن کو اپنا معبود بنا لینے کا طریقہ پایا جاتا تھا۔ میر نسیم محمود صاحب کے یہاں وہ پیکر حسن جاذب توجہ ہے لیکن دو دن کے پیار میں وہ ایک پیکر نظر ہوتا ہے پھر جدا ہو جاتا ہے۔

یہ دل وحشی مرا
طائر آوارہ تھا، اس کو قفس کی کیا خبر
ایک بے رہ رو مسافر منزلوں سے بے نیاز
یہ دل محروم تھا ہر حسن تھا جس کا ایاز
ایک بھونرا کہ جیسے کھر سے چپکا رہے
ایک گل باغ میں ہر پھول کا رس چوستا ہے

آہ وہ دن کے لیے جانے مجھے کیا ہو گیا
ایک نامعلوم سی دنیا میں آ کر کھو گیا
ایک ہی معبود کے آگے جبیں جھکنے لگی
جذبۂ رنگین آذر جانے کیسے سو گیا

قوزہ ڈالا ہے کس کمبخت نے سارا فسوں

اب کہاں ہے میری مدہوشی کہاں میرا جنوں
کس نے مجھ سے چھین لی میری متاعِ بے بہا
اس تلاطم میں ہوا ہے موت کا کس نے سکوں

پھر وہی بے کیفِ دل ہے پھر وہی شورِ حیات
پھر وہ بے معنی سی دنیا پھر وہی جہدِ ثبات
وہ جو تھا اک نور ہر ذرے میں اب ناپید ہے
پھر ہے میرے سامنے اک اندھیری سی رات

مجموعہ کی شاعری اس لحاظ سے روایتی ہے کہ اس میں جو عناصر ہیں وہ روایتی ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے جدید ہے کہ احساس ہوتا ہے کہ اس میں وفاداری اور عشق میں ایک ہی محبوب پر جان دینے کا طریقہ نہیں ملتا۔ وہ ایک کوشش کرتا ہے اور دوسری کوشش کرتا ہے۔ اب عشق حقیقت پسند ہو گیا ہے اور کوئی حسین دوشیزہ نہیں رہا۔

اس کتاب کی مختصر نظموں میں شاعر کے جمالیاتی احساس اور ذوقِ نظر کی نزاکت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اور جس طرح سامنے کا ہے شاعر کا دل معصوم ہے اس کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح بڑی معصوم خواہشات اور معصوم تمنائیں بھی اس شاعری میں ملتی ہیں۔

آئی ایک تیتری
رنگ کی دھنک بہار کی مہک لئے ہوئے
رقص اور مہک لئے

آئی ایک تیتری
تیتریوں کی ٹولیاں پروں کی موج لئے
حسن میں چمک وہ جس سے شبنم ماند پڑ گئے
ایک شب کی بات تھی شبنمی تھی زندگی
آئی ایک تیتری
جھومتی ہواؤں میں
ناچتی تھرکتی تیرتی ہوئی فضاؤں میں
رقص ختم ہو گیا ایک پل کی بات تھی
آئی ایک تیتری

الف سید

دل کی باتیں

دل کی باتیں میر نسیم محمود کی غزلوں اور نظموں کی کتاب ہے۔ میر نسیم محمود کی شاعری جذبات کی سچائی اور واردات کے خلوص کی شاعری ہے۔ کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں آپ کو شعر برائے شعر یا شاعری برائے اظہار صنعت گری نظر نہ آئے گی۔ گویا اُن کی شاعری دلی واردات کی کہانی ہے۔ شاعر پر کوچۂ عشق میں جو کیفیات بھی گزریں انھیں کی عکس اُن کے شعروں میں نظر آتی ہے۔ دلی اور لکھنؤ کی شاعرانہ روایات میں سے اُن کے کلام کا رشتہ دلی کی روایت سے جا ملتا ہے۔ اس شاعر کی توجہ اپنی ذات کی طرف اور اپنے جذبات محبت کی طرف ہے۔

میر نسیم محمود کے شعروں میں چند باتیں نمایاں نظر آتی ہیں جو دیگر شعرا سے منفرد ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کے جذبات کی شدت ہے اور یہ جذبات بالعموم عشقیہ جذبات ہیں۔ ان کے دل پر گھڑی گھڑی پل پل جو کیفیت گزرتی ہے کو شاعرانہ انداز میں بلا کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔ ان کا دل سیماب کی طرح بیقرار اور متلون مزاج ہے۔ جذباتی شدت کے اعتبار سے اور خالص جذبے کے اظہار کے لحاظ سے اُن کی شاعری کے رشتے روایت سے جڑے ہوتے ہیں۔ لیکن بعض شاعروں میں جذبے کی شدت کے ساتھ ساتھ ایک ہی پیکر حسن کو اپنا معبود بنا لینے کا طریقہ پایا جاتا تھا۔ میر نسیم محمود صاحب کے وہ پیکر حسن جاذب توجہ ہے۔ یہ دو دن کے پیار میں وہ ایک بگڑتا ہوا سے کچھ ہو جاتا ہے۔

یہ دلِ وحشی مرا
طائرِ آوارہ تھا، اس کو قفس کی کیا خبر
ایک بے پروا مسافر منزلوں سے بے نیاز
یہ وہی محمود تھا ہر حسن تھا جس کا نیاز
ایک بھونرا کہ جیسے کھو نہ بیٹھے
ایک تتلی باغ میں ہر پھول کا رس چوستی

آہ وہ دن کے سے جانے مجھے کیا ہو گیا
ایک معصوم سی دنیا میں آ کر کھو گیا
ایک ہی معبود کے آگے جبیں جھکنے لگی
جذبۂ رنگین آوارہ جانے کیسے سو گیا

تو نے ڈالا ہے کس کمبخت نے سارا فسوں

اب کہاں ہے میری مدہوشی کہاں میرا جنوں
کس نے مجھ سے چھین لی میری متاعِ بے بہا
اس تلاطم میں بھلا ہے موت کا کس نے سکوں

پھر وہی ہے کیفِ دل ہے پھر وہی شوخیِ حیات
پھر وہ ہے معنی کی دنیا پھر وہی جوشِ نشاط
وہ جو تھا اک نور ہر ذرّے میں اب ناپید ہے
پھر ہے میرے سامنے اک اجنبی سی کائنات

یہ مجموعہ کی شاعری اس لحاظ سے روایتی ہے کہ اس میں جذبہ خالص ہے اور شدید ہے۔ لیکن اس لحاظ سے جدید ہے کہ عصرِ حاضر کے احساس کا اظہار کرتی ہے کہ اس میں لاابالی پن اور عشق میں ایک ہی محبوب پر جان دے دینے کا رواج نہیں بلکہ وہ ایک کوشش کرتا ہے ناکام ہونے پر دوسری کوشش کرتا ہے۔ اب عشق حقیقت پسند ہو گیا ہے اور کوئی حسین ناچیز نہیں رہا۔

اس کتاب کی نظموں غزلوں میں شاعر کے جمالیاتی احساس اور ذوقِ جمال کی فراوانی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ وہ جس طرح جس انداز سے کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے شاعر کا دل متاثر ہوتا ہے اس کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت بڑی حد تک معلوم ہوتا ہے کہ جمالیات اور عصری تقاضوں کا بھی اس شاعری میں پتہ ہے شعر

آئی ایک تیتری
رنگ کی دھنک بہار کی مہک لئے ہوئے
رنگ اور مہک اڑے
آئی ایک تیتری
چمنوں کی نرمیاں پروں کے بیچ میں لئے
حسن میں چمک وہ جس سے غنچے ماند پڑ گئے
ایک شب کی بات تھی شبنمی تھی زندگی
آئی ایک تیتری
جھولتی ہواؤں میں
ناچتی تھرکتی تیرتی ہوئی فضاؤں میں
رقص ختم ہو گیا ایک پل کی بات تھی
آئی ایک تیتری

[illegible]

شاعر کے الفاظ، اچھوتی کومل نازک کلیاں ہیں
جیسے نور کی ننھی ننھی شمعیں چند فروزاں ہیں
(حسن میں یکتا، نور مجسم ہیں جو نزدِ رگِ جاں ہیں) (عشقِ کامیاب)

میں مستانہ ہوا بن جاؤں چمن چمن میں جھولوں
رنگوں کی تتلی بن جاؤں پھولوں سے خوشبو لوں
لہر سمندر کی بن جاؤں دور افق کو چھو لوں
آوارہ بادل بن جاؤں دنیا کے دکھ بھولوں (اسیری)

میر صاحب کی شاعری میں مقصدیت یا معاشرتی مسائل کا تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن شاعری اگر دل کی دنیا کی داستان ہے تو اُن کی یہ داستان بڑی رنگین اور دلکش ہے۔

ان کی غزل کا رنگ ڈھنگ بھی دبستانِ دہلی کی غزل سے ملتا جلتا ہے۔ اُن کے جذبات میں کہیں کہیں بیقراری اور بیتابی ہے تو کہیں شدتِ جذبات کے ساتھ ہی ٹھہراؤ بھی ہے۔ اور کہیں گل و گلشن کی بہار کی کے ساتھ مسرت کے جذبات ہیں تو کہیں یہ جھلکتا ہے۔ اگر ایک طرف شاعر رومانی دنیا کے ساتویں آسمان پر پرواز کرتا ہے تو دوسری طرف پیری کے نقصانات سے پریشان بھی ہے۔ ایک طرف یارِ طرحدار کا فدائی ہے تو دوسری جانب وطن کی آن پہ مٹنے والوں میں ہے۔ اور قومی وحدت کا شیدائی ہے۔ الغرض ان کے ان جذبات کا تنوع ہے۔ اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ وہ تنقیدی نظریات کے کسی سکول کے مقلد ہو کر نہیں رہے بلکہ جدید و قدیم میں سے جو کچھ انہیں پسند آیا اس سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں وہ خود لکھتے ہیں:

"میں پرانی شاعری کا مداح ہوں خصوصاً میر تقی میر کا۔ غالب کو بڑا شاعر مانتے ہوئے بھی اس کے طرزِ اظہار کو سوائے خود غالب کے، خطروں سے پُر سمجھتا ہوں ...... جدید شاعری میں راشد، میراجی اور ان کے بعد میں آنے والے بہت سے شاعروں نے ہیئت کے تجربے کئے، ان کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ جہاں جہاں مجھے اظہار میں مدد ملی ہے میں نے انہیں اپنایا ہے۔ قدیم شاعری کا پرستار ہوں نہ روایت سے بغاوت کا علمبردار۔"

چنانچہ میر نسیم محمود صاحب کی شاعری میں مفہوم و معانی کا سلسلہ روایت سے جڑا ہوا ہے اور ہیئت کا جدید شاعری سے میل کا پہلو نظر آتا ہے۔

اسی طرح ان کی غزل میں کلاسیکی غزل کی جھلک ہے اور ذاتی واردات کی انوکھی تمثیل ؎

آج ضرور بھلا کر آ جا — مست ہوا ہے مست فضا ہے
پل بھر جینا موت سے پہلے — اس میں بھی تو رہ گیا ہے
آ میں تجھے سینے سے لگاؤں — دیکھے دنیا، دنیا کیا ہے

یا تو جہاں میں اپنا حسن ایسے نہ ہر طرف بکھیر
یا مرے دل کو ضبط دے فطرت عشق کو بدل

آنکھ بے تاب ہے لیکن دل تپاں نہیں ہوتا
عشق اب بھی ہوتا ہے جاوداں نہیں ہوتا
وصل کے جھمیلوں میں پرسش و تصور گم
اب رقیب ہے دشمن آسماں نہیں ہوتا
اس کو کہیے خودداری شوق کی کمی کہیے
راز اب بھی ہوتے ہیں رازداں نہیں ہوتا
جانی بوجھی باتیں ہیں دیکھی بھالی راہیں ہیں
زخم تازہ ہوتے ہیں غم جواں نہیں ہوتا

کیا تری طرف سے ہیں مسرت جو ذکر اور نغم   نور نقش میں جیسے تیز کنول، شبنم
آج کیا ہوا جانے چونک چونک اٹھتا ہے   یوں تو دل کی ہر دھڑکن تیری یاد ہے پیہم
بار بار ہجراں میں دل سے عہد کرتا ہوں   پھر جدا نہ ہوں گے ہم اب ہوئے اگر باہم

غزل بنیادی طور پر عشقیہ جذبات کی داستان ہوتی ہے۔ مگر اس میں اپنا عہد بیان کا اس سے ... فلسفیانہ موضوعات، سیاست جیسے مسائل اور دیگر غیر عشقیہ باتیں بھی عشق کے پردے میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ بیگم نسیم محمود صاحبہ کی غزل میں بھی ایسے خیالات جلد جلد جھلک دیتے ہیں ؎

ہیں لاکھ تعزیریں کہ ہم اہل طلب ہیں
کچھ اور کڑی ہو کے سزا کیوں نہیں دیتے
ہے جان بھی کے لیے اک جنبش لب بس
عیسیٰ نفسو آج دوا کیوں نہیں دیتے

الغرض بیگم نسیم محمود کی شاعری روایتی فنی پختگی اور جذبے کی سچائی اور شدت اور سادگی سے حسن کی وجہ سے منفرد رنگ رکھتی ہے۔

کتاب دل کی باتیں سفید کاغذ پر خوبصورت چھپی ہے۔ سرورق رنگا رنگ ہے۔ صفحات ۲۰۰ اور قیمت چار روپے پچاس پیسے جو کہ بہت مناسب ہے۔ ناشر ادارہ فکر و ادب ۸۰۔ جی ماڈل ٹاؤن لاہور۔


معیار ہو یا مقدار
دونوں قابلِ اعتبار
میپل لیف
میں دوہرا فائدہ
MAPLE LEAF
BSS 12 1958
112
lbs
W.P.I.D.C.
میپل لیف سیمنٹ فیکٹری لمیٹڈ
داؤد خیل، میانوالی

793 F

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

لاہور

غزل نمبر

(ترمیم و اضافہ کے ساتھ)

فروری سنہ ۱۹۶۰ء

مرتبہ

محمد طفیل

(طبع ثالث)

ادارہ فروغ اردو، لاہور